انتخاب مخزن

حصہ سوم

اعنی

مجموعہ مضامین جناب خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب

بی اے بیرسٹر ایٹ لا لاہور

بفرمایش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری گیٹ لاہور

مطبوعہ کریمی پریس لاہور

طبع اول ۱۰۰۰

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بناوٹ اور سادگی

بناوٹ بھی اِک فن ہے جو جانتا ہو
تری سادگی کچھ ہمیں جانتے ہیں

مندرجۂ عنوان شعر کی خوبی یوں تو ظاہر ہے۔ مگر لطافت خاص اس میں یہ ہے کہ اس کا اطلاق محدود نہیں۔ سادگی سے مراد لیجئے سچ۔ اور بناوٹ کو قرار دیجئے دروغ۔ سچ سچ ہے۔ خواہ اُسے لاکھ پردوں میں چھپائیں۔ جس رنگ میں جلوہ گر ہو پہچاننے والے پہچان جائیں گے۔ ایسے ظاہر بیں زمانہ میں جیسا کہ ہمیں نصیب ہوا ہے۔ یہ اصول خطرناک تو ضرور ہے۔ مگر پھر سچا اصول ہے۔ گو ایک دفعہ تو سچی بات کہتے ہی انگلیاں اُٹھ جاتی ہیں اور آجکل دروغ کو فروغ ہے۔ مگر تابہ کے۔ گلٹ کے گہنے چند دن تو چاندی سونے کے زیوروں کو مات دیتے ہیں۔ مگر جب عارضی چمک اُڑی۔ اور نیچے پیتل اور تانبا نظر آیا پھر اُن سے ذلیل اور بد نما چیز قیاس میں نہیں آسکتی۔ اور اس بدنمائی کے آثار بھی ظاہر ہونے کو ہوتے ہیں۔ کہ وہی حسین جنہوں نے بڑے چاؤ سے ایسے زیوروں کو باعث زینت ٹھیرایا تھا۔ انہیں نہ صرف نظروں سے گرا دیتے ہیں بلکہ اُتار کے پھینک دیتے ہیں

اور آخر سونا سونا ہی ہے۔ جتنا پرانا ہو جائے جتنا اُسے گھسو۔ جتنا اُسے پتھر پر رگڑو اپنے جوہر اصلی دکھاتا ہے۔ اور کبھی کسی نازک بدن کے کانوں سے اُترے بھی تو صراف کی صندوقچی میں قدر و منزلت سے بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ گھر میں عزت پاتا ہے تو بازار میں بھی اُس کی توقیر ہے اور بازار سے گراں ملتا ہے تو گھروں میں بھی منزلت ہوتی ہے۔ جو نسبت کھوٹے کو کھرے سے ہے وہی تناسب بناوٹ اور سادگی میں ہے۔ تس پر بھی ایک عالم بناوٹ پر مٹا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ بہت تھوڑی آنکھیں ہیں جن کو وہ بینائی عطا ہوئی ہے جو بناوٹ کے پردوں کو ہٹا کر ہر چیز کے حسن و قبح کو اُس کی عریانی میں دیکھ سکے۔

جو لوگ سادگی کے نظاروں سے آشنا ہیں وہ بناوٹ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر بناوٹ کے شیدائی بھی کیا کریں اس دنیا میں رہ کر دنیا سے الگ رہنا یہ بھی تو ہر کسی کا کام نہیں۔ اور وہ اپنے اپنے طور پر ایک ادنیٰ نمونہ اُس بڑی مثال کا دکھا رہے ہیں جو دنیا نے اُن کے لئے قائم کی ہے پرانے شعرا اور مصنفین کی تحقیق متفق اللفظ ہو کر گواہی دے رہی ہے۔ کہ دنیا جس کے حسن زاہد فریب کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگان خدا مبتلا ہیں اصل میں ایک زال پیر ہے جو صرف خط و خال کی آرائش سے لوگوں کے دلوں کو لبھا کر دام تزویر میں لا رہی ہے۔ اور اگر اُس کے چہرہ سے وہ پوڈر اور سرخی جو اُس کی زینت ہے دھو ڈالی جائے۔ اور اُس کے مصنوعی کالے اور لمبے بال اُکھاڑ پھینکے جائیں۔ اور اُس کے بناوٹی سفید دانتوں کی لڑی جو یہ کسی متنفس کے روبرو نہیں اُتارتی۔ نکال باہر کیجائے اور اسکی اصلی شکل کسی کو دکھادیجائے تو پھر اسکو شیدائی اس سے قطع تعلق کر لینا تو کیا کسی حسین کے حسن پر اعتبار نہ کریں۔ اور سب سے کنارہ کش ہو کر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں۔ پس جب یہ دنیا بذات خود ایک بڑا دام تزویر ہے جو اس عالم پر پھیلا ہوا ہے تو وہ لوگ جو اس بڑے دام کے نیچے چھوٹی چھوٹی جالیاں لگاتے ہیں۔ معذور ہیں۔ اور جو بیچارے نادانستہ ان چھوٹے پھندوں میں پھنستے ہیں وہ معذور تر۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ بناوٹ کا پھندا بڑا زبردست پھندا ہے۔ جسے دیکھو

اس کا شکار ہے۔ عشاق ہیں تو زلفوں کے پیچ و خم کے پھیر میں۔ شعرا ہیں تو کلام میں ملازم کی تلاش میں۔ واعظ ہیں تو ناز و کرشمہ بر سر منبر کے انداز سوچ رہے ہیں۔ مضمون نگار ہیں تو انہیں قافیہ بندی کی دُھن لگی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جس کی زُلفِ پُر پیچ کے دیوانے ہیں۔ وہ اس قابل بھی ہے کہ اُسے چاہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا۔ کہ جس کلام کو تلازم کے نمک مرچ سے لطیف بنا رہے ہیں وہ کسی ذاتی صفت سے متصف ہے یا نہیں۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ وعظ میں نکات بھی دلپذیر ہیں یا محض انداز ہی کی فکر ہے۔ اور کوئی نہیں پروا کرتا۔ کہ قافیہ بندی کی دھن میں کہیں اصل مضمون ہی خراب نہ ہو جائے۔

اردو علم ادب کو آجتک اس بناوٹ کے شوق نے نہایت نقصان پہنچایا ہے اس میں شک نہیں کہ اردو زبان ابھی ایک نوعمر زبان ہے اور مقدار کے اعتبار سے اسکے ادب کا ذخیرہ کچھ تھوڑا نہیں۔ سینکڑوں دیوان اشعار آبدار سے پُر ہیں۔ مثنویاں ہیں۔ واسوختیں ہیں۔ مرثیے ہیں۔ تہنیتیں ہیں۔ ہجو ہے۔ قصائد مدح ہیں۔ نثر میں قصے ہیں افسانے ہیں۔ رقعات ہیں۔ اور حال میں کتب تاریخ و سیر و فلسفہ اردو میں موجود ہو گئی ہیں اخبارات ہیں۔ رسالے ہیں۔ اردو لکھنے اور بولنے والوں میں لکچرار ہیں۔ واعظ ہیں۔ لطیفہ گو ہیں۔ بذلہ سنج ہیں۔ رُلانے والے ہیں۔ ہنسانے والے ہیں۔ غرض جو آثار کسی لٹریچر کی ترقی کے ہوتے ہیں۔ سب کے سب موجود ہیں۔ مگر صرف ذخیرہ کی کمیت پر نظر ڈالنے اور کیفیت کا لحاظ کرنے سے صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ذخیرہ کس پایہ کا ہے اور کیفیت کا جو حال ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ پہلے نظم کو ہی دیکھئے۔ کہ از سرتا پا بناوٹ ہے۔ اکثر حصوں کی نسبت تو خود مصنفین اظہار کرتے ہیں۔ کہ ان میں فلاں صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ نہ صرف ہماری نظم کی ظاہری صورت میں بناوٹ سے کام لیا گیا ہے بلکہ خیالات بھی اکثر تصنع سے پُر ہیں۔ جن پیچیدہ جذبات دلی کے ظاہر کرنے کے لئے یہ ملکہ بعض طبیعتوں میں قدرت نے ودیعت کیا تھا اُن کو ہمارے شعرا اکثر دل میں ہی چھپائے چلے گئے ہیں۔ اور لیلی کی صورت پر طعنے دینے اور مجنوں کے ساتھ وحشت میں مقابلہ کرنے۔ فرہاد کو کم ہمت ٹھہرانے اور شیریں کی بیوفائی کی تشہیر میں اپنی ہمتیں صرف کر گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر

تصنع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہلِ ملک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہیں ہوا۔ جن کی باہمی محبت کے قصوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں۔ اور اس کثیر الوقوع معاملے میں بھی کتب فارسی کے دست نگر رہے۔ جو جو شوق اکثر شعرا نے نظم میں ظاہر کئے ہیں۔ اُن میں بہت سے اُن کے اصلی شوق نہیں۔ صرف تقلیدی طور پر اُن کے مضامین باندھتے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ کہ مہندی کو اس زمانہ میں وہ مقبولیت نہیں رہی جو آج سے چالیس پچاس سال پہلے تھی۔ اُس وقت حسن کی آرائش کے لوازم میں حنا نہایت ضروری تھی۔ اب شادی بیاہ۔ دن دہار میں تو رسماً استعمال ہوتی ہے۔ مگر نئے فیشن میں پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ نہ حسین اسے باعثِ زینت سمجھتے ہیں اور نہ دیکھنے والے اس کے رنگ کو کچھ بہت خوش ہو کر دیکھتے ہیں۔ اس پر یہ حال ہے کہ آجکل جو اشعار کے مجموعے چھپتے ہیں جن میں نوجوان شعرا پرانے رنگ میں طبع آزمائیاں کرتے ہیں۔ اُن کو اُٹھا کر دیکھئے۔ شاید کوئی حنا کی تعریفوں سے خالی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی مصنوعی شاعری سے کیا حاصل ہے اگر یہی طبیعتیں جو تقلید کے بندوں میں جکڑی رہیں۔ اپنے بل پر اُڑتیں۔ تو دنیا ان کی بلند پروازیاں دیکھکر حیران ہوتی۔ مگر ابتدا ہی میں کچھ ایسی بنیاد پڑی کہ بناوٹ کے سلسلہ سے رہائی نہیں ہوئی۔ نثر میں بھی آج سے بیس پچیس برس پہلے تک یہی رنگ ہے۔ عبارتیں مقفٰے۔ الفاظ زیادہ۔ خیالات کم۔ خطوط میں القاب لمبے اور مطالب مختصر۔ ضرورت سے زیادہ مبالغہ۔ ضرورت سے زیادہ لجاجت۔ رقعات کے رنگ کو تو پہلے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے پلٹا۔ اور اردو نثر کی سادگی میں وہ پُرکاری دکھائی کہ آجتک کسی سے اس کا جواب نہیں ہو سکا۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ مرزا غالب بجائے انیسویں صدی کی ابتدا کے اس کے وسط میں پیدا ہوتے اور اس وقت زندہ ہوتے تو نئے زمانہ کی ہوا سے اُنکی طبیعت وہ جلوہ دکھاتی۔ کہ اردو نظم مطالب اور معانی کی بلندی کے اعتبار سے ہر زبان کی عمدہ نظم سے مقابلہ کا دعوٰی کر سکتی۔ اور نثر میں وہ جادو ہوتا جسے طبیعتیں آجکل ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں۔ تاہم جس زمانہ میں مرزا غالب ہوئے اُس کے اعتبار سے جو کچھ وہ نثر کی

تجدیدیں کر گئے۔ نہایت حیرت خیز ہے۔ اس کے بعد سر سید احمد خاں مرحوم نے اردو نثر میں انگلستان کے سلیس سے سلیس لکھنے والوں کا نقشہ دکھایا۔ اور اُس نے سب سے پہلے یہ دکھا دیا کہ کلام بغیر رنگینی کی کوشش کے مؤثر اور پر زور ہو سکتا ہے۔ اور زبانِ اردو باوجود اپنی نوعمری کے ایسے ایسے دقیق مطالب کے ادا کرنے کی متحمل ہے جو کئی اور زبانیں باوجود پیرانہ سالی کی مشق کے نہیں ادا کر سکتیں۔ سر سید احمد مرحوم کا یہ شوق رفتہ رفتہ اُن کے احباب تک پہنچا۔ اور اب بہت سے اصحاب سادہ مگر پر مطلب مضامین لکھنے والے ملک میں پیدا ہو گئے ہیں۔ نظم میں سادگی سب سے پہلے اختیار کرنے کے ثواب کے مستحق مولانا الطاف حسین صاحب حالی ہیں۔ اور اب شعر میں سادگی۔ اصلیت اور جوش دکھانے والے شعرا ہندوستان میں موجود ہوتے جاتے ہیں۔ ہم آج سادگی کی اصلی دلفریبیوں کے قدردانوں کو صلائے عام دیتے ہیں کہ اگر سادگی اور بناوٹ کی جنگ دیکھنی ہو۔ تو ہمارے پاس آئیں اور مخزن کے صفحوں میں دیکھیں۔ بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہے اور ہو سکتا ہے۔ اُس کو اپنے دلدادوں کی تعداد کا گھمنڈ ہے اور بجا ہے مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسا ہے اور درست ہے۔ اور سب سے بڑی تسلی اُسے یہ ہے۔ کہ زمانہ کی رفتار اُس کے موافق ہے۔ یہ نیا مذاق ملک میں بہت کچھ تہذیب الاخلاق کے نامور ایڈیٹر اور اُس کے ہمراہیوں اور حسن کے فاضل مضمون نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور گو یہ دونوں بیش بہا رسالے اب موجود نہیں۔ مگر ان کے قیمتی مضامین موجود ہیں۔ اور ملک کے لٹریچر پر ان کا اثر موجود ہے اور یادگار رہیگا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ملکی لٹریچر ابھی اس قسم کی خدمات سے مستغنی نہیں۔ جو ان رسالوں نے کیں تھیں۔ اور کسیقدر ضروریات اور حالات بدل بھی گئے ہیں۔ اور متقاضی ہیں۔ کہ کوئی علمی رسالہ مناسبِ حالاتِ وقت نکلے ہم میں اور اُن بزرگواروں میں جنہوں نے اس سنگلاخ زمین میں سفر مینا کا کام کیا کوئی نسبت نہیں۔ ہم اُن کے خوان کے زلہ رُبا ہیں۔ مگر چونکہ اُن کی سر توڑ محنتوں سے اب راستہ بھی آسان ہو گیا ہے۔ ہم بھی اس طریق میں رہروی کا عزم کر سکتے ہیں اور اپنی ناچیز حیثیت کے موافق زبانِ اردو کی خدمت کرنے کے عشق میں اس امر کی پروا نہیں کرتے کہ راستے میں

کیا دقتیں اور دشواریاں پیش آئینگی۔ اور ہم کہانتک اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں گے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اردو خواں اصحاب کے لئے آسان اور تفریحی مطالعہ کا کافی سامان موجود نہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ تہذیب اور حسن کے برابر نہ سہی۔ اس سے کم ہم کہانتک اس سامان کے مہیا کرنے میں مفید ہو سکتے ہیں۔

دیر است کہ آوازۂ منصور کہن شد تو بارِ دگر تازہ کنی دار و رسن را

اس وقت جو ماہوار رسالے ملک میں شایع ہو رہے ہیں۔ اُن میں ہم دلگداز۔ معارف۔ افسر اور اودہ ریویو کو نہایت غنیمت سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے مفید کام میں اُن کے ساتھ شریک ہوکر اُن کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے چند ماہوار رسالے ہرگز کافی نہیں۔ اردو اخبارات کی تعداد کے ساتھ رسالوں کی تعداد کو کوئی نسبت ہی نہیں اور نہایت خوشی کا مقام ہو اگر وہ صرف جو بعض غیر مفید اخبارات پر جو اچھے اہتمام سے شایع نہیں ہوتے۔ ہو رہا ہے عمدہ رسالوں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ موجودہ علمی رسالوں کی تعداد میں ایک رسالہ زیادہ کرتے ہوئے اپنا رنگ جہانتک ممکن ہو سب سے جدا رکھیں۔

فنِ تقریر

خدا نے انسان کو گویائی عطا کرنے میں تو اپنے لطفِ عمیم کا ثبوت دیا ہی تھا۔ مگر بعض اپنے چیدہ بندوں کو قوتِ بیانیہ دیکر موردِ الطاف خاص بنایا ہے اور قوتِ بیانیہ کے ذریعہ سے حکمت ایزدی نے دنیا میں وہ وہ کام نکالے ہیں۔ جن کے کرنے سے اور قوتیں عاجز تھیں۔ مثلاً تیغ و آتش فاتحانِ دنیا کے ہاتھ میں بڑی طاقتیں رہی ہیں۔ ان سے انہوں نے سرکشانِ جہاں کو نیچا دکھایا۔ زبانِ تیغ نے بڑے بڑے بدزبانوں کے منہ پر مُہرِ سکوت لگائی۔ اور زبانۂ آتش کے بلند ہوتے ہی سب مغروروں کو سرِ غرور جھکاتے ہی بنی۔ مگر یہ تمام فتوحات ہیچ ہیں۔ اُن فتوحات کے سامنے جو مختلف زمانوں میں تیغِ زبان کو نصیب ہوئیں۔ زبانِ تیغ کا اثر دو پر چار پر دس پر ہوا۔ تو تیغِ زبان نے دو ہزار چار ہزار دس ہزار کو ایک وقت میں مطیع کیا۔

پہلا اثر اگر محدود عرصہ کے لئے ہوا تو دوسرا زمانہ دراز پر حاوی رہا۔ جو فتوحات پیغمبرونکی مبارک زبانوں کی آبدار تلواروں نے دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف زمانوں میں حاصل کی تھیں۔ وہ آجتک قایم ہیں۔ بلکہ دن بدن بڑہتی رہتی ہیں۔ حالانکہ فاتحانِ دہر کے نام و نشان تک رفتہ رفتہ صفحۂ دہر سے محو ہوتے جاتے ہیں۔ اور زمانے کے بیرحم ہاتھوں نے بعض کی دھندلی نشانیاں تک مٹا چھوڑی ہیں۔ پیغمبروں اور مذہبی پیشواؤں کی یہ آبدار تلواریں تو نہایت اعلیٰ نمونہ زبان کے معجزات کا ہیں۔ کیونکہ اُن کی چمک خاص نورِ الٰہی سے تھی۔ مگر دنیاداروں میں بھی وہ لوگ جنہیں جوہرِ فصاحت دیا گیا ہے اپنے اپنے عہد میں بہت کچھ کر گئے ہیں۔ اُن کے کام کے اثرات تاحال موجود ہیں۔ اور زمانہ اُن کو یاد رکھیگا اور اُن میں جس کسی کے اقوال قلمبند ہو گئے ہیں۔ اُس کے نام کے نہ مٹنے کی تو گویا ضمانت موجود ہے۔ جبتک دنیا میں علم ہے اور علم کے شوقین لوگوں میں پائے جاتے ہیں جبتک مطالعہ مفید سمجھا جاتا ہے۔ اور زباندانی مطالعہ کے لئے ضروری مدد تصور کی جاتی ہے جبتک لوگوں میں زبان کی خوبیوں کا مذاق ہے اور یہ مذاق قابلِ قدر شمار ہوتا ہے۔ اُس وقت تک لوگ ان شیریں سخنوں کا کلام پڑہنے سے سیر نہونگے۔ نسلیں گذرتی جائینگی۔ مگر اس شوق میں کمی نہ آئیگی۔

یوں تو ہر زبان میں مادہ فصاحت ہے اور ہر زبان کو فصاحت سے بولنے والے گذرے ہیں۔ مگر ایشیائی زبانوں میں یہ قوت بالطبع دوسری زبانوں سے بڑھ کر ہے۔ اور ایشیائی طبیعتوں میں اس قوت کے بڑہانے کی قابلیت قدرتی طور پر بہت ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ فصاحت بہ حیثیت فن ایشیا میں ایک عرصہ سے متروک ہے اور اہلِ فرنگ نے اس فن کو صدیوں کی مشق سے اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عرب و عجم میں فصحا نہیں گذرے یا اس وقت بالکل معدوم ہیں۔ یا ہندوستان میں پر تاثیر واعظ و خطیب نہیں ہوئے یا اب نہیں ہیں۔ مگر تعداد وہ نہیں جو ممکن تھی۔ یا جو ان ممالک سے بہت کم رقبہ کے ممالکِ اہلِ فرنگ میں ہے۔ نیز یہ کہ فرنگستان میں تو فصحا کے طبقے میں اکثر ایسے اصحاب ہیں۔ جن کی قابلیت عطایائے قدرت اور باقاعدہ مشقِ فن کی مناسب ترکیب

کا نتیجہ ہے۔ اور یہاں جو کوئی خال خال خوش بیان آدمی پایا بھی جاتا ہے۔ اُس کی مثال سبزۂ خودرو کی مثال ہے۔ قدرت نے کہیں جوہرِ فصاحت طبیعت میں رکھدیا۔ یا زبان میں تاثیر بخشدی۔ اور اتفاقیہ کسی تقریب سے تقریر کا موقعہ بھی پڑ گیا جس سے جوہردار کو خود اپنے جوہر کا علم ہوگیا۔ تو یہاں کے لئے فصاحت کے مردِ میدان بن گئے۔ اب دیکھتے ہیں تو مشق کا موقعہ بہت کم۔ کہیں برس چھ مہینے میں ایک دفعہ کوئی بڑا مجمع تقریر کے لئے مل جائے۔ تو وہی تختۂ مشق ہے اور وہی تقریبِ اظہارِ فن۔ دس بیس جلسوں میں بولنے کا اتفاق ہوگیا تو پختہ کار سمجھے جانے لگے۔ برعکس اس کے مغربی دنیا میں اول تو والدین یا اُستاد بچوں کی طبیعت کا موازنہ کر کے اگر اُن کی مناسبت گویائی کی طرف دیکھیں تو انہیں مدرسہ ہی میں مشق کے موقعے دینے لگتے ہیں اور اُنہیں بعد تحصیل علم ایسے کاموں میں لگاتے ہیں جہاں گویائی کی مشق ہوتی رہے۔ اس منزل پر پہنچکر اگر انہیں شوق ہوتا ہے تو فنِ تقریر پر ضخیم کتابیں موجود ہیں۔ جن کا وہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مدرسے اس فن کے لئے مخصوص ہیں۔ جہاں اس فن کے ابتدائی مرحلے آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑھکر ملک کے لٹریچر میں ایک بہت بڑا ذخیرہ فصحا کے لکچروں اور خطبوں کا موجود ہے جن پر عبور طالبِ فن کے لئے اکسیر ہے۔ ان مدارج کو طے کرنے کے بعد عدالتیں۔ کونسلیں اور پارلیمنٹیں ایک سے ایک اچھا ذریعہ قوتِ تقریر کے مانجھنے کا ہیں اور ایک ان پر کیا منحصر ہے۔ پبلک جلسے اس کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور ان میں اہلِ علم اس ذوق شوق سے آتے ہیں۔ اور ذرا ذرا سی خوبی کی اس زور سے داد دیتے ہیں۔ کہ الکن بھی کلیم بن جائے تو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ قدیم روما کے ایک مشہور فصیح کا قول ہے۔ کہ "فصاحت آزادی کا ایک بہترین ثمر ہے" یہ وہ درخت ہے جو اسی سرزمین میں جڑ پکڑتا ہے۔ جس پر آزادی کی حکومت ہو۔ اور جسے آزادی ہی کی آب وہوا راس ہے۔ ایک حد تک تو مغربی دنیا اور مشرقی دنیا کی فنِ تقریر کے متعلق ترقی کے نمایاں فرق کی وجہ اس قول سے سمجھ میں آتی ہے۔ یعنے مغربی ممالک کی ترقی فنِ فصاحت میں اُن ممالک کی آزادی کے مطابق ہے اور یہاں کی ترقی یہاں کی آزادی کے تناسب سے ہے۔ اس انگریزی

حکومت میں جو ہمیں آزادی کی نعمت نسبتاً زیادہ حاصل ہوئی ہے۔ تو ہندوستان میں مجالس کے چرچے شروع ہوئے ہیں۔ لکچراروں کی ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ اور فصیح اور خوش بیان خطیبوں کی مانگ ہے۔ اور جوں جوں ہمارے ملکی حقوق وسیع ہوتے جائیں گے توں توں فنِ تقریر میں ترقی ہوتی جائیگی مگر چونکہ وسعت حقوق اپنے قابو کی چیز نہیں۔ اسلئے کسی ایسے وسیلۂ ترقی کا ذکر کرنا چاہئیے جو اہل ملک کے اختیار میں ہو اور وہ قدردانیٔ اہلِ فن ہے۔ عرب میں قدردانی کی یہ نوبت ہے کہ مشہور آدمیوں کے ایک ایک لکچر کے لئے پانچ پانچ ہزار روپیہ اور دس دس ہزار روپیہ دینے کو لوگ تیار ہیں۔ اور وہ لکچر کا ٹھیکہ لے لیتے ہیں۔ اور ٹکٹ لگا دیتے ہیں۔ پھر سامعین اس کثرت سے جاتے ہیں کہ ٹھیکہ دارونکو بھی نفع ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی قدردانی نام کو بھی نہیں۔ مفت لکچر سننے والے بھی پانچ دس ہزار آدمی ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتے۔ اہلِ ملک کو ناقدردان ٹھہراتے ہوئے یہ بھی اعتراف کرنا ضروری ہے۔ کہ یہاں کے مقرر جو کچھ بھی ہیں۔ تقریر کی ذمہ داری کو اُس حد تک محسوس نہیں کرتے۔ جو مقرران یورپ کا خاصہ ہے۔ وہاں مشہور سے مشہور لکچرار بھی خاص تیاری کے بغیر پبلک کے روبرو نہیں آتے۔ بعض تو مہینوں پہلے تقریر کو قلمبند کرتے ہیں۔ پھر اُس کو پچاس بار یا سو بار پڑھکر حفظ کرتے ہیں۔ اس کے بعد چند رازدار احباب کے روبرو پڑھکر اُن سے کہتے ہیں۔ کہ اگر کوئی نقص طرزِ ادا یا حرکات میں ہوں تو انہیں بتادیں۔ یا آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر حرکات اور طرزِ ادا کی مناسبت کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر سامعین کے کانوں تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ تماشائیوں کو محوِ حیرت کر دیتے۔ دلوں کو موم بنا لیتے ہیں۔ اور سامعین سے جو کچھ مانگ بیٹھیں لیکر ہٹتے ہیں کاش ہمارے ملک میں بھی اس ضروری اور قابلِ قدر فن کو فن سمجھکر اختیار کرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں۔ اور قومی مفید کاموں کے واسطے ترغیب و تحریص کے لئے کارآمد ہوں۔ ایک برقی طاقت اُن کے ذریعہ سے اہل ملک کے دلوں پر اپنا اثر ڈالسکے۔ اور جن جن باتوں کے لئے کام کرنے والوں کو مستعد کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی وسیلہ سے آمادہ کئے جائیں +

ملکۂ معظمہ آنجہانی

وہ سانحۂ جانکاہ جس نے ابھی تھوڑے دن ہوئے خاتونانِ زمانہ کی سرتاج ملکہ وکٹوریہ کی ذات کی برکتوں سے اس دنیا کو محروم کر دیا۔ ابھی اہلِ ہند کے دلوں میں تازہ ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ خاتونوں کے ورق پر سب سے پہلے کچھ مختصر سا ذکر اس نیک نہاد اور رحم و انصاف مجسم ملکہ کا لکھا جائے جس کی ذات پر دنیا بھر کی عورتوں کو فخر کرنے کا حق ہے۔ تاریخ دنیا میں کئی مثالیں ایسی عورتوں کی ملتی ہیں جنہوں نے اپنے طور پر نمایاں کام کئے ہیں۔ حکومتیں کی ہیں۔ لڑائیاں کی ہیں۔ بہادریاں دکھائی ہیں۔ مردوں سے مقابلہ میں برابر اُتری ہیں۔ اور وہ جوہر دکھا کر۔ جو مردوں کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں دنیا کو حیران کیا ہے اور لوگوں سے ان الفاظ میں داد لی ہے کہ "کیا مردانہ عورت ہے"۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی عورتوں کے وجود سے طبقۂ نسواں کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیا وہ آنکے کام پر ناز کر سکتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ نہیں کر سکتیں۔ اُنہوں نے جو کچھ کیا شانِ نسواں کو چھوڑ کر کیا۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ نسواں اصل میں تو ان کاموں کے لائق نہیں۔ یہ چند عورتیں مستثنیات تھیں۔ مگر ملکہ وکٹوریہ کے کارناموں میں یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ اُس نے کام تو وہ کئے جو مردوں میں بھی کم اشخاص سے بن پڑتے۔ مگر خواصِ نسواں کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اُس کا نیک دل۔ اُس کا صحیح دماغ۔ اُس کی حرکات اُس کی سکنات اُس کے خیالات۔ اُس کی عادات سب ایک عورت کی عادات تھیں۔ تختِ سلطنت پر وہ جلال و سطوت۔ وہ ثقاہت اور متانت جو مردوں میں بھی کم دیکھ سکیں۔ اور گھر میں آتے ہی اپنے شوہر سے وہ سلوک اور اُمورِ خانہ داری کی طرف وہ توجہ جو معمولی گھر والیاں کرتی ہیں۔ آجکل نئے خیالات کی بعض عورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جو یہ سمجھتی ہیں کہ اگر اُنہیں کتاب پڑھنے یا بیلنو پرونے کا شوق ہو گیا تو اب وہ اولاد کی نگہداشت سے سبکدوش ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ سلطنت کے مشاغل کو سرانجام دیتے ہوئے اور پارلیمنٹ کے جھگڑوں جھمیلوں کی آئے دن کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے بچوں کی پرورش کو بھی ایسا ضروری فرض سمجھتی تھی۔ جیسے متوسط

طبقے کی مستورات جو اور تفکرات سے فارغ ہوتی ہیں۔ اور اُس نے اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت سے نمونہ دکھا دیا ہے کہ عورت دنیا کے بڑے سے بڑے کام کرتے ہوئے بھی اپنا اصلی اور سب سے بڑا فرض جو تربیت اولاد سے متعلق ہے ادا کر سکتی ہے۔ اگر کوئی عورت عورت ہونے سے کنارہ کش ہو کر کاروبار دنیا میں کامیاب ہو تو اُس سے عورتوں کی جماعت کو کونسی شاباش مل سکتی ہے عورت کی ذات کی بہترین خصلتوں میں سے نرم دلی ہے۔ مگر انتظام سلطنت اکثر نرم دلی کے منافی ہوتا ہے۔ اور بہت بہت سخت احکام انتظامی معاملات میں جاری کرنے ہوتے ہیں۔ ملکہ معظمہ نے انتظام میں بھی خلل نہیں آنے دیا۔ اور اپنے طبعی رحم کو بھی دل میں جگہ دیئے رہیں۔ مدت سے دستور چلا آتا تھا۔ کہ قتل کے وارنٹ پر دستخط شاہی ثبت ہوتے تھے۔ ملکہ معظمہ کے روبرو جب قتل کا وارنٹ آیا۔ تو اُس نے تعمیل سے تو نہیں روکا۔ مگر خواہش ظاہر کی کہ اُس کے خاص لحاظ سے آخری دستخط کا کام کسی معزز اہلکار کے سپرد ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی عملدرآمد ہوا۔ ایسی باتوں سے ملکہ کی ذات نے عورت کے نام کو وقعت دیدی ہے۔ اور انگلستان میں وہ وقت آگیا ہے کہ جیسے بعض چیزوں کی تعریف کے لئے "مردانہ" کی صفت اُن کے ساتھ لگائی جاتی ہے۔ ویسے ہی بعض چیزوں کی تعریف کے طور پر "زنانہ" کہا جاتا ہے۔ اور مثل یہاں کے زنانہ بطور صفت کے لکھنا بد صفتی میں داخل نہیں بلکہ تو شاید سکندر نامہ میں فخر سے کہتی ہے ع اگرچہ زنم زن سپر نیستم۔ ہماری ملکہ اگر اس قول کو اُلٹا کر فخریہ فرمائیں تو زیبا تھا کہ "اگرچہ کارِ مرداں کردم سیتزناں از دست ندلوم"

اینی بسنٹ صاحبہ

اس زمانہ میں انگلستان کی جو عورتیں شہرت کے معراج پر پہنچی ہیں۔ اُن میں اینی بسنٹ نہایت امتیاز کے ساتھ ذکر کے قابل ہے۔ فصاحت اور فن تقریر میں شاید اینی بسنٹ دنیا بھر کی عورتوں میں تو اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مگر خوبی یہ ہے کہ وہ یورپ کے فصیح البیان مردوں میں بھی بلند پایہ ہے۔ جب وہ بولنے لگتی ہے۔ تو سننے والے دم بخود ہو جاتے ہیں۔ اور سوائے

اس کی صاف اور دلنشین آواز کے یا کبھی کبھی تحسین و آفرین کی صداؤں کے ساری مجلس پر ایسی خاموشی چھائی ہوتی ہے کہ گویا بُت مندروں سے اُٹھکر اس فصاحت کی دیوی کی ملاقات کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔ اس کے الفاظ میں کچھ ایسا جادو ہے کہ جو سُنے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اور کم از کم اس کی تقریر سُنتے وقت تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ تقریر کی پُتلی جو کچھ کہہ رہی ہے بجا کہہ رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لیاقت بہت کچھ تو خداداد ہے۔ مگر اینی بسنت کی اپنی کوشش اور مشق کا حصہ بھی کچھ تھوڑا نہیں۔ اوائل عمر میں تعلیم اچھی پائی۔ جوانی میں اس شوق کو جاری رکھا۔ دماغ کو مسائل ملکی اور مذہبی پر غور کرنے کی عادت ڈالی۔ اور جس دن سے ان قابلیتوں کے زور پر فصاحت کے میدان میں نکلی۔ اُس دن سے اس فن میں وہ مشق بہم پہنچائی کہ کئی سالوں کی تقریروں کی اوسط تین سو فی سال نکلتی ہے یعنی اتوار اور سفر وغیرہ کے دن چھوڑ کر کوئی دن ایسا نہیں جس میں اینی بسنت نے تقریر نہ کی ہو۔ گو مذہبی اعتقادات میں اینی بسنت نے بعض لوگوں کے نزدیک مستقل مزاجی کا ثبوت نہیں دیا۔ ابتدا میں عیسائی پیدا ہوئی۔ عیسائیوں میں اس کی تربیت ہوئی اور ایک عیسائی پادری صاحب سے بیاہی گئی۔ مگر ابھی جوان ہی تھی کہ اس کے خیالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا۔ کہ دہریہ منش ہو گئی۔ مدت تک دہریت کا وعظ کرتی رہی اور ہزاروں بندگانِ خدا کے عقیدے اپنے سے کر لئے۔ اتنے میں اس کی مذہب پسند طبیعت نے پھر اس زور سے اس کے اعتقادات کو بدلا کہ دہریہ پن سے یکایک ہندو مذہب پر آٹھہری۔ اب ایک عرصہ سے اسکو ہندوستان کی سرزمین ایسی پسند ہوئی ہے کہ اس نے اسے قریب قریب اپنا مسکن بنا لیا ہے اور ہندو قوم کی ترقی کے لئے کوشش کرنا اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایا ہے۔ ہمیں یہاں اُس کے مذہبی خیالات اور عقائد سے بحث نہیں اُس کی جو بات ہمارے ملک کی عورات کی توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ عورت ذات ہو کر اینی بسنت نے کس درجہ کی لیاقت اور کس درجہ کی فصاحت حاصل کی ہے۔ اور کس مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی زندگی کو خلقِ خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس کی تقریروں کے موقعہ پر اکثر یہ اہتمام ہوتا ہے کہ معززین جوق جوق داخلہ کا ٹکٹ خرید کر سُننے جاتے ہیں اور ہر مقام پر سینکڑوں روپے ایک ایک تقریر کے

عوض میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر اینی بسنت اپنی ذات کے لئے روپیہ جمع کرنا چاہتی اور ذاتی آرام و آسائش کی خواہشمند ہوتی۔ تو اس کی قابلیت ایسی تھی کہ تقریر و تحریر کے ذریعہ ہی انگلستان جیسے ملک میں لاکھوں روپے کما کے بیٹھ جاتی اور بجائے اپنے مخالفین کے برا بھلا سننے کے ہر دلعزیزی میں لاجواب ہوتی۔ مگر اُس نے اپنے تمام اوقات کو اپنے خیال اور عقیدہ کے موافق خدا کے بندوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اب اُسے نہ آب و ہوا کی ناموافقت کا خیال ہے۔ نہ ہندوستان کی گرمی کا خوف ہے۔ نہ اہل ہند کی ناقدردانی کا ڈر ہے۔ نہ وہ کسی کی مخالفت سے گھبراتی ہے۔ بلکہ پوری تندہی کے ساتھ اپنا کام کئے جاتی ہے۔ اُس کو یہ دُھن ہے کہ ہندوؤں کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا کالج بنے جس میں مغربی علوم و فنون سنسکرت کے علم کے ساتھ ملا کر پڑھائے جائیں۔ جہاں یہ کوشش ہو کہ ہندو انگریزی پڑھکر پورے ہندو رہیں۔ اُن کے خیالات اور معلومات مغرب کے علما کی معلومات کا مجموعہ ہوں۔ اور اُن کی وضع۔ لباس اور عقائد ہندو مذہب کا پرانا رنگ قایم رکھیں اس راہ میں اُسے کئی دقتیں پیش آئی ہیں۔ کئی ناکامیوں کا سامنا ہوا ہے۔ مگر آخر اُس نے بنارس میں کالج قایم کر ہی دکھایا ہے۔ اُسے راستہ چلنے سے غرض ہے۔ نہ وہ منتظر ہے کہ راستہ میں پھولوں کی چادر بچھی ہو تو چلوں اور نہ وہ خائف ہے کہ پاؤں میں کانٹے چبھ جائینگے اور آبلہ پائی کی مصیبتیں جھیلنی پڑینگی۔ جس طرح بن پڑتا ہے چلی جا رہی ہے۔

جارج الیٹ

اس سلسلہ کی ابتدا ہم نے ملکہ وکٹوریہ کے نام سے کی تھی جو تریسٹھ ۶۳ سال سے زیادہ کروڑوں بندگان خدا کے دلوں پر بہ حیثیت فرمانروائی ملک کے حکمراں رہ کر اس جہان سے چل بسی۔ اس کے بعد جس عورت کا ذکر ان اوراق میں شایع ہوا۔ وہ جادو بیانی کے ملک کی فرمانروا تھی۔ جس نے اپنی عمر میں لاکھوں بندگانِ خدا کے دلوں کو اپنی زبردست تقریروں سے مسخر کیا ہے۔ آج ہم اقلیم سخن کی ایک ایسی ملکہ کا ذکر کرتے ہیں جس کی تصانیف نے

اہل انگلستان کے دلوں پر مستقل سکہ بٹھالیا ہے۔ اور جس کی لیاقت کے قائل نہ صرف انگلستان میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ جہاں کہیں انگریزی زبان بولی سمجھی یا پڑھی جاتی ہے۔ وہیں دلوں پر سینکڑوں سکے جارج الیٹ کی تحریر کے بیٹھے ہیں۔ اور اس علامہ عورت نے انگلستان کے مصنفین میں وہ پایۂ بلند پایا ہے۔ کہ جبتک انگریزی زبان اور انگریزی علم ادب زندہ ہے۔ اس کا نام زندہ رہیگا۔ ابتدائے عمر میں ہی بلا کی ذہانت پائی تھی اور ذہانت کے ساتھ مطالعہ کا شوق بھی غائت درجہ کا تھا۔ یہ دونو باتیں ایک ذات میں جمع ہونا ذرا کمیاب سی بات ہے۔ خصوصاً اس ملک میں تو ذہین لڑکے محنت کم کرتے ہیں اور جو محنت کرتے ہیں وہ بیچارے عموماً کند ذہن ہوتے ہیں۔ اور یہی حال لڑکیوں کا ہے۔ مگر جارج الیٹ کی خداداد طبیعت کے لئے مطالعہ کا شوق اور محنت کی عادت سونے پر سہاگہ ہوگئے۔ اور جب اُس نے پہلی دفعہ کنج گمنامی سے نکلنے کی کوشش کی۔ جنس علم کے خریدار فوراً پہچان گئے کہ کانِ معنی نے ایک لعل بے بہا اُگل کر صرافانِ کلام کی لیاقت آزمائی کے لئے بازارِ سخن میں بھیجا ہے۔ جارج الیٹ اصل میں ایک مردانہ نام ہے اور اس مشہور مصنفہ نے اپنی پہلی تصنیف اس نام کے پردہ میں شائع کی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اُس وقت تک عورتوں کی تصنیفات کو جو کہیں خال خال ہوئی تھیں وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اور اس لئے باوجودیکہ اُس نے اپنا خونِ جگر پی کر ایک فسانہ جو اپنے رنگ میں نرالا تھا تصنیف کیا۔ اُسے ہمت نہ پڑی کہ اپنے اصلی نام سے اُسے شائع کرے اُس نے یونہی اٹکل پچو یہ مردانہ نام انتخاب کرکے کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھدیا۔ اور سوائے ایک دو رازداروں کے کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ کہ یہ کتاب کس نے لکھی ہے۔ گو ایک گمنام شخص کی تصنیف تھی۔ مگر خوبی کب چھپی رہتی ہے۔ پرکھنے والوں نے جنس گراں بہا کو پہچان لیا۔ اور کتاب کی تعریف ہر طرف ہونے لگی۔ مصنفہ دل ہی دل میں تعریفیں پڑھ پڑھ کر خوش ہوتی تھی اور جب کبھی اُسے اخبارات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اپنے اپنے قیاس دوڑا رہے ہیں کہ کون شخص اس نام سے لکھنے لگا ہے۔ اور سب ذہن کسی نہ کسی مرد کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو اُسے عجیب لطف آتا تھا اور لوگوں کی شناخت پر ہنسی آتی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اُنہیں نقادوں کو اگر معلوم ہوتا کہ یہ کتاب عورت کی تصنیف کی ہوئی ہے تو سب مخالف ہو جاتے اور کہتے کہ عورت کی تصنیف کب مردوں کے پڑھنے کے لائق ہو سکتی ہے۔ اِس حجاب میں جو اُسے کچھ لطف آگیا۔ اُس نے آخر ٹھان لی۔ کہ یہ فرضی نام مدت العمر کے لئے اختیار کرے۔ چنانچہ بعد ازاں جب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ملکِ سخن پر ایک عورت نے قبضہ شروع کر دیا ہے۔ اور جب اہلِ تصنیف عورتوں کے برخلاف جو تعصب تھا وہ دور ہونے لگا تب بھی وہ اُسی نام سے مشہور رہی اور اسی نام سے اُس نے ہر دلعزیزی کے دربار میں قبولِ عام کا خلعت پہنا۔ شہرت کے بعد تو یہ نوبت ہوئی کہ کتاب لکھنے کا ارادہ اُس کی جانب سے ظاہر ہونے پر چھاپہ خوانوں والے پچاس پچاس ہزار روپیہ ایک کتاب کے لئے اُس کی نذر کرتے تھے کہ کتاب لکھی جائے تو اُس کا حقِ تصنیف انہیں ملے۔ اس کی مقبولیت کے دو بڑے راز تھے ایک تو اُسے فلسفہ پر بہت عبور تھا اور فسانہ کے رنگ میں فلسفہ لوگوں کو گھول کر پلا دینے کا طریق پہلے اُس نے اختیار کیا اور خصوصاً قلبِ انسانی کی تو وہ تشریح کی۔ کہ کوئی لوگوں کے دل چیر چیر کر دیکھتا تو اس سے اچھا بیان قلبِ انسانی کی مختلف حالتوں اور خواہشوں کے متعلق نہ لکھ سکتا دوسری خصوصیت جو جارج الیٹ میں تھی وہ یہ تھی۔ کہ اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ دلچسپی جنگ و جدال کے کارناموں۔ جن و پری کے افسانوں۔ یا افسانہ نگاروں کی اچنبھے کی کہانیوں پر ہی منحصر نہیں۔ بلکہ اُستادی اس کا نام ہے کہ غریب سے غریب آدمی کی زندگی کا نقشہ اس سچائی سے کھینچا جائے کہ پڑھنے والا اپنی آنکھوں کے سامنے ہو بہو تصویر دیکھ لے۔ چنانچہ اُس نے ایک قصہ لکھا۔ جس میں ایک غریب جُلاہا قصہ کی جان ہے اور اس کی قسمت کے انقلابات میں وہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ کہ عمرو عیار کی خلافِ قیاس عیاریوں کے بیانات کی دلچسپی نظر سے اُتر جاتی ہے۔ جارج الیٹ کی تعریف میں اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ کہ اُس نے اپنی تصانیف سے یہ مسئلہ کہ عورت کا دماغ اچھے سے اچھے مردوں کے دماغ کے برابر کام کر سکتا ہی ہمیشہ کیلئے حل کر دیا۔ عورت کی قابلیت کی تسلیم کرنیوالے بڑھ گئے اور اُسکے بعد اور بیشمار عورتیں عمدہ مصنفین انگلستان کی جماعت میں شامل ہو گئیں (عبد القادر)

لارڈ ڈفرن کی تقریر

فنون کی بے قدری | لارڈ ڈفرن صاحب بہادر بالقابہ نے شملہ میں فنون لطیفہ کی ایک نمائش کھولتے وقت ستمبر ۱۸۸۴ء میں اس ملک میں فنون کی بے قدری پر ایک فصیحانہ گفتگو فرمائی تھی۔ اُن کی تقریر کے ایک حصہ کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

صاحبان! اس وقت جو سماں میری نظر کے سامنے ہے وہ میری توجہ کو فنون کی ترقی کے وسیع مسئلہ کی طرف کھینچتا ہے۔ اور میں اس بات پر اظہار تعجب سے باز نہیں رہ سکتا۔ کہ ہندوستان میں صاحبان فن کی کس درجہ بے قدری ہے اور ان کے لئے کیسی راہیں کھلی ہوئی نہیں۔ یوں تو ہندوستان کا موجودہ زمانہ کئی پہلوؤں سے ملک ایطالیہ کے پندرہویں صدی کے زمانے سے مشابہ ہے۔ وہاں اُس وقت بہت سے دربار تھے جن پر دولتمند تعلیم یافتہ اور اہل مذاق نوابوں اور راجاؤں کی حکومت تھی۔ اور یہی صورت یہاں ہے۔ وہاں امراء۔ اہلِ دول۔ زمیندار۔ جاگیردار۔ سوداگر اور خوشحال تاجر موجود تھے اور یہی حالت یہاں ہے۔ وہاں بیشمار میونسپل کمیٹیاں شہروں کے فائدے کے لئے قایم تھیں اور یہاں بھی ہیں۔ وہاں ایک پہلے زمانہ کے اعلیٰ تمدن کی عمدہ یادگاریں ہر طرف اپنی دلفریبیوں سے دامن کو کھینچتی تھیں اور ایسا ہی یہاں ہو وہاں کی آب وہوا اور اَور سامان امراو شرفائے ملک کو کسبِ فن اور قدردانی فن کے لئے اسقدر فرصت اور اتنے موقعے دیتے تھے کہ دوسرے ممالک کو اپنے کثرت کاروبار اور اہل ملک میں بامذاق لوگوں کی کمی کی وجہ سے وہ موقعے حاصل نہ تھے۔ اور ہندوستان کی آب وہوا اور حالات اور امراء کی طبیعتیں بھی ایطالیہ سے مشابہت رکھتی ہیں پھر یہ غضب کیا ہے۔ کہ فن اور اہل فن کی قدردانی میں ہندوستان اور ایطالیہ میں مشابہت نہیں اور یہاں کے امراء کے گھر ایطالیہ کے نامور خاندانوں کی طرح اہل فن کا ملجا و ماوٰی نہیں ہیں اگر ہمارے ہاں کے دولتمند فنون کی قدردانی شروع کریں۔ تو وہ نہ صرف اپنے دل بہلانے

کے لئے جائز اور مناسب سامان کریں گے۔ بلکہ حُبِّ وطن کا ثبوت دیں گے۔ کیونکہ اگر ملک کی ترقی کی موجودہ حالت میں کوئی بات سب سے ضروری ہے تو یہ کہ ان نسلوں کے لئے جو اب تعلیم سے بہرہ ور ہو کر ہمارے مدارس سے نکل رہی ہیں۔ ایسے راستے نکالے جائیں جن سے وہ عزّت کے ساتھ کسب معاش بھی کریں اور جن میں وہ اپنی عقلِ خداداد اور علمی لیاقتوں کو کام میں لاسکیں۔ سردست اس ملک کے نوجوانوں کے لئے صرف تین راستے کھلے ہیں۔ ملازمتِ سرکار۔ وکالت اور چھاپے خانے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جس رفتار سے تعلیم بڑھ رہی ہے اور ہر سال ہزاروں طلبا تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند سالوں میں ان تین راستوں میں اتنا ہجوم ہو جائیگا کہ بہت لوگوں کو ناکامی کا سامنا ہوگا اور صرف چند مراد کو پہنچیں گے۔ لیکن اگر دولتمند ہندوستانیوں میں فنونِ لطیفہ کا شوق عام طور پر پھیل جائے اور وہ دل سے قدر دانی کریں تو سینکڑوں نوجوانوں کے لئے معزز اور مفید ذرائع کسبِ معاش کے نکل آئیں۔ کوئی نقاش کوئی حروف کن۔ کوئی سنگتراش کوئی تعمیرات کے نقشے بنانے والا۔ کوئی رنگساز اور کوئی روغن چڑھانے والا بن جائے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ فائدہ ہو کہ کئی اور کسبوں کا جو یہاں کے لوگوں کی طبیعتوں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں مگر جو کساد بازاری کی وجہ سے پھیکے پڑے ہوئے ہیں۔ بازار گرم ہو جائے۔

ہم اور ہمارے ناصح

دنیا میں نصیحت کرنے والوں کی اتنی کمی نہیں جتنی نصیحت ماننے والوں کی۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے جو نصیحت سننے سے سخت گھبراتے ہیں اور جو ناصح کو اپنا سب سے بڑا دشمن جانتے ہیں ایشیائی قومیں اس بارہ میں مغربی لوگوں سے بڑھ گئی ہیں۔ صدیوں کی خوشامد پسندی نے ان کے دماغوں کو بگاڑ دیا ہے۔ کیا ایران۔ کیا افغانستان۔ کیا ترکستان کیا روم کیا روس۔ کیا عرب۔ کیا چین جہاں جاؤ امرا اور شرفا کو بالخصوص خوشامد پسندی کے

مرض میں گرفتار پاؤ گے۔ جہاں کسی نے کھری بات کہی۔ وہیں لوگ اُس کی برخلاف ہوئے۔ نصیحت کرنے والوں سے یہ کشیدگی ان ملکوں میں اس درجہ تک پہنچی کہ رفتہ رفتہ ناصحوں کی مذمت ایک فخر کی بات سمجھی جانے لگی۔ فارسی اور اردو میں خصوصاً کوئی شاعر ایسا نہیں ہوا جس نے ناصح کو بُرا بھلا نہ کہا ہو۔ اور جس نے "حضرت ناصح" کی ہنسی نہ اُڑائی ہو۔ ایشیائی شاعری کی دنیا میں واعظ اور شیخ اور زاہد کے بعد شاید ناصح سے بڑھکر گالیاں کسی نے ہی کھائی ہوں۔ اس لئے اس ملک میں فرائض نصیحت ادا کرنے نہایت مشکل ہیں۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نیک صلاح خواہ کیسی ہی کڑوی معلوم ہو ترقی کی بنیاد ہے جہاں کہیں لوگ آزادی سے صلاح لینے کے عادی ہوں وہاں گویا ترقی کا بیج بویا گیا۔ ہندوستان میں اس رسم کا رواج ہونے کو ابھی زمانہ درکار ہے۔ خوشامد جو گھٹی میں پڑی ہوئی ہے نکلتے ہی نکلیگی۔ اور صفائی آتے ہی آئیگی۔ مگر یہ غنیمت ہے کہ لوگوں کو اس بات کا کسیقدر خیال پیدا ہوگیا ہے۔ اور ہمارے ہاں کے لوگ صاف صاف رائے دینا سیکھنے لگے ہیں۔ ہمیں اس خیال کے پیدا ہونے کا تازہ تجربہ مخزن کے جاری کرنیسے ہوا ہے۔ ہمیں جسقدر خطوط رسالہ جاری کرنیسے پیشتر آئے اور جسقدر آرائے اخباروں میں اسکو اشتہار شایع ہوئے پر چھپیں وہ سب کی سب متفق اللفظ ہوکر رسالہ کے عمدہ ہونے کا یقین ظاہر کرتی تھیں۔ یہ عام موافق رائے ہر چند کہ ہمارے شکریہ کی مستحق تھی۔ مگر اس پر ہمیں کسی قسم کے خاص فخر کا حق حاصل نہ تھا۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوسکتا تھا کہ لوگوں کو رسالہ شایع کرنے والے کی نسبت حسن ظن ہے۔ ان موافق خیالات کے اخبارات میں عام طور پر شایع ہونے سے ہمیں بجائے فرحت کے تردد ہوتا تھا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ رائے وہ ہوگی جو رسالہ دیکھکر اہل نظر قایم کریں اور ان راؤں سے تو ہماری ذمہ داری بڑھ رہی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں امیدیں پیدا ہوتی ہیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُن کو ہم کہانتک پورا کر سکینگے۔ آخر رسالہ نکلا۔ اور نکتہ داں احباب نے خوب صفائی سے نکتہ چینیاں کیں۔ جو خوشی ہمیں ان دوستانہ نکتہ چینیوں سے ہوئی ہے۔ وہ ہرگز محض دل خوش کن تعریفوں سے نہ ہوتی۔ ہم اپنے احباب اور کرمفرماؤں کی منصفانہ تنقید کو نہ صرف رسالہ کی کامیابی کی

دلیل سمجھتے ہیں بلکہ کامیابی سمجھتے ہیں۔ اگر مخزن کو پڑھ کر لوگ بالکل خاموش رہتے یا محض تعریف لکھتے تو اس سے زیادہ ناکامی ہمارے لئے کوئی نہ تھی۔ اس کے یہ معنے ہوتے کہ کسی نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ ذاتی لحاظ سے ایڈیٹر کو رسمی تعریف کے چند کلمات لکھ بھیجنے سے کوئی دلچسپی کا ثبوت نہیں ملتا۔ مگر ہم خوش ہیں کہ ہمیں ملک کے علم دوست اصحاب کی ایک کثیر تعداد نے اپنے اپنے خیالات اور اپنے مذاق کے مطابق نصیحت آمیز خطوط کا مخاطب بنایا ہے۔ اور بعض نے تو رسالہ کو اسقدر نقاد نگاہوں سے دیکھا ہے۔ کہ جا بجا روک ٹوک کی ہے۔ اعراب اور نقطوں تک رائے دی ہے۔ جس چیز کو غلط یا نامناسب سمجھا ہے غلط کہدیا ہے۔ جس کو اچھا جانا ہے۔ اسکی خوبی کا اعتراف کیا ہے ؎

دوست آنست کہ معائب دوست　　ہمچو آئینہ روبرو گوید

کسی نے استقلال سے رسالہ چلانے کی فہمائش کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں کہدیا ہے کہ "عموماً استقلال سے کام نہیں لیا جاتا۔ آپ بھی اُسی چندروزہ رسالہ نکالنے والوں کے زمرہ میں شریک نہ ہو جائیں"۔ کسی نے پیشگی قیمت دیتے ہوئے لکھدیا ہے "کہ کہیں قیمت لیکر سال کے اندر ہی اندر جواب نہ دیدینا"۔ کسی نے مضامین نثر میں سے بعض پر زبان کے اعتبار سے اعتراض کیا ہے۔ کسی نے ایک آدھ مضمون پر مطلب کے لحاظ سے نکتہ چینی کی ہے۔ طبعزاد نظم کا حصہ کہیں پسند ہوا ہے۔ کہیں ناپسند۔ کسی کو انتخاب سے اتفاق ہے کسی کو اختلاف۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سب کی سب رائیں تو درست نہیں ہو سکتیں۔ بعض کی نکتہ چینی حق بجانب ہوگی۔ اور بعض کی غلطی پر مبنی ہوگی۔ مگر اتنا ظاہر ہے کہ ہر کسی نے اپنی اپنی طبیعت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق رائے دی ہے۔ اور غور سے پڑھنے کے بعد رائے دی ہے۔ ہم اُن تمام اصحاب کا جنہوں نے نیک نیتی سے ہمیں مشورے دیئے ہیں، دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اُن کی یہ دلچسپی قایم رہے۔ ہم اپنے ناصحان مشفق کے لئے "دیدہ و دل فرش راہ" کرنے کو تیار ہیں اور مرزا غالب کی طرح طنزاً انہیں یہ نہیں کہتے۔ ع پر کوئی اتنا تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

ہم نصیحت سے جہانتک ممکن ہوا فائدہ اُٹھائیں گے۔ مگر کسی صاحب کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ سب رائیں چھوڑ کر فوراً اُن کی رائے پر عمل شروع ہو جائے گا اور نہ ہی جلدی عمل شروع نہ ہونے سے یہ سمجھنا چاہئے کہ نصیحت کارگر نہیں ہوئی۔ یا بے پروائی سے دیکھی گئی۔ بلکہ یہ یقین رکھنا چاہئے کہ کسی تجویز اور رائے کا جو ہم تک پہنچیگی غور و فکر کے بغیر فیصلہ نہ ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر بعض تجویزیں اختیار کی جائینگی تو بہت سی نظر انداز کرنی پڑینگی۔ یہ بات انسانی طاقت میں ہی نہیں کہ مختلف مذاق کے لوگ ایک ہی قسم کی تجویزیں پسند کریں۔ یا کوئی ایک شخص یا ایک چیز مختلف اشخاص کے پورے اطمینان کا ذمہ لے سکے مخزن میں البتہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر مذاق کے واسطے کچھ نہ کچھ سامان مہیا کیا جائے۔ اور مختلف قسم کے مضمون رکھے جائیں۔ اُن میں ترجمے بھی ہوں۔ طبعزاد مضامین بھی ہوں۔ جنہیں انگریزیت میں زیادہ لطف آئے وہ ترجمے پڑہیں۔ جنہیں لطفِ زبان زیادہ مقصود ہو وہ طبعزاد مضمون پڑہیں اور طالبانِ علم سب کچھ پڑھ لیں۔ اگر کوئی صاحب یہ امید کریں کہ ہر مضمون اُن کے اپنے معیارِ عمدگی میں پورا اُتریگا اور ہر نظم اُن کی نظر میں جنچ جائیگی تو اس کا نام خیالِ محال ہوگا۔ مخزن کے پہلے پرچہ میں ہی طبائع کے اختلاف نے وہ نیرنگی دکھائی ہے۔ کہ سبحان اللہ منشی محمد ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے نے جو ترجمہ ایک نہایت مشہور انگریزی نظم کا نہایت قابلیت سے کیا تھا۔ اُس کی نسبت اختلاف رائے دیکھکر ہم دنگ رہ گئے۔ بعض نہایت اعلیٰ درجہ کے سخن فہم اور سخن سنج حضرات نے خوب دل کھول کر داد دی۔ اور اس نظم کو اپریل کے رسالہ میں سب سے بڑھ کر قرار دیا۔ مگر بعض اصحاب نے یہ لکھا کہ یہ نظم درج ہی نہ ہونی چاہئے تھی۔ ہمارے ایک ہمعصر اُس پر ایسے بگڑے کہ اُنہوں نے اُسے "بے تکی" کے معزز خطاب سے ممتاز فرمایا۔ "انگریزی کے راگ" والی نظم جس کی یہ داد ملی زبان رکھتی تو وہ ضرور یہ شعر پڑھکر اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتی ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جوابِ تلخ مے زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

مگر لطف یہ ہے کہ ایک دوسرے ہمعصر نے اُسے اسقدر پسندیدہ خیال کیا ہے کہ ساری کی ساری اخبار میں نقل کرکے اپنے ناظرین کے سامنے پیش کی ہے اور اسے مخزن کے پہلے پرچہ کا بہترین

نمونہ سمجھا ہے۔ مذاقوں کے اس بے اندازہ اختلاف کو دیکھکر سوائے اس کے چارہ نہیں تھا کہ ہم انتخاب مضامین وغیرہ کے معاملے میں ذوقِ سلیم کے اُسی قلیل حصّہ سے جو ہمیں خدا نے دیا ہے کام لیں۔ اور اپنی طرف سے وہی چیزیں درج رسالہ کریں جو کارآمد ہوں۔ کیونکہ اس بات کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ کہ سب ناظرین اُن سب کو کارآمد سمجھیں۔ ایک صاحب نے ہمیں لکھا ہے کہ پہلے پرچہ میں جو میر کے کلام کا انتخاب چھپا وہ اُنہیں پسند نہیں۔ بلکہ اس کی ضرورت ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ ایک اور صاحب جو لکھنؤ میں اعلیٰ درجہ کے سخن فہم گنے جاتے ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ "مجھے دوسرے پرچے میں منتخباتِ میر نہ دیکھکر مایوسی ہوئی"

اسی مضمون کے سلسلہ میں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ چند مشوروں کا جو ہمیں دیئے گئے ہیں خاص طور پر ذکر کر دیا جائے اور ناظرین کو یہ بتا دیا جائے کہ اُن مشوروں پر عمل ہونا باعتبارِ حالات و وسائلِ موجودہ کہانتک ممکن ہے۔ پہلے سرورق کو ہی لیجئے۔ اس پر نقشہ ہندوستان کے بنائے جانے اور اُردو زبان کے استعمال کی وسعت دکھائے جانے کو عموماً پسند کیا گیا ہے۔ مگر کئی احباب نے یہ رائے دی ہے۔ کہ اور بہت سے شہروں کے نام لکھے جانے چاہئیں۔ اور ہمارے مکرم مولوی عبدالحلیم صاحب شرر تو اپنے دلگداز میں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مصر اور افریقہ تک کے بعض مقامات سرورق پر دکھلائے جائیں۔ اور اس صورت میں لازم ہے کہ سرورق پر نقشہ دنیا کا ہو۔ کیونکہ ہر جگہ اردو بولنے اور سمجھنے والے پہنچ گئے ہیں ان مشوروں کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس نقشہ سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ سب مقامات پر حاوی ہو۔ جہاں اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ ان شہروں کے نام دینے سے صرف سمت دکھانا منظور ہے۔ جس سے واضح ہو جائے کہ اس وسیع ملک کے اطراف و جوانب میں اُردو کا دور دورہ ہے۔ زیادہ مقامات کے نام دینا حدود نقشہ کے تنگ ہونے کے سبب غیر موزوں ہے۔ اگر کبھی نقشہ ذرا وسیع پیمانہ پر بنایا فہرستِ مضامین کسی اور صفحہ پر درج ہوئی تو بہت گنجائش نکل آئیگی۔

فہرست مضامین کے متعلق بعض بامذاق احباب کا خیال ہے کہ اگر وہ سرورق کے پہلے

صفحہ کی پشت پر درج ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ مگر بعض دوسرے اصحاب نے یہ مشورہ دیا ہے کہ کم از کم ایک سال تک سرورق کی صورت بالکل وہی رہنی چاہئے جو پہلے پرچہ میں ہے تبدیلیاں کچھ بہت اچھا اثر نہیں ڈالتیں۔ ہم ایک سال کے لئے اس آخری رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ گو ممکن ہے دوسرے سال کے ابتدا میں پہلی تجویز اختیار کریں۔

کئی صاحبوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ایسے رسالہ کی تقطیع موجودہ تقطیع سے بڑی چاہئے اور قرینِ قیاس ہے کہ اس سے ذرا بڑی تقطیع کا رسالہ زیادہ موزوں معلوم ہو۔ گو بہت بڑی تقطیع کے ہم طرفدار نہیں۔ لیکن اس کے متعلق بھی ایک سال تک موجودہ روش کو نباہنا ضرور ہے۔ دوسری جلد شروع کرتے وقت تقطیع بدلی جاسکتی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مصارف اس صورت میں بڑھتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اثنائے سال حال میں خریداروں کی تعداد میں معقول ترقی ہونے پر سالِ نو میں مصارف میں بھی اضافہ ممکن ہے۔

ہمارے ایک مہربان کہتے ہیں کہ ہر رسالہ میں کوئی تصویر دی جائے۔ جیسا کہ ماہ مئی کے پرچہ میں شیخ سعدی کی تصویر دی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رسالہ کو زیادہ مقبول بنانے کا یہ اچھا نسخہ ہے۔ مگر جب تک رسالہ میں غیر معمولی کثرت تعداد خریداران سے خاص گنجائش نہ نکل آئے۔ ہمیشہ تصویر دینے کا صرف اپنے ذمہ لینا مشکل ہے۔

ایک اور دوست لکھتے ہیں کہ "خاتونوں کا ورق" خاتونوں سے ہی لکھوایا جائے۔ اس تجویز کے دلپذیر ہونے میں تو کلام نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس ملک میں ابھی یہ بات نہیں سمجھی گئی کہ کوئی ایک رسالہ یا اخبار ساری ضرورتوں کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اسی لاہور سے ایک ہفتہ وار پرچہ "تہذیبِ نسواں" خاص کوشش اور خوبی سے اس ضرورت کو انجام دے رہا ہے۔ اور ہمارے لئے اس خصوصیت کا التزام چنداں ضروری نہیں۔ علاوہ بریں ہمارے ہندوستان میں مستورات پڑھی لکھی گنتی ہیں جن میں سے مضمون نگار مل جائیں جو کہیں کہیں خال خال خواندہ خاتونیں ہیں اُن میں بہت سی ایسی ہیں جو اخبارات میں مضمون بھیجنا خلافِ شان سمجھتی ہیں۔ تاہم اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اگر کوئی خاتونیں ہمیں اُس ورق کے لئے عمدہ مضمون عنایت کریں تو ہم اُسے خوشی سے درج کرینگے اور اُن کے نام کی نسبت

جیسی احتیاط وہ ضروری سمجھیں کرنے یا اُن کے عزیزوں یا رشتہ داروں کی معرفت مضمون لینے کو تیار ہیں۔

بہت اصحاب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مشہور مصنفینِ اردو سے مضامین اس میں لکھوائے جائیں۔ ان اصحاب کو ہم یہ یقین دلانا چاہتے ہیں۔ کہ مشاہیر عہد کی قدر دانی میں ہم کسی سے کم نہیں۔ بلکہ دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جو قعت ان بزرگوں کی تصانیف کی ہمارے دل میں ہے۔ بہت تھوڑے لوگوں کے دل میں ہوگی۔ اُن میں سے اکثر کی خدمت میں ہمیں ذاتی نیاز حاصل ہے۔ اور اُن پر سخت تقاضا کریں تو ایک آدھ مضمون تو کہیں گیا نہیں۔ مگر اس رسالہ کا منشا یہ ہے کہ میدان سخن کے جو پہلوان اس وقت تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ ان کو مشاہیر کی زندگی میں کنج عزلت سے نکالا جائے۔ اُن کے سامنے اُنہیں اُبھارا جائے۔ ان کے ہاتھوں ان کی لغزشوں کی اصلاح ہو۔ اور آخر ان کی شاباش کی سند لے کر یہ اس قابل ہوں کہ اس ضروری خدمت کو جو بزرگوں نے اس عمر تک انجام دی ہے۔ بُری بھلی طرح سنبھال سکیں۔ مولینا مولوی شبلی صاحب نعمانی اس رسالے پر رائے لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "یہ اچھی اُٹھان ہے اور نبھ بھی سکیگی۔ اکثر پرچے ابتدا میں مشہور آدمیوں کی تحریر کے تمغے پہنکر نکلتے ہیں لیکن چند ہی روز کے بعد وہ تمغہ اُتر جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی وہ بھی آنکھوں سے اُتر جاتے ہیں میری قطعی رائے ہے کہ پرانے مشاہیر سے ہاتھ دھونا چاہئے اور نوجوان پہلوانان سخن کو میدان میں لانا چاہئے" یہ رائے بعینہٖ ہمارا اصول بیان کرتی ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم پرانے مشاہیر سے ہاتھ دھونے کے لئے تیار ہیں۔ اگر مولینا شبلی صاحب۔ مولینا حالی صاحب۔ مولوی نذیر احمد صاحب۔ یا مولوی ذکاء اللہ صاحب چاہیں کہ انہیں کوئی علمی مشاغل سے تازیست پنشن یافتہ سمجھے تو وہ دھوکے میں ہیں۔ ہم ہیں اور ان کے دامن۔ البتہ یہ ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ یہ رسالہ پہلے مشاہیر کے نام سے بکنا شروع ہوتا اور بعد میں گندم نما جو فروش کا لقب پاتا۔ بہتر ہوا کہ یہ پہلے جَو دکھا کر بعد میں کسی وقت گندم بھی انہیں داموں میں دیگا۔ ان بزرگوں نے وقتاً فوقتاً قلمی امداد کے وعدے فرمائے ہیں اور امید ہے

کہ ناظرین کی یہ خواہش پوری ہو کر رہیگی۔

جناب مولٰینا مولوی شبلی صاحب نے ایک اور بہت مفید صلاح دی ہے۔ اُنہوں نے تحریر فرمایا ہے۔ کہ منتخبات کے حصہ کے لئے بھی سخن فہم حضرات سے مدد مانگی جائے۔ اور جو صاحب کچھ شعر قابلِ اندراج بھیجیں۔ اُن کے نیچے دائیں کونے پر اُن کا نام بھی درج کیا جائے۔ اور بائیں کونے پر حسب دستور موجودہ مصنف کا نام رہے۔ یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے۔ مگر حقیقت میں اُستادانہ ترکیب ہے۔ اس سے اکثر لوگوں کو انتخابات میں زیادہ دلچسپی ہو گی۔ مولوی صاحب نے خود صرف مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ چند شعر میر تقی ہوس کے کلام سے انتخاب کر کے بھیجے ہیں جو اس مہینہ کے منتخبات میں درج ہیں۔ میر ہوس قدیم شعرائے اردو میں ہیں۔ یہ اُن کی "لیلیٰ مجنوں" نہایت اعلیٰ درجہ کی مثنوی ہے۔ فسانۂ عجائب میں جستہ جستہ اُن کے اشعار بھی منقول ہیں۔ ان کا دیوان کمیاب ہے۔ مولوی صاحب کو ایک قلمی نسخہ حیدر آباد میں ہاتھ آیا ہے۔ اُس میں سے چند شعر بھیجتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تمام سخن فہم حضرات اپنے اپنے مطالعۂ اشعار کے وقت ہمارے کشکول کا بھی حصہ نکالنے کا خیال رکھیں گے۔

مرقع عبرت

خدا جانے لکھنؤ کے سیر کرنے والوں میں کتنے اصحاب ایسے ہیں جنہوں نے شاہانِ اودھ کی قدِ آدم تصویروں کے اُس مجموعہ کو غور سے دیکھا ہے۔ جو حسین آباد امام باڑہ کے قریب ایک بارہ دری میں حفاظت سے رکھی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی صاحب نظرِ غور سے اُن دس تصویروں کو جو اس مجموعہ میں شامل ہیں دیکھ چکے ہیں۔ تو وہ یقیناً ہم سے متفق ہونگے کہ یہ تصویروں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مرقع عبرت ہے۔ شاہانِ اودھ کی آزادانہ اور خود مختار حکومت کوئی سو سوا سو برس کے قریب رہی اور دیکھنے والے کے لئے ان دس تصویروں میں سو سال کی تاریخ موجود ہے۔ تصویروں کے نیچے سوائے فرمانروایانِ اودھ کے اسمار تاریخ جلوس اور زمانۂ حکمرانی کے اور کچھ نہیں لکھا۔ مگر تصویریں زبانِ حال سے اپنے اپنے

زمانہ کا قصہ بکمالِ فصاحت سُنا رہی ہیں۔ بشرطیکہ کوئی اُن کی بولی سمجھے۔ تصویروں کی بولی سمجھنے کا رواج اب بہت بڑھتا جاتا ہے۔ اور مغربی دنیا میں تو کوئی کتاب خواہ تواریخ کی ہو خواہ قصہ کہانی کی۔ خواہ سوانح عمری ہو خواہ لغت ہو مکمل نہیں سمجھی جاتی جبتک اُس کے متن کے ساتھ تصویرات کا حاشیہ نہ ہو۔ تصویر کی شرح بہت سی شرحوں سے اچھا کام دے جاتی ہے۔ وہاں تو یہ شوق اسقدر پھیلتا جاتا ہے۔ اور تقریر کو ذریعۂ تعلیم سمجھنا تجربہ کار افسرانِ تعلیم نے یہاں تک تسلیم کر لیا ہے۔ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی دن کو کتابیں محض تصویروں کا مجموعہ ہوا کرینگی۔ عبارت کی ضرورت ہی نہ رہیگی۔ چنانچہ ایک مشہور فرانسیسی مصنف نے جس کی نامی کتاب کو مولوی سید علی صاحب بلگرامی جیسے فاضل نے زبانِ اُردو میں ترجمہ کر کے ہندوستان کے اردو خوانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اپنی تصنیف "تمدن عرب" کے دیباچہ میں تصویروں سے سبق لینے کے مذاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہی بات لکھی ہے کہ اصل میں وہ کئی سو تصویریں جو کتاب میں جمع ہیں تواریخ تمدن عرب کے نقشے آنکھوں کے روبرو دکھا دینے کے لئے کافی ہیں اور جو کچھ اُس میں عبارت بڑھائی گئی وہ فقط توضیح کا کام دیتی ہے مگر شائد وہ وقت آجائے کہ صرف تصویروں سے ایسا مطلب نکلے کہ توضیح کی ضرورت بھی نہ رہے۔ اور تواور مغرب کے معاملات ملکی میں تصویریں اور خصوصاً وہ تصویریں جنہیں "کارٹون" کہتے ہیں۔ بہت کام دیتی ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی تصویروں کا بہت رواج نہیں اور اسی لئے تصویروں کو سبق حاصل کرنے کی غرض سے بہت کم لوگ دیکھتے ہیں۔ مگر شاہانِ اودھ کی یہ دس تصویریں کچھ ایسی ترتیب سے رکھی گئی ہیں کہ معمولی سے معمولی طاقت مشاہدہ رکھنے والا آدمی بھی یہ دیکھکر پھڑک جاتا ہے۔ کہ نواب سعادت جاہ مرحوم کی صورت شکل۔ لباس اور عادت میں (جہانتک عادت قیافہ سے معلوم ہو سکتی ہے) اور اُن کے دسویں جانشین واجد علی شاہ مرحوم کی شکل اور وضع میں کیسا زمین آسمان کا تفاوت ہے۔ تصویر میں بھی نواب سعادت جاہ کے چہرہ سے شجاعت۔ جفاکشی۔ عزم بالجزم اور مردانگی کا پتا چلتا ہے پیشانی پر چیں کیا کہتی ہے۔ کمر میں خنجر کیا کہہ رہا ہے۔ لمبی عبا سے کیا شوکت ٹپکتی ہے۔ غرض ساری ہیئت اور وضع سپاہیانہ ہے۔ اور اس رعب اور جلال کی تصویر پر نظر ڈالنے کے بعد

اگر اچانک دوسرے کونے پر اُس صورت کو دیکھیں جس پر اس آغاز کا انجام ہوا اور واجد علی شاہ مرحوم کی شبیہہ ملاحظہ کریں۔ تو زلفوں کے لام نستعلیق۔ کمر تک لٹکے ہوئے بال۔ باریک کپڑے کا انگرکھا جس سے بدن چھن چھن کر نظر آتا ہے۔ سب مل ملا کر آدمی کو گھبراہٹ میں ڈالتے ہیں کہ ۱۷۳۹ء میں لکھنؤ کے تخت پر وہ جری تھا اور کچھ اوپر سو سال بعد ۱۸۴۷ء میں یہ لباسِ زنانہ کے مشتاق اور عادتِ زنانہ کے پابند اُسی مسند پر جلوہ افروز ہیں۔ ۱۸۵۶ء میں تو شاہانِ اودھ کے اس سب سے آخری بادشاہ کی حکومت ہی اودھ سے اُٹھ گئی۔ اُسکے بعد تو جس طرح اُس نے دن گذارے۔ خیر گذارے ہی سہی۔ مگر اُس تصویر کو دیکھ کر اور اُن کے حالات کا خیال کر کے جو وہ تصویر بیان کر رہی ہے۔ کیا کسی کے دل میں تعجب ہو سکتا ہے۔ کہ شاہانِ اودھ کے تاج کے جواہر اُن سے چھن کر زینتِ تاجِ قیصری کیوں جا بنے اور اودھ کا حاصل خیز علاقہ سلطنت انگریزی کے جاہ و مال کی افزائش کا باعث کیونکر ہوا؟
سچ یہ ہے کہ جب سعادت جاہ کے جانشینوں میں سے کئی ایسے نکلے جو اُس وضع کے پابند نہ رہے جو اُس کامیابی کا راز تھی۔ اور اُس سے الگ ہو کر چلنے لگے۔ تو زمانہ نے ان کی مساعدت نہ کی۔ اور خاندان زور پکڑتے ہی بیٹھ چلا۔ اور اُبھرتے ہی ڈوبنے کے آثار پیدا ہونے لگ گئے۔ پہلے تین چار پشت تک تو خوب نبھتی گئی۔ سعادت جاہ کے جانشین تھے نواب صفدر علی خاں صفدر جنگ جنہوں نے ۱۷۳۹ء سے ۱۷۵۳ء تک حکومت کی۔ اُن کے بعد نواب شجاع الدولہ ابو المنصور خاں اسد جنگ نے ۱۷۷۵ء تک فرمانروائی کی اور ۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۷ء تک نواب آصف الدولہ ہزبر جنگ نے دادِ حکمرانی دی۔ اِس والی ملک کے زمانہ میں اودھ پر ایک خاص رنگ تھا۔ آصف الدولہ کئی اعتبار سے خاندان بھر میں نامور بادشاہ گذرا ہے۔ اور لکھنؤ کا سب سے بڑا اور عالیشان امام باڑہ جس کی صناعی کے بعض حصّے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کے عہد سلطنت کی یادگار ہے۔ اس کے قیافہ سے بھی وہ تمام اوصاف جو اس میں موجود تھے مترشح ہو رہے ہیں مگر جس جس کے قیافہ میں آرام طلبی اور عیش پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ اُس کا زمانۂ حکومت بھی اُس کے حالات کے مطابق ہی کامیاب پایا جاتا ہے نشست کا انداز ہی بدلتا جاتا ہے۔ جوتے تک کی وضع میں نمایاں تبدیلی ہوتی

جاتی ہے۔ لباس ایسا آتا جاتا ہے جس سے سپہگری کو کوئی واسطہ ہی نہیں۔ درمیان میں پھر ایک دو کام کے آدمی آتے ہیں اور اخیر واجد علی شاہ کے وقت میں خود آرائی حد کو پہنچ جاتی ہے ۱۷۹۸ء میں سعادت علی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بھی اپنا سکہ اچھا چلا جاتے ہیں ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۷ء تک پہلے کی اور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک دوسرے کی حکومت ہوئی۔ محمد علی شاہ صاحب ۱۸۴۲ء تک اور امجد علیشاہ صاحب ۱۸۴۷ء تک سلطنت کر کے چل دیئے۔ اور یہ ناؤ جس کے ڈوبنے کے آثار ابتدا میں ہی پیدا ہو گئے تھے۔ کئی دفعہ ڈوبتی ڈوبتی بچکر واجد علی شاہ کے عہد میں آخر کو بیٹھ گئی اور ایسی بیٹھی کہ پھر نہ اُبھری۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک۔ انتہا ہے یہ

مجالسِ تفریح

اہل یورپ کی موجودہ تمدنی ترقی کے اجزا میں ایک جزو اُن کی تفریحی مجالس ہیں جن کو انگریزی میں کلبز[1] کہتے ہیں۔ آج ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اُن کا کیا اثر یورپ پر ہوا۔ اور ہندوستان میں ان مجالس کی ضرورت ہے یا نہیں۔

یورپ کی پوچھو تو وہاں آج سے نہیں۔ صدیوں سے جب وہ موجودہ معراج ترقی پر بھی نہیں پہنچا تھا۔ بلکہ اکثر امور میں ایشیا کے قدیم تمدنوں کا دستِ نگر اور محتاج تھا اتنا رواج تو ضرور چلا آتا ہے۔ کہ وہاں کے لوگ مل جُل بیٹھنے کی بیحد قدر کرتے ہیں۔ اور ایسے موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں جن میں بہت سے ہم قوم یا ہم ملت یا ہم خیال آدمیوں کے جمع ہونے کی صورت نکل آئے۔ وہ اس گُر کو شروع میں ہی جان گئے تھے کہ ایک ایک اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ اور ہر قسم کے کام بجائے شخصی کوششوں کے اگر قوم یا حصۂ قوم کی مجموعی ہمت سے ہوں تو زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہی اصول اُن تمام امور میں جن پر آج یورپ کی تہذیب کو ناز ہے نظر آتا ہے۔ ملکداری کے کاموں سے لیکر معمولی روزمرہ ضروریات قومی

[1] Clubs

تک سب میں اسی کا پرتو ہے۔ یہ جو جمہوری سلطنت کی خوبیوں کی طرف آجکل تمام دنیا کی تعلیمیافتہ طبائع جھکی پڑتی ہیں۔ یہ جو یورپ اپنی مضبوط پارلیمنٹوں اور کونسلوں پر فخر کرتا ہے۔ یہ جو ہندوستان کی اقوام میں سے وہ حصہ جو سب سے زیادہ نئی روشنی سے مستفید ہوا ہے۔ ہندوستان کی ترقی کے واسطے ہندوستانی کونسل اور پارلیمنٹ کی خواہش کرتا ہے۔ یہ صرف اسی پُرانے اصول کی خوبیوں کا بے ساختہ اقرار ہے۔ یعنی یہ کہ ایک بادشاہ خواہ وہ کیسا ہی بیدار مغز اور فہمیدہ ہو۔ مصالح ملکی پر غور کرنے کے لئے ہرگز تنہا ایسا مفید نہیں ہو سکتا جیسے ایک مجمع جس میں رعایا کے لائق ترین اشخاص شامل ہوں اور سب کے سب اپنی دماغی طاقت کو اُس کے ساتھ ملکر خرچ کریں۔ اس اصول پر ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے عمل کر کے دکھایا اور اس سے نمایاں نتائج پیدا کئے۔ مگر افسوس کہ اب وہ ایسی حالت میں ہیں کہ اُنہیں وہی باتیں دوسرے دوسروں کے پاس نہایت عجیب اور نئی معلوم ہوتی ہیں۔ ملکداری کو چھوڑ کر تجارت کی طرف آیئے۔ جس میں یورپ کی تمام دولت و ثروت کا راز نہاں ہے۔ یہی اصول مدت سے وہاں کی تجارت کا رہنما ہے۔ گو ایسے اشخاص وہاں موجود تھے جنہیں ہر فرد لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کا بیوپار کر سکتا تھا۔ مگر اُنہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ بیوپار بل جُلکر کیا جائے۔ چنانچہ بیوپار میں عام شراکت کا رواج ہو گیا۔ اہلِ یورپ کے وہ تجارتی جہاز جو آج نئی اور پُرانی دنیا کو احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ جن کے بہانہ سے اہلِ یورپ دنیا کے ہر حصہ میں جا گھستے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے وہ آخرش جا بجا حکومت حاصل کر رہے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے دنیا کے مختلف حصوں کے مال و اسباب اور نعمتیں فرنگستان کے امراء کے جاہ و تمکنت عیش و آرام اور زینت و آرائش کی باعث ہو رہی ہیں۔ اُن میں سے اکثر اسقدر صرف سے تیار ہوئے ہیں اور یہ تمام بیوپار اسقدر زر روپیہ چاہتا ہے کہ اگر تمام قوم کی مجموعی طاقت نہوتی تو ان باتوں کا عشر عشیر بھی حاصل نہ ہو سکتا۔ خواہ خاص خاص آدمی اب سے بھی زیادہ دولتمند ہوتے۔ ایک آدمی کروڑ دو کروڑ تک کا بیوپار کریگا یورپ کی جائنٹ[۱] سٹاک کمپنیاں کروڑہا اور ارب ہا روپیہ کی تجارت کرتی ہیں۔ کمپنیاں ملک گیری کرتی ہیں۔ کمپنیاں ملک داری کرتی ہیں۔

[۱] مشترکہ سرمایہ والی ۱۲

اور جہاں جہاں انسان کی رسائی ہے۔ وہاں پہنچکر ایسی سرزمینوں پر اپنی سلطنتوں کا جھنڈا گاڑتی ہیں جن میں آج تک کوئی علم بھی بلند نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان کی ضروریات گو سب سے زیادہ متقضی اس امر کی ہیں کہ یہاں جائنٹ سٹاک کمپنیاں بکثرت پیدا ہو جائیں لیکن ہندوستانی ابھی اس طرف متوجہ ہی نہیں۔ غرض یہ کہ یورپ کی یونیورسٹیاں۔ وہاں کے بعض فرقوں کے گرجے۔ وہاں کے مشن۔ وہاں کے ابتدائی مدارس اور ہر طرح کے قومی اور ملکی کام کسی ایک شخص یا دو تین شخصوں کی سعی یا صرف پر منحصر نہیں ہیں۔ نہ سلطنت کے محتاج ہیں۔ بلکہ قومی انجمنوں اور مجالس کے ماتحت ہیں اور انہی سے مدد پاتے ہیں غنیمت ہے کہ اس معاملہ میں ہندوستان میں بھی کچھ اسی طرح کے انتظام کی صورت ہونے کی ابتدا ہو گئی ہے لیکن ہماری انجمنوں اور مجالس کے واسطے ابھی بہت سے مرحلے طے کرنے باقی ہیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ اسقدر کام کر سکیں۔ جتنا ویسی مجالس فرنگستان میں کر رہی ہیں۔ یہ تمام اقسام جو یورپ میں میل ملاپ کے رواج کی بیان ہوئی ہیں یہ سب کسی خاص مقصود اور کام کی غرض سے ہیں لیکن وہاں ایک اور قسم میل جول کی ہے جو ہمارے ہاں قریباً مفقود ہے وہ محض اتحاد اور تفریح کی غرض سے جمع ہونا ہے۔ یہ بھی وہاں کوئی تازہ رسم نہیں۔ بلکہ مدتوں سے چلی آتی ہے۔ اور یہ تقاضائے فطرتِ انسانی بھی ہے کہ کوئی ایسی رسم ہر ملک میں ہو۔ انسان بالطبع مدنی یعنے سوسائٹی پسند واقع ہوا ہے۔ جبتک یہ وحشی ہے۔ اُس وقت تک تو مثل حیوانوں کے دوسرے انسان سے بھاگتا ہے۔ لیکن وحشی انسانوں میں بھی اپنے ہم جنسوں سے ملنے کی رغبت بہ نسبت حیوانات کے بدرجہا زیادہ پائی جاتی ہے۔ مگر جہاں اسے تمدن کی ذرا سی بھی چاٹ لگی پھر تو یہ ہم صحبتوں کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔ تنہائی وبالِ جان ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام شائستہ دنیا میں قید تنہائی سزاؤں میں صعب ترین شمار کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں انسان بتقاضائے فطرت مل بیٹھنے پر ویسے ہی مجبور ہیں۔ جیسا انگلستان یا فرانس جرمنی میں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ یہاں کا مل بیٹھنا یہاں کی تمدنی حالت کے درجہ کے موافق ہے۔ اور وہاں کا جمع ہونا وہاں کی ترقی کے مطابق۔ آپ ہندوستان کے کسی گاؤں میں شام کے قریب جائیں۔ جب کسان دن بھر کی محنت سے تھکے ماندے

آگر کسی کوچہ کے موڑ پر یا کسی گاؤں کے پاس کے میدان میں حقّہ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہوں اور حقہ ایک سے دوسرے کی طرف گردش کر رہا ہو۔ یہ کیا ہے مگر ایک کلب۔ لیکن ساتھ ہی نہایت کم خرچ اور ہندوستان کی حالت کا سچا نقشہ۔ اُسی کے مقابل میں ذرا اپنی عنانِ خیال کو یورپ کی طرف دوڑایئے اور انگلستان کے کسی گانو کے اسی طبقہ کے لوگوں کے کسی مجمع کی تلاش کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مختصر سا مکان ہوگا۔ اس میں گو کسیقدر بھدی مگر خاص آرام دینے والی کرسیاں ہونگی جو ایک میز کے گرد قرینے سے سجی ہوئی ہونگی۔ میز پر کچھ چُرٹ پڑے ہونگے اور ہر شخص اپنا اپنا چرٹ پی رہا ہوگا۔ خاموشی کا شیدا چپ چاپ بیٹھا ہوگا اور باتوں کا مشتاق اپنی بذلہ سنجی سے دوسروں کے دلوں کو لُبھا رہا ہوگا۔ ایک خدمتگار ہوگا جو ادب سے ایک طرف کھڑا ہوگا۔ اور جس چیز کی اہلِ بزم میں سے کسی کو ضرورت ہوگی مہیا کریگا۔ گو دن بھر حاضرین میں سے ہر شخص مزدور یا کاشتکار تھا۔ اور گو گھر میں جا کر اُن کو خدمتگار میسّر نہو۔ مگر کم از کم اس تھوڑے عرصہ کے لئے ہر شخص اس پُر آسائش مکان کو اپنا مکان اور اُس خدمتگار کو اپنا خدمتگار سمجھنے سے ایک قسم کی راحت پائیگا۔ اور دن بھر کی تھکان دور کر کے گھر کو جائیگا۔ جاڑوں میں اگر آپ کسی ہندوستانی دیہاتی کلب کو ملاحظہ کرنا چاہیں۔ تو آپ اہلِ دِہ کا ایک اچھا معقول مجمع کسی تکیہ میں یا شوَوالہ میں یا ٹھوار خانے میں غرض ایسی جگہ میں جسکو سب کی جگہ کہہ سکیں اور کسی خاص شخص کا مکان نہ ہو۔ پائیں گے۔ وہ بدستور حلقہ باندھے ہونگے اور درمیان میں آگ جل رہی ہوگی۔ جس کے لئے لکڑیاں وغیرہ بہم پہنچانے میں ہر کسی نے تھوڑی بہت مدد دی ہوگی۔ سب کے سب آگ تاپ رہے ہونگے۔ کبھی ہاتھ لنبے کر کے آگ کے قریب لیجائیں گے۔ کبھی اُن کو ملکر پھر چادریں لپیٹ لیں گے۔ جو بیچاروں کے لئے دوشالہ یا اوورکوٹ کی قائم مقام ہوتی ہے۔ ذرا بھی آگ بجھنے لگے تو ہر شخص اپنی اپنی طرف اور تھوڑا سا ایندھن ڈالتا جائیگا۔ ساتھ ساتھ باتیں ہوتی جائیں گی۔ اگر آپ اپنے ذہن کو لمحہ بھر کے لئے ہی ملک انگلستان کے موسم سرما میں کسی چھوٹے قصبہ کی طرف منتقل کریں تو آپ دیکھیں گے کہ کمرہ میں دو تین انگیٹھیاں دہک رہی ہیں جو شخص زیادہ آگ کے قریب بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ وہ اپنی کرسی انگیٹھی کے پاس کھینچ لیتا ہے۔ دوسرا

کمرہ کی بڑھی ہوئی حرارت پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا ہے۔ کوئی چا یا قہوہ پی کر اپنے تئیں گرم کر رہا ہے اور جو شراب پینے والے ہیں وہ ساغر سے اپنے تئیں گرما رہے ہیں گو ہم انگلستان کے اُس مجمع کے اُن لوگوں کو جو شراب پینے والے ہیں اپنے ان غریب دیہاتی بھائیوں سے خوش قسمت نہیں کہہ سکتے۔ مگر باقی سب باتوں میں وہ بلاشبہ قابلِ رشک حالت میں ہیں۔ لیکن اس سارے معاملہ میں جو قابلِ غور امر ہے وہ یہ ہے کہ یورپ کے دیہات کے کچھ نمونے تو ہندوستان کے دیہات میں موجود ہیں۔ گو بہت کم درجہ کے ہیں۔ لیکن یہاں کے شہروں میں اُن مجالس کا جو وہاں کے شہروں کی رونق ہیں۔ نشان بھی نہیں۔ وہاں کے شہروں کی مجالس اس عروج پر ہیں۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے اور بارہا مفید نتائج کا باعث ہوتی ہیں۔ سامان اور زینت اور آرائش کی تو کچھ نہ پوچھئے۔ وہ تو یورپ کے موجودہ تموّل پر شاہد ہیں۔ اور ہندوستان میں ابھی نہ ان کی تقلید ممکن ہے نہ ان کی تقلید مفید۔ مگر ان کے کاموں کو تو دیکھئے۔ ہزاروں ایسے لوگ جو غم غلط کرنے یا دل لگی کی تلاش میں گمراہ ہو جاتے اور ایسی عادات عامیانہ صحبتوں میں بیٹھ کر سیکھ لیتے جو اُن کی زندگی کی تلخی کا باعث ہوتیں۔ اور اُس کو خراب کر دیتیں۔ عمدہ قسم کی سوشل مجالس کے ذریعہ سے اُن تمام خطرات سے بچ جاتے ہیں اور سوسائٹی اور قوم کے لئے مفید اور کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ دل بہلانے کے سامان وہاں تو مختلف ہیں۔ علاوہ انواع واقسام کے کھیلوں کے جو محض تفریح کا کام دیتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر مجلسوں میں ایسے مشاغل بھی ہیں جو بیک کرشمہ دو کار کا حکم رکھیں۔ یعنے دل بھی بہل جاتا ہے اور علمی یا عملی فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "عمر خیام کلب" کو لیجئے۔ جو لوگ اخبارات دیکھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے تو بالخصوص اس کی لمبی لمبی رپورٹیں بھی دیکھی ہونگی اس کا آغاز چند ایسے علم دوست انگریزوں سے ہوا جو فارسی زبان دانی کے شوقین تھے اور فارسی شعراء میں عمر خیام کی مشہور رباعیات کو پسند کرتے تھے ہمعولی انگریزی کتابیں پڑھنے اور روزمرہ کے کام کے بعد انہیں عمر خیام کی رباعیات میں ایک جدّت ملتی تھی جو فرحت بخش تھی اور جو اُن کے تھکے ہوئے دماغوں کو بہت کچھ آرام دیتی تھی۔ لیکن فرق یہ ہو گیا کہ آگے تو ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کے

دل خوش کر لیتا تھا اور ڈرتا تھا کہ بعض اس کے ہم قوم اُسے کسیقدر مجنوں سمجھیں گے کہ ایک ایرانی شاعر کو خوبیوں کا پُتلا سمجھتا ہے۔ اور اب اس طرح ایک مجلس کے ذریعہ سے اُنہوں نے یہانتک کامیابی حاصل کر لی کہ اور سینکڑوں اور ہزاروں کو اپنا ہمخیال بنالیا جو اُن سے بھی بڑھکر عمر خیام کے کلام کے دلدادہ ہو گئے۔ اور بانیان کلب اب فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکیلے وہی نہیں جو عمر خیام کی قدر کریں۔ بلکہ عمر خیام فی الواقع قدر کے قابل ہے ؎

نہ من بر آں گلِ عارض غزل سرائم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

اس کا اثر علمی ترقی اور شوق زباندانی پر تو جو کچھ پڑنا چاہئے محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن ویسے بھی اُنہوں نے اپنے ملک کے لئے کیسا اچھا نام پیدا کر لیا کہ دنیا بھر میں یہ چرچا ہے۔ کہ انگریزوں میں ایسے ایسے علم دوست موجود ہیں جو اپنی زبان کی قدر دانی کے علاوہ دوسری زبانوں کی عمدہ تصانیف کے بھی مستقل قیام کے ممد و معاون ہیں۔ اگر اہل ہندوستان اور خصوصاً انگریزی خواں صاحبان میں ذرا بھی دوسری قوموں کے ساتھ قدم بقدم ترقی کرنے کا خیال ہوتا تو آج اس ملک میں کم از کم پانچ سات جگہ انگریزی خوانوں کی ایسی مجالس ہوتیں جو انگلستان کے بہترین شعراء کے مطالعہ کو اپنا خاص کام ٹھہراتیں اور جیسا انگریزوں نے عمر خیام کے ترجموں سے اپنے اہلِ ملک کو مستفید کیا وہ شیکسپیئر اور ملٹن کی نازک خیالیاں اپنے دیسی بھائیوں تک پہنچاتیں۔ مگر یہ تو دور کی باتیں ہیں۔ یہاں کی ہمت کا تو یہ حال ہے کہ ہمارے ہاں کے وہ علوم اور مصنفین جن کی خوبیاں مسلّم ہیں۔ مٹتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری اقوام خود بخود اپنی کوششوں سے اُن خوبیوں کو دریافت کرتی اور اُن کا اعتراف کرتی ہیں مگر یہاں کسی کو ہمت نہیں کہ شیکسپیئر کلب نہ سہی ایک سعدی کلب تو بنا دے۔ ایک وقت تھا کہ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ کی بے نظیر تصانیف روم سے لیکر ہندوستان تک تمام ایشیائی ممالک میں جہاں مسلمانوں کو کچھ بھی دخل رہا ہو بکثرت متداول تھیں۔ بچے اُن سے اخلاق اور نصائح کے سبق شروع کرتے تھے اور بوڑھے اُن ہی سے تمام امورِ دنیاوی اور معاملات ملکی کے واسطے ہدایات حاصل کرتے تھے۔ اور فی الواقع گلستان اور بوستان ایسی کتابیں ہیں

کہ داناسے دانا آدمی اُن سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔اور عالم سے عالم شخص خواہ وہ خود نہایت خوش تحریر و خوش تقریر صاحبِ تصنیف ہو مرتے دم تک اُن سے کچھ سیکھ سکتا ہے۔ انگلستان میں شکسپیئر کی یہ قدر ہے کہ گو بچپن میں بھی وہ درسی کتابوں میں ہوتا ہے۔ مگر مرتے وقت وہاں کے ملک الشعرا ٹینی سن کی اُنگلی بھی اسی شکسپیئر کی ہی کتاب میں تھی۔ ہمارے خیال میں نہ صرف ایران بلکہ ایشیا سعدی پر ویسا ہی نازاں ہو سکتا ہے۔ جیسے انگلینڈ یا یورپ شکسپیئر پر۔ وہاں باوجود موجودہ قدردانی کے جابجا شکسپیئر کے نام پر سوسائٹیاں قایم ہیں اور اصل میں یہی سوسائٹیاں ہیں جن کے ذریعہ سے شکسپیئر کا کلام کچھ مدت تک زیبِ طاقِ نسیاں رہنے کے بعد اس شہرت کو پہنچا ہے۔ مگر یہاں یہ نوبت ہے۔ کہ آج اگر ہے سہے انتخاب سعدی سرکاری مدارس کی کتابوں میں سے اُڑا دیئے جائیں تو آنے والی نسلوں کو شاید رفتہ رفتہ بھول ہی جائے کہ سعدی کون تھا۔ اب بھی تو خود تعلیم میں ایسے اختیارات طالبعلموں کو دیئے جا رہے ہیں۔ جن کے وسیلے سے وہ بغیر سعدی کا ایک حرف بھی پڑھنے کے بی۔ اے اور ایم۔ اے بن سکتے ہیں اور بعض کو ضروریاتِ زمانہ مجبور کرتی ہیں کہ وہ اُن طریقوں کو اختیار کریں۔ تو اہلِ ہند کے پاس جن کے واسطے سعدی کی تصانیف ایک قابلِ قدر وراثت ہیں کون سا ذریعہ رہ سکتا ہے جس سے وہ اس کو ضایع نہ ہونے دیں۔ سوائے اس کے کہ اُن کا کوئی نہ کوئی مجمع ایسا ہو جس میں فارغ التحصیل نوجوان بھی جنکو دیگر ضروریات کے باعث اُس وقت تک ایسی تصانیف سے کامل بہرہ نہیں ملا۔ ایسا موقع پائیں۔ کہ وہ اس کمی کو پورا کر سکیں۔ اچھا اس کو چھوڑیئے اور انگلستان کی ایک اور مجلس کی طرف توجہ فرمایئے۔ گو یہ مجلس اب موجود نہیں مگر اس کی حکائتیں زبان زد خلائق ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں وہاں ایک کلب تھا۔ جس کی روح و رواں ڈاکٹر جانسن تھے کوئی اس کے حالات پڑھ لے تو اس صدی کے تمام انگریز مصنفوں کی بیش بہا تصانیف اُس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر جانسن جو انگریزی کی پہلی مشہور لغت کی کتاب کے جامع اور علمی تنقید کی رسم کے بڑے موجدوں میں گذرے ہیں۔ اپنے دن بھر کے کام کے بعد کلب میں جا کر بیٹھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایک کلب اُن کے مذاق کی اُن کو مل گئی تھی۔ اس میں کچھ اور بھی

تصنیف و تالیف کے شائق آمد و رفت رکھتے تھے۔ گولڈ اسمتھ سا نادر الکلام مضمون نویس برک کا سا جادو بیان فصیح۔ رینالڈ کا سا مصوّر۔ اس مجلس کے ممبروں میں تھے۔ ان سب کے بہترین نتائج طبع انہی دنوں کا ثمرہ ہیں۔ جب یہ لوگ مل بیٹھتے تھے۔ صفائی سے ایک دوسرے پر نکتہ چینیاں ہوتی تھیں دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں۔ ایک کی مثال دوسرے کو اکساتی تھی۔ اور نہایت عمدہ اثر اس کا ملک کے علمی ذخیرہ پر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی اس وقت کی گفتگوئیں جمع کی گئی ہیں جو نہایت ہی دلکش اور پڑھنے کے قابل ہیں اس طرح اس کلب نے ملک کی علمی حالت پر بیّن اور مفید اثر ڈالا تھا۔

عُمر خیام کلب جس کی بنا علمی مذاق پر ہے اور جو ایک مذاق کے اہل علم کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اُس پر کیا حصر ہے۔ فرنگستان میں ہر طبقہ اور ہر مذاق کے آدمیوں کو مل بیٹھنے کے سامان ہیں۔ اور یہاں کوئی ایسی مجلس بھی نہیں۔ جو مدارس اور کالجوں کی تعلیم کے بعد علم مجلس اور روزمرہ کے برتاؤ کی تہذیب کی تعلیم گاہ کا کام نوجوانوں کو دے سکے۔ یورپ میں جہاں عزت اور روزگار حاصل کرنا ہندوستان سے بدرجہا مشکل ہے (گو یہاں بھی اب بہت مشکل ہوتا جاتا ہے) نوجوانوں کی کامیابی اخلاق و عادات و برتاؤ پر بالکل منحصر ہے۔ وہاں سوائے نہایت اعلیٰ طبقہ کے آدمیوں کے دوسرے ہر شخص کو اپنے بل پر بڑھنا پڑتا ہے۔ کسی کے متوسلین میں کوئی شخص اس سبب سے عزت نہیں پاتا۔ کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ پس قواعد مجلس سیکھنے اور مجالس میں عزت اور اعتبار حاصل کرنے کے لئے وہاں کے نوجوان مجالس ہی میں جاتے ہیں۔ فرض کیجئے ایک شخص نے اپنی ضروری تعلیم سے فارغ ہو کر ایک دوکان کھولی ہے۔ اب اپنے لئے ایک معزز فرد قوم کی حیثیت قائم کرنے کے واسطے اسے خاص کوشش کی ضرورت ہے اسکو خود ملاقاتیں پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ خود دوستوں کو اپنی خوبیوں کا معترف بنانا پڑتا ہے اور خود ہی ہر قسم کی عزت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ پہلی آشنائی جو وہ سوسائٹی سے پیدا کرتا ہے۔ کسی نہ کسی کلب کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دنوں میں اگر وہ مناسب طریق سے چلتا ہے تو وہاں کے تمام ممبروں کو اپنا بنا لیتا ہے وہی اس کے لئے علم مجلس کے معلم ہوتے ہیں۔ انہی کے

تجربہ سے وہ تجربہ اور انہی کے مشاہدے سے وہ مشاہدہ جمع کرتا ہے۔ اور وہ تعلیم اسکے واسطے اعلیٰ طبقات کی مجالس کے لئے پروانہ راہداری ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ تو عام طور پر مانا جاتا ہے کہ مدارس کی تعلیم مکمل نہیں خصوصاً علمِ مجلس میں بالکل ناقص ہے اور کوئی ایسا تعلیم یافتہ نہیں جس کو اپنے خاندانی تعلقات میں اس قسم کی معلومات کی ضرورت نہ پڑے سوسائٹی میں داخل ہوتے ہی سخت گھبراتا ہے۔ غلطیاں کھاتا ہے۔ اُس کی ہنسی اُڑتی ہے اور اُس کی تعلیم کو بھی بٹہ لگتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں ایسی مجالس ہوں۔ جن میں نوجوانوں کو تعلیم رواجی سے فارغ ہونے کے بعد اچھی صحبت میں بیٹھنے۔ آدابِ صحبت کو سمجھنے اور ملحوظ رکھنے اور کچھ نہ کچھ معلومات دنیا بڑھانے کا موقعہ مل جائے تو بے انتہا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ممالک فرنگ میں ہر کام کے لئے ایک جداگانہ کلب موجود ہے۔ اکثر مجلسیں ہیں جن کا کام ورزشِ جسمانی اور کھیل کود کی عادات کو ملک میں جاری رکھنا ہے تاکہ لوگوں کی صحت میں خلل نہ پڑے اور قوم ایسی مردہ نہ ہو جائے۔ کہ پڑھ پڑھ کر جوش بہت سا ہے اور ہاتھ پانو ہیں کہ جواب دے رہے ہیں اور جوش کو عملی طور پر ظہور میں لانے کی اُن میں صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ مثلاً یونیورسٹیوں میں لڑکے کشتی چلانا سیکھتے ہیں۔ جو ایک نہایت مفرح اور مردانہ ورزش ہے۔ تو وہاں ایسی کلبیں بھی موجود ہو گئی ہیں۔ جن میں وہی طالبعلم دنیاوی کاروبار ملازمت یا تجارت وغیرہ میں پڑنے کے بعد بھی اپنی مشق کو جاری رکھتے ہیں۔ گیند بلے کے کلبوں کا تو کچھ حساب ہی نہیں۔ جن میں بوڑھے بوڑھے آدمی اپنے پرانے شوق کو پورا کرتے ہیں۔ بلکہ اُن میں فن کمال پیدا کرتے جاتے ہیں۔ غرض ٹینس کھیلنے کے لئے کلب ہیں۔ بائسکلوں کی گھوڑدوڑ کے کلب ہیں فن تصویر کے کلب ہیں۔ کونسا شوق ہے جو وہاں پورا نہیں کیا جاتا اور کونسا کام ہے جس میں فائدہ کا پہلو ساتھ ہی مرعی نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ ظاہراً لہو و لعب میں بھی پڑے ہوئے دکھائی دیں گے تو اُن میں بھی کوئی نہ کوئی ترکیب مالی۔ علمی یا اخلاقی فائدہ کی رکھی ہوئی ہوگی۔

پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے مجھے چال سے خالی کہاں یہ لغزشِ مستانہ ہے

ہمارے ہاں پہلے تو سرے سے یہ غلطی کی گئی کہ جن لوگوں نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ محض پڑھنے میں ایسے مستغرق ہوئے کہ دنیا و مافیہا کو بھول گئے۔ کھانے تک کی ہوش نہ رہی۔ نیند کم لینا تو

طالب علمی کا پہلا فرض سمجھا جاتا ہے۔ کثرت سے بیخوابی کی ورزش کھیلنے۔ کودنے۔ دوڑنے کا نام ہی نہ لیا۔ نہ منہ پر رونق۔ نہ ہاتھ میں سکت۔ رہ گئے تو قلم فرسائی کے قابل۔ اور وہ بھی ادھورے کہ انگریز بیسیوں نقص نکالیں صحت کی نعمت ہاتھ سے دے بیٹھے۔ پڑھنے کے بعد دفتر یا کچہری میں گئے۔ دن رات کام۔ نتیجہ یہ کہ جوانی میں ہی آنکھوں کی بینائی ناقص۔ بھوک بند۔ معدہ ضعیف دماغ کمزور۔ اور بڑھاپے تک تو پہنچتے نہیں اور اگر پہنچیں تو زندگی دوبھر ہو جائے۔ اجی ایسے پڑھنے سے تو نہ پڑھنا ہی اچھا تھا۔ آخر یہ مصیبت کی حالت دیکھکر حکام کو ہی رحم آیا۔ اور انہوں نے تاکیدی حکم جاری کرنے شروع کئے۔ کہ مدارس میں طلبا کی ورزش اور کھیل کود پر ویسا ہی زور دیا جائے جیسا اُن کی تعلیم پر۔ کچھ دنوں تو یہ حکم بالائے طاق رہا۔ آخر تعمیل شروع ہوئی اور اس وقت گو عام عملدرآمد کے سبب اتنا ہو گیا ہے۔ کہ طالبعلموں میں سے اکثر باقاعدہ ورزش کرتے ہیں۔ مگر طالبعلموں کی زندگی کا پتہ لگایا جائے تو نوّے فیصدی اُسی کانِ نمک میں چلے جاتے ہیں جس میں اُن سے پہلے کی جماعتیں جا چکی ہیں۔ اور اگر کچھ باقی رہجاتا ہے تو ایک قصہ کہ کسی زمانے میں ہم ایسے اچھے ورزشی کرتب سیکھ گئے تھے۔ یا گیند کھیلنے میں ایسے اُستاد تھے۔ یا ٹینس میں ہماری شہرت تھی۔ کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب وہ سب شوق کیا ہوئے۔ تو آہ سرد بھر کر جواب دیتے ہیں۔ جناب کار سرکاری سے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ وہ صحبتیں کہاں کہ خواہ مخواہ کو بھی جی للچا آئے۔ اور اگر شوق بھی کرنا چاہیں تو کیونکر۔ ہمعصروں میں یہ مذاق نہیں اور چھوٹوں میں جا کر مل نہیں سکتے۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ ہی نہ رہا شورِ سودائے خط و خال کہاں

اس کے مقابلہ میں انہی بابو یا منشی صاحب کے محکمہ کے بڑے صاحب کو دیکھئے جو عمر میں ان سے بھی بڑے ہیں۔ مگر طبیعت میں نوجوانی کی سی اُمنگ۔ کام کرنے کا شوق۔ اور کام کرنے کی طاقت باقی۔ دفتر سے جاتے ہی منہ ہاتھ دھو کپڑے بدل۔ اپنے کلب کی راہ لیتے ہیں۔ پہنچتے ہی اپنے رواج کے مطابق تفریح کے سامان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ کسی کتاب یا اخبار یا مخزن کو اگر دم بھر کے لئے اُٹھا لیتے ہیں تو کسی نہ کسی معاملہ کی نسبت کچھ بحث کی ضرورت معلوم ہوتی ہو

اپنے احباب سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو روزمرّہ کے فرائض اور دفتر کی چکّی پیسنے سے تعلق نہیں رکھتیں اور تازہ دماغ ہو کر رات کو آرام کی نیند لیتے ہیں۔ ادھر اگر ہمارے بھائی کہیں کسی دوست کے مکان پر تین چار جمع بھی ہو جائیں تو اُن کی باتیں کیا ہیں۔ وہی دفتر کے قصے۔ وُہی کچہری کے رونے۔ وکیل ہوں تو مقدمات کا ذکر حکیم ہوں تو بیماروں اور معالجوں کے جھگڑے۔ غرض شب و روز ایک ہی دُھن میں کٹتا ہے۔ اور پھر دیکھو تو ڈھاک کے وہی تین پات۔ اپنے اپنے کام میں کوئی ایسی بڑی قابلِ رشک ترقی بھی نہیں کر لیتے کہ کچھ تو اطمینان ہو۔ انگریزوں کا تو یہ حال ہے کہ جہاں جائیں خواہ جنگل ہی کیوں نہ ہو۔ دو چار ہم خیال ڈھونڈھ ہی نکالتے ہیں۔ اور اپنے مل بیٹھنے اور تفریح کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ اُس وقت رُتبہ اور عہدہ کا بھی چنداں لحاظ نہیں کرتے۔ یہ مجالس تو اُن کے لئے ایک ضرورتِ زندگی بن گئی ہیں۔ ہم شوق سے اُس وقت کا انتظار کرینگے جب ہمارے ملک میں بھی کارآمد و مفید تفریحی مجالس کے گھر گھر چرچے ہوں۔

فنِ تنقید

ہندوستان میں علوم و فنون کی ترقی کی راہ میں ایک روک یہ رہی ہے کہ یہاں فنِ تنقید کا رواج نہیں تھا۔ اور باوجود ترقی کے مختلف خیالات پیدا ہو جانے کے آج تک یہ فن اس ملک میں رائج نہیں ہے۔ آج کل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اسقدر کم اور وہ جھلک ابھی ایسی خفیف ہے۔ کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہو گیا۔ مغربی دنیا کے باشندوں میں جہاں آجکل اور خوبیاں نظر آتی ہیں۔ وہاں یہ بھی ہے کہ لوگ ہنروروں کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں۔ نظم و نثر کی تصنیفات قبولِ عام کا خلعت پہننے سے پیشتر، جوہریانِ سخن کی نقاد نظروں کے کامل العیار ترازو میں جانچی اور تولی جاتی ہیں۔ اور اُن سے سندِ درستی حاصل کرنے کے بعد سخن فہم قدردانوں کی نظروں میں سماتی ہیں۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے "کرٹک" جس سے مراد وہ شخص جو کسی فن کی نسبت رائے لگائے اور کھوٹا کھرا انصاف سے پرکھ دے۔

اس لفظ سے مشتق ہے ایک لفظ کرٹسزم جس کے معنے ہیں جانچنا پرکھنا۔ تعجب ہو کہ اس فن کا وجود تو ایک طرف ہمارے ہاں ابھی ان دونو لفظوں کے صحیح ترجمہ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ان الفاظ کے ترجمے عموماً غلط کئے جاتے ہیں۔ جو ان کے اصل مفہوم سے بہت دور ہیں۔ مدرسوں میں تو بعض نیم ملا "کرٹسزم" کے معنے "نکتہ چینی" پڑھاتے ہیں یا بہت پڑھے تو "رائے زنی" کہدیا۔ اس میں شک نہیں کہ کرٹسزم میں بعض اوقات نکتہ چینی ہوتی ہے مگر بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے۔ اس لئے نکتہ چینی کچھ ٹھیک ترجمہ نہیں۔ ابتدائی تعلیم میں غلط معنے ذہن نشین ہو جانیکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض اچھے خاصے انگریزی خواں تحصیل سے فارغ ہونے پر بھی اس غلطی میں مبتلا رہتے ہیں اور "کرٹک" کو محض نکتہ چین اور اُسکے فن کو فقط نکتہ چینی جانتے ہیں۔ رائے زنی والا گروہ بمقابلہ ان کے راستی پر ہے۔ مگر اول تو یہ لفظ پورا مفہوم ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرا کچھ کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اپنے زمانے میں انگلستان کے نامور رائے زنوں میں گذرا ہو خواہ مخواہ مذاق سلیم کو کھٹکتا ہے۔ اور جو لوگ بالکل اصلی انگریزی لفظ سے ناآشنا ہیں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موصوف کس معاملہ پر رائے زنی کیا کرتے تھے۔ معاملات ملکی سے اُنہیں خاص دلچسپی تھی۔ یا تمدنی امور میں زیادہ دخیل تھے۔ علوم کی طرف رجوع تھا یا فنون کی طرف۔ حالانکہ انگریزی لفظ کے معنے زیادہ تر علم اور فن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کرٹک یا تو علم ادب کی تصانیف کے لئے ہوتے ہیں یا فن نقاشی اور مصوری و معماری وغیرہ کے لئے اگر اور کسی چیز کی نسبت رائے دینے والے لوگوں کا ذکر کرنا ہو تو اس کا نام لینا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ فلاں چیز کے کرٹک"۔ ان دو ترجموں کے علاوہ حال میں کہیں کہیں لفظ تنقید اس معنے میں استعمال ہوتا نظر آیا ہے۔ مگر اہل زبان کی غفلت اور سہل انگاری سے رواج نہیں پاسکا۔ کیونکہ بعض ایسے لکھنے والوں نے جو اُستادوں میں گنے جاتے ہیں۔ اس کوشش سے کہ اپنی زبان کے کسی لفظ کو ان معنوں میں رواج دیں۔ اجتناب کیا اور عافیت اس میں سمجھی کہ اصل انگریزی اصطلاح اردو کتابوں میں لکھدیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ اصطلاح ایسی ہو کہ اُس کا تلفظ آسان نہیں کبھی فارسی خواں اصحاب کی زبان سے جو اس اصطلاح کو سنا ہے تو

سخت ہنسی آئی ہے۔ فرمانے لگے "ہمارے ملک میں ابھی کرٹک نہیں نکلے" جو پوچھا "صاحب وہ کیا" تو بولے "یہی جو کتابوں پر کیری ٹی سزم لکھتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصطلاح اُن انگریزی الفاظ میں سے نہیں ہے جو اُردو میں عام طور پر مقبول ہو سکتے اور جزوِ زبان بن سکتے ہیں۔ یہ ایسی اصطلاح ہے کہ اس کا تلفظ اگر انگریزی خوانوں کی زبان سے صحیح طور پر بھی ادا ہوگا تو بھی اُردو آشنا کانوں کو کھٹکیگا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اُس کے لئے ایک لفظ ایسا تلاش کیا جائے جو زبانِ اردو میں پہلے سے مروّج ہو اور جو اس اصطلاح کے مفہوم کو ادا کر سکے۔ ہماری نظر میں اس مطلب کے لئے "تنقید" سے بہتر کوئی لفظ نہیں اور ہم تو آج سے ہی "کیری ٹی سزم" کو سلام کہتے ہیں۔ اور تنقید سے کام لیں گے۔ کرٹک کو ہم نقاد یا ناقدِ سخن کہیں گے۔ کیونکہ ہمیں ابھی علمِ ادب ہی کے نقادوں سے کام ہے اور ان دو لفظوں کے رواج کو فنِ تنقید کی ترقی کا پہلا زینہ سمجھیں گے۔ اور فن تنقید کی ترقی۔ اگر یہ فن ایماندار اور انصاف پسند لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ ہمارے علم ادب کو اُس معراجِ ترقی پر پہنچا دیگی جس کے اکثر ہوا خواہانِ مُلک دل سے آرزومند ہیں۔ اس وقت مصر میں عربی زبان کا علم ادب غیر معمولی ترقی کر رہا ہے۔ یورپ کے علمی اور ادبی خزانے مالِ غنیمت کی طرح ملک کے ذخیروں کو مالا مال کرنے کے لئے لوٹے جا رہے ہیں۔ جو کام پہلے سلطنتیں کرتی تھیں وہ عوام کر رہے ہیں اور ہر قسم کی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہاں ضرورت نے بہت سے غیر زبانوں کے لفظوں کو اختیار کرنے اور بعض کے لئے اپنی زبان کی اصطلاحیں ڈھونڈھ نکالنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ جن لفظوں کو اختیار کیا ہے اُنکو بالعموم خوبصورتی سے اپنا بنا لیا ہے اور جن کے ترجمے ڈھونڈھے ہیں۔ ایسے موزوں کہ لفظی رعایت بھی ملحوظ ہے اور مطلب بھی ادا ہو گیا ہے۔ انہی ترجموں میں یہ لفظ "تنقید" ہے۔ وہاں اکثر اخبارات یا رسالوں میں جہاں "تازہ تصانیف کی پرکھ ہوتی ہے۔ وہاں صفحہ یا کالم کے اوپر "باب التنقید" لکھا ہوتا ہے خود کالم کے لفظ کی بجائے وہ "عامود" لکھتے ہیں۔ جو انگریزی لفظ کا صحیح ترجمہ ہے اور اگر ہمارے اخبارات میں کالم کا لفظ حد سے زیادہ مروّج نہ ہو چکا ہوتا۔ اور یوں بھی ایک سادہ اور

سہل لفظ نہ ہوتا۔ تو ہم زور سے رائے دیتے کہ "عماد" کو یہ نئے معنے عطا کئے جائیں۔

فن تنقید کے رواج کے لئے دو تدبیریں ہمارے ذہن میں ہیں ایک تو یورپ کی بعض مشہور تصانیف میں سے وقتاً فوقتاً اس فن کی نسبت اقتباسات درج کرنا۔ دوسرے اصولِ فن کے موافق اس رسالہ میں آجکل کی بعض مشہور تصنیفات کو تنقید کے ترازو میں تولنا اور نتیجہ بلاکم وکاست ظاہر کرنا۔ یہ دونو کام بجائے خود مشکل کام ہیں۔ پہلی تدبیر میں تو ترجمہ کا کام نہایت دشوار ہے۔ اس فن کی مختلف اصطلاحیں تعداد میں اسقدر ترقی کر گئی ہیں اور مدح وذم کے ایسے ایسے باریک پہلو نکالے گئے ہیں۔ کہ اُن عبارات کو جو وہاں صدیوں میں منجھی ہیں۔ اردو میں ادا کرنا کارے دارد۔ دوسری تدبیر میں علاوہ اس کے کہ صحیح تنقید کوئی آسان بات نہیں۔ دِقّت یہ ہے کہ مصنفین اور مطابع ابھی سچّی تعریف اور سچّی مذمّت سننے کے عادی نہیں۔ یہاں مدت سے تقریظوں کا رواج رہا ہے۔ کوئی پُرانا دیوان یا کتاب اُٹھا کر دیکھئے۔ قلمی نسخہ ہو یا چھپا ہوا۔ آخر میں صفحوں کے صفحے تقریظوں سے پُر ہیں ہمیں یاد نہیں کہ آجتک کوئی ایسی تقریظ کسی کتاب کے ساتھ لگی ہوئی ہو جس میں جہاں دس خوبیاں جتائی ہیں۔ ایک آدھ نقص بھی جتا دیا گیا ہو مصنّف کو دیکھئے تو ہر تقریظ لکھنے والے کے قلم جواہر رقم۔ طبع رسا۔ اور کلکِ گہر سلک کے گیت گا رہے ہیں۔ اور تقریظوں کو دیکھئے تو سب کی سب کتاب کو لاجواب۔ رشکِ آفتاب و مہتاب۔ ہزاروں میں انتخاب بتا رہی ہیں۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کتاب کتنے تعریفی الفاظ کی مستحق ہے اور ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی تقریظ دوسرے سے زور والی ہو۔ تقریظ لکھنا ہر شخص کے لئے اپنی طبع آزمائی کا موقعہ ہوتا تھا۔ نہ کہ مصنّف کو ایسی داد دینے کا جس کا وہ مستحق ہے۔ بعض ایسی مثالیں بھی دیکھنے اور سُننے میں آئی ہیں کہ تقریظ میں تو تعریف کے پُل باندھ دیئے اور ویسے اگر کسی نے پوچھا کہ کتاب کیسی لکھی گئی ہے تو کہہ دیا۔ کہ "کتاب تو مبتدیانہ مشق ہے۔ ہم نے تو ایک دوست کی خاطر سے تقریظ لکھ دی ہے"! تقریظوں کے علاوہ بعض پرانی کتابوں پر نکتہ چینی بھی کی گئی ہے مگر اس کا مذاق یہ نہیں کہ ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو بلکہ یہ کہ اُس کو سراپا عیب اور ہمہ تن نقص قرار دیتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر اعتراض

حرکات - سکنات پر گرفت - بندش پر نکتہ چینی مضمون پر حرف گیری - ایسے ہی لوگوں کی شان میں میر انیس مرحوم لکھ گئے ہیں -

مزا یہ طرفہ ہے مضموں تو دستیاب نہیں مقابلہ پہ چڑھائے ہیں آستینوں کو
یہ لفظ غلط - وہ بندش بری یہ مضمون سست ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

غرض افراط تفریط کی عملداری رہی ہے - اور مذاق میانہ روی سے آشنا ہی نہیں - نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کی تعریف کر دینا نشانِ دوستی سمجھا جاتا ہے اور نہ کرنا یا کوئی اعتراض کرنا علامت دشمنی ہے - آپ ذرا کسی کی کتاب میں کوئی نقص بیان کیجئے مصنف کے بیسیوں طرفدار آپ کی پگڑی اُتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں - اور کہتے ہیں کہ آپ میں کتاب کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں - اس حالت میں آزادی سے تصانیف پر رائے دینے کا بیڑا اُٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے - اور دشمنی بھی وہ جسے خدا واسطے کی دشمنی کہتے ہیں - یعنے نہ کوئی ذاتی غرض نہ عناد صرف ملک کے علم ادب اور مذاق کی اصلاح اور منفعت عام کی غرض سے تو تنقید لکھی جائے اور جن کے کلام پر تنقید ہو وہ ایسے بگڑیں کہ دل میں غصہ بھر لیں - اور بدلا لینے کی فکر میں رہیں - اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ تنقید کی برداشت لوگوں میں پیدا ہوتی جائیگی - مگر ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے - ہم سر دست یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کتابیں ریویو کے واسطے بھیجی جائینگی اُن کو دو قسم میں تقسیم کریں گے - ایک وہ جن پر ہم ناقدانہ نگاہ ڈالیں گے - اور انجمن کی نئی برقی شعاعوں کی طرح ناظرین کو اُس کے حسن و قبح صاف دکھا دینگے - اس صیغہ میں ممکن ہے کہ ہماری سخن فہمی غلطی کرے - مگر نیت کبھی غلطی نہ کریگی - نہ کسی کا لحاظ تعریف کی طرف راغب کریگا - نہ کسی کا عناد مذمت کی طرف - مال کو کسوٹی پر کس کے رکھدینگے - گاہک کا جی چاہے اُٹھائے - جی چاہے نہ اُٹھائے - جو صاحبانِ تصانیف یا صاحبانِ مطابع اس معیار کو منظور فرمائیں تنقید کی فرمایش کریں - ورنہ لکھدیں کہ وہ صرف تقریظ چاہتے ہیں - ہمارے ہاں کی تقریظ "رشحۂ قلم جواہر رقم" تو نہ ہوگی - اُس پُرانے رنگ میں کسیقدر ترمیم کی جائیگی - اس تقریظ کی تعریف یہ ہوگی -

دندانِ تو جملہ در دہاں اند چشمانِ تو زیر اَبرواں اند

یہ بتادیا جائیگا کہ کس مضمون کی کتاب ہے۔ کون صاحب مصنف ہیں۔ کیسی چھپی ہے۔ کیا قیمت ہے۔ شاید تقریظ کا یہ بہت درست مفہوم نہیں۔ مگر چونکہ تقریظ اپنے آپ کو اس درجہ سے بھی گرا چکی ہے۔ اس لئے ہم اس سے یہ اصطلاحی مطلب لیتے ہیں۔

اگر کوئی صاحب یہ تحریر فرمائیں گے کہ وہ تقریظ چاہتے ہیں یا تنقید تو ہمیں اختیار ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی پسند کرلیں۔

جوہر فصاحت

بعض انگریزی مخزنوں میں کچھ عرصہ سے یہ دلچسپ بحث جاری ہے کہ فصاحت قدرت کا عطیہ ہے یا سیکھنے سے آتی ہے۔ اہل الرائے لوگوں میں اس باب میں بہت کچھ اختلاف ہے کوئی تو کہتا ہے کہ تقریر کی عمدگی ایک جوہر خداداد ہے۔ جو مشق سے جلا پاسکتا ہے۔ مگر پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور کوئی کہتا ہے۔ کہ مشق پر فصاحت تقریر کا مدار ہے۔ ایک منچلے مضمون نویس نے یہانتک کہہ دیا ہے۔ کہ اس خیال نے کہ فصاحت وہبی ہے۔ اکتسابی نہیں۔ بہت گویا آدمیوں کو فصیح بننے سے روکا کیونکہ وہ تھوڑے سے عطیہ پر اسقدر بھولے۔ کہ کوشش ترک کردی اور جو کچھ بننا تھا وہ نہ بن سکے۔ اور کئی کم زبان اشخاص کو بے زبان بنادیا۔ اور وہ سمجھ بیٹھے کہ جب فی الحال اُن کی تقریر موثر نہیں۔ تو اُن کو مشق سے کیا فائدہ ہوگا۔ کیونکہ یہ فن اکتسابی نہیں۔ خواہ ان خیالات میں سے کسی کے ہم طرفدار ہوں غالباً اس رائے سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ کہ مشق تقریر بہرحال مفید ہے۔ جن میں قوت گویائی اور زور طبع قدرت نے رکھا ہے۔ اُن کی قدرتی خوبیاں مشق سے دوبالا ہوجائینگی اور جنہیں قدرت نے اس نعمت سے تھوڑا حصہ دیا ہے۔ وہ بھی اپنی موجودہ حالت سے بہت کچھ ترقی کرجائیں گے۔ اور فن تقریر کو بہ حیثیت فن سیکھنے سے اس قابل ہوجائیں گے کہ بھرے مجمع میں دلیری سے گفتگو کرسکیں اور سننے والوں پر تھوڑا بہت اثر ڈال سکیں۔ اس فن کی نسبت یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ اگر کوئی دل سے اس کا شوق کرے اور طبیعت بھی معمولی درجہ کی رسا پائی ہو۔ اور ایسا ہی بدقسمت اور کند ذہن نہ ہو تو یہ اُسے کچھ نہ کچھ بنادیگا۔

اور اُس کے کلام کو خوبیوں سے آراستہ کردیگا۔ اس کا خاصہ ہے کہ میدانِ سخن میں

بزدلوں کو دلیر کرتا ہے
اور دلیروں کو شیر کرتا ہے

موجودہ زمانہ میں فنِ تقریر شائستہ ممالک کے لئے ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگیا ہے اور جس ملک میں رعایا کو تھوڑی سی بھی آزادی حاصل ہے۔ وہاں ہر معزز باشندے کو کئی موقع مجلسوں کے سامنے تقریر کرنے کے پیش آتے رہتے ہیں۔ واعظوں اور خطیبوں اور لکچراروں کی جماعت کو تو جانے دیجئے۔ وہ تو اس فن کے لئے بنائے گئے ہیں۔ یہ اُن کی زندگی ہے اور وہ اُس کے زندہ رکھنے والے

مزا نہیں ہے خموشی کا خوش بیاں کے لئے
زباں سخن کے لئے ہے سخن زباں کے لئے

صرف اُن لوگوں کی حالت پر غور کیجئے جو تقریر پیشہ نہیں۔ راجہ ہیں۔ نواب ہیں۔ رئیس ہیں ساہوکار ہیں۔ طبیب ہیں۔ اہلکار ہیں مجسٹریٹ ہیں۔ جج ہیں۔ ہر کسی کو کبھی نہ کبھی ایسے موقعے پیش آتے ہیں کہ ابنائے جنس کے ایک مجمع سے خطاب کرے۔ راجاؤں اور نوابوں کو کسی ہمسر کے ہاں مہمان ہونے کے وقت۔ کسی حاکم یا معزز مہمان کی میزبانی کے وقت تقریریں کرنی پڑتی ہیں۔ رؤسا اور امراء کو بڑی بڑی مجالس کی صدارت کے وقت ساہوکاروں طبیبوں۔ سوداگروں اور اس قسم کے حضرات کو جو پولیٹکل معاملات سے خصوصیت نہیں رکھتے اور اپنی آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہرداری کے تعلقات میں یہ ضرورت پیش آتی ہے۔ کسی برادری یا قوم کے مجمع میں۔ کسی اصلاح کے جلسے میں۔ اور اگر ان سب سے کنارہ کش ہیں۔ تو میونسپل کمیٹی کی ممبری میں ہی سہی۔ وہ جب ہی کام کے ہوتے ہیں۔ کہ اپنے خیالات واضح اور مدلل طور پر سامعین کے سامنے پیش کرسکیں اور کبھی کبھی اپنی رائے کو اپنے ہمراہیوں کی رائے پر تقریر یا دلیل کے زور سے غالب بنا سکیں۔ اہلکاروں کو اگر اور کاموں سے وہ سروکار نہ بھی رکھیں۔ تو اپنے افسروں کے استقبال یا رخصتانہ کے اوقات پر ہی تقریر سے کام پڑ جاتا ہے۔ مجسٹریٹ اور جج علیٰ ہذا القیاس اور نہیں تو وفادارانہ جلسوں

میں ہی خیر خواہئ سرکار انگریزی کا اظہار پُرزور لفظوں میں کرنا چاہتے ہیں۔غرضکہ ہر ذی وجاہت شخص کو کم و بیش فنِ تقریر کی ضرورت ہے اور جوں جوں مُلک میں شائستگی بڑھتی جائیگی اور آزادی ترقی کرتی جائیگی۔یہ ضرورت زیادہ ہوتی رہیگی۔اس لئے ہم زمانہ حال کے چند مشہور فصحائے انگلستان کی آرائے کا خلاصہ لکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ کس کس طرح تقریروں کی تیاری کرتے ہیں۔

پہلے مسٹر چیمبرلین کی مثال لیجئے۔کیونکہ کچھ عرصہ سے وہ بہ حیثیت وزیر صیغۂ نوآبادی ہائے انگلستان ہونے کے بہت مشہور ہو گئے ہیں اور خصوصاً جنگ افریقہ جنوبی کے متعلق جو آجتک ختم نہیں ہوا۔اخبارات میں زیر بحث ہیں۔ان کے مخالف کہتے ہیں کہ ان کی سیاسی غلطیاں اس منحوس جنگ کا باعث ہیں جس نے لاکھوں بندگانِ خدا کی جانیں جوکھوں میں ڈالیں۔اور ہزاروں کے خون بہا دیئے۔سینکڑوں گھر برباد اور بیسیوں شہر تہ تیغ و آتش کر دیئے۔ان اعتراضات کا جواب مسٹر چیمبرلین اپنی زبردست تقریروں میں دیتے ہیں۔اور اُن کا باوجود ان سب واقعات کے ایسا اثر ہے کہ انگلستان میں ایک گروہِ کثیر اُن کا طرفدار ہے اور امید رکھتا ہے کہ اُن کی لیاقت اُن کو کسی دن سلطنت انگلستان کے اعلیٰ ترین عہدہ پر ممتاز دیکھیگی۔مسٹر چیمبرلین نے چند سال ہوئے مقام برمنگھم کی ایک مجلس مناظرہ (ڈی بیٹنگ سوسائٹی) میں اُسکے پنجاہ سالہ جلسے پر ایک تقریر کرتے ہوئے خود اُس مجلس کے ذریعہ فنِ تقریر کی ابتدا کرنے کا ذکر کیا تھا اُنھوں نے فرمایا کہ وہ ۱۸۵۴ء میں پہلے اس مجلس کے رُکن مقرر ہو کر ۱۸۶۳ء تک رہے اور اس عرصہ میں برابر اس کے مناظروں میں شریک ہو کر ایک طرف یا دوسری طرف تقریریں کرتے رہے۔اس تجربہ سے جو رائے اُن کی قرار پائی وہ یہ ہے:"بغیر سخت محنت کے کوئی عمدہ دلیل مناسب الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ایک فرانسیسی مصنف کا قول ہے اور میرے خیال میں بہت درست قول ہے کہ فصاحت اصلی اس کا نام ہے کہ آدمی سب باتیں جو مناسب ہوں کہدے اور ان کے سوا اور کچھ نہ کہے۔یہ آخری شرط سب سے مشکل ہے۔اور تقریر تیار کرتے ہوئے زبان کے مانجھنے سے زیادہ وقت اس بات میں صرف ہو جاتا ہے۔کہ غیر ضروری باتیں کم کر دی جائیں اور بے محل فقرے نکال دیئے جائیں۔میں جانتا ہوں ہر اچھے مقرر کا

کا تجربہ اس امر کا شاہد ہوگا کہ بڑے بڑے فصحا بھی اور زیادہ فصیح ہوتے اگر وہ اختصار سے کام لیتے۔ مگر بہت سے مطلب کو تھوڑے الفاظ میں ظاہر کرنا خالی از تکلیف نہیں اور بغیر محنت اور تردد کے ہو نہیں سکتا۔ جان برائٹ جو اپنے عہد میں منتخب فصحائے روزگار تھا۔ اپنی تقریروں پر بیحد محنت کرتا تھا۔ ہفتہ ہفتہ بھر بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ ایک مضمون پر اپنے خیالات کو پختہ کرتا اور سلجھاتا رہتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ میں سب سے پہلے تو خود اچھی طرح اپنے دلنشین کر لیتا ہوں کہ کونسا مدعا ہے جو میں سامعین کے دل پر نقش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر اُس کو سادہ سے سادہ عبارت میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور اس امر کا خاص لحاظ رکھتا ہوں کہ ہر ایک زائد لفظ۔ ہر بے ضرورت دلیل تقریر سے خارج رہے اور ہر مناسب تشبیہ و توجیہ جو خیال میں آتی جائے اور جو نفسِ مضمون کی موید ہو۔ وہ داخل ہوتی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب میں تقریر ختم کر کے بیٹھتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ سامعین میرا مطلب پوری طرح سمجھ گئے ہونگے اور میری تقریر کا مقصدِ اصلی بخوبی اُنکو ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص جان برائٹ نہیں ہو سکتا۔ اور اُسکے شہبازِ فصاحت کی بلند پروازیوں کی تقلید ہر مرغِ بے بال و پر سے ممکن نہیں۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک اس قابل ہے کہ تقریر پر محنت کرنے اور وقت صرف کرنے میں اُس کی تقلید کرے۔ اور کم از کم یہ کر سکے کہ سننے والوں کو کسی امرِ حق کا وہ پہلو وضاحت سے جتا دے جو خود اُس کے نزدیک مسلمہ ہو۔"

برمنگہم کی مجلس مناظرہ کے ایک دو اراکین نے جنہیں مسٹر چیمبرلین کی فصاحت کی ابتدائی حالت دیکھنے کا موقعہ ہوا تھا۔ بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف پہلے اپنی تقریریں لکھ کر حفظ کر لیا کرتے تھے۔ اور اسی لئے طرزِ ادا میں بے ساختہ پن نہ ہوتا تھا۔ گو وضاحت میں کوئی کسر نہ ہوتی تھی۔ اسی مجلس کے سکریٹری صاحب نے لکھا ہے کہ مسٹر چیمبرلین صاحب کی تقریریں دلچسپ۔ بامعنے اور پُر مطلب بھی ہوتی تھیں۔ اور اُن سے ذہانت۔ ہوشیاری اور نکتہ رسی بھی ٹپکتی تھی۔ مگر ابتدا میں بالخصوص یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہایت محنت اور کوشش سے پہلے ہی سے تیار کی ہوئی ہیں۔ اور صرف پڑھی

جارہی ہیں۔ اس سبب سے ایک دفعہ کسی کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے مسٹر چیمبرلین اپنا سلسلۂ تقریر بھول گئے اور گھبرا کر بغیر ختم کئے بیٹھ گئے۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر چیمبرلین کا اپنا تجربہ اُن کے اس خیال کا شاہد ہے کہ فصاحت صرف قدرتی جوہر ہی نہیں بلکہ مستقل مزاجی اور محنت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سر چارلس ڈلک پارلیمنٹ کے مقرروں کے اعلیٰ طبقہ میں ہیں۔ اور فصحا میں شمار ہوتے ہیں۔ اب اُن کی مثال لیجئے۔ سر چارلس ڈلک سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے فنِ تقریر کیسے سیکھا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں نے سب سے پہلے کیمبرج یونین میں اس فن کی مشق کی۔ میں یونین کے جلسوں میں اکثر بولتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ وہاں ان دنوں آکسفورڈ کے دستور کے خلاف تقریروں میں معاملہ فہمی کا رنگ غالب تھا۔ اور محض خوش بیانی اور شیریں زبانی کی قدر کم تھی۔ اور میں جانتا ہوں کہ میری تربیت میں اس مذاق کا خاص اثر ہوا۔ کوئی نیا آدمی جو خوش بیانی کی کوشش کرتا اُس پر وہاں کے طلبہ ہنستے تھے۔ اور جس تقریر میں واقعات اور نکات بیان ہوں اُس کو غور سے سُنتے تھے۔ اُس کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ میں اکثر مضمونِ تقریر کی تیاری تقریر سے زیادہ کیا کرتا تھا یعنے واقعات اور دلائل تلاش کرنے میں سعیٔ بلیغ کرتا تھا۔ اور زبان کی چنداں پروا نہیں کرتا تھا۔ مستفسر نے دریافت کیا کہ آپ کا پھر ہمیشہ یہی طریق رہا یا بعد میں بدل گیا؟ سر چارلس نے کہا۔ "ہاں۔ میں سیر و سیاحت کے بعد پارلیمنٹ میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں پہلے پہلے بولنے سے ہچکچایا۔ گو یونین میں بے دھڑک بولتا رہا۔ پارلیمنٹ میں جب موقعہ ہوتا میں گھبراہٹ کے بغیر بولنے کے لئے نہ اُٹھ سکتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ میں طبیعت پر قابو پا گیا اور اپنا کیمبرج والا طریق استعمال کرنے لگا۔ جس سے ایک حوصلہ پیدا ہوا میں بڑی احتیاط سے مضمون کو تیار کرتا۔ اور خاصے مکمل نوٹ پہلے سے لکھ لیتا۔ مگر وہ نوٹ نفسِ مضمون کے متعلق ہوتے تھے۔ طرزِ ادا سے انہیں کچھ واسطہ نہ ہوتا تھا" سر چارلس تیاری اور مشق کے اصول کے پورے قائل ہیں۔ اور کم از کم اُن کی حالت میں یہ درست بھی ثابت ہوا ہے۔ مسٹر لوسی صاحب نے پارلیمنٹ کے کچھ حالات مرتب کئے ہیں جن میں

یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۸۶۰ء میں ڈلک صاحب کی تقریر ایسی بھدی ہوتی تھی۔ کہ متوسط درجہ کے ممبروں سے بھی گری ہوئی شمار ہو۔ اور ۱۸۷۰ء میں وہ نہایت پُرتاثیر مقرروں کے زمرہ میں گنے جانے لگے۔

نظمِ آزاد

کچھ عرصہ ہوا شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے کلامِ منظوم کا ایک دلچسپ مجموعہ شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان یہ تھا "نظم آزاد۔ جو قیدِ حسن و عشق سے آزاد ہے"۔ مولوی آزاد نے جو رتبہ اُردو زبان کے اعلیٰ ترین مصنفوں میں پایا ہے محتاج بیان نہیں خصوصاً نثر کے میدان میں تو وہ معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ نظم جدید رنگ میں کبھی کبھی کہتے تھے اور طبیعت کی تیزی قیدِ حسن و عشق سے نکلکر بھی اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ اب ایک عرصہ سے اُردو علمِ ادب کی بدقسمتی نے ملک کو اُن کی دماغی خدمت سے محروم کر دیا ہے۔ اور اُن کی مفید تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ اُن کی نثر موزوں کی اب صرف یاد باقی ہے۔ اور نظم آزاد کی فقط کہانی زبانوں پر ہے۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ جب پنجاب میں پہلے پہل تعلیم کا چرچا ہوا۔ اور لائٹنر صاحب مشہور جرمن علامہ نے دار الخلافہ پنجاب میں دار العلوم کی بنیاد ڈالی۔ اور اطراف و جوانب سے سخن داں اور سخن فہم لوگ۔ جوہر سخن کی قدر دانی دیکھکر لاہور کی طرف جھکے۔ انہیں یاد ہو گا کہ جو مشاعرے انجمن پنجاب کے متعلق ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی سے ہوتے تھے اور جن میں مشتاقانِ سخن بلا قید مذہب و ملت جوق جوق آتے تھے۔ اُن میں گلشنِ ذوقِ دہلوی کا یہ عندلیب کس انداز سے چہکتا تھا۔ فصاحت اس کے کلام پر نثار ہوتی تھی اور بلاغت اسکی طرزِ ادا پر فدا تھی۔ دہلی کے علوم و فنون کے باغ پر جب غدر کی خزاں آئی۔ اور کئی بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے کئی پودے سوکھ گئے۔ کئی پھول کُملا گئے اور کئی غنچے بن کھلے مرجھا گئے۔ تو چند مرغانِ چمن نے اُس اُجڑے دیار سے کوچ کر کے خطۂ پنجاب کو آ بسایا۔ گو اس مُلک میں وہ گُل بوٹے جو اُن کے مایۂ زندگی تھے انہیں نظر نہ آتے تھے۔ تاہم انہوں نے

یہاں کی سرزمین کو سیراب اور مادۂ قبول سے بہرہ ور پایا اور اُن کی دعائے سحری کے اثر سے دنوں میں پنجاب بھی ایک ہرا بھرا گلزار ہوگیا۔ جس میں وہ آزادی سے نغمہ سنجی کرنے لگے۔ انہی خوش نواؤں میں آزاد بھی تھا۔ کئی اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ گئے مگر آزاد کو یہ باغ ایسا بھایا۔ کہ اسی کو اپنا نشیمن بنا لیا۔ اور غنیمت کو جس میں امن نصیب ہو۔ آفت زدہ وطن پر جہاں کسی نہ کسی وبال کا سامنا رہتا تھا ترجیح دیکر یہیں کا ہو رہا۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

گو دہلی کو آزاد کے زاد و بوم ہونے کا فخر ہے۔ اور دہلی کے اساتذہ کے زیر سایہ ہی آزاد نے تعلیم و تربیت پائی۔ مگر پنجاب سے بھی اُسے اب وہ گہرا تعلق ہے۔ کہ پنجاب کو بھی اُس کے وجود پر ناز کرنا بجا ہے۔ طوفانِ حوادث نے ہمارے طباع مصنّف کے لئے اُستادِ شفیق کا کام دیا۔ اور تجربہ کے مدرسے میں اُس نے وہ وہ سبق سیکھے۔ جو طبع رسا کے سمندِ ناز کے لئے تازیانہ بن گئے۔ ذوقؔ جیسے اُستاد کی صحبت سنگِ پارس کا حکم رکھتی تھی اُس نے سونا کر کے کٹھالی سے نکالا۔ مگر یونیورسٹی کی ملازمت میں مشرقی علوم کے قدردان انگریزوں کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ سیر و سیاحت اور وسط ایشیا اور ایران کی مجالس نے اس زرِ خالص کو ایسا چمکایا۔ کہ اردو علمِ ادب میں آزاد کا کلام کندن کی طرح دمکنے لگا قصصِ ہند میں وہ سادہ پُرکاری دکھائی ہے کہ سُبحان اللہ۔ مُبتدی پڑھیں تو سب مطالب سمجھ میں آجائیں مُنتہی پڑھیں تو شیرینیِ کلام کے چٹخارے لیں۔ نیرنگِ خیال میں ایک یونانی طرزِ تحریر کا ایسا نمونہ اُڑا لیا ہے کہ یونانی یاد کریں کہ اُڑانے والے رنگ یوں اُڑا لیتے ہیں۔ ایلگوری انگریزی میں یونانیوں کی تقلید سے کسی زمانہ میں بکثرت مروّج رہی اور اب تک پسند کی جاتی ہے۔ اس میں بہت سے ضروری اور مفید مطالب کسی ایسے پیرایہ میں بیان کئے جاتے ہیں جس کا ربط اُن مطالب سے بظاہر نہ معلوم ہو۔ مشرقی علم ادب کے ذخیروں میں تو مذہبی کتب میں اس کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ اور مولانا رومؔ فارسی لکھنے والوں میں اس طرز کے بادشاہ ہیں مگر جو وسعت مغربی مصنّفوں نے اس کو دی ہے۔ اور جس حد تک اُنھوں نے استعاروں کو

پھیلا کر طویل کہانیاں بنائی ہیں۔ اس کے نمونے ایشیائی تصنیفات میں کمیاب ہیں۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ہم اپنے ہاں اس کے لئے ایک لفظ تلاش کریں تو مشکل سے پائیں۔ ہاں یہ شعر اس کا مفہوم خوب ادا کرتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مگر اُردو میں نیرنگِ خیال نہایت عمدہ اور نہایت کامیاب الیگوری ہے۔ آبِ حیات میں آزاد نے دریا کوزہ میں بند کیا ہے۔ اور زبانِ اردو کے اُستادوں کے کلام پر اپنے عبور اور اُن کے حالات کی نسبت اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی ہے اور کئی دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک چکی ہے۔

دربار اکبری کے نورتن اگرچہ آزاد کے زمانۂ علالت میں مولوی ممتاز علی صاحب کی کوشش سے چھپے ہیں۔ مگر انہیں آزاد نے دربار میں اپنی صحت کے دنوں میں اپنے ہاتھوں سے ہی بٹھایا تھا۔ دیوانِ ذوق جہانتک مکمل دستیاب ہو سکا مع تمہید اور حواشی کے چھپوا کر ذوق کا حقِ اُستادی ادا کیا گیا ہے۔ اور جو چھوٹی چھوٹی درسی تالیفاتِ آزاد کیا اردو کیا فارسی۔ ملک بھر میں مروّج ہیں۔ وہ اُن کے علاوہ ہیں۔

گو عارضۂ دماغی نے آزاد کے فیضان سے ملک کو محروم کر دیا۔ مگر یہ ایک طرفہ تماشہ ہے کہ مولانا کا کام کا عادی دماغ علالت میں بھی بیکار نہیں رہ سکا۔ اور اشہبِ قلم صفحۂ کاغذ پر برابر گھوڑ دوڑ کرتا رہا۔ اس دوڑ دھوپ کا ایک نتیجہ تو کتاب سپاک نام کی ہے جو مطبع رفاہِ عام۔ لاہور نے ایک اعجوبہ کے طور پہ چھاپی ہے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ عالی دماغوں کی بیماری بھی دوسرے دماغوں کی بیماری سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ وہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی نئے مذہب کا بانی ہونا چاہے۔ اور عجب نہیں ان دنوں ایسے ہی خیالات مولانا کے دل میں جاگزیں ہوں۔ دوسرا نتیجہ ان دنوں کی سرگرمی کا غزلیات ہیں۔ پرانی مشق کی غزلیں جو کبھی کسی کو دکھاتے بھی نہ تھے۔ آجکل نکال نکال کر پڑھتے ہیں اور نئی غزلیں کہتے ہیں۔ علم قلبِ انسانی کے ماہر اس بات کو

اچھی طرح سمجھ سکیں گے کہ علالت میں مولانا کی طبیعت نے مدت کے بعد غزل کی طرف کیوں رجوع کیا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ ابتدائی عمر میں مولانا آزاد نے غزل گوئی میں خوب زور مارا ہوگا۔ گو جوانی میں ضروریاتِ زمانہ کے احساس سے اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا۔ اور زیادہ پختہ کاری نے نثر کو ترقی دینے کی سجھائی۔ لیکن جب اس فکر سے فراغت ہوئی کہ ضروریاتِ زمانہ کیا چاہتی ہیں۔ پھر وہی پرانا رنگ غالب آیا۔ آجکل غزل گوئی مقبول مشاغل میں ہے۔ اور یہ مزے کی بات ہے کہ اس میں کسی دماغی عارضہ کا اثر نہیں آتا۔ البتہ تصوف کا رنگ غالب ہے۔ غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں اور بے پروائی سے رکھ دیتے ہیں۔ مگر یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی اُن کو لے جائے یا چھپوائے۔ چونکہ ہم اُن لوگوں میں ہیں جو اُن کے ہر قسم کے کلام کے ہر وقت مشتاق رہتے ہیں۔ اور ہمیں بہت سے احباب کا بھی حال معلوم ہے جو مولانا کے کلام کو نہایت شوق اور ادب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ہم نے یہ گستاخانہ کوشش کی ہے۔ کہ ہم مولانا کی غزلیات کچھ نئی کچھ پُرانی اپنے ناظرین کے لئے حاصل کریں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ دستِ شوق کی یہ گستاخی مولانا بھی قابلِ معافی سمجھیں گے اور کبھی کبھی شائقین کو اپنے کلام سے مستفید ہونیکا موقعہ دیں گے۔ ہمارے مہربان آغا محمد ابراہیم صاحب جو مولانا کے فرزند رشید ہیں ان غزلوں کے بہم پہنچانے کے لئے خاص شکریہ کے مستحق ہیں:-

غزلیات اُردو

اس دلِ پر داغ سا گلشن میں اک لالہ تو ہو — پر یہ گُل جیسا ہے کوئی دیکھنے والا تو ہو
آفریں ہمت کو اُسکے دل کی جس نے عشق میں — جان تک پیاری نہ کی ایسا جگر والا تو ہو
ہم تو قیس و کوہکن کے بھی تماشے دیں بھلا — لیلی و شیریں سا کوئی دیکھنے والا تو ہو
ایک ہی ساغر میں کچھ ایسا پلا دے ساقیا — بے خبر دنیا و دیں سے تیرا متوالا تو ہو
ہاتھ خالی مردم دیدہ بتوں سے کیا ملیں — موتیوں کی پنجۂ مژگاں میں اک مالا تو ہو
ناخنِ خار آنکے خود عقدہ ترا کر دیگا وا — پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو
کچھ نہ کچھ آزاد کو بھی چاہئے دل بستگی — گر نہ ہو تبخانۂ چیں سیرِ بنگالہ تو ہو

مثالِ ابرِ کرم فیضِ عام کرتے ہیں　　　وُہی ہیں خوب کہ جو خوب کام کرتے ہیں
نہ کیونکہ اہلِ کرم ہوویں کامیابِ جہاں　　　کہ ہیں یہ کام جو کرتے وہ کام کرتے ہیں
ہزاروں قافلے حسرت کے دشتِ غربت میں　　　ہمارے خانۂ دل میں مقام کرتے ہیں
دلوں میں کرتے جو الفت سے ہیں جہانداری　　　جہاں کو ایک نظر میں غلام کرتے ہیں
ہیں اہلِ دل ابھی زندہ کہ ذکرِ خیر اُن کے　　　دلوں سے آکے سلام و پیام کرتے ہیں

دکھا کے سبزۂ جنّت کے باغِ سبز آزاد
غزالِ نفس رمیدہ کو رام کرتے ہیں

جو نالوں سے مرے دل کے تہ و بالا جہاں ہوتا　　　تو پھر نیچے زمیں ہوتی نہ اوپر آسماں ہوتا
بلا سے دشمنِ جانی مرا سارا جہاں ہوتا　　　کسی صورت سے اے جانِ جہاں تو جانِ جاں ہوتا
تمہارے بیدلوں کی خاک اگر صرفِ چمن ہوتی　　　تو ہر اک شاخِ گل پر جائے غنچہ گل عیاں ہوتا
جو کوئی چوٹ دل کی ساتھ تیشے کے اثر کرتی　　　تو جائے آب ہر چشمہ سے شیرِ خوں رواں ہوتا
دلِ نالاں جرس کی طرح آجاتا ہے جنبش میں　　　رواں سینے سے جب ہے آنسوؤں کا کارواں ہوتا
صنم ہے گردشِ عالم نگاہِ مہر سے تیری　　　اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا

خدا کے واسطے آزاد روکو نالۂ دل کو
کہ کوئی آن میں کون و مکاں ہو لامکاں ہوتا

ہے کہاں سے تو نے یہ طرزِ ستم ایجاد کی　　　دھوم ہے بیداد گر ہر سو تری بیداد کی
پوچھتا حالت ہی کیا میرے دلِ ناشاد کی　　　آہ کی ہمت نہیں طاقت نہیں فریاد کی
بل بے سوزِ دل کہ ہے بدلے لہو کی بوند کے　　　آبلہ آتا زباں پر نشترِ فصّاد کی
آب داری کے لئے محتاجِ خاکستر ہوا　　　مفت آئینہ نے اپنی آبرو برباد کی
گریۂ حسرت ہے یہ کس کا کہ اے دل اب تلک　　　جوئے اشک آنکھوں سے جاری ہی پلِ بغداد کی
سروساں زنجیرِ الفت سے ہے پابندِ چمن　　　نام کو آزاد ہے حالت ہے یہ آزاد کی

غیر دیدارِ صنم گر ہو سروکار مجھے — تو میسر نہ ہو اللہ کا دیدار مجھے
تیری اُلفت نے کیا جینے سے بیزار مجھے — جان سے کھوتا ہے پیارے ترا پیار مجھے
دیتے کیا کیا ہیں دلاسے شبِ فرقت میں بہم — دلِ بیمار کو میں اور دلِ بیمار مجھے
حق خدمت میں ملے دیکھئے کیا حضرتِ دل — کہ ہے قسمت سے ملی عشق کی سرکار مجھے

دیکھنا قیدِ تعلق میں نہ آنا آزاد
دام آتے ہیں نظر سبحہ و زنار مجھے

زندہ دِلوں کا وطن

خدا جانے کس مقبول گھڑی میں سر سید احمد خاں مرحوم کی زبان سے "زندہ دلانِ پنجاب" کا فقرہ نکلا تھا۔ کہ تیر کی طرح نشانہ پر بیٹھا۔ اور جزوِ زبانِ اُردو بن گیا۔ اب جس اخبار کو کھولو۔ جس قومی مجلس کی روئداد کو پڑھو جس تحریک کے اشتہار پر نظر ڈالو۔ یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو کوئی باشندگانِ پنجاب کو کسی قسم کا شوق دلانا چاہتا ہے وہ اُن الفاظ کے ذریعہ اُن کو یاد دلاتا ہے۔ کہ یہ تمغہ جو قوم کی جانب سے اُنہیں مل چکا ہے اس کی لاج رکھیں اور بعض دوسرے صوبجات کی طرح بے اعتنائی سے کام نہ لیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ افسوں کئی دفعہ چل جاتا ہے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ اگر زندہ دلی سے مراد قومی اور ملکی بہتری کے لئے سر توڑ کوشش ہے۔ تو پنجاب کچھ ایسا بہت مستحق نیک نامی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ملک کے اور حصّوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو اور یہاں ایک دھیما سا چراغ ٹمٹماتا نظر آئے۔ مگر ترقی جس چیز کا نام ہے۔ اس سے ابھی پنجاب بھی بہت دور ہے۔ پنجاب میں بھی بہت تھوڑے لوگ ہیں جو فی الحقیقت خطاب "زندہ دلانِ پنجاب" کے مستحق ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ جو زندہ دلوں کو مردہ دل بنانا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں روڑا اٹکانا۔ بنے ہوئے کام بگاڑنا۔ اور ترقی کے راستہ میں سدِّ راہ بننا اپنا شعار کئے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اس اصلیت سے واقف ہیں۔ اُنہیں بڑی ندامت ہوتی ہے

جب وہ ہر طرف سے اپنے ہموطنوں کی تعریفیں سُنتے ہیں اور بیساختہ اُن کے منہ سے دعا نکلتی ہے کہ جو کچھ وہ بظاہر سمجھے جاتے ہیں وہ فی الحقیقت بن جائیں۔ تاکہ اس ندامت سے رہائی ہو۔ جو اب اُنہیں اپنی تعریف سُنتے وقت لاحق ہوتی ہے۔

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست ۔ خلق
تحسیں کنند و او خجل از زشتِ پائے خویش

ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر زندہ دلی کے زیادہ وسیع معنے لئے جائیں تو اہل پنجاب اس خطاب کے بہت مستحق ہیں اور اس کی وجہ زیادہ اُن کے وطن کی قدرتی خوبیاں ہیں۔ پنجاب اور اہل پنجاب کی حالت اور عادات کا صحیح اندازہ آجتک دیگر حصصِ ہند میں نہیں کیا گیا۔ ایک عرصہ تک تو یہ صوبہ کُنجِ گمنامی میں پڑا رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے باشندے کس مُپرسی کی حالت میں رہے۔ اسلامی سلاطین کے زمانے میں یہ سلطنت ہندوستان کا ایک دُور اُفتادہ حصہ تھا۔ جس کی منزلت سرائے سرِ شاہراہ سے زیادہ نہ تھی۔ سرحد پنجاب ہندوستان کے حملہ آوروں کا دروازہ تھا۔ اور پنجاب بمنزلہ ایک سڑک کے تھا جو بڑے بڑے دارالخلافوں تک پہنچتی تھی۔ وسط ایشیا سے آریاورت کے بانی آئے تو اُن کو گنگ وجمن کی کشش نے راوی اور بیاس کے کناروں کو آباد نہ کرنے دیا۔ آریہ ورت پر محمود حملہ کرنے نکلا تو اُس کو بھی ہندوستان کی دولت کے مرکزوں نے اپنی طرف کھینچا اور اُس کا شوق بُت شکنی گوا سے سومنات تک پھر لایا۔ مگر پنجاب پر اُس نے کوئی خاص التفات نہ کی۔ تیمور لنگ نے بھی اپنی جرّار فوجوں کو لئے ہوئے پنجاب میں سے گذر جانے پر ہی اکتفا کیا۔ اور شاہانِ مغلیہ کی شان وشوکت نے بھی دہلی اور آگرہ کو ہی انتخاب کیا۔ پنجاب کا پُرانا دارالخلافہ لاہور۔ صرف ایک صُوبہ کے گورنر کی ہی قیامگاہ رہا۔ اور پنجاب کے وسیع میدانوں۔ سیراب کھیتوں اور دلچسپ سبزہ زاروں کا ذکر کہیں ضمناً آیا تو آیا۔ کہیں جہانگیر نے کشمیر جنّت نظیر کو جاتے جاتے اپنی تزک میں لکھدیا کہ پنجاب کے فلاں مقام سے گذر ہوا۔ تو اس کے منظر کو دلاویز پایا۔ کہیں کسی نے کابل کو جاتے ہوئے یا آتے ہوئے کسی مقام کو قابلِ تذکرہ خیال کر لیا۔ تو پنجاب کا نام آگیا۔ مگر اس سے

زیادہ خصوصیت اسے بہت کم حاصل ہوئی - اس گمنامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدتوں دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جن کی آنکھیں شاہی کی آب و تاب کے تماشے دیکھ چکی تھیں - پنجاب کو کچھ نظرِ حقارت سے ہی دیکھتے رہے - اور چونکہ یہاں کے باشندوں میں وہ نفاست اور سلاست نظر نہ آئی جو شاہی دربار کے قرب نے اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ اور ان شہروں کے مضافات کو سکھائی تھی - اس لئے انہیں شائستگی کے حلقہ سے باہر سمجھتے رہے اہلِ پنجاب جو اُن اثرات سے خالی تھے جو اُن کے ہمسایوں پر پڑ چکے تھے - ہندوستانی حضرات کی غیر معمولی نازک منشی کو دیکھکر اُن سے الگ رہے - اور انجامکار دونوں ایک دوسرے سے رُک رُک کے ملنے کے عادی ہو گئے - اور ہندوستانیوں اور پنجابیوں میں ایک علیحدگی سی ہو گئی - سر سید مرحوم نے جو بڑے اہم کام اپنی زندگی میں سرانجام کئے اُن میں یہ بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں کہ اُنہوں نے ہندوستانیوں اور پنجابیوں میں ایک ربطِ خاص پیدا کر دیا - اور ہندوستانی حضرات کو بجائے پنجابیوں سے نفور ہونے کے اُن کا مداح بنا دیا - اس میں شک نہیں کہ ابتک ہندوستانیوں میں بعض ایسے لوگ ملینگے جن میں پہلی کشیدگی باقی ہے اور پنجاب میں کچھ ایسے آدمی نظر آئیں گے جو ہندوستانیوں سے بدستور کھنچتے ہیں - مگر اکثر صورتوں میں یگانگت اور اتحاد کی بنیاد مستحکم ہو رہی ہے - اور وجہ یہی ہے کہ قوم کے دونوں حصے ایک دوسرے کو بخوبی پہچانتے جاتے ہیں - اور شناسائی دوستی اور محبت کی ابتدا ہے -

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے - ملک کا یہ چھوٹا سا حصہ پانچ دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے - اور انگریزوں کے وقت میں یہ پانچ دریا حکمتِ جدید کے زور سے اتنی انہار میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں - کہ کہا جا سکتا ہے کہ صفحۂ ملک پر پانی کی ایک چادر پڑ گئی ہے یہاں کی زمینیں شروع سے حاصل خیز رہی ہیں - اور یہاں کے کسان محنت و مشقت میں ضرب المثل ہیں - اُس پر پانی کی مناسب تقسیم نے وہ لطف پیدا کیا ہے - کہ فصل کے دنوں میں اطرافِ ملک میں ایک گلزار کھل جاتا ہے - بشرطیکہ فلک کا اہلِ ہند پر خاص عتاب نہ ہو اور بارانِ رحمت کا نزول بھی انسانی حکمتوں کا معاون ہو جائے - غلہ کامیاب فصلوں میں

اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر دوسرے صوبجات میں نہ جائے اور ممالک غیر کی خرید نہ ہو۔ تو وہ ارزانی ہو کہ باید و شاید۔ اس عام سیرابی کے علاوہ بعض قطعات خصوصیت سے سیر حاصل ہیں ستلج اور بیاس کے درمیان ایک دوآبہ ہے جو خوبیٔ آب و ہوا اور کثرتِ باغات و اشجار کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ ایک طرف راولپنڈی اور دوسری طرف گورداسپور کے قریب بعض مقامات دامن ہائے کوہ میں واقع ہیں جن کے قدرتی چشمے اور خوشگوار پانی اور اُن کے زور پر بڑھنے والے میووں کے باغ "جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" کا سماں آنکھوں میں کھینچ دیتے ہیں۔ بعض اضلاع ہیں کہ نسبتاً غیر آباد اور سرسبزی و طراوت سے خالی ہیں۔ مگر اُن میں اور کچھ نہیں تو ہوا نہایت صحت بخش ہے۔ کشمیر کا قرب اور اسکے ساتھ پنجاب کا قدیم اور موجودہ تعلق اس صوبہ کے لئے باعث رونق ہیں۔ بعض اضلاع پنجاب کی حد ریاست کشمیر کی حد سے ملتی ہے یہ اضلاع زبانِ حال سے ع جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد" پکار رہے ہیں۔ شملہ کا پہاڑ اور اُس کے ساتھ کی پہاڑی ریاستیں۔ کانگڑہ کا ضلع مع اپنے قدرتی منظروں کے۔ تماشائے قدرت کے دلدادوں کے لئے کشش خاص رکھتے ہیں۔ اور ان سب قدرتی سامانوں کا مجموعی اثر باشندگانِ پنجاب پر پڑتا ہے۔ کسی ملک یا حصۂ ملک کی جغرافیائی حالت ہمیشہ ایک خاص اثر اہلِ ملک پر رکھتی ہے۔ اہلِ عرب کی ترقی کا راز اُن کے صحرائی ملک میں مستور تھا۔ اگر انہیں گھر میں کھانے کو مل جاتا تو مشکل تھا کہ وہ دنیا کے مشارق اور مغارب کو چھان مارتے۔ اہلِ انگلستان کی اکثر خوبیاں اُن کے وطن کی برکت سے ہیں۔ اہلِ انگلستان بہ حیثیت قوم اچھے جہاز راں ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ قدرت نے اُن کو دنیا سے اسقدر الگ تھلگ ڈالدیا تھا۔ کہ بغیر جہاز رانی کے وہ شائستگی کی نعمت سے بہرہ ور ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ اہلِ انگلستان کامیاب تاجر اور باہمت سیاح ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر صرف اپنے ملک کے سہارے بیٹھتے تو سوائے آلو کے کچھ کھانے کو ہی نہ ملتا۔ لوہے کا کام انگلستان میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ انگلستان کی سرزمین لوہے کی کان ہے۔ اسی طرح جاپان اپنی جغرافیائی حالت میں ایشیا میں انگلستان کا جواب ہے۔ اسی طرح برِ اعظم سے الگ پڑا ہوا ہے۔

اسی طرح چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اسی طرح دندانہ دار ساحلِ بحر رکھتا ہے۔ اسی طرح اکثر پیداوار کے لئے دوسرے ملکوں کا حاجتمند ہے۔ اور اسی طرح ایک باہمت قوم کا وطن ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اہلِ پنجاب بھی جیسی حالت میں ہیں یا جس حالت تک پہنچینگے اپنے وطن کی خصوصیتوں کے اعتبار سے ہی بنے ہوئے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے بڑھینگے ان کی زراعت پیشہ زندگی۔ ان کے وطن کے کوہ و دریا۔ اُس کے چٹیل میدان۔ سب اس بات کے متقاضی ہیں کہ یہ جفاکش اور سادہ اطوار ہوں۔ تکالیف کے عادی اور سفر کو آسان سمجھنے والے ہوں۔ ممکن ہے کہ پنجابی کی جفاکشی اور سادہ وضعی دوسرے صوبجات میں کنجوسی پر محمول کی گئی ہو۔ مگر جاننے والے جان سکتے ہیں کہ یہی ایسی خوبیاں ہیں جن سے اُمید ہوسکتی ہے کہ پنجابی بڑھنے والا آدمی ہے۔ پنجاب میں لکھ پتی اشخاص اکثر اوقات لنبے لنبے قدم مار کر چلتے۔ مستعدی سے کام کرتے اور حسب ضرورت میلوں پیادہ چلنے کو آسان سی بات بات سمجھتے دکھائی دینگے۔ ممالک مغربی و شمالی میں معمولی سفید پوش بھی تھوڑی دور تک بغیر سواری کے چلنا عار سمجھیگا۔ پنجابی کے دسترخوان پر سیدھی سادی روٹی اور سیدھا سادا سالن ہوگا اور بس۔ ہندوستان میں دسترخوان دسترخوان نہ سمجھا جائیگا جبتک اُس پر کم از کم چار پانچ رکابیاں نہ ہوں۔ یہاں تکلف سے خالی ہونا ہنر اور وہاں پر تکلف ہونا داخلِ خوبی شمار ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ پنجابی کے لئے ضرورت ہے کہ کبھی کبھی اپنے ہندوستانی بھائی سے تکلف کی کتاب کے۔ بہت نہیں۔ تو ایک دو ورق ہی پڑھ لیا کرے اور ہندوستانی کو چاہئے کہ بے تکلفی کا سبق پنجابی سے سیکھ لے۔ شائستہ زندگی کے لوازم پنجابی کو ذرا پُر تکلف ہونے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ اپنی اصلی سادگی ہاتھ سے نہ کھو بیٹھے۔ ہندوستانی اگر زندہ دلوں کے وطن کی سیر کرے اور پنجابیوں سے بے تکلف ربط اور میل جول بڑھائے تو بہت سی وہ مردانہ اور مفید عادتیں سیکھ سکتا ہے۔ جو اسے ترقی کرنے میں پوری مدد دیں۔

پنجاب کی اگر کوئی سیر کرے تو وہ جابجا صحت بخش زندہ دلی کے ثبوت پائیگا جس کو اگر عمدہ موقعوں پر استعمال کیا جائے تو قومی امور میں سچی زندہ دلی پیدا ہو جائے اس

صوبہ کی آبادی گُلہائے رنگارنگ کا ایک عجیب گلدستہ ہے۔ ہر شہر میں ایک معقول تعداد ملک کے دیرینہ باشندوں کی ہے۔ جو آریہ نسل سے ہیں۔ پنجاب کے آریہ اصل والے باشندے رنگ و روغن میں اپنے اُن بھائیوں سے اچھے ہیں جو گنگا کنارے جا بسے ہیں اور جنکے رنگ کو پورب کے آفتاب کی زیادہ سخت حدّت نے قدرے سیاہ کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ ہر شہر میں ایک خاص حصّہ مسلمانوں کی مختلف اقوام کا ہے۔ جن میں سیدعربی الاصل۔ مُغل تاتاری اور پٹھان افغانستان سے آئے ہوئے ہیں۔ اکثر بڑے شہروں میں ایک کثیر تعداد کشمیری الاصل باشندوں کی ملتی ہے۔ جن میں سے بعض ابتک اپنی مادری زبان اور وطن مالوف کی عادات کو نباہے جاتے ہیں۔ اور بعض ٹھیٹھ پنجابیوں میں مل جل گئے ہیں اس ملاپ نے پنجاب کے بعض مقامات کو کانِ حسن و ملاحت بنا دیا ہے۔ اور وہ صورتیں پیدا کی ہیں جن کا نظیر ہندوستان کے اور بہت کم حصّوں میں پایا جاتا ہے۔ اثر قبول کرنے کی طاقت کچھ قدرت نے اس علاقہ میں ایسی ودیعت کی ہے کہ شایستہ پنجابیوں میں اُن سب اقوام کی اچھی اچھی چیزیں جن سے اُنہیں سابقہ پڑا ہے مروّج ہو گئی ہیں۔ پنجاب میں کئی گھر ملیں گے جہاں زن و مرد ایرانیوں اور افغانیوں سے فارسی میں گفتگو کرتے اور اُن کے ساتھ قہوہ پیتے ہیں۔ کشمیریوں کے ساتھ قیماتی چائے اُڑاتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ پان کھاتے ہیں۔ اور اردو میں باتیں کرتے ہیں۔ اور خالص پنجابی مجلس ہو تو پنجابی بولی جاتی ہے اور حُقّہ بھری سبھا میں یوں پھرتا ہے جیسے گوپیوں میں کاہن۔ ہر زبان کے تلفظ کو پنجابیوں میں سے تیز ذہن لوگ آسانی سے اُڑا لیتے ہیں۔ اور اردو زبان کو یوں بولتے ہیں جیسے اُن کی اپنی ہو۔ بااین ہمہ بلا ضرورت کم بولتے ہیں۔ اور خموشی پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہانتک کہ ہندوستانی بھائی انہیں عموماً عجمی کہتے ہیں۔ کوئی پنجابی آپ کو سفر میں ملے تو بہت کم ایسا ہوگا کہ خود بخود آپ سے مستفسر حالات ہو یا گفتگو شروع کرنا چاہے۔ لیکن اگر اتفاق سے گفتگو شروع ہو جائے تو پردۂ تکلف جلد درمیان سے اُٹھ جاتا ہے۔ دوست بننے میں پنجابی بہت مستعد اور زود باز نہیں۔ مگر دوست بن جائے تو پکا دوست ہوتا ہے۔ پنجابی گھر کا ایسا ہی عاشق ہے جیسا ہند کا کوئی اور باشندہ۔ لیکن جب گھر سے نکل کھڑا

ہو تو افریقہ اور آسٹریلیا اور امریکہ سب ایک ہے۔ دنیا کے دُور سے دور حصّوں میں پنجابی کا سراغ ملتا ہے۔ اور جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جائیگی۔ زندہ دلوں کا وطن اپنے ہونہار بیٹوں کو ہر ملک و دیار اور ہر آب و ہوا میں جاگزیں ہوتا۔ اور پھلتا پھولتا دیکھیگا۔

عورتوں میں ہمدردی

عورتوں کو خدا نے بالطبع نرم دل پیدا کیا ہے۔ اور نرم دلی کا یہ تقاضا ہے کہ جہاں کسی کو ذرا پریشاں حال دیکھا۔ رقّت پیدا ہو گئی اور خواہ مخواہ دل یہی چاہنے لگا کہ ہو سکے تو اس سے کچھ ہمدردی کی جائے۔ ہمارے ملک میں گو تعلیمِ نسواں کی کمی کے سبب عورتوں میں باہمی ہمدردی کی نظیریں ایک وسیع پیمانے پر عموماً نایاب ہیں۔ مگر اپنے اپنے حلقہ میں عورت ہمدردی کا ایک ذخیرہ ہے۔ کسی ہمسایہ کی عورت کو کوئی صدمہ پہنچ جائے یہ فوراً اُس کی دلجوئی پر آمادہ ہوتی ہیں۔ مردوں سے کہکر مدد دلواتی ہیں اور زبانی بھی ہر وقت اپنی غمزدہ بہن کی دلدہی کرتی ہیں۔ ایک دوسری کے سامنے اس سادگی اور صفائی سے اپنے دُکھڑے کہہ سکتی ہے کہ مردوں میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ جس تحمّل بردباری اور سچی ہمدردی کے ساتھ ایک عورت پہروں۔ دوسری عورت کے دُکھ سُکھ کی کہانی سنتی ہے اسے دیکھکر طبعِ انسانی کے متعلق اچھی رائے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ میلان جس کے سیدھے سادے اور بلا تصنّع ظہور ہندوستان کی مستورات میں کم و بیش نظر آتے ہیں۔ مغربی دنیا کی تعلیم یافتہ عورتوں میں بہت نفیس رنگ میں اور وسیع پیمانے پر پایا جاتا ہے۔ اور اس وقت اہلِ فرنگ کے لئے مایۂ ناز ہے۔ بعض اعلیٰ درجہ کی پڑھی لکھی اور خاندانی خاتونیں ایسی ہیں۔ جو ہمدردئ نسواں اور اپنی جماعت کی خدمت کو اپنی زندگی کا سب سے اہم فرض اور بہت بڑا مقصد جانتی ہیں۔ مگر اُن خاتونوں کو چھوڑکر بھی جنہوں نے اس قسم کی ہمدردی میں شُہرتِ خاص حاصل کی ہے۔ ہزاروں نیک نیّت اور خدا پرست خاتونیں ایسی ہیں جو اپنے مقدور کے موافق کوشش کر رہی ہیں۔ کہ اُن کی ذات سے اُن کی بہنوں کو نفع ہو۔

اور چپکے چپکے غیر معلوم طور پر بغیر اس کے کہ طالبِ شہرت ہوں۔ اس کام کو ایک فرضِ مذہبی جانکر کئے جاتی ہیں۔ کوئی اپنے گھر کے کام کاج سے فارغ ہوکر اپنی ہمسائی کے ہاں چلی جاتی ہے۔ اور اگر اس کو انجیل پڑھنے کا شوق یا ملکہ نہیں ہے تو اس کو انجیل سناتی ہے۔ یا اُس کی لڑکیوں کو انجیل پڑھاتی ہے۔ یا سینا پرونا سکھاتی ہے۔ کوئی ایسے غربا کے گھر میں چلی جاتی ہے۔ جنہیں پیٹ بھر کھانے کو نہیں میسر ہوتا۔ اور انہیں کچھ کھانے کو دیتی ہے۔ اور عورتوں کو محنت مزدوری کے ایسے طریقے بتاتی ہے جس سے وہ گھر کے مالک کی کمائی میں کچھ اضافہ کر سکیں۔ کوئی اُن مصیبت زدہ مکانات میں جاتی ہے۔ جہاں صاحبِ خانہ اپنی کمائی شراب کی نذر کر چکا ہے اور زن و فرزند فاقہ مستی میں پڑے ہوئے صدمات کی وجہ سے ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ کہ خدا کی ہستی سے بھی انکاری ہیں۔ اُن کی مصیبت کو گھٹانا۔ اُن کو صبر سکھلانا۔ ان کے گھر کی صفائی کی کوشش کرنا اور ایسے ایسے اور دشوار کام یہ نیک بخت اپنے ذمّہ لیتی ہے اور سرانجام کرتی ہے۔ غرض اپنی اپنی سمجھ کے موافق ہر ایک کچھ نہ کچھ مفید کام کر رہی ہے۔ اور ایسے طریق سے کہ دنیا کی آفرین سے کچھ غرض نہیں۔ بلکہ اپنے اعتقاد کے موافق اپنے خدا سے اجر کی خواستگار ہے۔ اس طبقہ میں بعض ایسی خاتونیں بھی ہیں۔ جو اپنے ہاں بیٹھی بیٹھی دوسرے ممالک کی عورتوں پر اپنے خیالات کے مطابق نیک اثر ڈالنا چاہتی ہیں اور جن کی یہ خواہش ہے کہ اُن کی بہنیں جو دُنیا کے دوسرے حصّوں میں آباد ہیں۔ اُن نعمتوں کا جو اُنہیں حاصل ہیں حصّہ پالیں۔ اس خیال کی ایک خاتون کا خط جو ایک ہندوستانی خاتون کے نام انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ ہمیں اتفاق سے ہاتھ لگا ہے اور ہم اُس کا ترجمہ اپنے ملک کی مستورات کے فائدے کے لئے کئے دیتے ہیں۔ تاکہ اُن کی آنکھیں کھلیں اور اُنہیں معلوم ہو۔ کہ مغربی دنیا میں اُن کی بہنیں کیا کچھ کر رہی ہیں۔ اور اُن میں سے بعض کتنی روشن خیال ہیں۔ یہ میم صاحبہ جن کے خط کا ترجمہ ہم درج کیا چاہتے ہیں۔ امریکہ کے اُس حصّہ کی ہیں۔ جو کینیڈا کہلاتا ہے۔ اور اُسی سلطنت کے زیر سایہ ہے جس کا ہندوستان میں راج ہے۔ کینیڈا اہر چند کہ ترقی میں امریکہ کے آزاد اور جمہوری سلطنت والے حصّے سے

کم ہے۔ جسے ریاستہائے متحدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم نہایت مہذب و ترقی یافتہ ہے جس کا کافی ثبوت اس خط میں ملیگا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوگا کہ وہاں معمولی متوسط الحال خاتونوں کی تربیت کیسی ہے اور خیالات کس قسم کے ہیں :۔

کوچہ اروِن نمبر ۱۱۲

وسٹ ماؤنٹ

کینیڈا۔ ۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۰۱ء

میری مکرمہ

تسلیم۔ آپ کا خط مورخہ ۱۵؍جولائی۔ مجھے آج ہی ملا۔ اور مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ کیسی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میرے پچھلے خط سے اور اُس مرقع سے جو میں نے اُس کے ساتھ بھیجا تھا۔ مسرت ہوئی۔ اس وقت شمالی امریکہ کا یہ حال ہے کہ ملک بھر میں خیالات کا رجوع مذہب کی طرف ہوتا جاتا ہے۔ اور ہم اس میلان کو سورج کی روشنی کہتے ہیں اسی لئے یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے۔ کہ جب کسی کو کچھ خوشی حاصل ہو۔ وہ کسی دوسرے بھائی یا بہن کو اُس کا حصہ دے۔ یہاں ایک انجمن اسی غرض سے قایم ہوئی ہے۔ گو میں ابھی اُس میں شریک نہیں ہوں۔ تاہم جو کام مجھے دل سے پسند ہے وہ یہ ہے کہ اخبارات اور رسالے جو مجھے ہاتھ لگیں میں دوسری بہنوں کو دکھاتی رہوں۔ اور جو دوسری بہنوں کی نظر سے گذریں وہ مجھے دکھا دیا کریں۔ میری ہمسائی کو جو اخبارات آتے ہیں وہ پڑھ کر مجھے دیدیتی ہے۔ میں اُسے دیدیتی ہوں۔ پھر جو فارغ ہو جائیں۔ اُن کو میں بذریعہ ڈاک کسی رشتہ دار یا سہیلی کے پاس بھیجدیتی ہوں۔ اور وہ پڑھکر کسی اور تک پہنچا دیتی ہے۔ جب میں چھوٹی سی تھی اور بورڈنگ سکول میں پڑھتی تھی تو میرے خاندان کی ایک بزرگ عورت نے میرے پاس ایک روزانہ اخبار بھجوانے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے یہ تحفہ دل سے پسند ہوا تھا۔ اور میں اس احسان کو عمر بھر نہ بھولونگی۔ بارہ سال ہوئے کہ وہ مرحومہ انتقال کر گئی۔ اور خدا جانے اُسے اب معلوم ہے یا نہیں کہ اُس کی یاد یہاں کیسی تازہ ہے۔ جب میری شادی

ہوگئی تو میرے خاوند کے ایک دوست نے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جواب وفات پا گیا ہے۔ سالہا سال تک مجھے ایک بیش قیمت ماہوار رسالہ بھیجکر ممنون کیا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس رسالہ کے پڑھنے نے مجھ پر اور میرے بال بچوں کے دلوں پر بہت اچھا اثر کیا۔ آپ کا خاوند چونکہ باخبر اور پڑھا لکھا آدمی ہے وہ آپ کو بتا سکیگا کہ اس زمانہ میں اخبارات کے ہاتھ میں کتنی بڑی طاقت ہے۔ جسے چاہے وہ بھلائی کے لئے کام میں لائیں چاہے برائی کے لئے۔ میں آج پھر آپ کو دو اخبار بھیجتی ہوں۔ ایک وہی مرقع تصویرات ہے اور دوسرا خاص عورات کے لئے ہے۔ جو مقام ٹارنٹو سے شایع ہوتا ہے۔ ٹارنٹو مثل اوٹاوہ کے قدیم باشندگان امریکہ کی زبان سے لیا گیا ہے۔ یہ نام نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مشہور شاعر "لانگ فیلو" کی نظم میں یہ نام اکثر آتے ہیں۔ کیا آپ نے "لانگ فیلو" کا کچھ کلام پڑھا ہے؟ کیا پاکیزہ کلام ہے۔ اگر آپ نے نہ پڑھا ہو تو میں آپ کو اُس کی کلیات کی ایک جلد بھیج دوں۔ کیونکہ اہلِ امریکہ کو اس شاعر کے وجود پر ناز ہے اور ہم سب چاہتے ہیں کہ اُس کی شہرت دُور دُور پھیلے۔ اس ملک میں ہمارا علم ادب ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ مگر یہ بھی معلوم رہے کہ اس مُلک ہی کی ابھی کتنی عمر ہے۔ ہمیں یہاں آباد ہوئے صرف چند سو سال ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان ہزار ہا سال سے آباد ہے۔ علاوہ بریں تمہارے آباؤ اجداد مدتوں سے تعلیم یافتہ تھے۔ اور ہمارے بڑے اُس زمانہ میں وحشی تھے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ اب تہذیب یہاں روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ وسٹ ماؤنٹ۔ کیوبک میں۔ جو یہاں کا سب سے پُرانا صوبہ ہے۔ نمونہ کے طور پر پیش کئے جانے کے قابل قصبہ گنا جاتا ہے۔ اگرچہ مانٹریل کے ایک طرح ماتحت ہے اور اُس کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہاں ہمارا اپنا انتظام ہے۔ ہم مقامی عہدہ دار منتخب کرتی ہیں۔ یہ تعلیم یافتہ اصحاب ہیں۔ جن کا مقصدِ اعلیٰ یہ ہے کہ مقام وسٹ ماؤنٹ پر امن اور اور خوشحال مقام ہو۔ یہ قصبہ ایک خوبصورت پہاڑی پر واقع ہے۔ مکانات جن کی شکل و صورت سے مکینوں کی خوشحالی برس رہی ہے۔ اس پر واقع ہیں۔ پُرانے اور بڑے بڑے درخت اُن پر سایہ کئے ہوئے ہیں اور اُن کے گرد رفاہ عام کے لئے زمینیں ہیں۔ جن کو نہایت

کوشش سے خوشنما حالت میں رکھا جاتا ہے۔ یہاں بجلی کے ذریعہ چلنے والی گاڑیوں کا انتظام بہت عمدہ ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک نفیس گاڑی آپ کو مل سکتی ہے اور پانچ سنٹ (اڑھائی آنہ) دیکر آپ سارے مانٹریل کی جس کا رقبہ دس میل ہے سیر کر سکتے ہیں۔ مقام وسٹ ماؤنٹ میں جس کی آبادی نو ہزار ہے۔ کوئی ایسی دوکان نہیں جہاں شراب مل سکے۔ اور اس سبب سے یہاں مخمور آدمی بہت کم نظر آتے ہیں۔ چھ سال کے عرصہ میں مجھے صرف دو آدمیوں کو نشہ کی حالت میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور وہ بھی شراب مانٹریل سے جاکر لائے تھے۔ یہاں اتوار کو ہر دوکان بند ہوتی ہے۔ اور لوگ پوری طرح اتوار مناتے ہیں۔ ہر شخص اچھے اچھے کپڑے پہنکر گرجے کو جاتا ہے۔ یا گلگشتِ چمن کرتا ہے۔ یا پہاڑ کے قدرتی نظاروں کا لطف اٹھانے کو گھر سے نکل پڑتا ہے۔ ہر طرف سے آرام اور استراحت کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں سات گرجے۔ تین بڑے بڑے مدرسے اور ایک کُتب خانۂ عام ہے۔ جہاں سے اس قصبہ کا ہر باشندہ زن و مرد دو کتابیں ایک وقت میں مُستعار لے سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ممبری کا کوئی چندہ ادا کرے۔ ایک ریڈنگ روم (کمرہ جس میں اخبارات وغیرہ رفاہِ عام کے لئے رکھے ہوتے ہیں) ہے۔ جس میں بجلی کی روشنی ہے۔ اور جسے جاڑوں میں گرم ہوا بہم پہنچا کر خوب گرم رکھا جاتا ہے۔ اس میں ایک تعلیم یافتہ خاتون ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جس کا فرض ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت و قوم ہر باشندۂ وسٹ ماؤنٹ کی وہاں خاطر تواضع کرے۔ اور اُن کو کتب خانہ کے ارا کین سمجھے۔ اس قصبہ میں ایک عمدہ اور بڑا ہال بھی ہے۔ جو بڑے بڑے جلسوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس کے ساتھ ورزش کا کمرہ اور غسل خانے اور حمام ہیں۔ جاڑے کے موسم کے لئے ایک حوض مکان کے اندر تیار کیا گیا ہے۔ اور گرما کے واسطے ایک بہت بڑا تالاب کُھلی ہوا میں ہے۔ جس کے محافظ معقول اور معتبر آدمی ہیں۔ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ اوقات نہانے اور تیرنا سیکھنے کے مقرر کرتے ہیں۔ بچّوں کو تیرنا بتاکید سکھایا جاتا ہے۔ کتب خانہ اور ہال کے قریب ایک کُھلی زمین نوجوانوں کی انواع و اقسام کی کھیل کود اور تفریح کے واسطے مہیا رہتی ہے۔ ایک چھوٹی سی جھیل بھی موجود ہے۔ جس میں ننھے بچے اپنی

چھوٹی چھوٹی کھلونوں کی سی کشتیاں چلاتے ہیں۔ رات کو اُس پُر فضا مقام میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے اور ہمیں ہمارے خاوند وہاں سیر کے لئے لے جاتے ہیں۔ یا ہم ایک طرف بیٹھکر بچوں کی کھیل کود کا تماشا دیکھتی رہتی ہیں۔ میرے خاوند کو یہ فضا خاصکر بہت پسند ہے۔ اور وہ مجھے اکثر وہاں لے جاتا ہے۔ صحت کی حفاظت کے لئے ایک انتظام ہمارے ہاں کا بہت اچھا ہے۔ ہمیں تاکیدی حکم ہے کہ اپنے اپنے صحن اور گلی کوچے صاف اور ستھرے رکھیں۔ ایک ملازم پولیس اس کام کی نگرانی کے لئے گشت کرتا رہتا ہے۔ اور ہفتہ میں دو دفعہ کوڑا کرکٹ ایک بڑی بھٹی میں ڈالکر جلا دیا جاتا ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکی تھی کہ مجھے چٹھیوں کے صندوق میں ڈاک کے ہرکارہ کے چٹھیاں ڈالنے کی آواز آئی جس سے مجھے آپ کی چٹھی کا ایک فقرہ یاد آیا۔ آپ نے پوچھا تھا۔ کہ کہیں میرا خاوند تو آپ کی تحریر کو نہ دیکھ لیگا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کو جتا دوں کہ میرا خاوند میرے خطوط سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ اُس کو مجھ پر ایسا اعتبار ہے کہ وہ اپنے کاغذات اور خطوط بھی مجھے رکھنے کو دیدیتا ہے۔ وہ نہایت دانشمند اور دیانتدار آدمی ہے۔ اور متانت اُس کی طبیعت میں بہت ہے۔ میری طبیعت ویسی متین نہیں۔ اور میں زندہ دل اور خندہ پیشانی واقع ہوئی ہوں۔ اور یہی بات اُسے پسند ہے جب وہ دن بھر کا کام کر کے تھکا ماندہ گھر میں آتا ہے۔ تو وہ چاہتا ہے کہ کوئی باتوں سے اُس کا دل بہلا دے۔ اور یہ کام مَیں کرتی ہوں۔ میں فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھکر دنیا کے حالات معلوم کرتی رہتی ہوں تاکہ اپنے شوہر سے اور اپنے لڑکوں سے اُن حالات کے متعلق آسانی سے گفتگو کر سکوں۔ میرے دو جوان لڑکے ہیں جو اس وقت مجھ سے دو ہزار کوس پر برٹش کولمبیا میں ہیں۔ میں اُن کو مفصل خط لکھ کر اپنے دل کو خوش کرتی ہوں اور وہ مجھے اپنی حالت کی نسبت مفصل اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ مجھے اپنے لڑکوں پر فخر و ناز ہے۔ اور میں یقین کرتی ہوں کہ اگر آپ صاحبِ اولاد ہیں تو مجھے معذور سمجھیں گی۔ میرے بچے نہ شراب پیتے ہیں نہ تمباکو۔ اور میرے شوہر نے اُن کی تربیت ایسی کی ہے۔ کہ یہ خوب ذہن نشین کر دیا ہے کہ اُن کی زندگی نہایت پاکیزہ ہونی چاہئے۔ میرا

بڑا لڑکا صیغۂ معدنیات کا انجنیر بننے کی تیاری کر رہا ہے۔ اور تین سال تک انجنیری کے مدرسہ میں تعلیم پا چکا ہے۔ ابھی تین سال اُس کی پڑھائی کے باقی ہیں۔ کیونکہ اُس نے دوہرا نصاب اختیار کیا ہے۔ دوسرا لڑکا ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔ دونو برٹش کولمبیا کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کیونکہ آب و ہوا خوشگوار ہے۔ اور ہر قسم کی آسائش وہاں موجود ہے۔ وہاں بھی اتوار کو بالکل کام نہیں ہوتا۔ اور ریڈنگ روم بھی موجود ہے۔ مگر افسوس ہے کہ شراب کا بہت رواج ہے۔ اور اکثر لوگ سخت شرابی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ اُن کی آمدنی بے حساب ہے۔ اور اسی طرح بے حساب خرچ کرتے ہیں۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔

اب میں آپ کو اپنی لڑکیوں کا حال سناتی ہوں۔ میری تین لڑکیاں ہیں اور تینوں لڑکوں سے چھوٹی ہیں۔ جب یہ پیدا ہوئیں تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہمارے ملک میں لڑکیاں ماؤں کے لئے بہت آرام دہ ہوتی ہیں اور میرا شوہر بھی لڑکیوں کو بہت پیار کرتا ہے۔ سب سے بڑی کا نام اینی ہے۔ اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہے اور رات تک مدرسہ میں پڑھتی ہے۔ دوسری میری ہے جس کی عمر سولہ سال ہے اور تیسری کا نام مارگرٹ ہے جو آٹھ سال کی ہے۔ اب کے برس دونوں بڑی لڑکیاں ایک بورڈنگ والے مدرسے میں داخل ہونگی۔ جسے پچاس سال ہوئے ایک فرانسیسی خاتون نے ایک جھونپڑے میں شروع کیا تھا۔ لیکن جو اب ترقی کرتے کرتے کینیڈا کے بہترین مدرسوں میں گنا جاتا ہے۔ میرے دونو لڑکے بھی کچھ عرصہ اس مدرسہ میں پڑھ چکے ہیں۔ اس مدرسہ میں بچوں کو کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھنا لابدی ہے۔ خواہ کوئی کیسا ہی امیر کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ کام ضرور سیکھنا پڑتا ہے۔

آپ نے مجھ سے کینیڈا کے قدرتی منظروں کی چند تصویریں مانگی ہیں۔ میں اگلی ڈاک میں ضرور بھیجونگی۔ مجھے خوشی ہے کہ کینیڈا ابھی اب بڑے ممالک میں شمار ہونے لگا ہے خصوصاً جب سے یہ معلوم ہوا کہ اس میں بیش قیمت کانیں ہیں۔ اس کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ والے جو اپنے آپ کو "امریکن" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ساتھ ملا لیں۔ مگر ہم اپنے پُرانے وطن انگلستان کے ساتھ ہی

رہنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے قدیمی جھنڈے کے زیر سایہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہم اپنے فوائد کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور انگلستان جیسے باضابطہ ملک کے محدود اختیارات والے بادشاہ کی رعایا ہونیکو پریسیڈنٹ کی رعایا ہونے پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جمہوری ریاستوں میں پریسیڈنٹ اپنی میعاد مقررہ کے لئے ایک قسم کا زار روس ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ریاستہائے متحدہ کے بعض پریسیڈنٹ نہایت اچھے اچھے ہوئے ہیں جن کا چلن بہت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ مگر ہمارا یہ خیال ہے کہ ہم کینیڈا میں زیر سایہ برطانیہ ہی اچھے ہیں۔ اور اس لئے ہم اپنے بچوں کو بھی سکھاتے ہیں کہ برطانیہ کے وفادار رہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ میں عیوب اور نقائص ہیں اور کبھی کبھی اس سے سخت غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مگر ہمارا عقیدہ ہے کہ برطانیہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے اور۔ آخرکار خدا اُس کو عیوب سے بری کر کے اس کے ذریعہ تمام دنیا میں اپنی حکومت پھیلائیگا۔

میں حیران ہوں کہ میرا قلم مجھے کہاں سے کہاں لئے جاتا ہے اور میں نے اس خط کو کسقدر لنبا کر دیا ہے۔ تاہم میں امید کرتی ہوں کہ میں باعثِ ماندگی نہیں ہوئی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی مجھے ایک لنبی چٹھی لکھیں۔ اپنی بابت آپ جو کچھ مجھے بتائیں۔ میرے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح ہماری دوستی مضبوط ہوگی اور جانبین کی خوشی کا ذریعہ اور فائدہ کا موجب ہوگی۔

آپ کو یہاں کی "مجلس خواتین" کا بھی حال معلوم ہے؟ میرا خیال ہے کہ ابھی ہندوستان میں کوئی ایسی مجلس قایم نہیں ہوئی۔ یہاں کی مجلس لیڈی ابرڈین نے قایم کی ہے۔ ہر مذہب و ملت کی عورتیں اس میں شامل ہیں اور کینیڈا بھر میں اس کی شاخیں ہیں۔ ان میں عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ مجالس منعقد کرتی ہیں مضامین پڑھتی ہیں۔ تمدنی معاملات پر بحث کرتی ہیں اور ان تمام امور پر جو دنیا میں عورتوں اور بچوں کی حالت کو بہتر بنا سکیں بحث ہوتی ہے۔ اس مجلس کا یہاں بڑا اثر ہے۔ کیونکہ بہت سے اعلیٰ طبقہ کی خاتونیں اس میں شامل ہیں اور وہ اپنے شوہروں کو جو بڑے مدبرانِ ملک میں ہیں اس کی حالت پر توجہ دلاتی ہیں میں ان جلسوں میں جانا پسند کرتی ہوں۔ اگرچہ میں باقاعدہ ممبر نہیں۔ لیڈی ابرڈین کے ذریعہ

ملک کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اُس نے بیمار دار عورتوں کی ایک جماعت مہیا کی تھی۔ جس سے غربا کو بہت نفع ہو رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی بندوبست کیا تھا۔ کہ اُن لوگوں کو جو خود عمدہ کتابیں خرید نہیں سکتے یا اُن تک دسترس نہیں رکھتے۔ عمدہ کتابیں پہنچ جایا کریں۔ یہ فی الواقع بہت مفید کام ہے۔ اور مجھے اس پر فخر ہے۔ جو عورت کوئی بڑا کام کرے میں اُسے اپنی ساری جماعت کے لئے باعثِ فخر خیال کرتی ہوں۔ اور گو میں اس کے پایہ کو نہ پہنچ سکوں۔ میں دل سے اُس کی تعریف کرتی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں طبقۂ نسواں میں پیدا ہونا باعثِ افتخار سمجھتی ہوں۔ اور ہمیشہ خدا کا شکر کرتی ہوں کہ اُس نے مجھے عورت بنایا۔ خدا نے تمام دنیا کو پیدا کرنے کے بعد آدم کو بنایا۔ اور پھر سب کے بعد آدم سے عورت کو پیدا کیا۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں خدا نے ہمارے لئے اعزاز خاص پنہاں رکھا ہے میں اکثر مذاق کے طور پر اپنے شوہر سے کہتی ہوں کہ خدا نے عورت کو آدمی کے پہلو سے پیدا کیا۔ تاکہ وہ اُس کا ساتھ دے۔ سر سے پیدا نہ کیا۔ کہ وہ اس پر حکومت کرتی۔ پائوں سے پیدا نہ کیا کہ وہ اُس کا حاکم ہوتا۔ بلکہ اُس کا رفیق اور ہمسر بنایا۔ اس پر میرا خاوند مسکرا کر جواب دیتا ہے "اگر تم عورتوں کا بس چلے تو تم سب حکومت پسند ہو" وہ اس طرح چپکے چپکے چٹکیاں لینے میں بہت طاق ہے اور گو بظاہر خاموش ہے۔ اُس نے طبیعت میں بہت کچھ ظرافت پائی ہے۔ میں نے آپ کا خط اُسے پڑھ کر سنایا تھا۔ اور وہ اُس سے ایسا ہی خوش ہوا جیسے میں۔ شائد ہماری عادات آپ کو ایسی عجیب معلوم ہوں جیسی آپ کی ہمیں۔ مگر ہمیں ایک دوسرے کی رسوم و رواج کا ضرور لحاظ کرنا چاہئے۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو خطوط اُن ہدایات کے موافق لکھوں جو آپ مجھے لکھیں۔ اور اگر مجھ سے نادانستہ کوئی اور غلطی ہو تو مجھے ضرور بتا دینا۔ اور اگر چاہیں کہ میں ہی آپ کے خطوط پڑھا کروں اور اپنے خاوند کو نہ سناؤں تو میں اس پر کاربند ہونے کو بھی حاضر ہوں۔ ہماری تربیت کا یہ جزو اعظم ہے کہ دوسروں کے عقائد اور خیالات کا لحاظ کیا جائے۔ میں نہایت خوش ہونگی۔ اگر آپ مجھے خدمات لائقہ سے مطلع فرمادیں۔ یا میں کسی طرح آپ کی خوشی کے ازدیاد کا ذریعہ بن سکوں۔

میں ہوں آپکی صادقہ م۔ اگ

سیّد محمد کاظم حبیب

سیّد محمد کاظم صاحب المتخلص بہ حبیب کنتوری یادگارِ خاندان شیخ ناسخ مرحوم شعرائے زمانہ حال کے اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ حال میں اُن کا دیوان مطبع شمسی حیدرآباد دکن میں شائع ہوا ہے۔ اور اتنا اندازہ تو اُس پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی ہو سکتا ہے کہ کہنہ مشق اُستاد ہیں۔ اور خداداد قوّتِ سخن کے زور سے لکھ رہے ہیں۔ کلام میں آمد زیادہ ہے اور آورد کم۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ سیّد حبیب ایک ایسے خاندان سے ہیں جو علما کا خاندان ہے اور خود بھی ذی علم آدمی ہیں۔ اُن کے کلام کی ایک وقعتِ خاص دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ ذی علم آدمی عموماً اپنے ہر کام کے لئے کوئی انجام اور مقصود قرار دیتا ہے۔ اگر وہ ذوق شعر رکھتا ہے۔ تو شعر گوئی اور سخنوری سے محض اپنی فطرت کے ایک پُر زور تقاضے کو ہی پورا نہیں کرتا۔ بلکہ چاہتا ہے کہ اُس کے ذریعہ اپنے بھائیوں کی کچھ خدمت کرے اور اُن کو مقبول پیرایہ میں اخلاقی۔ مذہبی یا علمی مسائل اور نکات سمجھا دے۔ معلوم ہوتا ہو کہ سیّد محمد کاظم صاحب کے دل میں یہ خیال ایک عرصہ سے موجود ہے۔ کہ اُن کی شاعری وہ شاعری نہ ہو جس پر فعلِ عبث کا فتویٰ لگ سکے یا جس سے بعض شائقین سخن کی فوری تفریح طبع سے بڑھکر کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اور اس خیال کا اُن کے دل میں جاگزیں ہونا خصوصیت سے قابل داد ہے۔ کیونکہ یہ خیال ہندوستان کی دنیائے شاعری میں ایک زمانہ سے کمیاب ہو۔ اور دہلی اور لکھنؤ کی صحبتیں اس شوق سے اتنی ہی دور ہیں۔ جتنا چین انگلستان سے۔ لکھنؤ کی صحبتوں میں حبیب کنتوری کو تحصیلِ فن کے لئے رہنے کا موقعہ ہوا ہے۔ اُن میں سے نکلکر اُن کی جانب سے یہ کوشش شروع ہونا کہ اردو زبان میں غزل کا رنگ بدل دیا جائے اور غزل سے وہ کام لیا جائے جو صوفیا اپنے صوفیانہ کلام سے تہذیبِ اخلاق کے متعلق لیتے رہے ہیں۔ اور جو مصلحانِ قوم نثر کی پُرزور تقریروں اور مولانا حالی صاحب مسدس اور ترجیع بند قومی نظموں سے۔ خالی از تعجب نہیں۔ اور یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جب یہ

معلوم ہو کہ ان کو بسلسلۂ ملازمت حیدر آباد دکن سے تعلق ہے اور مدت سے وہیں رہتے ہیں۔ وہاں کی مجالس میں آتے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ وہیں کے اہلِ ذوق سے داد پاتے ہیں۔ اور وہیں ایک خاصہ حلقہ اپنے شاگردوں اور مداحوں کا رکھتے ہیں۔ بلدۂ حیدر آباد اس وسیع مگر بدقسمت ملکِ ہند کے ان چند بڑے شہروں میں ہو جہاں ابتک رفتارِ زمانہ سے بہت کچھ بے پروائی ہے۔ بے پروائی تو ایک طرف شاید بیخبری ہے۔ امرا ہیں کہ (خاص مستثنیات کو چھوڑ کر) یوں محوِ آرام پرستی ہیں۔ کہ گویا دنیا اُن کے لئے ہے اور وہ دُنیا کے لئے۔ گویا نہ کبھی اس سے پہلے زمانہ میں انقلاب آئے ہیں۔ نہ اب آرہے ہیں۔ نہ آیندہ آئیں گے۔ اور اگر کھٹکا ہو بھی تو بلا سے۔ کم از کم اُن کے لئے تو انقلاب پیدا ہی نہیں کیے گئے۔ بزرگوں کی بدولت جھوٹا سچا شوق علمی اگر کسی میں ہوا بھی تو وہ لفظی دلچسپیوں تک محدود ہے۔ کسی سخنور کا کلام اُن کے کان تک اگر اتفاق سے پہنچ گیا۔ تو صلۂ داد اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی لفظی صنعتیں ایسی ہوں جو انہیں سمجھ آجائیں۔ کوئی بندش یا نشستِ الفاظ ایسی ہو کہ اُن کے دل میں بیٹھ جائے۔ یا کوئی مضمون رنگین۔ عشق و عاشقی یا بادہ نوشی کا ایسا ہو جو حسب حال معلوم ہو۔ فلسفی خیالات اور اخلاقی مضامین سے تو واسطہ نہیں۔ کہیں اگر سن پائیں تو فوراً منہ پھیر کر کہہ دیں "کیا پھیکا پھس پھسا کلام ہے۔ اسے کہو مسجد میں جاکر وعظ کہے جس کو ضرورت ہو گی خود جاکر سن لیگا۔ اگر خدا نے شاعر نہیں بنایا تو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ انسان شعر ہی کہے۔ اپنا وقت ضائع اور دوسروں کا دماغ پریشان کرے۔ آئے وہاں سے بڑے متقی اور پرہیزگار۔ ناصح مشفق بن کے۔ واللہ ہم ایسے لوگوں سے سخت جلتے ہیں" دو چار حاشیہ نشینوں نے ہاں میں ہاں ملائی اور چلئے فلسفی شاعر کو اپنی عرقریزی کا صلہ مل چکا۔ اس سے بھی کم قدر ایسے حلقوں میں اُس شاعری کی ہے جس کو قومی شاعری کہتے ہیں۔ جہاں قوم کا نام کسی شعر میں آگیا۔ اور ہماری نازک مزاج رئیس بگڑے "اجی کوئی اور اچھی سی چیز پڑھو۔ خدا جانے آجکل کیا مرض پھیل گیا ہے۔ جسے دیکھو قوم۔ قوم پکار رہا ہے۔ بس یہی ایک حیلۂ رزق ہاتھ لگ گیا ہے" اگر کسی شاعر نے اس سے بڑھکر غلطی کی ہے اور غزل میں قومی رنگ بھر دیا ہے۔ بس اُس نے تو اپنا گلا

آپ کاٹ ڈالا۔ اگر شہرت پائی بھی تھی۔ تو کھو دی۔ اس خنجرِ ستم کے سب سے پہلے مجروح مولوی الطاف حسین صاحب حالی ہیں۔ چند سال ہوئے کہ اُن کا دیوان چھپا۔ بہت لوگوں نے تو نثر کا جو دیباچہ اُس کے پہلے لکھا ہوا تھا۔ اُس کو پڑھ کر اصل دیوان کو پڑھا ہی نہیں اُن کے نزدیک حالی کی غزلوں کا پڑھنا غزل گو شعراء کے مذہب کی تکفیر کا مستوجب ہونا تھا۔ بعض نے ورق گردانی کی اور جہاں غزل میں قومی مضمون دیکھے اُسے پھینک دیا۔ "اجی اب مسدس حالی کے بعد آدمی انہیں خیالات کو غزل میں کیا پڑھا کرے" بعض ایسے بھی نکلے جنہوں نے ذرا غائر نظر ڈالی اور اس جھگڑے میں پڑ گئے کہ شاذ اور ناز کا قافیہ جو مولانا حالی نے لکھدیا ہے۔ اس کے واسطے عدالت شاعری سے کوئی تعزیر مقرر ہونی چاہئیے کوئی صاحب آئے کہ "نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں" اچھا مصرعہ نہیں اُچاٹ کا یہ استعمال بہت بامذاق اور نفیس نہیں۔ ایک صاحب بولے "خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا" باعتبار مضمون کے تو عشق کی سچی تعریف ہے۔ مگر "شخص" ایک ایسا لفظ ہے کہ نثر کے لئے مخصوص ہے۔ اور مصرعہ میں گھبرایا ہوا بیٹھا ہے کہ میں کہاں آپھنسا ایک زمانہ آئیگا۔ کہ شاعری کے اُس رنگ کی جسے حالی نے اپنا بنایا ہے قدر کیجائیگی اور اسی کے یہ عنوان ہیں کہ حبیب کنتوری جو اساتذۂ لکھنؤ سے تلمذ رکھتے ہیں اور حیدرآباد میں مقیم ہیں وہاں سے بیٹھے ہوئے حالی کو پہچانتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک غزل لکھی ہے جس میں ہر شعر نتیجہ خیز ہے اور مقطع میں جتادیا ہے کہ وہ اور حالی اس حصۂ مذاق میں ہمدرد ہیں وہ لکھتے ہیں :-

عیاں ہے سنگ سے آہن کے اشتیاق کا درد — ہر ایک نوع میں موجود ہے فراق کا درد

وہ سنگ ہے نہ ہو جس دل میں اتفاق کا درد — ہمیشہ مہلکِ اقوام ہے نفاق کا درد

نہ سمجھے گا جو ہمیشہ رہا ہے باساماں — کہے بھی گر کوئی بے ساز بے یراق کا درد

تمہیں بھی بھائیو لازم ہے اس کی چارہ گری — ہمارے دل پہ بہت شاق ہے نفاق کا درد

حبیب خوب تھی طرزِ کلامِ اہلِ عرب — ہوا ہے ہند میں حالی کو اس مذاق کا درد

حبیب نے اس سیدھے سادے رنگ میں غزلیں کی غزلیں لکھی ہیں اور لطف یہ

ہے کہ خوبیٔ زبان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ صوفیانہ۔ اخلاقی اور مذہبی رنگ رندانہ مذاق کے ساتھ ساتھ ہر استادِ فن کے ہاں کم وبیش پایا جاتا ہے حالی اور حبیب کے رنگ کے سخنوروں میں اور پرانے شعرا میں اس بارہ میں تمیز یہ ہے کہ وہاں رندانہ رنگ اصل مقصود ہے اور تصوّف اور اخلاق کی تھوڑی سی چاشنی۔ داخلِ وضعداری اور یہاں اخلاقی شاعری مدِنظر ہے۔ اور عاشقانہ مضامین وضع کے نباہ کا تقاضا۔ ہم چند غزلیں اور چیدہ اشعار دیوانِ حبیب سے اقتباس کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ دیوان بھر میں اخلاقی مضامین کس کثرت سے موجود ہیں۔

قیدِ تکلیف سے ہیں اہلِ طریقت آزاد | غمِ دنیا سے یہ رکھتے ہیں طبیعت آزاد
ہوگا تنہائی و غربت سے ضرر کیا اے چرخ | پا گئے روز کے جھگڑوں سے فراغت آزاد
نہیں جتنے کسی چہرے پہ کبھی ہو کے غبار | بنتے ہیں ابرِ کرم جن کی ہے طبیعت آزاد
یارِ شاطر بھی کہیں ہوتے ہیں بارِ خاطر | روز احباب کو دیتے نہیں زحمت آزاد

متکفل ہے خدا بارِ علائق کا حبیب
خلق میں چاہیئے انسان کی ہمت آزاد

اس غزل کو پڑھتے ہوئے بالکل اسی رنگ کی ایک غزل مولانا حالی کی یاد آگئی جس کے کچھ شعر درج کر دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ | ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ | رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
یوں علائق میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند | پر جو دل ڈھونڈھو تو اُن کا ہے وہاں سب سے الگ
سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں | ہے کوئی بھیدی اور اُن کا رازداں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں حالیؔ نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ

یہ الگ دوکان جو اس جدید مذاق کے پسند کرنے والوں نے کھولی ہے۔ اسے کچھ عرصہ تک قبولِ عام سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ اور چند قدر دانوں کی قدر دانی پر قناعت کرنی

ہو گی۔ لیکن وہ دن آئیگا کہ یہ دکانیں غیر آباد اور بے رونق نہ رہینگی۔ پُرانے اور مشہور بازاروں سے کئی بڑے بڑے سوداگر اسی بازار کی طرف جھکیں گے اور جوہریان سخن کی نئی نسلیں اس بازار کی گاہک ہونگی۔ سردست تو انہیں بھی تسلّی ہونی چاہئے کہ اپنی اپنی خدمت انجام دے کر فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ دیکھئے تو سہی اس تہذیب کے راگ کے جو حبیب نے گایا ہے۔ سُننے والے ابھی کہاں ملتے ہیں:۔

مہر و اُلفت ہے آلِ تہذیب — خاکساری ہے کمالِ تہذیب
ہے وہ آرائشِ حُسنِ باطن — جس کو کہتے ہیں جمالِ تہذیب
کم نہیں مردمکِ چشم سے کچھ — رُخِ انسان پہ خالِ تہذیب
آج کل ہم میں اگر سچ پوچھو — شکلِ عنقا ہے مثالِ تہذیب
رُخ پہ کرتا ہے متانت پیدا — دل میں آتے ہی خیالِ تہذیب
قوم کا اپنے نہ گھٹتا وہ عروج — ہو نہ جاتا جو زوالِ تہذیب
جامِ جم سے ہے کہیں پُر تمکیں — بزمِ خُلقت میں سفالِ تہذیب
مردہ قوموں کے لئے آبِ حیات — بنتا جاتا ہے زلالِ تہذیب

بدر بن جائے گا چندرے میں حبیب
حق نے چاہا تو ہلالِ تہذیب

اُن غزلوں کے سوا جن میں سوائے نصیحت آمیز رنگ کے دوسرا رنگ آنے نہیں پایا جا بجا اس مجموعہ میں ایسی غزلیں ملتی ہیں جن میں اکثر اشعار میں مفید خیالات کا پہلو مدّ نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:۔

مانگوں خدا سے اپنے نہ کیوں نفسِ مطمئن — بس اِک یہی مقام ہے بیم و رجا کے بعد
ہوتی ہے جس طرح شبِ دیجور کی سحر — آتا ہے روزِ عید یوں نہیں ہر بلا کے بعد
ہوا التیام زخمِ زباں کا محال ہے — کیا لُطفِ معذرت سخنِ ناسزا کے بعد
بد ہیں معاملات میں در پردہ ساز شیں — یارانِ سینہ صاف سے عہدِ وفا کے بعد
سمجھو بنا رہا ہے خطاکار کو دلیر — راضی جو درگذر پہ نہ ہو التجا کے بعد

انداز ساز دہر ہے حیرت فزا حبیبؔ — دلچسپ تر ہے یاں جو صدا ہے صدا کے بعد

ایک اور غزل ہیں نہایت مشکل زمین میں مفید مضمون آفرینی کا شوق پیدا کیا گیا ہے:-

خود ہیں جو سچے وہ کر لیتے ہیں باور جھوٹ سچ — روح کی قوت سے ہو جاتا ہے اکثر جھوٹ سچ
غیر ممکن ہے کہ فرق آئے محبت میں مری — اس میں کیا بس کوئی کہدے تم سے کچھ گر جھوٹ سچ
اہلِ دنیا کو نہیں مرغوب خالص راستی — شاہدِ اغراض کو گویا ہے زیور جھوٹ سچ
پڑ گیا افواہ میں سچ بھی تو ہو جاتا ہے جھوٹ — یہ بھی دیکھا ہے کہ ہو جاتا ہے اکثر جھوٹ سچ

ہے مبصر کو حبیبؔ اُس وقت مشکل امتیاز
خلق میں ہو جائے شائع جبکہ ملکر جھوٹ سچ

اسی غزل کے نیچے ہی یہ دو تین شعر چھپتے ہوئے نظر آتے ہیں:-

کیوں نہ آ جائے فرومایہ کو غصہ جلدی — آگ لگتے ہی بھڑکتی ہے خس و خار کی آنچ
حرص کے جوش میں اچھا نہیں لڑنا بھڑنا — خاک اقوام کو کر دیتی ہے پیکار کی آنچ
ہیں کثافت سے بَری جنکے طبائع ہیں لطیف — نہ دھواں ہے نہ کہیں آتشِ گلزار کی آنچ

غرض کہاں تک حبیبؔ کے گلزارِ سخن کی گلچینی کی جائے۔ صاحبانِ ذوق خود پڑھیں اور اپنی اپنی پسند کے اشعار چن لیں۔ ہاں اتنا جتا دینا ضروری ہے کہ جا بجا تغزل پر بھی قادر ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں اور کیا بیساختہ لکھتے ہیں:-

اتفاقاً اُن کا آنا ہو گیا — دل کے جانے کا بہانا ہو گیا
تھا سبک رَو توسنِ عمرِ رواں — عشقِ کاکل تازیانہ ہو گیا
کہتے ہیں سُن سُنکے یاں پھر کیا ہوا — حال میرا اک فسانہ ہو گیا
تم جو آئے سب کو حیرت ہو گئی — میرا گھر آئینہ خانہ ہو گیا
دل بہت گذرے بدلنا چاہیے — جامۂ ہستی پُرانا ہو گیا

پوچھتے کیا ہو کہاں ہے اب حبیبؔ
مر کے بھی اُس کو زمانہ ہو گیا

تصوف کا مذاق گو اکثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ مگر بعض اشعار میں کمال کو پہنچ گیا ہے:-

مبدا قدرت سے ہے حسنِ صورت آرائے ازل — اُس نے جب آئینہ دیکھا اک حسیں پیدا ہوا
کیا عجب باہم ہو اگر ارتباطِ جسم و روح — درد سے پہلے مرا قلبِ حزیں پیدا ہوا

غرض مختلف مذاق کے اشعار کو جو اس دیوان میں ملتے ہیں پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک مقطع میں جو حبیب نے سخن گسترانہ تعریف اپنی کی ہے۔ وہ حقیقت میں اُس کا مستحق ہے اور وہ تعریف یہ ہے :-

دانائے فن سنینگے تو فرمائینگے حبیب
پختہ کلام ہے کسی نازک خیال کا

اس کے سوا بالکل جدید طرز میں مسلسل مضامین نظم لکھنے میں بھی سید محمدؐ کاظم صاحب دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔ اور اس طرز کے کلام کا ایک نمونہ جو اُنہوں نے مخزن کے واسطے خاص طور پر لکھا ہے۔ آج حصۂ نظم میں درج کیا جاتا ہو۔ شائقین پڑھیں اور داد دیں۔ اُن سے اختلاف اگر ہم کو ہے تو صرف ایک بات میں اور وہ یہ کہ شاعرانہ رقابت کے جوش میں اُنہوں نے بعض معاصرین کی طرف ایسے کھلے اشارے حقارت آمیز کئے ہیں۔ جو پایۂ متانت سے گرے ہوئے ہیں۔ رقابت شعرا کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ اور ایشیائی شعرا میں بالخصوص بہت کم اس سے خالی ملیں گے۔ ہندوستان میں یہ اور بھی ترقی کر گئی ہے۔ اور بعض دفعہ شاعروں کی باہمی چشمک ناظرین کے لئے لطفِ خاص رکھتی ہے۔ بشرطیکہ نزاکت کے ساتھ چوٹ کی جائے۔ کہیں کہیں اس قسم کے اشعار دیوان حبیب میں بھی ہیں۔ جن کیلئے خواہ نخواہ داد زبان پر آتی ہے۔ مگر جہاں بہت کھلے اشارے آتے ہیں۔ وہ صحیح مذاق کو ضرور کھٹکتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اگر طبع ثانی کی نوبت آئے تو ایسے اشعار نکال دیئے جائیں۔ کیونکہ ان کی موجودگی سے اُس نصیحت آمیز کلام کی تاثیر میں فرق آنے کا ڈر ہے۔ جس سے اُن کے دیوان کی بہت سی غزلیں مملو ہیں۔

ہیر و رانجھا

سال گذشتہ کے پہلے پرچہ کے پہلے مضمون میں بناوٹی خیالات کے رواج پر افسوس کرتے ہوئے ہم نے یہ فقرہ لکھا تھا "اس سے بڑھ کر تصنع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہل ملک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہیں ہوا جن کی باہمی محبت کے قصوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں"۔ اس سال کے پہلے نمبر میں ہم اپنے ملک کے دو جانبازانِ عشق کا ذکر کیا چاہتے ہیں۔ اور ایک ایسے شاعر کا نام لیا چاہتے ہیں جس نے ان کے حسن و عشق کی داستان کو دوام کا خلعت بخش دیا ہے۔ افسوس ہے تو اتنا کہ اس شاعر نے زبان ایسی اختیار کی جو بدقسمتی سے علمی زبان نہیں ہے۔ ورنہ سرزمین پنجاب کا یہ دلفریب قصہ شہرت کے پر لگا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گیا ہوتا۔ اور لوگ لیلیٰ اور مجنوں اور شیریں اور فرہاد کے قصوں سے زیادہ دل لگا کر اسے پڑھ رہے ہوتے پنجاب میں تو اب بھی کوئی آدمی ایسا بے خبر نہ ہو گا۔ جو علاقہ جھنگ سیال کی مشہور جمیلہ ہیر اور تخت ہزارہ کے چودھری میاں رانجھا کے نام سے ناواقف ہو۔ مگر چونکہ اُن کی محبت کے افسانے صوبہ پنجاب کی ٹھیٹھ بولی میں ہی منظوم ہوئے ہیں اس لئے وہ اُنہی حدود کے اندر محدود رہ گئے۔ اور اُس حصۂ ملک میں جسے ہندوستان کہتے ہیں اور جہاں زبانِ اُردو بولی جاتی ہے۔ ان کا چرچا نہیں ہوا۔ ہمارے ناظرین میں ایک کثیر تعداد ایک طرف ممالک مغربی و شمالی و اودھ اور بہار کے رہنے والوں کی ہے۔ اور دوسری طرف حیدرآباد دکن کے باشندگان کی۔ اور ان میں سے اکثر کے لئے یہ مشہور نام بالکل نئے ہونگے۔ اسی خیال سے مناسب معلوم ہوا کہ ایک مختصر سا خاکہ اس قصہ کا لکھ دیا جائے۔ تاکہ اُن اصحاب کو جنہوں نے پنجابی کُتب قصص کو زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ زیادہ مفصل حالات لکھنے کی ترغیب ہو اور

رفتہ رفتہ ہمارے اُن دوستوں کے پاس جو زبانِ پنجابی سے ناآشنا ہیں۔ اتنا کافی ذخیرۂ معلومات کا پیدا ہو جائے کہ وہ محبّت کی مثالوں میں ہیر اور رانجھے کو بھی پیش کرنے لگیں اور اُنہیں یہ نام غیر مانوس نہ معلوم ہوں۔ اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ نام اُن کی زبان پر چڑھ نہیں سکتے۔

یوں تو پنجابی شاعری کا جزوِ اعظم ہیر اور رانجھے کے معاملہ کی طرف اشارات سے پُر ہے۔ مگر دو مشہور پنجابی شاعروں نے اپنی خداداد ذہانت اور لیاقت کو صرف اسی قصّے کے نظم کرنے پر صرف کیا ہے۔ اور اُن کی مدت العمر کی کمائی اصل میں وہی کتابیں ہیں جو ہیر وارث شاہ اور ہیر فضل شاہ کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ دونوں سخنور اپنی اپنی جگہ صاحبِ کمال گذرے ہیں۔ مگر آج ہمیں صرف اُن میں پہلے کے ساتھ سروکار ہے۔ وارث شاہ یا جیسا کہ عوام میں پکارا جاتا ہے "وارے شاہ" ایک فقیر منش اہلِ دل گذرا ہے۔ جس کا کلام جوہر قبول ساتھ لیکر آیا تھا اور جسے ہر دلعزیزی حاصل کرنے میں اتنی کامیابی ہوئی ہے۔ کہ اُس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی "وارے شاہ" کا کلام پنجاب کی دیہاتی زندگی کا ایک جزو ضروری ہے۔ کسی گاؤں میں آپ جائیں۔ آپ "وارے شاہ" کے پڑھنے والے اور سُننے والے پائینگے کہیں دھوپ کے وقت آدھے دن کی سر توڑ محنت کے بعد کسی درختوں کے جھنڈ کے تلے کسی کنوئیں کے قریب چند دیہاتی جمع ہیں۔ اپنی اپنی روٹی کھا چکے ہیں۔ ذرا حقّہ پینا اور سستانا چاہتے ہیں۔ کہ اُن میں سے ایک ہیر وارث شاہ کے ابیات گانے لگا۔ دم بھر میں سب کے سب حلقہ باندھ لیتے ہیں اور لیٹنا اور سونا چھوڑ کر ہر ایک ہمہ تن گوش بن جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اطمینان کا جلسہ اُس وقت ہوتا ہے جب رات کو کام کاج سے نبٹ کر گاؤں والے شاملات دہ کے میدان میں یا کسی فقیر کے تکیئے یا ٹھاکر دوارہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اور ایک خوش الحان آدمی سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہیر پڑھ کر سُنائے۔ بہت سے پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کو کتاب کا بہت سا حصّہ برزبان ہے۔ اُن کا پڑھنا زیادہ پُر تاثیر ہوتا ہے۔

بعض کتاب کھول کر پڑھتے ہیں اور سننے والے اس خوشی اور اس توجہ سے سنتے ہیں کہ حیرت کی تصویریں نظر آتے ہیں۔ اس کے پڑھنے کے مختلف لہجے ایجاد کیے گئے ہیں اور ہر شخص اپنی خاص لے میں پڑھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی زبان نہ بھی سمجھتا ہو۔ جب بھی ایک قسم کی تاثیر آواز کی اپنے قلب پر پاتا ہے۔ سالہا سال سے یہ قصہ اس طرح دہرایا جا رہا ہے۔ بوڑھے جوان سب اسے سنتے ہیں۔ اور قصہ میں یا زبان میں یا طرز بیان میں کچھ ایسی دلچسپی ہے کہ اُکتاتے نہیں۔ اس خاصیت میں "وارث شاہ" دنیا کے مشہور شعرا سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور اگر پنجاب میں سعدی یا شیکسپیئر سے کسی کو تشبیہ دینی ہو۔ تو وارث شاہ سے زیادہ مستحق اس تشبیہ کا کوئی نہیں مل سکتا۔ گو بہت سے اسباب سے وارث شاہ اُس رتبہ عالی کو جو بزرگانِ موصوف کو حاصل ہے کبھی نہ پہنچ سکے۔ تصانیف کی رنگارنگی کے اُڑتے ہوئے بھاؤ کے اعتبار سے تو سعدی اور شیکسپیئر جیسے ناموران جہاں ایسے بلند پایہ پر ہیں۔ کہ اور مصنفین کو اُن سے نسبت دینا گستاخی ہے۔ مگر اپنی حد اثر میں وارث شاہ کئی باتوں میں اُن سے مشابہ ہے۔ وارث شاہ اپنی محدود اور تا حال اَن گھڑ زبان کا ویسا ہی اُستاد ہے۔ جیسا سعدی فارسی جیسی شیریں اور شیکسپیئر انگریزی جیسی وسیع زبان کا الفاظ اور لغات کی کثرت وارث شاہ میں اپنی زبان کی بساط کے موافق ویسی ہی ہے جیسی اُن مسلم الثبوت اُستادوں میں۔ محاورات اور ضرب المثلیں وارث شاہ نے بھی اس کثرت سے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ کہ اُن کے مجموعہ سے پنجابی زبان کی ایک خاصی کتاب الامثال تیار ہو سکتی ہے۔ مختلف طبقوں اور مختلف قماش کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جس خوبی کے ساتھ وارث شاہ نے اسی قماش کے لوگوں کی زبان اُڑائی۔ وہ اسی کا حصہ ہے اور اس کی نظیر شیکسپیئر میں ملتی ہے۔ مُلّا کی طرف سے جو گفتگو ہے اُس میں مسجد کی مفت کی روٹیاں صاف جلوہ گر ہیں رانجھے کی گفتگو میں سادگی۔ ناتجربہ کاری چودھری زادہ ہونے کا گھمنڈ عشق کی چوٹ اور گداز سب ملکر پرتو افگن ہیں۔ ہیر کی

باتیں دلفریبی کے ساتھ الڑھ پن کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ ہیر کی نند کی باتیں، خوشی اور شرارت کا پہلو برابر نباہتی چلی جاتی ہیں۔ کہیں وید اپنی دوائیوں کے خواص بتا رہا ہے اور کہیں جوگی مختلف منتھوں کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ ایک طرف کوئی اہل اللہ رموزِ معرفت شناتا جاتا ہے تو دوسری طرف کوئی خود غرض فقیر دلقِ طمع کی آڑ میں دنیا طلبوں کو شکار کرتا ہے۔ ملاح ملّاحوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔ اور بازاری مردوں اور عورتوں کے الفاظ اور خیالات کی سچّی تصویریں موجود ہیں۔ یہ مرقع بے عیب ہوتا اگر اس میں بعض جگہ فحش عبارتیں نہ آجاتیں۔ مگر ہر زمانہ کا اپنا مذاق ہوتا ہے۔ جیسے سعدی کی کتابوں میں بعض فقرات ایسے ہیں۔ جن کو لوگ آجکل نہیں سُن سکتے۔ یا جیسے شیکسپیئر کے کلام کے خلاصے مدارس میں پڑھائے جانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ نفیس مذاق کے اطمینان کے واسطے وارث شاہ کی ہیر کا بھی ایک ایسا ایڈیشن تیار ہونا چاہئے جس میں سے معیوب فقرات نکال ڈالے جائیں اور جو چھپائی کے نقصوں اور لکھائی کے سُقموں سے مبرا ہو۔ بلکہ اگر کسی سے ہو سکے تو اُس کے بعض الفاظ کا فرہنگ اور اُس کے بعض اشعار پر حاشیے لکھے تو پڑھے لکھے آدمیوں میں اس بیش بہا کتاب کے مقبول ہونے کی بہت زیادہ توقع ہو سکتی ہے۔ اور یہ کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے استحقاق رکھتی ہے کہ اس کے واسطے ایسی محنت برداشت کی جائے۔

اصل قصّے کی طرف آئیں تو روایت یہ ہے کہ رانجھا ایک پنجابی نوجوان ہے جو اپنے گاؤں کے چودھری کا بیٹا۔ مردانہ حُسن میں اپنے اقران و امثال میں ممتاز اور نشۂ جوانی میں سرمست ہے۔ ایک دن اپنی بھاوجوں سے اس کی بحث ہو پڑتی ہے وہ کہتی ہیں کہ تو کسی سے شادی کر اور وہ کہتا ہے کہ میں گاؤں میں اپنے مذاق کے موافق حسین عورت نہیں پاتا۔ اس پر بگڑ کر وہ بولتی ہیں کہ دیکھیں تو کہاں سے کوہ قاف کی پری لے آتا ہے۔ وہ غصّہ کھا کر گھر سے نکل پڑتا ہے۔ اور ہیر کی شہرتِ حُسن اسے جھنگ سیال کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ ریلوں اور سڑکوں سے پہلے کے زمانے میں

پنجاب میں ایک ضلع سے دوسرے ضلع تک کا سفر بھی بیشمار مصائب سے پُر تھا ابتدا ہی میں بیسیوں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ بہت دقتوں کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچکر ہیر کے والد کے گھر شبانی کی خدمت لیتا ہے۔ صرف اس امید پر کہ اس تعلق کی بدولت ہیر سے دوچار ہونے کے موقعے ملتے رہیں گے۔ انہی ایام میں ہیر کے دل میں بھی اُس کا گھر ہو جاتا ہے۔ اور ایسی محبت کا بیج بویا جاتا ہے۔ جو آخر بڑھتا پھولتا اور پھلتا ہے۔ اور زمانہ کی نامساعد ہوائیں اُس کو اُکھیڑ نہیں سکتیں جب ہیر کے والدین کو اس حالت سے آگاہی ہوتی ہے تو وہ رانجھے کو معمولی حیثیت کا آدمی سمجھکر اور اپنے درجہ سے کمتر جان کر اس خیال کو کہ ہیر اور رانجھے کی شادی ہو جائے پسند نہیں کرتے اور عشق کی راہزنی کرکے ہیر کی شادی کسی اور سے کر دیتے ہیں اور ہیر کو جلد سُسرال بھجدیتے ہیں۔ اب رانجھے کو کیا پڑی تھی کہ گلہ بانی کرتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ فقیر ہو جاتا ہے اور فقیری رنگ میں اُس مقام پر پہنچتا ہے جہاں ہیر کی سُسرال تھی۔ وہاں دیہات کی سادہ اور بے پردہ زندگی کچھ عرصہ کے بعد اس بات کا امکان پیدا کراتی ہو کہ رانجھا ہیر کے درشن کرلے۔ ہیر جوگی کی کرامتوں کا ذکر سُن کر معتقدانہ بھیس میں جوگی کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے۔ مگر جوگی کی باتوں سے چوٹ کھائے دل کا درد بے اختیار ٹپک پڑتا ہے اور حالِ دل چھپا نہیں رہتا۔ اور آخر یہ تدبیر بھی ناکام رہتی ہے۔ اور بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں مگر کوئی کارگر نہیں ہوتی۔ اسی کشمکش میں جانبین کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ہیر کے والدین اُسے زہر دیکر مار ڈالتے ہیں اور گویا رانجھا بے زہر ہی مرتا ہے آخر دونوں داغ حسرت لیکر قبر میں جا سوتے ہیں۔ صرف اُن کی مستقل اور بے لاگ محبت کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ اُن کا نام لوگوں کی زبانوں پر رہ جاتا ہے۔ اس قصہ میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبۂ محبت کے جو ایثار اور قربانیاں بیان ہوئی ہیں اُن میں خلافِ قیاس باتیں یا غیر ممکن کرشمے نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے واقعات ہیں جو ایسی حالت میں انسان سے سرزد ہونے ممکن اور قرینِ قیاس ہیں۔ گویا یہ قصہ نیچرل رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور یہ ایک باعثِ امتیاز ایسا ہے کہ جس پر اس کے مصنف کو

بجا ناز ہو سکتا ہے۔ کاش اردو زبان کا کوئی نامور مصنف اس قصہ کو وارث شاہ کے خیالات کے ساتھ اردو میں منتقل کرلے۔ مگر اس کے واسطے پنجابی اچھی طرح سمجھنا مقدم ہے۔ اور یہ وہ شوق ہے جو زبان اردو کے مضمون نگاروں اور شعرا نے۔ خواہ وہ پنجاب میں ہوں یا صوبجات متحدہ اور اودھ میں۔ آجتک کیا ہی نہیں۔ اغلب ہے کہ کوئی زمانہ آئیگا کہ وارث شاہ کا کلام تعلیم یافتہ لوگوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگیگا اور اُسے نہ محض تفریحاً پڑھا جائیگا۔ بلکہ اُس کی تصنیف میں نکات علمی ڈھونڈ ینگے۔ اور دانش اور ظرافت کے بیشمار جواہرات جو اُس کے اوراق میں دبے ہوئے ہیں سمیٹینگے اور اس طرح اُس زمانہ کی ابتدا ہوگی۔ جس میں پنجابی زبان علمی زبانوں کے زمرہ میں داخل ہوگی۔ اور وارث شاہ کی تصنیف کے ماہِ تاباں کے گرد اور بیسیوں خاص خاص اختر چمکینگے۔ اعلیٰ خیالات کے لکھنے والے اور قدرتی جذبات کی تصویریں کھینچنے والے مصنفوں کی پنجابی میں کمی نہیں۔ مگر ان میں کئی ایسے ہیں جن کا کلام بعض آوارہ گرد فقیروں کی زبان پر ہے۔ کہیں قلمبند نہیں ہوا۔ بعض ایسے ہیں جن کی شاعری عوام کے مقبول گیتوں میں چھپی ہوئی ہے۔ نہ کوئی اُن گیتوں کو جمع کرتا ہے اور نہ سوائے عیش و طرب کے موقعوں کے اُن کو سُنتا ہے۔ حالانکہ اہلِ پنجاب کی زندہ دلی کا راز اور اُن کی مردانگی کا جلوہ اُن کے ان قومی گیتوں میں نظر آتا ہے +

کیا رسمِ ستی بند ہو گئی ہے؟

در محبت چوں زنِ ہندی کسے مردانہ نیست سوختن بر شمع مردہ کارِ ہر پروانہ نیست

ہندوستان کی درسی کتابوں میں اکثر زور کے ساتھ اُس زمانہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب سایۂ برطانیہ نے سرزمین ہند سے رسم ستی کی بیخ کنی کردی۔ مُردہ خاوند کی لاش کے ساتھ بیوی کا جل مرنا قانوناً جرم قرار دیدیا ہے۔ اور اس فعل کی امداد اور اعانت کو بھی جرم ٹھہرایا۔ لیکن یہ معلوم نہیں کتنے لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ رسم ستی

فی الحقیقت مسدود بھی ہوگئی یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ظاہری جل مرنے کا تعلق تھا وہ تو رُک گیا ہے۔ مگر ایک اور جل مرنا ہے جو ابھی جاری ہے اور جس کے انسداد کی کوئی صورت جلدی بنتی نظر نہیں آتی۔ اور ہندوستان کی عورتوں کو اس جلا کر راکھ کر دینے والی آگ سے بچانے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ستی بذاتِ خود ایسی بُری رسم نہ تھی کہ اُسے جرم کہا جا سکے۔ اُس کو معیوب اس بات نے بنا دیا۔ کہ عورتیں جلنے پر مجبور کی جانے لگیں۔ ورنہ باختیارِ خود جوشِ محبت کے اثر سے آگ میں کود پڑنا مجنونانہ حرکت ہو تو ہو محض وحشیانہ حرکت نہ تھی۔ بلکہ انسانی طبیعت کے ایک زبردست جذبہ کا پُرزور ظہور تھا۔ ہندوستان کی بےشمار ستی ہونے والی بیواؤں میں کئی ایسی نیک نہاد اور پاک طینت عورتیں ہونگی۔ کہ اُن کی مردانگی کی یاد میں بت سیمیں بنائے جائیں۔ شعر مندرجۂ عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایرانی شاعر کے دل پر ہندوستان کی اس رسم کا کیا اثر ہوا۔ اور اُس نے جل مرنے کو ایسا فعل قرار دیکر جو رضا و رغبت سے کیا گیا ہو۔ ستی کی کیسے خوبصورت الفاظ میں تعریف کی ہے۔ اور ہندوستان کی عورتوں کی بہادری کی کیا بیساختہ داد دی ہے۔ افسوس کہ وہ چتا میں کود کر جلنا گو ختم ہو گیا۔ مگر تمام عمر آتشِ غم پر کباب ہونا نہ گیا۔ اُس آگ میں اگر اسی فیصدی مجبوراً کودتی تھیں۔ تو یہاں نوّے فیصدی مجبوراً کُڑھ کُڑھ کر مرتی ہیں۔ اُس میں جو بیس فیصدی سچے جوش سے اپنے آپ کو قربان کرتی تھیں۔ کم از کم اُن کی داد تو ملتی تھی۔ ان کی قسمت، پر ہمارے ایرانی شاعر جیسے آنسو بہانے والے تو پیدا ہو جاتے تھے۔ اور یہاں نہ کوئی خوشی سے بقیۂ زندگی تلخ کر لینے والیوں کی داد دیتا ہے۔ نہ مجبور جل بجھنے والیوں کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ ہندوستان کے ہر گھر میں۔ اور ہر گھر میں نہیں۔ تو ہر گلی میں۔ اور ہر گلی میں نہیں تو ہر محلہ میں ایسا بھاڑ موجود ہے۔ جس میں کوئی باعصمت خاتون بیگناہ جل رہی ہے۔ مگر غضب یہ ہے کہ دھواں تک نہیں اُٹھتا۔ اور اگر اُٹھتا ہے تو کوئی دیکھتا نہیں۔ اور اگر کوئی دیکھتا ہے تو آگ بجھاتا نہیں۔ وہ جلنا ایک آدھ گھنٹے کے لئے تھا۔ یہ جلنا ایک آدھ عمر کے لئے ہوتا ہے

اُس جلنے پر لوگ کفِ افسوس ملتے تھے۔ اس جلنے کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی اُس جلنے کے بعد راکھ قدر و منزلت سے اُٹھا کر دریائے رواں کے صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی میں بہا دیتے تھے اور اس راکھ کے ذرّوں کو پانی برسوں اپنی ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ یہاں راکھ ہونے کی نوبت آنے سے پہلے کچھ ایسے سامان ہوتے ہیں جو آگ پر تیل کا کام دیں۔ اور تیل بھی وہ تیل جو چپکے چپکے آتش کو تیز کرتا جائے۔ مگر بھڑکنے نہ دے۔ یہ سب امتیاز چھوڑ کر اُس ستی اور آجکل کی ستی میں بڑا فرق یہ ہو کہ وہ قربانی خاوند کے مرنے کے بعد کرنی پڑتی تھی اور اس قربانی میں کئی ایسی نیکبخت عورتیں بھی ہیں جو خاوندوں کے جیتے جی چتا پر ہیں۔ شاعر نے فی الواقع بڑا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ اور نہایت نفیس پیرایہ میں زنانِ ہند کو قربانیٔ نفس کے بارہ میں دوسری عورتوں پر ترجیح دی ہے۔ مانا کہ عشق میں بڑی قوت ہے اور عورت خاوند کی محبت میں یوں جان دیدے جیسے پروانہ شمع پر نثار ہو کر مر جاتا ہے۔ اور ایسی مثالیں ہر ملک میں نظر آئیں۔ مگر ایسا پروانہ اور کہاں ملتا ہے جو بجھی شمع کے گرد پھرے۔ اور بجھی شمع پر فدا ہو جائے۔ یہاں بجھی شمع پر فدا ہونے والیاں آج بھی موجود ہیں۔ ایک تو وہ جو خاوند کے مرنے سے حسب رواج ملک زندہ درگور ہیں ان کی حالت کی پُر درد کہانی چھیڑنے کے قابل نہیں۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کو چھوڑ کر ذرا اُن کی حالت پر نظر ڈالئے۔ جو خاوندوں کے جیتے جاگتے مصیبت میں ہیں۔ کئی گھر ایسے ملیں گے جہاں خاوند کے دل میں محبت کی آگ یا تو جہانتک بیوی کا تعلق ہے کبھی بھڑکی نہیں یا تھی تو بجھ چکی ہے۔ مگر بیوی کے دل کو ٹٹولو تو اسی بجھے شعلے کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ جو اُلفت پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ جو خدمت کا شوق اوّل میں تھا وہ آخر تک پایا جاتا ہے۔ جو ایثار آغاز میں تھا وہی انجام تک ہے جو وفا بچپن میں سیکھی تھی وہ ہاتھ سے نہیں گئی۔ اندر ہی اندر تن من جلا دیا۔ مگر ظلم پر اُف تک نہیں کی۔ یہ وہ ستی ہے جس میں زنانِ ہند ہی آجتک ستی سے بڑھ کر مردانگی دکھا رہی ہیں گو آج اس کی بہادری کی قدر مفقود ہے۔ مگر یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صفتِ خاص

فی الحقیقت مسدود بھی ہو گئی یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ظاہری جل مرنے کا تعلق تھا وہ تو رُک گیا ہے۔ مگر ایک اور جل مرنا ہے جو ابھی جاری ہے اور جس کے انسداد کی کوئی صورت جلدی بنتی نظر نہیں آتی۔ اور ہندوستان کی عورتوں کو اس جلا کر راکھ کر دینے والی آگ سے بچانے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ستی بذاتِ خود ایسی بری رسم نہ تھی کہ اُسے جرم کہا جا سکے۔ اُس کو معیوب اس بات نے بنا دیا۔ کہ عورتیں جلنے پر مجبور کی جانے لگیں۔ ورنہ باختیارِ خود جوشِ محبت کے اثر سے آگ میں کود پڑنا مجنونانہ حرکت ہو تو ہو محض وحشیانہ حرکت نہ تھی۔ بلکہ انسانی طبیعت کے ایک زبردست جذبہ کا پُر زور ظہور تھا۔ ہندوستان کی بیشمار ستی ہونے والی بیواؤں میں کئی ایسی نیک نہاد اور پاک طینت عورتیں ہونگی۔ کہ اُن کی مردانگی کی یاد میں بت سبیں بنائے جائیں۔ شعر مندرجۂ عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایرانی شاعر کے دل پر ہندوستان کی اس رسم کا کیا اثر ہوا۔ اور اُس نے جل مرنے کو ایسا فعل قرار دیکر جو رضا و رغبت سے کیا گیا ہو۔ ستی کی کیسے خوبصورت الفاظ میں تعریف کی ہے۔ اور ہندوستان کی عورتوں کی بہادری کی کیا بیساختہ داد دی ہے۔ افسوس کہ وہ چتا میں کود کر جلنا گو ختم ہو گیا۔ مگر تمام عمر آتشِ غم پر کباب ہونا نہ گیا۔ اُس آگ میں اگر اسی فیصدی مجبوراً کودتی تھیں۔ تو یہاں نوّے فیصدی مجبوراً کُڑھ کُڑھ کر مرتی ہیں۔ اُس میں جو بیس فیصدی سچے جوش سے اپنے آپ کو قربان کرتی تھیں۔ کم از کم اُن کی داد تو ملتی تھی۔ ان کی قسمت، پر ہمارے ایرانی شاعر جیسے آنسو بہانے والے تو پیدا ہو جاتے تھے۔ اور یہاں نہ کوئی خوشی سے بقیۂ زندگی تلخ کر لینے والیوں کی داد دیتا ہے۔ نہ مجبور جل بجھنے والیوں کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ ہندوستان کے ہر گھر میں۔ اور ہر گھر میں نہیں۔ تو ہر گلی میں۔ اور ہر گلی میں نہیں تو ہر محلہ میں ایسا بھاڑ موجود ہے۔ جس میں کوئی باعصمت خاتون بیگناہ جل رہی ہے۔ مگر غضب یہ ہے کہ دھواں تک نہیں اُٹھتا۔ اور اگر اُٹھتا ہے تو کوئی دیکھتا نہیں۔ اور اگر کوئی دیکھتا ہے تو آگ بجھاتا نہیں۔ وہ جلنا ایک آدھ گھنٹے کے لئے تھا۔ یہ جلنا ایک آدھ عمر کے لئے ہوتا ہے

اُس جلنے پر لوگ کفِ افسوس ملتے تھے۔ اس جلنے کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی اُس جلنے کے بعد راکھ قدر و منزلت سے اُٹھا کر دریائے رواں کے صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی میں بہا دیتے تھے اور اس راکھ کے ذرّوں کو پانی برسوں اپنی ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ یہاں راکھ ہونے کی نوبت آنے سے پہلے کچھ ایسے سامان ہوتے ہیں جو آگ پر تیل کا کام دیں۔ اور تیل بھی وہ تیل جو چپکے چپکے آتش کو تیز کرتا جائے۔ مگر بھڑکنے نہ دے۔ یہ سب امتیاز چھوڑ کر اُس ستی اور آجکل کی ستی میں بڑا فرق یہ ہو کہ وہ قربانی خاوند کے مرنے کے بعد کرنی پڑتی تھی اور اس قربانی میں کئی ایسی نیکبخت عورتیں بھی ہیں جو خاوندوں کے جیتے جی چتا پر ہیں۔ شاعر نے فی الواقع بڑا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ اور نہایت نفیس پیرایہ میں زنانِ ہند کو قربانیٔ نفس کے بارہ میں دوسری عورتوں پر ترجیح دی ہے۔ مانا کہ عشق میں بڑی قوت ہے اور عورت خاوند کی محبت میں یوں جان دیدے جیسے پروانہ شمع پر نثار ہو کر مر جاتا ہے۔ اور ایسی مثالیں ہر ملک میں نظر آئیں۔ مگر ایسا پروانہ اور کہاں ملتا ہے جو بجھی شمع کے گرد پھرے۔ اور بجھی شمع پر فدا ہو جائے۔ یہاں بجھی شمع پر فدا ہونے والیاں آج بھی موجود ہیں۔ ایک تو وہ جو خاوند کے مرنے سے حسب رواج ملک زندہ درگور ہیں ان کی حالت کی پُر درد کہانی چھیڑنے کے قابل نہیں۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کو چھوڑ کر ذرا اُن کی حالت پر نظر ڈالئے۔ جو خاوندوں کے جیتے جاگتے مصیبت میں ہیں۔ کئی گھر ایسے ملیں گے جہاں خاوند کے دل میں محبت کی آگ یا تو جہانتک بیوی کا تعلق ہے کبھی بھڑکی نہیں یا تھی تو بجھ چکی ہے۔ مگر بیوی کے دل کو ٹٹولو تو اسی بجھے شعلے کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ جو اُلفت پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ جو خدمت کا شوق اوّل میں تھا وہ آخر تک پایا جاتا ہے۔ جو ایثار آغاز میں تھا وہی انجام تک ہے جو وفا بچپن میں سیکھی تھی وہ ہاتھ سے نہیں گئی۔ اندر ہی اندر تن من جلا دیا۔ مگر ظلم پر اُف تک نہیں کی۔ یہ وہ ستی ہے جس میں زنانِ ہند ہی آجتک ستی سے بڑھ کر مردانگی دکھا رہی ہو گو آج اس کی بہادری کی قدر مفقود ہے۔ مگر یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صفتِ خاص

میں دنیا بھر کی عورتوں میں ہندی عورت اپنا جواب نہیں رکھتی +

نقش ارژنگ

اس گئے گذرے زمانہ میں بھی خاکِ پاک ہند سے ایسے ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوتے ہیں کہ عقل اُن کے کام کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں تو اہلِ کمال کو ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ناقدردانیٔ زمانہ کی شکایت رہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ شکایت زیادہ زور سے پائی جاتی ہے۔ اور ان دنوں بڑھ رہی ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ فنونِ لطیفہ کے کمال کی قدر اس ملک میں اب بہت ہی کم رہ گئی ہے فنونِ لطیفہ کی قدر کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ملک میں روپیہ کا مینہ برس رہا ہو۔ اور سونا چاندی کسی کی نظر میں کچھ مال نہ ہو۔ ایسی صورت میں خواہ مذاق قدردانی نہ بھی بڑھا ہوا ہو۔ ممکن ہے کہ ملک کے امرا طلبِ شہرت و ناموری میں اہلِ فن کو انعام و اکرام دیتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ ملک کا تموّل چاہے معمولی درجہ کا ہو۔ مگر ملک میں مذاقِ فن اس درجہ پر ہو۔ کہ لوگ جی جامہ بیچ کر بھی اہلِ فن پر نثار کریں۔ ہندوستان میں نہ تو تموّل کی وہ حالت ہے اور نہ مذاق کے پیدا ہونے اور بڑھنے کے سامان۔ پھر فنونِ لطیفہ بڑھیں تو کیونکر بڑھیں۔ ہر قبرستان میں کئی خفتگانِ خاک ایسے ہیں جو مشاہیرِ زمانہ میں ہوتے۔ اگر انہیں حالات مساعد مل جاتے۔ مگر چونکہ زمانہ نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ زمانہ سے بیزار ہو کر کنجِ لحد میں ہم آغوشِ حسرت و حرماں ہو گئے ہیں۔ اُس کثیر تعداد کے علاوہ جو اس طرح دنیا میں آئے اور غنچۂ ناشگفتہ کی طرح بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ کئی اہلِ کمال ایسے بھی ہیں جن کی اہمیت کی رنگینی گل کھلاتی ہو گلوں میں رنگ بھی ہوتا ہے اور بو بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ رنگ کسی قدردان کی آنکھ کو تازگی نہیں بخشتا اور وہ بو کسی ذی فہم دماغ کو معطر نہیں کرتی۔ گل کھلے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں۔ تختۂ گلاب مہک رہا ہے۔ اور کوئی خوشبو لینے والا نہیں۔ ایسے

ایسے اہلِ کمال اس پریشان حال اور معتوبِ روزگار دیار کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اور ان کی حالت بالعموم ایسی ہے کہ بے اختیار فنِ شعر کے ایک اُستاد کا یہ پُر درد شعر زبان پر آتا ہے :۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال۔ افسوس ہے
اے کمال! افسوس ہے۔ تجھ پر کمال افسوس ہے

حیدر آباد دکن باوجود اُس شہرت کے جو قدردانیٔ اہلِ فن میں اسے حاصل ہے اور بجا حاصل ہے۔ کئی ایسے آشفتہ حالوں کا مخزن ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سرکار نظام نے (خدا اس سلطنت کو ہمیشہ قایم رکھے) عباسیوں کی فیاضی اور قدردانیٔ علم و ہنر کی شہرت کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور کئی باکمال اس سرکار کی توسّل سے کامیاب ہوئے ہیں۔ ورنہ مایوسی اُن کے زورِ طبیعت کو بجھا دیتی۔ اور وہ کئی اپنے جیسے طبّاع مگر بدقسمت آدمیوں کی طرح کنجِ گمنامی میں پڑے رہتے۔ مگر یہ بھی مجبوراً کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہیں بہت لوگ ایسے ہیں جو یا تو نگاہِ لطفِ سرکار سے محروم رہے ہیں یا اگر نگاہ اُن پر پڑی بھی ہے تو ادھوری پڑی ہے۔ اور اُن پر وہ عنایات نہیں ہوئیں۔ جو اُن کے کمال کے متناسب ہوں۔ یا جن سے وہ اپنے فکرِ معاش سے مستغنی ہو کر پوری توجہ سے اپنے فن کو رونق دے سکیں۔ یوں تو مختلف علوم و فنون کے جاننے والے وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اُن سب کے کمال کے نمونے اپنے اپنے رنگ میں خاص خوبیاں رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت ہمارے تصور میں فنِ خطّاطی کے کمال کا ایک نمونہ ہے جس کی ایک جھلک اتفاق سے دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ اور جس کا نقش ذہن میں اس خوبی سے جما ہے کہ مٹائے سے نہیں مٹتا۔ اور اسی کا نام ہم نے **نقشِ ارژنگ** رکھا ہے اور ہم کیا رکھیں گے۔ خود سعدی شیرازی نے اس نام پر صاد کیا ہے۔ یہ نقشِ ارژنگ ایک آئینہ ہے جس کا طول ۳ ۱/۲ فیٹ اور عرض ۲ ۱/۲ فیٹ ہے۔ اس آئینہ پر اُستاد نے ایک درخت گڑیا ہے۔ جو بحیثیت شجر ہی نہایت پیارا اور خوشنما شجر ہے۔ چوٹی سے لیکر تنہ تک ایک مکمل شجر ہونے کی شان آشکار ہے۔ کیا ڈال

کیا بات نیچر کے مطالعہ کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس شجر کے سایہ میں ایک خوبصورت عرب گھوڑا کھڑا ہے۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ یہ گھوڑا حضور نظام خلداللہ ملکہٗ کو نازی گھوڑے کی صحیح تصویر ہے۔ درخت کی ٹہنیوں پر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے پرندے بیٹھے ہیں۔ کوئی اُڑنے کو پر تول رہا ہے۔ کوئی اُڑتا ہوا آرہا ہے اور اگر سستا رہا ہے کسی کی حالت سے کلیلیں ٹپکتی ہیں۔ ایک کونے میں ایک بلی دبکی ہوئی بیٹھی ہے اور گھات میں ہے کہ کسی پرندہ پر جست کرے۔ ایک آدھ پرند کی صورت پر جس سے بلی کی آنکھ لڑ گئی ہے۔ سہمے ہوئے ہونے کے سب آثار نمایاں ہیں۔ یہ پرند تعداد میں گیارہ ہیں۔ اور ایک گوشہ میں یہ موزوں مصرع ان کی موزونیت کی داد دے رہا ہے۔ "دوحۃٌ سجع طیرھا موزون" مگر سب سے بڑی بات جو اس نقاشی میں دکھائی گئی ہے اور جو دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ درخت اور یہ جانور ملکر سالم گلستاں ہیں یعنی سعدی کی گلستاں کے سارے باب نہایت باریک اور خوشنما خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور اسی لکھائی کے الفاظ ملکر اس شجر کی شاخیں اور پتے اور ان پر بیٹھنے والے پرند بنتے ہیں اور سعدی ہی کے دو شعر زیب عنوان ہیں۔ اور اس آئینۂ حیرت انگیز کی طرف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سعدی نے انہیں اسی کے واسطے لکھا تھا وہ شعر یہ ہیں:-

گر التفات خداوندیش بیاراید | نگار خانۂ چینی و نقش ارژنگیست
امید ہست کہ روئے ملال در نکشد | ازیں سبب کہ گلستاں نہ جائے دلتنگیست

باوجود باریک ہونے کے تحریر میں یہ خوبی ہے کہ اس کا بہت سا حصہ تو بغیر کسی مصنوعی مدد کے صاف پڑھا جاتا ہے اور جو زیادہ باریک ہے وہ کلاں نما شیشہ کے ذریعہ سے پورا واضح ہو جاتا ہے۔ صاحبِ فن کے فن کا اندازہ اصلی طور پر اسی باریک حصہ سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کلاں نما شیشہ کے ذریعہ سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بظاہر نظر کام بھی نہیں کر سکتی وہاں بھی حروف کے دائرے ایسے ہی موزوں اور درست ہیں جیسے اُن مقامات میں جہاں ذرا جلی قلم استعمال کیا گیا ہے۔ اور تناسب حروف میں

کہیں فرق نہیں آنے پایا۔ اس سے پہلے اسی باکمال نے اس سے ذرا چھوٹے پیمانہ پر یہ فن دکھایا تھا۔ بلکہ وکٹوریہ مرحومہ کی ایک سوانح عمری اس شیشہ سے ایک چھوٹے شیشہ پر لکھی تھی اور وہ شیشہ بر موقع جوبلی ملکہ معظمہ کو بھیجا گیا تھا۔ وہاں سے پروانہ اظہار خوشنودی مزاج آیا تھا۔ اُس زمانہ میں الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار پائینیر نے بھی نہایت پُر زور الفاظ میں اس فن کی داد دی تھی اور سر سید احمد خاں مرحوم مغفور نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اپنی بے نظیر جوہر شناسی کا ثبوت دیا تھا معمولی اخباروں کا تو کیا ذکر وہ تو مدتوں مدح سرائی کرتے رہے ہونگے۔ کسی اور ملک میں کسی صاحبِ فن کا یا اُس کی کسی ساخت کا ایسا چرچا ہوتا تو وہ غالباً آجتک مالامال ہو چکا ہوتا۔ اسی قسم کے کام تیار کرنے کی سینکڑوں فرمائشیں اُس کے پاس پہنچ جاتیں اور وہ مجبور ہوتا کہ اپنے شاگرد بنا کر اُن سے کام لے اور فن کی ترویج مزید کا باعث ہو مگر یہاں تعریفیں خواہ کسی مصنف کی ہوں۔ کسی مشہور فصیح کی ہوں۔ کسی مدبر ملک کی ہوں۔ کسی مصور کی ہوں۔ کسی نقاش کی ہوں یا کسی اور فن کے ذی کمال کی ہوں عارضی ہوتی ہیں اور محض زبانی۔ اُن سے کوئی معتد بہ فائدہ صاحبِ فن کو نہیں پہنچتا اور خلق خدا جلد اُن تعریفوں کو بھول جاتی ہے۔ اور دنیا جلد اُن لوگوں کو فراموش کر دیتی ہے جن پر ایک فوری جوش کے اثر سے یہ واہ واہ اور مرحبا کے ہزاروں پھول برسانے کو تیار تھی۔ ہمارے ہاں اکثر باکمالوں کو اُن کی محنت اور عرقریزی کا صلہ اسی زبانی تحسین و آفرین سے ملتا رہا ہے۔ اور اُن میں سے بعض اپنی قانع طبیعت کی بدولت اسی کے نشہ میں مست رہے ہیں۔ چنانچہ امیر مینائی مرحوم لکھتے ہیں

شاعر کو دل سے بھاتی ہے تحسینِ شعر امیر
سَو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

مگر یہ فرضی اور خیالی نشہ اور تصور کے لہلہاتے ہوئے سبز باغ۔ اس زمانہ میں کسی کو دیر تک سہارا نہیں دے سکتے تاوقتیکہ وہ بالکل تارک الدنیا نہ ہو جائے اور امیر جیسا فقیر منش صوفی مزاج کنج قناعت کا عادی۔ آخر واہ واہ کی بوتلوں کے نشہ سے

سیر ہو کر اُس نشہ کی تلاش میں وطن سے نکلنے پر مجبور ہوا جس کے ڈورے سے ابیض منقوش کی دید آنکھوں کو میگون کر دیتی ہے۔

وہ تو اپنی ذات سے آدھی کو چھوڑ کر ساری کی طرف دوڑنے والا نہ تھا مگر امیر اللغات کی سی ضخیم اور تحقیق طلب تصنیف اُس ہوائی جنس سے جسے تحسین و آفرین کہتے ہیں تیار نہیں ہو سکتی تھی اور اُس کے واسطے زر سے بھرا کیسہ درکار تھا۔ اُس نے سارے ہندوستان پر نظر دوڑائی اور دکن کے سوائے کہیں بھی اُسے جائے امید دکھائی نہ دی۔ گیا اور چلتے چلتے یہ پیشینگوئی کرتا گیا۔

اب نہ آؤں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے۔ مجھ کو

وہاں پہنچتے ہی اُس کے بیمار ہونے اور دنیا اور مشاغل دنیا سے رخصت ہونے کا دردناک واقعہ ابھی ایسا تازہ ہے کہ اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ غرض اس سے صرف یہی ہے کہ اہلِ ملک اور خصوصاً رؤسا اور امراء کو ان کا یہ اہم فرض یاد دلایا جائے کہ اپنے ہاں کے باکمالوں کی قدردانی علمی طور پر کریں۔ پیشتر اس کے کہ قدردانی کا موقع اُن کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی سے نہ صرف ملکی علم و ہنر کو ترقی دیکر اہلِ ملک کو ممنون کریں۔ بلکہ اپنے واسطے جہانِ باقی میں وہ دولت جمع کر لیں جسے نہ کیڑا کھائیگا نہ گھن لگیگا۔

خصوصاً دکن پر جس سے ہندوستان میں گزشتہ اسلامی عظمت و شان کا نشان ملتا ہے ہر فن کے اہلِ کمال کے بہت حقوق ہیں اور جو سلوک آجتک صاحبانِ کمال کے ساتھ وہاں ہوا ہے اُس کی توسیع کی بہت کچھ ضرورت ہے۔

اسرارِ وجود

نشوی واقفِ یک نقطہ ز اسرارِ وجود
گر تو سرگشتہ شوی دائرہ دوراں را (حافظ)

حافظ کا کلام جس پایۂ قبول کو پہنچ چکا ہے۔ محتاج بیان نہیں۔ اور اس قبولیت کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس دریائے عرفاں کے شناور کی زبان سے بیساختہ رموزِ معرفت کے ایسے ایسے نکتے نکل گئے ہیں جو اور شعرا میں کم پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اس خاص صیغہ میں بیشتر شعرائے فارس وہندوستان حافظ کے خوانِ علم کے زلہ ربا ہیں۔ انہیں نکات میں وہ نکتہ ہے جو شعر مندرجہ بالا میں نہایت پُرزور الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ گو اس کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر اس کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس شعر کا اور اس قسم کے اور اقوال کا اثر مختلف آدمیوں پر مختلف پڑتا ہے۔ جہاں یہ منتہیوں کے لئے چراغ ہدایت ہیں وہیں یہ مبتدیوں کے لئے باعثِ گمراہی بھی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ حافظ اور اس رنگ کے اور مصنفین اور شعرا کی تصانیف کی بابت ہمیشہ سے دو رائیں چلی آتی ہیں۔ ایک فریق انکو نہایت اعلیٰ سمجھتا ہے اور اُن کی تعریف کرتے نہیں تھکتا اور دوسرا فریق اُن کی مذمت کرتا اور اُن کے مطالعہ سے لوگوں کو روکتا ہے۔ اور اپنی اپنی جگہ دونوں حق بجانب ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے جو ان حقائق کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو ایسی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں ان کے مطالعہ سے بہتر شغل نہیں ہوسکتا۔ اور اُن کے لئے جو اُس فہم سے بہرہ ور ہی نہیں ہوئے۔ جو ان کے مطالب کے ادراک میں مددوے۔ ان کا مطالعہ نہایت مضر ہے۔ اب اسی مسئلہ اسرارِ وجود کو دیکھئے۔ اس سے زیادہ سچی بات کیا کہی جاسکتی ہے کہ اسرارِ وجود اسقدر پیچیدہ ہیں۔ اُن کی تحقیقات کی راہیں ایسی باریک اور دشوار گذار ہیں۔ اور اُن کے علم کا احاطہ ایسا وسیع اور اُن کی اصلیت کا سمندر ایسا ناپیدا کنار ہے کہ آپ عمر بھر ٹوہ لگاتے رہیں۔ اُس کی تھاہ کو پہنچنا محال ہے۔ لیکن اسی بات کا دوسرا

پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی یہ سُن کر تلاش اور تجسس کو ہی چھوڑ بیٹھے اور ہمت ہار دے تو اُس سے زیادہ غلطی اور خسارہ میں پڑنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ دنیا میں جتنے فلسفی گذرے ہیں جن کا نام اُن کے علم و فضل اور خردوری کے سبب سے آجتک ادب سے لیا جاتا ہے۔ سب مدت العمر اسرار وجود کی دریافت میں مصروف رہے اور شاہد مقصود ہاتھ لگا یا نہ لگا مگر ان کی یہی تلاش اُن کے بقائے نام کا سبب بن گئی۔ جتنے نامور اہلِ دین و بانیانِ مذاہب گذرے ہیں۔ اُن کی زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد اسرارِ وجود پر روشنی ڈالنا تھا۔ اور جہانتک اُن کے وسائل نے اجازت دی اُنہوں نے خود تلاش سے کام لیا۔ اور جو کچھ اُنہیں اس تلاش میں ملا اسے اُنہوں نے کھلے دل سے اپنے ابنائے جنس کے سامنے رکھدیا۔ آگے یہ دوسروں کے نصیبوں پر رہا کہ وہ کس حد تک اس تحقیقات سے مستفید ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی محدود انسانی عقل اور اپنی مسدود حدِ نگاہ کے مطابق کچھ نہ کچھ اخذ کر لیا۔ اگر یہ لوگ سب اس نصیحت کے بدیہی معنوں پر عمل کرتے جو حافظ کے مندرجہ عنوان شعر سے حاصل ہوتی ہے۔ تو یقیناً یہ مسئلہ سخت تاریکی میں رہتا اور اسرارِ وجود سے تھوڑی بہت آگاہی رکھنے والے بھی دنیا سے مفقود ہوتے۔ جو لوگ اس رمز سے آگاہ ہیں جو حافظ شیرازی نے اس شعر میں بیان کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ انتہائے مقصد رسی کا اظہار ہے۔ علم ابتدائی حالت میں انسان کو اپنی معلومات کی وسعت پر نازاں کرتا ہے۔ اس درجہ میں آدمی دوسرے ابنائے جنس کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔ یا اُن کی کم علمی پر رحم کرتا ہے۔ اپنی بڑائی پر فخر کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے کہ صاحبِ علم وسعتِ علم کو دیکھکر خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی خاموشی اُسے تصویر حیرت بنا دیتی ہے۔

جو طبلِ تہی ہیں وہ ہنکارتے ہیں　　　جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

اس مرحلہ سے گذر کر ایک منزل آتی ہے۔ جہاں خاموشی پھر مبدّل بہ گویائی ہوتی ہے مگر اس گویائی میں نخوت و غرور و تکبر کا کہیں پتا نہیں۔ ہر ایک ہر بنِ مو سے صدائے "من نیم"

"من نیستم" نکلتی ہے۔ اور علامۂ دہر پکار اٹھتا ہے "ایں قدر دانستم کہ ہیچ نہ دانستم"
یہ تھا قول ایک مشہور ترین حکیم کا۔ اپنے بستر مرگ پر۔ موجودہ زمانہ کا ایک بڑا بلند پایہ
جرمنی مصنف جس کے تبحر علمی کا سارا فرنگستان معترف ہے۔ مرتے وقت آبِ
حیاتِ علم کے لئے العطش العطش پکارتا ہوا گیا۔ اور اس کے آخری الفاظ یہ تھے
"اور روشنی! اور روشنی! اس بے چینی کا اظہار حافظ نے کیا ہے۔ جب اس نے
یہ کہا ہے۔ کہ اسرارِ وجود کی تحقیق کے میدان میں خواہ آپ کتنے گھوڑے دوڑائیں
اس کے کوہ و دشت میں کتنا ہی سر ٹکرائیں۔ اور آخر کسی حد تک اپنی معلومات کو لے
جائیں۔ مگر یہ سمندر اتنا وسیع ہے کہ اس کے ایک قطرہ سے بھی آپ آشنا نہ ہونگے
یہ دائرہ اتنا بڑا ہے۔ کہ اس کے ایک نقطہ پر بھی آپ حاوی نہ ہونگے۔ اس کا مطلب
جو کچھ ہم سمجھتے ہیں انتہائے علم انسانی کے محدود ہونے کا اعتراف ہے۔ ورنہ اس
سے یہ غرض ہرگز نہیں۔ کہ ہر نوجوان زندگی کا آغاز کرنے والا۔ ہر طالبِ علم طلب علم
میں عازمِ سفر ہونے والا۔ ہر متلاشی اور ہر متجسس تلاش و جستجو سے دست بردار ہو جائے
کیونکہ ایک صاحبِ عرفان نے کہدیا ہے کہ اس جستجو سے حاصل کچھ نہیں۔ طالب کو
چاہیئے کہ سرگرمِ جستجو رہے۔ بلکہ جستجو گاہی کوچہ وہ کوچہ ہے۔ جس کی خاک چھاننی
انسان کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اور جس کی خاک چھانتے چھانتے انسان حقائق و
معارف کے اتنے ریزہ ہائے زر و جواہر جمع کر سکتا ہے کہ سمیٹے نہ سمیٹے جائیں اور
اس کا دامن گوہرِ مقصود سے مالا مال ہو کر ایسی دولتِ بے انتہا نظر آئے کہ وہ مجبور کہہ اٹھے

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

تصویر کے دو رُخ

یوں تو ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک روشن اور ایک دھندلا۔ ایک سفید
اور ایک سیاہ۔ ایک طرف نقش و نگار اور ایک طرف ورق سادہ۔ ایک رخ صرف سادگی

کی آرائش سے زیبا اور دوسرا حسن وخوبی سے معرا۔ مگر جو دردناک اور تعجب خیز نظارہ اہلِ ہند کی روزمرہ کی تصویر کے دو رُخ دکھاتے ہیں۔ بہت کم تصویریں دکھا سکتی ہیں۔ افسوس اس تصویر کی نقل اُتارنے کے لئے جیسے صاحبانِ فن کی ضرورت ہی وہ میسّر نہیں۔ نقّاشِ ازلی نے بھی اسے کھینچکر "دست از قلم کشید" پر عمل کرلیا ہی اور جب کبھی کسی مصوّر نے اس کا نقشہ اُتارنے کی کوشش کی ہے وہ نور اور پرتو دونوں کو یکساں تناسب کے ساتھ دکھانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کسی کی تصویر میں نور اچھا جلوہ گر ہے تو پرتو ندارد۔ اور کسی نقّاش کی نظر پرتو پر جا پڑی ہے تو نور نظر سے اوجھل ہوگیا ہے۔ ہاں چشمِ بینا کے مطالعہ کے لئے نقّاشِ ازل کے ہاتھ کی تحریر کے اوراق ہر وقت وا ہیں۔ آنکھ کو چاہیئے کہ ذرا کھل جائے اور تماشہ دیکھے۔

چلئے پہلے کسی دیسی عہدہ دارِ سرکاری کے مکان کی سیر کریں۔ ایک بڑی ڈیوڑھی سے گذر کر ایک وسیع صحن میں پہنچتے ہیں۔ صحن کے عین وسط میں ایک حوض ہے جو پانی سے لبالب ہے۔ حوض کے چاروں طرف خوشنما گملے رکھے ہیں۔ کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور ہمارے معزز عہدہ دارِ سرکاری جو ایک پرانی وضع کے بزرگ ہیں کچہری سے آکر چوغہ وغیرہ اُتار کر ذرا استارہے ہیں۔ فرّاش پیچھے ایک بڑا دستی پنکھا لیئے کھڑا ہے۔ اور ہمارے معزز دوست پیچوان کی چاندی کی مہنال مُنہ میں لئے دھوئیں کے بادل نکال نکال کر اُن کی پیچ در پیچ رفتار کا ایک مست نگاہی کے ساتھ لطف لے رہے ہیں۔ گویا آرام و آسائش کی مورت ہیں۔ اگر کوئی اجنبی اتنی ہی کیفیت کو دیکھے تو سمجھے کہ ہندوستان میں لوگ بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گستاخی سے نگاہِ تصور کو زنانہ کی طرف لے چلئے اور ملاحظہ کیجئے کہ "گھر کے لوگ" کس حالت میں ہیں۔ بیوی صاحبہ ہیں کہ چیں بہ جبیں، ایک چارپائی پر متمکن ہیں۔ چارپائی پر ایک طرف کو ایک پاندان رکھا ہے۔ جس کے پاسنگ ہاتھ چونے کے دھبے ہیں۔ اُس کے پاس ایک بچے کا ٹوٹا سا کھلونا پڑا ہوا ہے۔ پائنتی کی طرف

کچھ ساگ پات دھرے ہیں اور وہ ماما کو پکار رہی ہیں "اری جلدی کھانے کا فکر کر ابھی میاں آتے ہونگے۔ ذرا دیر ہو گئی تو میری جان کھا جائیں گے۔ تیرا کیا جائیگا" اُدھر سے ماما بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے "جب سے اس گھر میں آئے ہیں نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ سارا دن کام کاج میں کھپ جاتا ہے اور پھر بیوی کو دیکھو تو پیشانی سے بل ہی نہیں اُترتا" اور سامنے آکر پکار کر کہتی ہے "میاں تو آبھی گئے نہیں کونسی فارغ بیٹھی رہی کہ اس سے پہلے کچھ فکر کرتی" اتنے میں ایک چھوٹی سی لڑکی باورچیخانہ کی طرف سے راکھ سے کھیلتی ہوئی آجاتی ہے۔ اور اُسے دیکھ کر اُس کی ماں طیش میں آتی ہے "ابھی نگوڑی کو نہلا دھلا کر بھیجا تھا۔ اور ابھی پھر لتھڑی ہوئی آگئی۔ اب کہاں تک کوئی ان کو صاف رکھے۔ اور وہ آئینگے تو مجھے ڈانٹینگے۔ ذرا آپ ایک دن بھی خبر گیری کرنی پڑے تو حال معلوم ہو" اور لڑکی سے مخاطب ہو کر "اری چڑیل آ تو سہی تجھ سے سمجھونگی۔ اب کے باورچی خانہ میں جانا۔ اگر دسپنا تجھ پر توڑ نہ دیا تو کہنا" یہ گھُرکی سُنتے ہی لڑکی بسورنے لگتی ہے اور اُس حالت میں ماں کے ماتھے پر اور بل پڑتے دیکھکر پھوٹ پڑتی ہے اور چلا چلا کر رونے لگتی ہے۔ رونے کی آواز مردانہ تک گئی اور ہمارے عہدہ دار صاحب چیخے "یہ کیا غل مچا رکھا ہے۔ جب آؤ اس گھر میں کچھ نہ کچھ شور ہی پاؤ گے۔ جاؤ جمّن (نوکر کا نام ہے) ذرا لپک کے ننھی کو لے لینا" جمّن آواز دیتا ہے۔ اندر سے آواز آتی ہے "ٹھیرا ذرا اس کا منہ دھو لیں" مگر لڑکی بھاگ کر اسی طرح لتھڑی ہوئی جمّن کی گود میں آجاتی ہے اور وہ نامعقول بے سوچے سمجھے اُسے میاں کے سامنے لے آتا ہے۔ لڑکی کی صورت دیکھتے ہی جھلاتے ہیں اور غصہ کے جوش میں بھرے ہوئے اندر جاتے ہیں "سارے دن بیٹھی ہوئی کیا کرتی رہتی ہو کہ ذرا لڑکی کا بھی دھیان نہیں رکھ سکتیں۔ لڑکے تو اب تمہارے محتاج نہیں۔ اُن کے لئے تو میانجی نوکر ہے۔ وہی بیچارہ انہیں کپڑے پہنا دے وہی سیر کو لے جائے وہی سبق پڑھا چھوڑے۔ ایک لڑکی ہے۔ اُس کی طرف بھرے گھر میں کوئی توجہ کرنے والا نہیں" یہ عتاب سنتے ہی بھلا تاب کسے! بیوی بھی بگڑ کر جلے پھپھولے پھوڑنے لگی کہ

اگلے پچھلے گلے شکوے دفتروں کے دفتر کھل جاتے ہیں اور آخر ایسی تلخی تک نوبت پہنچتی ہے کہ میاں کھانا کھائے بغیر شام کو پڑ رہتے ہیں۔ اور بیوی الگ منہ لپیٹ کر اپنے بڑوں کو کوستی ہے کہ ایسے سخت گیر خاوند سے بیاہ دیا کہ عمر رونے میں کٹ گئی۔

اب یہاں زیادہ ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔ انہی کے ہمسایہ میں ایک اور معزز عہدہ دار رہتے ہیں مگر وہ نئے رنگ کے آدمی ہیں۔ ذرا اُن کے ہاں ہوتے چلیں۔ ایک مکلف نشست ہے۔ جس کے دروازوں پر چلمنیں پڑی ہیں۔ اندر پردے لٹک رہے ہیں۔ کمرہ کی آرائش میں انگریزیت کی صاف جھلک نظر آ رہی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مکان کے سجانے کا یہ نقشہ ضرور کہیں سے اُڑایا ہوا ہے۔ کچھ کرسیاں قرینے سے دھری ہیں۔ کونے میں ایک میز رکھی ہے۔ جس پر شیشہ کنگھی۔ انگریزی خوشبودار تیل بال سنوارنے کا بُرش سب سامان درست ہے۔ وسط میں ایک میز ہے جس پر چند نہایت عمدہ جلدوں کی کتابیں ہیں۔ اُن میں بعض تصویروں کے آلبم ہیں۔ بعض عمارات اور مشہور مقامات کے نقشے ہیں۔ ایک آدھ دلچسپ ناول ہے۔ ایک کسی مشہور سیّاح کا سفرنامہ ہے۔ غرض ہر چیز سے صاحب خانہ کی تربیت۔ سلیقہ شعاری اور صفائی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ اتنے میں دو صاحب نئی وضع کے لباس میں ملبوس کمرہ میں باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک تو صاحبِ خانہ ہیں اور دوسرے اُن کے ایک دوست ہیں۔ جو نئے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اصلاحِ ملک وقوم کی فکر میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی خوش تقریری سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے خیالات کا اثر لوگوں کے دلوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ذرا اُن کی گفتگو سن لیجیے

صاحبِ خانہ:۔ اب آپ بہت دنوں میں تشریف لائے۔ آپ کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں دل خوش ہو جاتا ہے۔ قومی کاموں میں آپ کی طرح دلسوزی کرنے والے ہم لوگوں میں ابھی بہت کم ہیں۔

مُصلح:۔ جناب یہ سب آپ کی قدردانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری خدمات کیا۔ واللہ! اگر آپ جیسے قدردان نہ ہوں۔ تو اس ملک میں دم گھٹ جائے۔ ملک کیواسطے

آپ کوئی کام کیجئے۔ اہلِ ملک آپ سے بدظن ہو جائیں گے۔ اور داد کی بجائے اعتراضوں کی بوچھاڑ کریں گے۔ اب اسی عورتوں کے اصلاح کے مسئلہ کو دیکھئے۔ جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ کیسا ضروری معاملہ ہے۔ اور لوگ اس سے کسقدر غافل ہیں۔ اور تو اور۔ جو نیک صلاح دے اُلٹے اُس کے سر ہوتے ہیں۔

صاحب خانہ:۔ واقعی جس استقلال سے آپ ان دقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ آپ ہی کا کام ہے۔ فرمائیے اب کچھ عرصہ سے کوئی لکچر آپ نے نہیں دیا۔

مصلح:۔ جناب مجمع ہی نہیں ہوتا۔ آپ کا شہر ایسے بدمذاق آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ورنہ بندہ تو ہر وقت حاضر ہے۔ اب پرسوں کے لئے ایک جلسہ قرار پایا ہے۔ اسی کے اہتمام میں جاتا ہوں۔ اور آپ سے مرخص ہوتا ہوں۔ آپ بھی قدم رنجہ فرمائیے گا۔

غرض صاحب خانہ سے وعدہ لیکر وہ تو رخصت ہوئے۔ اور صاحب خانہ اندر تشریف لے گئے۔ گوش زدہ اثرے دارد۔ ابھی ابھی عورتوں کی اصلاح کا ذکر تھا بیوی سے اُسی کے متعلق گفتگو شروع ہوئی:۔

میاں:۔ میں نے کئی دفعہ تم سے کہا ہے کہ ابھی موقعہ ہے۔ کچھ شُدبُد لکھنا پڑھنا سیکھ لو۔ واقعی جب کبھی باہر لکھی پڑھی عورتوں کا ذکر ہوتا ہے تو مجھے سخت ندامت ہوتی ہے۔ اور میں تو اسی خیال سے تعلیم نسواں کی حمایت میں کچھ کہنے سے شرماتا ہوں کہ میرے اپنے گھر میں پڑھی ہوئی بیوی نہیں۔

بیوی:۔ یہ کیا آپ کو دھن لگی ہوئی ہے۔ کیا سارے زمانہ کی عورتیں پڑھی ہوتی ہیں۔ ہمارے تو کنبہ بھر میں کبھی لکھنے پڑھنے کا چرچا نہیں ہوا۔ کسی کو بہت خیال ہوا تو کلام مجید ناظرے پڑھنا سیکھ لیا۔ کہ چلو ثواب کا کام ہے۔ یہ ایک نئی علّت لگی کہ پڑھے بغیر گذارہ ہی نہ ہو۔

میاں:۔ گذارے کی تو بات ہی الگ ہے۔ اب ہم زندگی بھگت ہی رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ بغیر خواندہ بیوی کے زندگی بے لطف ہے۔

بیوی (اچانک بگڑ کر) :- تو کوئی خواندہ ڈھونڈی ہوتی۔ میری تو ماں کی آنکھوں پر تمہارے ہاں کی رزق روٹی دیکھکر پٹی ہی بندھ گئی۔ کہ اُس نے مجھے یہاں جھونکدیا۔ ہر وقت پڑھائی کا طعنہ۔ ہر وقت پڑھنے کا جھگڑا۔ اور کوئی بات ہی نہیں بس یہی ایک چھیڑ ہاتھ لگ گئی۔ اب کوئی اور خواندہ کر لاؤ۔ ہم سے بھی جیسے ہوگا زندگی کاٹ ڈالیں گے (اور بلند آواز کر کے) آگ لگے ایسی روٹی کو اچولھے میں جائے ایسا رزق! (رونے کی آواز آنے لگتی ہے)۔

میاں بیچارے سلیم الطبع آدمی۔ دم بخود۔ خواہ مخواہ امن خانگی میں خلل اندازی پر پچھتائے۔ کچھ اپنی تعلیم کو کچھ اپنی قسمت کو کوستے باہر نکل آتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں کُڑھتے ہوئے خدا سے شکایت کرتے ہیں۔ کہ یا تو اس ضرورت کا احساس نہ دیا ہوتا۔ یا والدین کے دل میں بھی جن کے ہاتھ میں اولاد کی مناکحت کی باگ ہوتی ہے۔ اس ضرورت کا احساس ڈالدیا ہوتا۔

خرم آنکس کز جہاں بے خبر است   ہوش است کہ سرمایۂ دردِ سر است
ہرچند کہ بیضہ از قفس تنگ تر است   در بیضہ نے کنند مرغاں فریاد

اب ذرا قومی مصلح کا تعاقب کیجئے۔ دوست کی ملاقات سے فارغ ہو کر ایک چھاپہ خانہ میں پہنچے۔ وہاں اسی طرح ناقدردانئے زمانہ کے دُکھڑے رُوئے اور کہا کہ خیر:-

دکس بشنود یا نشنود من گفتگوئے مے کنم،

بلا سے لوگ نہ مانیں ہم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ ایک اشتہار لکچر کا پرسوں کے لئے چھاپ دیجئے۔ لکچر کا موضوع یہ ہو "عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہیں"۔ موضوع کا اظہار کرنے پر دیر تک صاحبِ مطبع سے اس اصول پر بحث رہی۔ حضرت مصلح نے بڑے شدومد سے اس اصول کو ثابت کیا اور کہا مرد عورتوں پر اس ملک میں بڑا ظلم کرتے ہیں۔ اور ان کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہیں۔ ان کو خدا کے روبرو جواب دینا ہوگا۔ اس گفتگو سے فارغ ہو کر گھر پہنچے

ایک پُرانے سے گھر میں۔ جس میں کھاٹ کھٹولے تک درست نہیں۔ ایک دالان میں جہاں باوجود شام ہو جانے کے چراغ تک نہیں جلا تھا۔ ایک بیکس سی عورت لیٹی تھی۔ یہ ہمارے لکچرار صاحب کی اہلیہ تھی۔ لکچرار صاحب نے اُسے کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنے دیا۔ اُس کو پوچھا تک نہیں۔ اور آپ الگ صحن میں ایک ٹوٹی سی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ وہ نیک بخت اُٹھی۔ اور پنکھا لیکر جھلنے لگی۔ وہ کھڑی پنکھا کرتی رہی۔ ہمارے انصاف پسند دوست کے منہ سے یہ نہیں نکلا۔ کہ بیٹھ جاؤ۔ نہ کوئی شکریہ کا کلمہ نکلا۔ کچھ دیر کے بعد بغیر کسی خطاب کرنے کے پوچھا "کھانا تیار ہے؟" وہ دوڑی اور کھانا نکال لائی۔ پاس بیٹھکر کھلانے لگی۔ جو کچھ پکا تھا۔ اُس نیک اور ایثار کرنے والی بی بی نے خاوند کے آگے لاکے رکھ دیا۔ اور جو کچھ اُس نے کھانے کے بعد چھوڑا۔ اُس سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ معلوم نہیں ہمارے لکچرار کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال آیا یا نہیں۔ کہ اُن کے گھر میں زن و مرد کے حقوق کی مساوات کہانتک ملحوظ ہے۔ لیکن اگر آیا بھی ہو گا تو اُنہوں نے یہہ من سمجھوتہ کر لیا ہو گا۔ کہ اگر عورت بھی پڑھی لکھی ہو تو اُس کے حقوق اُن کے ساتھ برابر ہوں۔

چلئے ان کے حال سے درگذر کر کے ان کے ایک پڑوسی بابو صاحب ہیں۔ اُنکی خانہ داری کا اندازہ کرتے چلیں۔ بابو صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔ اُن کی غیر حاضری میں بام خانہ پر ایک عورت چھڑکاؤ کر رہی ہے۔ ایک چارپائی پر بچھونا بچھا ہے۔ اُس کے پاس اُسی عورت نے حقہ بھر کر رکھ دیا ہے۔ اُس عورت کی پوشاک یہ ہے کہ ایک میلا سا کپڑا ہے۔ جسے سر سے پانوں تک ساڑھی کے طور پر اوڑھے ہوئے ہے۔ مگر وہ ستر میں کچھ بہت مدد نہیں دیتا۔ شاید خیال گذرے کہ یہ کوئی خادمہ ہے مگر نہیں۔ یہ بابو صاحب کی بیوی ہے۔ جو آپ تو روز دُھلے ہوئے کپڑے بدلتے ہیں۔ اور ہم چشموں میں خوش خور اور خوش پوش مشہور ہیں۔ یہ بھی اچھے اچھے کپڑے رکھتی ہے جن کی زرق برق سے آنکھیں چکا چوند ہو جائیں۔ مگر وہ تو تیوہار یا میلے پر

جانے یا شادی بیاہ میں شریک ہونے کے موقعوں پر نکالے جانے کے لئے صندوقوں میں احتیاط سے بند ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس بھاری بھاری زیورات ہیں جن پر اسے ناز ہے۔ مگر ان کو بھی خاص موقعوں پر ہی نکالتی ہے۔

اسی مکان کے سامنے جلاہوں کا ایک گھر ہے۔ اس میں ایک بڈھا دیرینہ سال جلاہا بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ آؤ آج کے مشاہدات کے ختم کرنے سے پہلے اس کی باتیں سن لیں۔ ویسے تو آپ جس دن آئیں گے اور جتنی مرتبہ آئیں گے ہندوستان کی زندگی کی تصویر کے دونوں رخوں کا منظر آپ کو نئے سے نئے رنگ دکھائیگا۔ یہ بڑے میاں گذشتہ زمانہ کی خوبیوں کا بیان کر رہے ہیں:۔

آپ:۔ کہو بڑے میاں آجکل کے زمانے کے بڑے شاکی معلوم ہوتے ہو

بڈھا:۔ کچھ پوچھئے نہیں۔ زمانہ کیسے ایسا نکل گیا ہے کہ کوئی حد نہیں۔ خدا جانے کیا اندھیر ہونے والا ہے۔ عورتوں کی کبھی ایسی آزادی نہ دیکھی نہ سنی۔ یقین جانئے عمرے کی ماں کو (بیٹے کا نام ہے) میں نے وہ وہ پیٹا ہے۔ مگر بیچاری نے کبھی یہ نہ کہا کہ میں تمہارے گھر نہیں رہتی۔ مگر اس عمرے نالائق نے میرے گھر کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اپنی عورت کو اسقدر سر چڑھا رکھا ہے کہ خدا کی پناہ ہمارا بھی جوانی میں بیاہ ہوا تھا۔ ہم تو اپنے باپ کے سامنے عورت کی اتنی پاسداری نہیں کرتے تھے۔ خواہ وہ اسے جھڑک دیں۔ خواہ زیادہ کام لیں خواہ کم۔ خواہ تھوڑا کھانے کو دیں خواہ بہت۔ یہ ناہنجار تو جس دن سے بیاہا گیا ہے مجھے باپ ہی نہیں سمجھتا اور وہ نامراد ناشاد ساس سے یوں لڑتی ہے جیسے سوت ہو۔ میں نے بارہا لڑکے کو سمجھایا تو آج آخر اس نے ذرا ہاتھ اٹھایا تھا۔ مگر صاحب وہ بگڑی ہوئی عورت ابھی دو چار ہی پڑی تھیں۔ کہ محلہ سر پر اٹھالیا۔ اور اس وقت سے رو رہی ہے۔ کہ میں تو طلاق ہی لونگی۔ عجب مصیبت میں جان ہے۔ ادھر یہ بے عقل پھر سوم ہوا جاتا ہے کہتا ہے عورت ہاتھ سے جائیگی۔ حالانکہ میں اسے کہہ چکا ہوں۔ کہ عورت کو تو جوتی ایسا سمجھنا چاہیئے۔ ایک اتر گئی۔ دوسری پہن لی۔

بڑے میاں کے خیالات کا نمونہ تو آپ نے سُن لیا۔ چلو اب چل کے سو رہو۔ خدا کرے خواب میں آپ کو تصویر کا سیاہ رُخ کسیقدر سفیدی سے بدلتا نظر آئے۔ تو صبح کو ہم آپ کو کوئی اچھی سی تعبیر بتائیں +

جشن تاج پوشی

بیسویں صدی کے ابتدائی سال بہت سے اہم تاریخی واقعات کے سبب یادگار رہیں گے۔ مگر جو عزت سنہ ۱۹۰۲ء کے حصّۂ آخری اور سنہ ۱۹۰۳ء کے حصّۂ ابتدائی کو ہندوستان میں جشنِ تاج پوشیٔ قیصری سے حاصل ہوئی ہے۔ اُس کے سبب یہ سنین مدتوں تک اپنے اقران و امثال میں باعثِ رشک ہونگے چودہ پندرہ دن تک مُلک کے ہر کونے سے خوشی کے نعرے بلند ہوتے رہے اور ہر جگہ ہر شخص نے اپنی اپنی بساط کے موافق اس عالمگیر جشن میں حصّہ لیا۔ اُن سب نظاروں کو دیکھنے کے لئے جو اس ایک ہی زمانہ میں ہزاروں مقامات میں بندگانِ خدا کے پیشِ نظر تھے۔ فرشتوں کی آنکھ چاہیئے۔ اور کسی ایسی بلندی پر نشیمن ہو جہاں سے بلندی و پستی سب آئینہ ہو جائے۔ انسان کی تو چشمِ تصوّر بھی اُن سب کے احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ ہاں دہلی میں ان سب تماشوں کا خلاصہ اس عمدگی اور اس خوبی سے نظر آیا ہے کہ اُس کے دیکھنے والوں نے گویا سب کچھ دیکھ لیا۔

دِلّی اُن دنوں اپنے بڑھاپے کو بھول گئی تھی اور یوں بنی سنوری ہوئی تھی جیسے کل کی دُلہن۔ وُہی دلفریبیاں جو شعرا ازلِ دنیا میں دیکھا کرتے ہیں۔ دِلّی میں نظر آ رہی تھیں۔ اُس کی معمّر پیشانی پر جھرّیوں کا نشان تک باقی نہ تھا۔ اُسکے نزار و نزار جسم میں دوبارہ توانائی دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا رنگ رُخ رونق گل کو مات کئے دیتا تھا۔ اور اُس کی آنکھ فلکِ پیر سے اُسی آزادی کے ساتھ لڑ رہی تھی۔

جس سے اُن جوانانِ رعنا سے جو اُس کے مہمان تھے جس طرح عجوزِ دنیا ہر کامیاب شخص سے آئے دن پیمانِ وفا باندھتی ہے اور نت نیا شوہر ڈھونڈھتی ہے۔ اسی طرح دِلّی یکم جنوری کو شہنشاہ ایڈورڈ سے بوساطت اُس کے نائب السلطنتہ لارڈ کرزن کے پیمانِ وفا باندھ رہی تھی۔ اور اس خوشی میں شادیانے بج رہے تھے۔ اور اُس دن دِلّی میں دنیا کی خُوبُو کیوں نہ ہوتی۔ دِلّی اُسوقت دنیا بھر کی ایک چھوٹی سی تصویر تھی۔ کونسا گوشہ دنیا کا ایسا تھا۔ جسکی آبادی کے نمونے دِلّی میں جمع نہ تھے۔

جھمگٹا تھا اُس میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
یعنی گلدستہ تھی وہ گلہائے رنگارنگ کا

۲۹ ماہ دسمبر ۱۹۰۲ء کو جن لوگوں نے لارڈ کرزن کی سواری دیکھی ہے۔ وہ اُس شاندار نظارہ کو دیر تک نہ بھولیں گے۔ ساڑھے گیارہ بجے ریلوے سٹیشن سے لارڈ اور لیڈی کرزن مع شاہزادۂ عالی تبار ڈیوک آف کناٹ و ڈچس آف کناٹ کے ہاتھیوں پر سوار ہوئے۔ تمام ہندوستان کے سرکردہ والیانِ ریاست ہمراہِ جلوس تھے۔ جلوس کا سارا راستہ جو میلوں تک چلا گیا تھا۔ دو رویہ فوجوں کے پروں سے مزیّن تھا۔ فوجوں کی قطاروں کے پیچھے وفادار اور جاں نثار رعایا کے ہر طبقہ کے لوگ نہ در تہ موجود تھے۔ کچھ تو یہ صرفِ زرِ کثیر کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے اور لوگ تھے جو یہ توفیق نہیں رکھتے تھے۔ مگر اس نظّارہ کے دیکھنے کی اُمنگ سے خالی نہ تھے۔ وہ ویسے ہی آن کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دُکانوں کے چبوتروں پر تھے کچھ اُن کے بالاخانوں پر۔ غرض اور جس طرف اور جہاں تک نظر جا سکتی تھی۔ لوگ صف در صف نظر آتے تھے۔ اور قوس قزح کے سارے رنگ اس خوبی سے اُن کی پگڑیوں۔ ٹوپیوں اور دیگر اقسام لباس کے اجتماع سے پیدا ہوئے تھے کہ آنکھ اُن سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ انتظار کی یہ کیفیت تھی کہ گو سواری بارہ بجے

نکلنے کو تھی۔ مگر لوگ زن و مرد۔ پیر و جواں صبح سے ہی اپنی اپنی جگہ پر آجمے تھے اور نو دس بجے کے بعد تو کوئی اپنی جگہ سے ہلا ہی نہیں۔ سب سے زیادہ خوشنما منظر جامع مسجد کی سیڑھیوں سے دیکھا گیا۔ مگر اُس کے بعد چاندنی چوک کی رونق بالاتفاق بے نظیر تھی۔ جلوس میں سب سے آگے صوبۂ پنجاب کی پولیس کے افسر اعلیٰ گھوڑے پر سوار تھے اور جلوس کی رفتار گویا اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اس آہستگی اور وقار سے اُن کا گھوڑا قدم اُٹھاتا تھا۔ کہ دیکھنے والوں کے مُنہ سے آفرین نکلتی تھی۔ پھر کچھ دستے فوج انگریزی کے تھے۔ جُوں جُوں یہ لوگ قریب آتے جاتے تھے۔ آنکھیں وائسرائے بہادر کی دید کے لئے بیتاب ہوئی جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ اُس دن ایک عظیم الشان قیصر کے قائم مقام ہونے کی حیثیت میں دلچسپی کا مرکز تھے۔

اُن کے ہاتھی کا نظر آنا تھا۔ جس کی عماری میں وہ مع اپنی ہمدم و ہمراز کے متمکن تھے۔ کہ ایک شورِ طرب اُٹھا۔ تالیاں ہر طرف سے اس زور سے بجتی تھیں کہ کان بہرے ہوئے جاتے تھے۔ ہر صف یہ چاہتی تھی۔ کہ حضور وائسرائے اُس کی تالیوں کا اعتراف ہاتھ کے اشارے سے یا سر کے اشارے سے کریں۔ لیڈی کرزن کی شان اُس وقت ایک نئی آن رکھتی تھی۔ لباس میں اس خوبصورتی سے مغربی اور مشرقی خوبی مذاق کو جمع کیا گیا تھا۔ کہ صاحب نظروں کے دل داد دیتے تھے۔ اس پر حُسنِ خداداد اور وفورِ خوشی سمندِ ناز کو تازیانہ تھے جب امریکہ کے ایک امیر سوداگر زادہ کے گھر میں جنم لیا ہو گا تو ماں باپ کے خواب میں بھی یہ بات نہ آئی ہو گی۔ کہ اتفاقاتِ زمانہ اس خوش قسمت لڑکی کو پایۂ تختِ مغلیہ میں لے جاکر نور جہاں کے جھولے میں بٹھائینگے۔ اور وہ حسن جو معمولی حالات میں امریکہ کے کسی خانہ نشین کروڑپتی کے گھر کی زینت ہوتا۔ لارڈ کرزن جیسے اقبال مند مدبر انگلستان و نائب السلطنتہ برطانیہ کی بدولت ہندوستان کے در و دیوار پر اپنی روشنی ڈالیگا۔ یہ دونوں خوش نصیب لوگوں کی بشاشی اور جوشِ

عقیدت دیکھ کر کھلے جاتے تھے اور لوگ انہیں خوش و خرّم دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ اور بار بار خوشی کے نعرے بلند کرتے تھے۔ ان کے بعد ملکہ معظمہ مرحومہ کی یادگار شاہزادہ کناٹ معہ اپنی عالی جاہ ڈچس کے ایک دوسرے ہاتھی میں سوار نظر پڑے۔ جس کی سج دھج پہلے ہاتھی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ لوگوں کے جوشِ ارادت کا دریا ایک دفعہ پھر اُمڈا اور وہ نعرے ہوئے کہ آسمانِ پیر گونج اُٹھا۔ ملکہ معظمہ سے جو تعلّق ہندوستان کو پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دِلی تعلق تھا اور لوگ نہایت خوش تھے۔ کہ اُس ملکہ کا ایسا سپوت ان کے اس جشن میں شریک ہے۔ اس کے بعد راجوں اور نوابوں کی سواریاں آئیں۔ نظام دکن بمع ایک اور رئیس کے سب سے آگے۔ حضور نظام کی سادگی نے وہ شان دکھائی کہ اُس پر ہزار زینتیں قربان تھیں۔ جلالِ شاہی چہرے پر نور برسا رہا تھا۔ دکن کا بسنتی رنگ نمایاں تھا۔ ہاتھی کی جھول بسنتی۔ ہودے پر بسنتی رنگ۔ فیلبان کی وردی بسنتی۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے تاجداروں کی سواریاں تھیں۔ ایک سے ایک فوق البھڑک۔ ہاتھیوں کی جھولیں سونے چاندی کی چادریں معلوم ہوتی تھیں جن میں موتی ٹکے ہوئے تھے۔ مشرقی شان و شوکت کے اعلیٰ ترین نمونے موجود تھے۔ چیدہ والیان ملک کے پیچھے گورنران صوبجات تھے۔ جن میں پنجاب کے لاٹ صاحب کو باعتبار اس کے کہ جلوس اُن کے علاقہ میں تھا نمایاں جگہ ملی تھی۔ سپہ سالار افواج ہند یعنے لارڈ کچنر بھی بمع اپنے خاص دستۂ فوج کے بر سرِ زین تھے اور رونقِ جلوس کو بڑھا رہے تھے۔ ان کے بعد سپہر سلطنت کے چھوٹے چھوٹے ستارے آ رہے تھے۔ اُن مختلف نسلوں مختلف رنگوں۔ مختلف مذہبوں اور مختلف لباسوں کے لوگ تھے۔ چشم نظارہ پسند اس جلوس کے جلوہ کو دیکھتی تھی اور سیر نہ ہوتی تھی۔ اور ختم ہونے پر ہر شخص یہ کہتا تھا۔ کہ کاش ایک دفعہ پھر سواری اُن کے سامنے سے گذرتی۔ یا کاش اور لمبی ہوتی اگر کوئی ایشیائی حاکم ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ اور فوجیں جلوس میں شامل کر کے

اور تمام راجاؤں اور نوابوں کے خدام کو اُن کی اپنی اپنی سواری کے ہمراہ ہونے کی اجازت دیکر جلوس کو اتنا طول دیتا کہ بارہ بجے سے شروع ہوکر شام تک ختم ہوتا۔ مگر لارڈ کرزن کو جہاں ایشیائی مذاق کو نباہنا تھا۔ وہیں مغربی ضروریات اور خیالات سے بے پروائی نہ تھی۔ دو ڈھائی بجے جلوس سے فارغ ہوکر کمپ میں بعد دوپہر کا ناشتہ کرنا سب یورپین اصحاب کے لئے ضروری تھا اس لئے یہ مبارک رسم وقت مقررہ پر ختم ہوگئی۔

اگر دوسرے دن کوئی کارروائی پروگرام میں نہ ہوتی تو اس میں شک نہیں اسی جلوس کا چرچا رہتا۔ مگر ۳۰ دسمبر نمائشِ فنونِ لطیفۂ ہندوستان کی افتتاح کے لئے قرار پاچکی تھی۔ عوام میں تو گھر گھر جلوس ہی کی داستانیں رہیں مگر معزز رؤسا اور حکام اور مہمانانِ سرکاری بالعموم رسمِ افتتاح میں شامل ہوئے۔ نمائش کا مکان گو عارضی تھا۔ مگر مغلیہ طرزِ تعمیر کی ایسی اچھی نقل تھی کہ باید وشاید۔ اُس عمارت کے اندر جانے سے نظر آتا تھا۔ کہ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ہندوستان کی سرزمین ایسے ایسے باہنر لوگوں سے مملو ہے۔ کہ بعض صنعتوں میں اُن کا نظیر روئے زمین پر ملنا محال ہے۔ ان سب فنون کے بہترین نمونے لارڈ کرزن کی کوشش سے دہلی میں یکجا کئے گئے تھے۔ اور یہ متفقہ رائے ہے کہ اس نمائش کی ذریعے ملک کے فنون کے تروتازہ کرنے کی سعی سے وائسرائے بہادر نے ملک کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ اور جو تقریر افتتاح نمائش کی شاندار رسم کے ادا کرنے کے موقعہ پر لارڈ کرزن نے فرمائی۔ اُس سے بہتر اُن کی فصیح زبان سے بھی کم تقریریں نکلی ہونگی۔ اس میں اُنھوں نے راجاؤں نوابوں اور دیگر اہلِ دول کو ملک کے فنون کی حوصلہ افزائی کی زور سے ترغیب دی۔ اور دمِ تقریر یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ حُبِ وطن کے جوش سے لبریز ایک ہندوستانی گفتگو کر رہا ہے۔ نہ کہ ایک انگریز عہدہ دار جو ہزاروں کوس سے عارضی طور پر حکومتِ ہند کے لئے بھیجا گیا ہو۔

۳۱؍ دسمبر کو بھی یوں تو سیر و تفریح والوں کے لئے بیسیوں مشاغل تھے۔ مگر بالعموم یکم جنوری کے عالیشان دربار کی تیاری میں گذرا۔ گھر گھر اُسی کے تذکرے تھے۔ ٹکٹ تو اکثر لوگ پہلے ہی سے حاصل کر چکے تھے۔ مگر پھر بھی بہت لوگ ایسے تھے جو اُس دن ٹکٹ حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔ بہت سے وہ لوگ تھے جو یہ سوچ رہے تھے۔ کہ ٹکٹ بھی ہیں اور پاس بھی ہیں مگر وہاں تک پہنچنے کے لئے تردّد بکار تھا۔ اور اس میں مصروف تھے۔ یکم جنوری کی صبح عجب شان کی صبح تھی۔ سویرے ہی سے لوگ بازاروں میں جوق جوق نظر آنے لگے۔ عید کی نمازیں پڑھنے والے جلدی جلدی نمازیں ادا کر کے اور دوسرے لوگ ویسے آٹھ نو بجے کے بعد سے گاڑیوں میں سوار ہو کر دربار کی طرف روانہ ہوئے۔ دربار کی سڑک پر میلوں تک گاڑیوں کی قطاریں بندھ گئیں اور سب کو آہستہ چلنا پڑتا تھا۔ دس ساڑھے دس بجے دربار کے شاندار مکان میں جو ہلالی صورت میں خاص اس تقریب کے لئے بنایا گیا تھا اجتماع شروع ہوا۔ اس کے بنانے میں یہ ترکیب مدّنظر رکھی گئی تھی کہ نشست کا ایسا انتظام ہو۔ کہ لوگ قطار در قطار بیٹھ سکیں۔ مگر کسی کی نظر اُس سے اگلے آدمی کی وجہ سے رُک نہ سکے۔ دروازے محراب دار تھے اور محرابوں پر سفید روغن اور سُنہری نقش و نگار نظر کو یہ دھوکا دیتے تھے۔ کہ کسی شاہجہانی تعمیر کے دروازے اُکھیڑ کر اس میدانِ وسیع میں نصب کر دیئے گئے ہیں۔ دس سے بارہ ہزار تک منتخبانِ روزگار کی نشست کا انتظام تھا اور سب نشستیں رُکی ہوئی تھیں۔ یہ مجمع ایک ایسا لاجواب مجمع تھا کہ چشمِ فلک نے باوجود اپنے وسیع اور دیرینہ تجربے کے کم دیکھا ہوگا۔ شہزادہ کناٹ و وائسرائے بہادر کی سواریوں سے آنے سے پہلے ہر شخص اپنی جگہ لے چکا تھا اور مقام دربار کے سامنے تیس ہزار انگریزی اور ہندی فوج پرے جمائے کھڑی تھی۔ اور اُن کے چمکتے ہوئے اسلحہ کی نوکوں پر سورج کی شعاعیں پڑتی تھیں اور ہزاروں چھوٹی شعاعوں میں تقسیم

ہو کر آنکھ کو چکاچوند کئے دیتی تھیں۔ دور میدان میں جہاں افواج کا ہجوم زیادہ تھا۔ دیکھنے والے کو نظامی کا یہ شعر یاد آتا تھا ؎

زنسم ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

دونوں سواریاں آتے ہی دربار شروع ہوا۔ نقیب شاہی نے بآواز بلند جس کا ایک ایک لفظ ہر متنفس کو سنائی دیتا تھا۔ شاہنشاہی پیغام سنایا۔ اور اسکے بعد وائسرائے نے ایک نہایت فصیح و بلیغ تقریر فرمائی۔ جو عموماً اخبارات میں شایع ہو چکی ہے۔ مگر جس کے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اُس میں کوئی خاص تاریخی اعلان جو یادگار رہنے کے قابل ہو مندرج نہیں پس کے بعد تمام والیانِ ملک نے فرداً فرداً کورنشات بجا لاکر مبارکبادیں دیں۔ اس ضمن میں حضور نظام کا ایک باضابطہ تہنیت نامۂ مختصر پڑھ کر سنانا اور بیگم صاحبہ بھوپال کا برقعہ پوشی کی حالت میں نذر گذراننا قابلِ ذکر واقعات ہیں۔ والیانِ ملک باری باری سامنے لائے جاتے تھے۔ وائسرائے اور شہزادہ دونوں پاس پاس کھڑے تھے۔ اور دونو جھک جھک کر اُن سے ہاتھ ملاتے۔ مزاج پُرسی کرتے اور مبارکباد قبول کرتے جاتے تھے۔ اُس وقت سلطنت برطانیہ کی عظمتُ جبروت دلوں پر بیٹھی جاتی تھی اور اُس کی وسعتِ لامتناہی اور تعلقاتِ شاہنشہی کا گہرا نقش دل نشیں ہوتا تھا۔

دربار کے بعد بھی آٹھ نو دن تک دہلی میں جلسے تماشے رہے۔ دن عید اور رات شب برات کا نقشہ تھا۔ مگر سب سے نمایاں اور قابل یادگار واقعے جن کی باقی سب یا تمہیدیں تھیں یا تتمے یہی تھے۔ جن کا ذکر کر دیا گیا۔ جس رات دہلی میں لاکھوں بندگانِ خدا نے ولایت کی بے نظیر آتشبازی کا تماشا دیکھا ہے۔ اور جس دن تمام ریاستوں کی افواج کا معائنہ ہوا ہے وہ بھی نظارے کچھ کم دلچسپ نہ تھے۔ لیکن باعتبار اہمیت ان دو واقعات سے بڑھ کر دربار دہلی کے

متعلق مشاغل میں کوئی نہ تھا۔

دہلی نے بھی اس زمانے میں جب پایۂ تخت ہند ہونے کا فخر اُس سے چھن چکا ہے۔ خوش قسمتی سے ایسا جشن دیکھ لیا اور وہ اس عزت پر تادیر ناز کرے گی۔ گو اختتام دربار کے چند ہی روز بعد وہ چہل پہل کم ہونے لگی گو آج وہ عارضی شہر جو نواحِ دہلی میں کسی جادو کے شہر کی طرح پیدا ہو گیا تھا۔ پھر مفقود ہو گیا ہے۔ اور پھر دہلی کے وُہی پرانے کھنڈ ہیں وہی پہاڑیاں اور وہی چٹیل میدان۔ مگر تاریخ ان واقعات کو جو آخر دسمبر و ابتدائے جنوری میں دہلی نے دیکھے۔ دیر تک زندہ رکھیگی اور جو اندنوں میں خورد سال ہیں اوران حالات سے بے خبر رہے ہیں چند سال تک ان بیانات کو کتابوں میں جو کوڑیوں میں تیار ہو رہی ہیں دیکھیں گے اور دلچسپی سے پڑھ کر کہیں گے۔ کاش ہم ایسے جشن میں شریک ہوتے۔

اہلِ قلم کی طرف سے مبارکباد

آج اس وسیع ملک کے ہر گوشے میں جشنِ تاجپوشی کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ رعایا کا ہر طبقہ۔ ہر ملت و مذہب کے لوگ۔ پیر و جواں۔ شادمانی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان کے قدیم پایۂ تخت میں تو جشنِ مہتابی اور تختِ طاؤس کے زمانے کا سماں ایک دفعہ پھر نظروں میں پھر گیا ہو اور تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ مبارکباد کا ایک غلغلہ ہے کہ جس سے آسمان گونج رہا ہے۔ اور ہر طرف سے تہنیت نامے اور مبارکبادیوں کے پیغام نائب السلطنت کی آستانِ دولت کو چوم رہے ہیں۔ اس میں ہم اگر یہ کہیں۔ کہ ہم بھی کروڑوں بندگانِ خدا کے ساتھ جو زیرِ سایۂ برطانیہ رہتے ہیں اور اس وقت اظہارِ وفاداری و شکرگذاری میں شریک تہنیت ہوتے ہیں۔ تو ایک بے اثر بات ہوگی۔ اس عظیم الشان سلطنت کی رعایا کے دریائے ناپیداکنار میں ایک قطرہ کی کیا حقیقت ہے۔

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم

ہاں ایک منصب ادائے تہنیت کا ہمیں حاصل ہے۔ جو باعثِ امتیاز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم ملک کی زبردست اور طاقتور اور دن بدن ترقی کرنے والی جماعت کی طرف سے جن کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اور جو اس کے ذریعہ ملک و سلطنت کی خدمت کر رہے ہیں۔ اظہارِ خلوص و نیاز کیشی کریں اور اُن کی جانب سے حضور پُرنور ہز امپیریل مجسٹی ایڈورڈ ہفتم شاہِ انگلستان و قیصرِ ہندوستان کو سریر آرائی سلطنت پر دلی مبارک دیں۔ ہر ملک کی بنیاد اصل میں دو قوتوں پر ہوتی ہے۔ اہلِ سیف اور اہلِ قلم۔ اور باقی قومیں ان طاقتوں کے تابع ہوتی ہیں۔ خوش نصیبی سے سرکارِ برطانیہ کو اہلِ سیف تو ایسے ملے ہیں۔ کہ دنیا کے جس حصّے میں اُنہیں اپنی سپہگری کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا ہے۔ وہیں اُن کی دھاک پڑ گئی ہے اور سرکار کی افواجِ ہندی کی جفاکشی۔ بہادری اور آزمودہ کاری کی داد بیساختہ دشمنوں کے منہ سے بھی نکلی ہے۔ اس طبقہ رعایا کے ساتھ سرکار کا سلوک ایسا ہے جیسا چاہئے اور دن بدن اُن جانباز دلیروں کی ترقی زیرِ غور رہتی ہے۔ اب رہے اہلِ قلم۔ ان کا بھی بیشتر حصّہ امن و آزادی کی برکتوں کے اعتراف میں عموماً نغمہ سرا رہتا ہے۔ اور یہ بھی دعاگوئے دولت ہیں۔ گو انہیں شکائت ہے کہ ان کے فن کی وہ قدردانی نہیں ہوئی جو اُن کا حق ہے۔ لوگوں کے سر اور لوگوں کی جانیں تو اہلِ سیف کے قبضہ میں ہیں۔ مگر یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ کہ کامیاب اہلِ قلم کے ہاتھوں میں لوگوں کے دل ہیں۔ اور اگر برطانیہ اپنی رعایائے ہندی کے دلوں پر حکمرانی کرنا چاہے۔ تو اُسے اہلِ قلم کو اپنا بنانا چاہیئے۔ یہ مطلب نہیں کہ اب وہ کچھ بیگانے ہیں۔ یا کہیں خدمت سے بھاگے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ کہ اُن سے وہ کام نہیں لیا جاتا۔ جس کے لئے وہ اسقدر موزوں ہیں۔ جو کچھ بن پڑتا ہے۔ بغرضانہ طور پر کر بھی رہے ہیں۔ مگر ان کی جماعت

گوشِ بر آواز بیٹھی ہے۔ کہ ملک یا سرکار اُن سے کوئی خاص خدمت لے:۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

اس مبارک موقعہ پر جوشنِ جلوس کے ساتھ روزِ عید و نوروزِ سعید بھی ہے۔ وہ دُرہائے مضامین جو ان تاجدارانِ ملکِ سخن نے بلا دریغ تاجِ شاہی پر نثار کئے ہیں۔ اس قابل ہیں کہ دریا کے موتی ان کے سامنے عرقِ شرم میں ڈوب جائیں اور کانوں کے جواہر اُن کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ آج کا یہ مخزن اس خصوصیت پر ہمیشہ ناز کریگا۔ کہ اسے نہ صرف شاہِ جمجاہ اور ملکۂ ذیشان کی تصویروں اور ہزاکسلنسی لارڈ کرزن و لیڈی کرزن کے ہر دلعزیز نقوش سے زینت ملی۔ بلکہ اسے اس بات پر بھی فخر ہوگا۔ کہ اُن تاجدارانِ ذی وقار کے زیرِ سایۂ ملک کے اُن ناظموں اور ناثروں کی بھی تصویریں زیبِ اوراقِ مخزن ہوئیں جنکا مخزن پر احسان ہے۔ ان تصویروں میں مخزن کے سارے قلمی معاونین رونق افروز نہیں۔ اور ممکن ہے کہ ایک مرقع اور شایع کرنا پڑے۔ مگر جو ہیں اُن سے رسالہ کی جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان میں پرانی تعلیم کے نمونے بھی ہیں اور نئی تعلیم کے نتیجے بھی۔ اُن میں ولایت کے تہذیب یافتہ احباب بھی ہیں۔ اور یہاں کے کالجوں کے تربیت یافتہ بھی۔ اُن میں وہ بھی ہیں جو ابھی کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جن کی طبّاعی۔ ذہانت اور شوقِ ترقی کے ساتھ ملک و قوم کی ترقی کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اُن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اور یہ سب اہلِ قلم۔ مترجم۔ مولف یا مصنف۔ شاعر یا نثّار اس اظہارِ مسرت اور تہنیت میں ہمارے ہم زبان ہیں اور اخلاص کے پھول ارادت کے ہاتھوں سے نمکحلالی۔ وفاداری اور سپاس گذاری کے معبد پر چڑھا رہے ہیں۔ ع

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

بے سروسامانی

جدھر نظر اُٹھا کر دیکھو۔ ایک دنیا سروسامان کی فکر میں سرگردان نظر آتی ہے۔ کوئی کامیاب ہو۔ کوئی ناکام۔ مگر یہ دُھن اور یہ سودا ہر سر میں موجود ہے۔ کہ مکان ہو آراستہ۔ اور لباس ہو پیراستہ۔ گاڑی گھوڑا سواری کے لئے مل جائے دو چار نوکر چاکر خدمت میں حاضر رہیں۔ اور کچھ نہیں تو زروجواہر بھی مضبوط صندوقِ آہنی میں بند ہوں۔ بازار میں ہو کر نکلیں تو دس بیس سلامی ہوں۔ اور گھر میں بیٹھیں تو کوئی آکر پُرسانِ حال ہو۔ کسی مجلس میں جائیں تو لوگ تعظیم کو اُٹھیں۔ اور خلوت میں ہوں تو احباب دیکھنے کے لئے طلبگار ہوں۔ یہ باتیں لوازم شائستگی و تہذیب سمجھی جاتی ہیں۔ اور ہر شخص دل وجان سے ان ہی باتوں کا فدائی ہے۔ کون سی مصیبت ہے جسے انسان اس مقصدِ عالی کے حاصل کرنے کے لئے نہیں اُٹھاتا۔ بچہ مدرسہ اور مکتب میں جا کر جورِ استاد سہتا ہے تو اُس کے ننھے سے دماغ میں یہی خیال ہوتا ہے۔ جو والدین کی باتوں سے اُس کے ذہن میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ ذرا اور بڑا ہوا۔ مدرسہ سے نکل کر بیت العلوم میں پہنچا۔ تو کیا پوچھنا۔ ہُوا کے گھوڑوں پر سوار ہے۔ اُمنگوں اور آرزوؤں کا لشکر دل میں ہے۔ امید کا لہلہاتا ہوا باغ آنکھوں کے سامنے ہے۔ یاس کا کانٹا نظر سے اوجھل ہے۔ کوئی محتاط تجربہ کار جتا بھی دے کہ ذرا ہوشیار رہنا یاس اُمید کے ساتھ لگی ہوئی ہے تو اُس کی یہ تنبیہ بُری معلوم ہو۔ یاس کا خیال دل میں لانا تک روا نہیں۔ عہدِ شباب کی مستی اور اس پر نشۂ علوم۔ کتاب میں ہے۔ کبھی کمرے میں ٹہل رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ کبھی باغوں کی روشیں ہیں اور اُن پر ٹہلتے ہوئے کتاب کا رٹنا۔ کبھی آدھی رات ہے اور چراغ اور طالب علم۔ آخر فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے۔ قوےٰ مضمحل۔ دماغ پریشان اور وہی تلاش سروسامان پیشِ نظر۔ اس

جستجو کے زمانے میں بے سروسامانی یُونہی ذراسی جھلک دکھاتی ہے۔ وجہ معاش پیدا کرنے میں دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ روزی کے سب دروازے بند نظر آتے ہیں۔ کوئی کھُلے ہی کھلے تو کلید زر سے کھُلتا ہے۔ اور اسی کی کمی ہے۔ اپنی محنت پر پچھتاوا شروع ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں پڑھ پڑھ کے دیوانہ ہوگیا ہے اور یہ فرماتے ہیں کہ جناب من! سالہا سال "دُودِ چراغ خوردہ سحر کردہ ام بروز"۔ پھر اگر دماغ میں خشکی کا اثر ہو تو آپ تعجب کیوں کرتے ہیں۔ "معذورم ار نماند دماغ مرا تری"۔ اتنے میں امید وبیم کے بھنور میں غوطے کھاتے کھاتے آخر اُس کی اُمیدوں کی کشتی ساحلِ مراد پر جالگتی ہے۔ اور کامیابی کی ہوا سر میں سماتی ہے۔ وہ ساز وسامان جس کی جستجو تھی۔ سارا نہیں تو آدھا میسر آنے لگتا ہے۔ پیٹ میں روٹیاں آتے ہی چودہ طبق منور نظر آتے ہیں۔ اور سرخوشی کی سوجھتی ہے مے گلرنگ کے دور چلتے ہیں اور عیش و نشاط کے طور ہوتے ہیں۔ اُس وقت کوئی بے سروسامان اپنا دُکھڑا روئے یا کوئی اور اُس کے لئے مدد مانگے تو ایسے کاموں کا ہوش کسے اپنی کامیابی میں مست ہیں۔ ابھی یہ نشہ اُترا نہیں ہوتا۔ کہ حرص اور ناصبوری آکر اپنا سکّہ جماتی ہیں۔ جو سامانِ عیش میسر ہے وہ نظر میں ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ اور اُس سے بڑھ کر ساز وسامان کی تلاش ہوتی ہے۔ اور کچھ اور ملنے پر وہاں طمع سے "ہل من مزید" کی صدا نکلتی ہے۔ یہ وہ مرض ہے جسے امراضِ اخلاقی کے اطبّا نے لاعلاج قرار دیا ہے۔ اور اسی کی بدولت یہ نوبت پہنچتی ہے کہ آدمی کی آرزؤں کا جہاز مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے کام سے جاتا رہتا ہے۔ اس مایوسی میں ایک حالت انسان پر آتی ہے جس میں نہ صرف بے سروسامانی کی قدر آجاتی ہے۔ بلکہ اُس کے حصول کی تمنّا پیدا ہوتی ہے۔ یہ فقط انتہائے یاس کا ایک ظہور ہوتا ہے۔ ورنہ کسی کے دل کو ٹٹول کر دیکھا جائے تو اس میں پھر کوئی نہ کوئی حسرت بھری ہوئی ہوتی ہے۔

اس کیفیّتِ قلبی کا ایک عجیب اور پُر زور نقشہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے کھینچا ہے۔ گویا بے سرو سامانی کی تصویر کھینچ دی ہے :-

رہئیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے　　کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار　　اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مگر یہ بے سرو سامانی اشعار میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جب سب سامان موجود ہوں اور کسی ایک آدہ اُمید میں ناکامی کا سامنا ہو جائے تو ناز پروردہ انسان اپنی بے اطمینانی کا اظہار اس طرح اپنے آپ کو کوس کر کرتا ہے لیکن اگر ایسا خوفناک سماں کبھی فی الحقیقت موجود ہو جائے۔ تو آدمی فوراً گھبرا جاتا ہے بڑے بڑے فلسفی جو دنیا کو قناعت کا وعظ سُناتے تھے۔ جو تنہائی کی خوبیاں گھنٹوں تک اس فصاحت سے بیان کرتے تھے۔ کہ سُننے والے اُن کی شیرینیٔ کلام پر عش عش کرتے تھے۔ جو ماں کو سمجھاتے تھے کہ جدائی سے نہ گھبرانا۔ جو باپ کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کھانا۔ جو بیوی کو بہلاتے تھے کہ خیریت ہے۔ چار دن مشکل کے ہیں۔ پھر اسی حلقۂ خانہ داری میں آئے جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کو دیکھا گیا ہے۔ کہ جب کبھی عارضی طور پر بھی وہ امتحان میں ڈالے گئے ہیں اور اُنہیں تنہائی کے صدمے۔ فرقت کے رنج اور بے سرو سامانی کے غم اُٹھانے پڑے ہیں تو آخر اُن کی ثابت قدمی اُنکو جواب دے گئی ہے۔ اور وہ بے صبری سے چلّا اُٹھے ہیں۔ ہائے وہ پہلی حالت! اس وقت شاید انہیں خیال آتا کہ اصلی بے سرو سامانی خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُن میں کس کس نے عہد کر لیا ہو۔ کہ اگر اب کے بہ خیریت اپنی پہلی حالت کو پہنچ جاؤں تو نہ صرف سجدۂ شکر ادا کرونگا بلکہ خدا کی شکر گذاری کا عملی ثبوت اُس کے ایسے بندوں کے ساتھ جو سرو سامان نہیں رکھتے۔ بھلائی کرنے سے دونگا گرما میں اپنے خسخانہ و برفاب سے آرام پاتے ہوئے غربا کو کم از کم ٹھنڈا پانی تو پلاؤنگا

سرما میں اپنے حماموں اور انگیٹھیوں سے آسائش حاصل کرتے ہوئے یہ بھی ذہن میں رکھونگا۔ کہ کئی ایسے بھائی ہیں۔ جن کے پاس آگ تاپنے کو نہیں۔ کمبل اوڑھنے کو نہیں۔ گدڑی بچھانے کو نہیں اور یہاں تک کہ کہیں جیتھڑا بدن ڈھکنے اور لسے اپنی زندگی کا مقصد اعلیٰ بناؤنگا جہاں اپنے لئے لباس حریر و سمو۔ یا کم از کم بانات کے کوٹ سِلاؤنگا۔ وہاں بے سرو سامانوں کے لئے کچھ موٹے سوتے چوغے چھینٹ کے یا کسی سستے گرم کپڑے کے بھی تیار کرادونگا۔ اور انہیں اس بے سروسامانی سے بچاؤنگا۔ جس کے سامنے کھاتے پیتے چلتے پھرتے تندرست توانا اور کامیاب لوگوں کی نازک دماغی سے بھری ہوئی شکائیتیں ہیچ ہیں انہیں نہ صرف اپنے متعلق قناعت سے کام لینا چاہیئے۔ بلکہ دوسروں کی بے سروسامانی سے اپنی ثروت کا مقابلہ کرکے جس حد تک ممکن ہو۔ دوسروں کی بھلائی میں کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے انہیں وہ سروسامان ملے گا جسے نہ گھن کا ڈر ہے نہ زنگ کا۔ جو جتنا پرانا ہوگا چمکیگا اور جتنا بانٹا جائیگا بڑھیگا۔

دَربارِ اعظم

دربار دہلی کے ملکی۔ تجارتی۔ اور سیاسی نتائج تو مہینوں سے معرض بحث میں ہیں اور جہاں بعض لوگ اُن کے معترف ہیں۔ وہیں بعض لوگ اُن کے قائل نہیں۔ لیکن شائد دربار کے علمی نتائج پر غور کرتے ہوئے اس امر سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اُردو علم ادب کی صنفِ قصیدہ گوئی کے مردہ قالب میں دربار نے دوبارہ جان ڈالدی ہے اور اس مبارک تقریب پر ہمارے ملک کے جادو نگار سخنوروں نے اپنی اپنی طبیعتوں کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ گو ایک زمانہ قصائد پر ایسا گذرا ہے۔ کہ تصنع۔ مبالغہ اور غلو کی کثرت نے انہیں اصنافِ سخن میں نہ صرف ایک مدعا ظل بلکہ سخنوری کے لئے ایک مرضِ مہلک بنادیا تھا

اور طمع زر کے سبب قصیدہ گوئی شاعروں کی آزاد منشی کا خون کردیتی تھی۔ تاہم یہ کہنا پڑتا ہے کہ مشرقی شاعری کی اقسام میں دراصل قصیدہ ایک ضروری جزو ہے۔ اور اگر اس میں مبالغہ کی جائز حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تو شاعری کی طبیعت کے امتحان کے لئے شائد ہی کوئی اور ذریعہ اس سے بہتر نکل سکے ہم نے خوشی سے اس بات کو دیکھا۔ کہ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم مدظلہ کی شان میں جو قصائد نکلے ہیں۔ وہ چونکہ امیدِ نفع ذاتی سے نہیں لکھے گئے۔ اس لئے عموماً اُن عیوب سے جو قصیدہ گوئی کو لے ڈوبے تھے خالی ہیں اور بہت سی نئی خوبیاں رکھتے ہیں۔ جنہیں آجکل کا مذاق ڈھونڈھتا ہے۔ ایسے قصائد میں ایک ممتاز قصیدہ "دربارِ اعظم" کے نام سے ہمارے نامور دوست آغا شاعر قزلباش دہلوی۔ ارشدِ تلامذۂ نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی کی تصنیف ہے۔ جو نہایت اہتمام سے یوسفی پریس دہلی میں طبع ہوا ہے۔ اس میں کوئی دو سو اشعار ہوں گے۔ اہلِ فن جانتے ہیں کہ اتنے اشعار قصیدہ کے لکھنا کس قدر دشوار یاں رکھتا ہے۔ خصوصاً جب زمین مشکل انتخاب کی گئی ہو۔ جیسے حضرت آغا شاعر نے کی ہے۔ ایسی سنگلاخ زمین میں پھولنا پھلنا۔ ہر شخص کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے لئے طبع خداداد کے ساتھ مشق کامل درکار ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ صرف تیس سال کی عمر کو پہنچنے تک کلام شاعر ایسا اُستادانہ کیونکر ہوگیا اور ابھی انتہا دیکھیں کہاں ہوتی ہے۔ زبان کی خوبیاں تو ویسے ہی اہلِ دہلی کا حصہ ہیں۔ مگر آغا شاعر اس بارہ میں امتیازِ خاص رکھتے ہیں۔ ہم نموناً جستہ جستہ مقامات اس عمدہ قصیدہ کے نقل کرتے ہیں۔ پہلے تشبیب ملاحظہ ہو:-

مثل رکھتے ہیں کہیں کُن فیکوں کے جوہر؟ — واہ کیا شانِ تصنع ہے زہے صنعت گر
کیا قیاسِ بشری جو نرّی قدرت جانچے — مہر کے سامنے کب آنکھ کو ہے تابِ نظر
ایک سے ایک کی صورت نہیں ملتی حاشا — ایک سے ایک طبیعت نہیں ہوتی خوگر
کہیں تصویرِ بگلی پر ہے پری کا عالم — کہیں بازیچۂ ہر سنگ ہے مسجودِ بشر

کہیں بلبل کا ترانہ کہیں قمری کی صدا — کہیں بالیدگیٔ سرو کہیں ہیں گل تر
کہیں دریا ہے کہیں ہے لبِ خشکِ ساحل — خس و خاشاک کہیں ہیں کہیں سلکِ گوہر
حسنِ مہتاب کہیں تقویتِ جوششِ نمو — تابشِ مہر کہیں جانِ ریاحین و ثمر
نغمۂ نے کہیں دلکش کہیں آہنگِ سرود — نالہ و آہ کہیں راحتِ قلبِ مضطر
کہیں زخمِ دلِ صد پارہ ہیں گلہائے اُمید — کہیں داغِ جگری یاس و الم کے جوہر
کہیں سوزش کہیں سازش کہیں دل اور خیال — کہیں آتش کہیں گلشن کہیں غنچہ کہیں زر
وہ سرِ شام کہیں ایک چمن کا جوبن — ہلکا ہلکا وہ دھواں باغ کے اوپر اوپر
قبلۂ رخ کی وہ شفق زردئے رخسار کیساتھ — چمپئی رنگ میں ڈوبی ہتی گلابی چادر
وہ درختوں کی پھننگوں پہ ہزاروں عالم — اُن کے سایہ میں وہ سبزے کی جھلک تا سر
ٹٹیاں مہندی کی ہر چار طرف کتری ہوئی — بیچ میں جنگلے وہ لوہے کے پئے حفظِ شجر
وہ مناسب روشیں اور وہ گملوں کی قطار — لہلہاتے ہوئے وہ پھول اِدھر اور اُدھر
نیچے اک قطع میں لبریز وہ نتھرا پانی — ہلکی ہلکی سی جسے جنبشیں تھیں رہ رہ کر
لالٹینوں کی چمک کا وہ سنہرا پرتو — بجلیاں کوندتی تھیں پانی کے اندر باہر
وہ حسینوں کے پرے آئینۂ برقِ جمال — گون پہنے ہوئے ہر سمت بتانِ آذر
وہ ستمگارِ تبسم وہ جفا گر چتون — بجلیاں اس سے گریں اُس سے رواں ہوں خنجر
فتنہ پرداز نگاہیں کہ جگر میں ٹھہریں — اتنی بیتاب ادائیں کہ ادائیں ششدر
ایک سے ایک زیادہ تھا مٹانے کیلئے — ہر طرف خوبیٔ اُستادِ ازل کے مظہر

اس کے بعد گریز اصل مضمون کی طرف ہے جو لنڈن کی تاجپوشی سے شروع ہوتا ہے اور اس میں وہاں کی رسمِ تاجپوشی کو بہت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں واقعیت کا رنگ تاریخی اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ تمام وہ رسوم جو ویسٹ منسٹر ایبے میں جس میں سلاطین و مشاہیر انگلستان کے مرقد ہیں اور جہاں رسمِ تاجپوشی عیسائی مذاہب کے قواعد کے مطابق ادا کی جاتی ہے۔ نہایت بسط کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ اثنائے بیان میں فرماتے ہیں:-

اتنے میں شاہ بھی پوشاک بدل کر آئے — اور اک کرسیٔ زریں پہ ہوئے زینت گر
گرد آ آ کے اراکین نے حلقہ باندھا — جس طرح ایک لڑی میں ہوں پروئی گوہر
رشک سے بالِ ہما ہوگیا روپوش کہیں — اک سرا پردۂ زریں کو جو کھینچا سر پر
آئے پھر سامنے وہ تیل لئے صدر اُسقف — شاہ کے سر پہ بہایا اُسے چمچہ بھر کر
پہلے تو شکلِ صلیب اُس سے بنائی پوری — پھر یہ الفاظ کہے اپنی زباں سے فرفر
تیرا سر بھی یونہیں ممسوح ہوا والا جاہ — جیسے ممسوح ہوا کرتے تھے شاہانِ دگر
جیسے ممسوح ہوا کرتے تھے کاہن پہلے — انبیا اور شہنشاہ۔ خدیوِ کشور
پھر دو زانو ہوئے شہ اور دعائے برکت — مانگی جانے لگی اسمائے الٰہی پڑھ کر
اس سے جس وقت فراغت ہوئی تو شاہ کو — ایستادہ ہوئے مانند ہزبر صفدر
دفعتاً لائی گئی پہلو سے اِک تیغِ اصیل — صدرِ اُسقف نے اُسے پیش کیا خود لیکر
اور کی عرض کہ اے شاہ مبارک ہو تجھے — یہ وہ شمشیر ہے جس کا نہیں کوئی ہمسر
پہلوئے شاہ مزین رہے اس سے ہر دم — خونِ دشمن سے چمکتے رہیں اس کے جوہر
باندھ اس کو تو کمر میں کہ ترا حصہ ہے — تجھ کو بخشا ہے خداوند نے بانکا زیور
اِس سے انصاف ہی کرنا کہ یہی شایاں ہے — اس سے بجھ جائیں جو بڑھتی ہوں فطرت کے شرر
اِس سے اے شاہ کلیسا کی حفاظت کرنا — اس سے امداد یتیموں کی ہو بیووں کو مفر
چیزیں برباد جو ہو جائیں انہیں کرنا بحال — اور جو ٹھیک ہوں قائم انہیں رکھنا سرور
گوشمالی اُسے دینا جو سرِ کبر اُٹھائے — اس سے اصلاح بھی ہو جائے جو ہو نوعِ دگر
تاکہ الطافِ خداوند میں تیری گذرے — عاقبت میں بھی حکومت ہو تری جوبن پہ
لیجئے شاہی لبادہ یہ انگوٹھی بھی ہے — اور دستانے بھی حاضر ہیں کرامات ادھر
پہنئے شوق سے یہ ارثِ قدیمانہ ہے — یہ عصا لیجئے۔ دونوں ہیں یہ شاہی زیور
ایک پر فاختہ ہے دوسرے پر شکل صلیب — دونوں یہ قوتِ بازو ہیں نہ ہے فتح و ظفر
ٹھہرئیے ٹھہرئیے اک اور امانت ہے حضور — یہ وہ ہے نصرت و اقبال ہیں جس کے چاکر
کہہ کے یہ تاج اُٹھایا ز سرِ فرش بانگاہ — رکھ دیا جھوم کے سر تاجِ شہاں کے سر پر

باجے بجنے لگے اک بار خوشی کے پھر تو — اُڑ گئے نعرۂ بہجت سوئے چرخِ اخضر
سر ہوئیں توپیں۔ اُسی وقت سلامی اُتری — شور اُٹھا کہ سلامت رہیں شاہ و قیصر

اس کے بعد دربارِ دہلی کی طرف عنانِ توجہ پھرتی ہے۔ دِلّی کو مخاطب کرکے جو اشعار پر تاثیر لکھے ہیں۔ قابلِ داد ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

واہ کیا کہنا ترا جانِ جہاں اندرپت — تیری ہی خاک سے چمکے ہیں ہزاروں اختر
آسماں تیری زمیں کو جو کہیں زیبا ہے — ذرّہ ذرّہ ہے تری خاک کا مہرِ انور
تجھ میں وہ لعل چھپے ہیں کہ نہ تھا جنکا نظیر — تجھ میں وہ گوہرِ نایاب کہ قدرت ششدر
دھرم اوتار۔ مہابیر۔ رشی اور مُنی — وہ جواں مرد کہ میدان نہ چھوڑیں مرکر
وہ شہنشاہ اُولوالعزم وہ خدامِ قریش — وہ شجاعانِ عرب میرِ عجم گردوں فر
جاں نثارِ ازلی پُشت و پناہِ اسلام — سرفروشانِ سرانداز و جلالت پیکر
وہ بہادر کہ بگڑ جائیں تو لے لیں اقلیم — بات پہ آئیں تو دم بھر میں اُلٹ دیں لشکر
وہ حسینانِ جہاں جن کا نہ پرتو دیکھا — مہرِ گردوں کی بھی پڑتی تھیں نگاہیں جن پر
انتخاباتِ زمانہ حکمائے کامل — فضلائے ادب آموز و طریقت گستر
پاکبازانِ حقیقت۔ سخن آرائے حجاز — معدنِ علم و عمل مخزنِ تفہیم و نظر
تو وہ ہے جس سے ہر اک شہر نے رونق پائی — تو وہ ہے لفظ و معانی کا ہی تو ہی مصدر
تیرے ہی در سے تو آئے ہیں اُردو والے — بات کرنے کی روش لطفِ زباں کے تیور
تو وہ ہے تو نے لٹایا ہے چمن کو اپنے — ہند میں چار طرف ہیں تری بخشش کے ثمر
برسوں آدابِ تلفظ کو کیا ہے تعلیم — درس و تدریس سے ہر شخص ہوا بہرہ ور
پھر خدا جانے یہ کیا ہے کہ زمانہ دشمن — اُف رے احسان فراموشی اربابِ ہنر
تجھ کو دِلّی بھی کہیں تو بھی تو اے اُمِّ بلاد — ریشِ بابا پئے بازی ہے نہ زلفِ مادر
اب کے بھی دور میں تیرے ہی رہا سر سہرا — تاجپوشی شہِ جم جاہ کی ہے پیشِ نظر
یہ وہ عالم ہے کہ برسوں نہ کوئی بھولیگا — یہ وہ چرچے ہیں زبانوں پہ رہیں گے اکثر

سلہ ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی کثیر تعداد کی طرف اشارہ ہے،

گھما گھمی ہے وہ ہر چار طرف نامِ خدا لفظ بھی صاف سُنائی نہیں دیتے دیگر
غرض کہانتک نقل کریں۔ مرصع قصیدہ لکھا ہے۔

حیات جاوید پر ایک تنقیدی نظر

سنہ ۱۹۰۱ء میں اردو علم ادب کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا۔ یعنی مولانا الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی جیسے مشہور مصنف کے قلم سے سر سید احمد خاں مرحوم جیسے نامور محسنِ ملک و قوم کے حالاتِ زندگی ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شایع ہوئے ہیں۔ جس کا نام "حیاتِ جاوید" تھا۔ یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ کہ اس سے موزوں تر نام ایسی کتاب کے لئے ملنا مشکل ہے۔ اس ملک میں اور زمانۂ حال میں اگر کسی مسلمان سے ایسے کام بن پڑے ہیں جن کے سبب وہ جاودانی زندگی کا مستحق ہو اور اُس کا نام قائم رہے۔ جب تک کہ مسلمانان ہند قومی حیثیت سے زندہ ہیں۔ تو وہ سر سید احمد خاں تھا۔ اور اُس کی حیات کے سوانح کو "حیات جاوید" کہنا بالکل حق بجانب ہے۔ یہ کتاب شایع ہوتے ہی مقبول ہوئی۔ بلکہ شاید یہ کہدینا داخلِ مبالغہ نہیں کہ چھپنے سے پہلے مقبول ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے منتظر تھے۔ اس کا مطبع سے نکلنا تھا کہ قبولِ عام استقبال کو دوڑا۔ اور ہر دلعزیزی نے قدم لئے۔ دام بھی حجم اور حسنِ طبع کے اعتبار سے زیادہ نہ تھے۔ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ بعض بڑھیا قسم کی جلدیں تو بہت جلدی ہو چکیں اور جو باقی تھیں وہ رفتہ رفتہ بکتی جاتی ہیں۔ گو اُس کامیابی کی جو کسی ایسے مصنف کی کتاب کو جس میں کسی ایسے یگانۂ روزگار کے حالات درج ہوں۔ انگلستان جیسے ملک میں ہوتی۔ تو توقع ہی نہ تھی۔ مگر اس ملک کے اعتبار سے جس قدر کی نگاہ سے اس کتاب کو دیکھا گیا اور جو کامیابی اسے ہوئی۔ وہ بہت غنیمت ہے اور یہ اُمید دلاتی ہے کہ وہ زمانہ روز بروز قریب آتا جاتا ہے۔ کہ جب عمدہ اور مفید کتابیں

زبانِ اردو میں بکثرت لکھی جائینگی اور بکثرت بکیں گی۔ ہم اس کتاب کے قابل اور واجب التعظیم مصنّف کو اس کامیابی پر صدقِ دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اگر طبع ثانی کی نوبت آئے تو انہیں اس سے بھی زیادہ کامیابی ہو۔ کیونکہ یہ اوراق سالہا سال کی جگر کاوی کا نتیجہ ہیں۔ اور مدتوں مولانا حالی اس دھن میں رہے ہیں کہ سر سیّد کی سوانح عمری لکھیں۔ جب کہیں جاکر یہ جلد تیار ہوئی ہے۔

یہ کتاب شائع ہوتے ہی مخزن کو بغرض تنقید عطا ہوئی۔ ہم نے اسے بغور پڑھا۔ اور پڑھ کر حضرتِ مصنّف کو اطلاع دی۔ کہ اس پر بہت آزادانہ اظہارِ رائے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اُنھوں نے بکمال دریا دلی اجازت دی کہ پوری آزادی سے تنقید لکھی جاوے۔ یہ اجازت ہمارے ملک میں ہر مصنّف نہیں دے سکتا۔ یہ مولانا حالی کا ہی حصّہ تھا۔ موجودہ زمانہ کے سرکردہ اہل قلم میں مولانا ہی پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں انگریزی کے آزادانہ رنگ میں تنقید کے لئے قلم اُٹھایا ہے اور منصفانہ رائیں دی ہیں۔ اس لئے یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی سب سے بڑی تصنیف پر ہی مخزن میں سب سے پہلے اُس قسم کی بے دھڑک رائے لکھی جاوے۔ جس کی ملکی علم ادب کی ترقی کے لئے ضرورت ہے اور جس کے کبھی کبھی لکھتے رہنے کا کام ہم نے ایک ابتدائی مضمون میں جو بہ عنوان "فن تنقید" شایع ہوا تھا۔ وعدہ کیا تھا۔ اتنے عرصہ تک سکوت اس لئے اختیار کیا گیا کہ کہیں آزاد تنقید کا مضر اثر کتاب کی خریداری پر نہ پڑے۔ کیونکہ باوجود اُس ساری نکتہ چینی کے جو اس کتاب پر ہوسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اُردو میں اس ضخامت اور خوبی کی اپنی قسم کی پہلی ہی کتاب ہے۔ جس کا پڑھنا ہر اُردو خواں کے لئے بالعموم اور ہر مسلمان کے لئے بالخصوص نہایت ضروری اور مفید ہے۔ اب چونکہ کافی عرصہ اس کو چھپے ہوئے گذر چکا ہے اور ایک معقول

حد تک خریداری ہو چکی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں۔ کہ بالکل صفائی سے اُن خیالات کا اظہار کر دیں۔ جو اس کو پڑھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ اور جن کا قابل مصنف تک پہنچانا خالی از فائدہ نہ ہو گا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ اگر بعض نکات پر اُن کی رائے ہماری رائے سے متفق ہو تو طبع ثانی اُن نقائص سے جو اس کتاب میں رہ گئے ہیں۔ مبرا ہو کر نکلے۔ اور آیندہ کے لئے تنقید کا راستہ صاف ہو جائے۔ اور لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ جب وہ تمام عقیدت اور ارادتمندانہ خلوص جو ہم مولانا موصوف سے رکھتے ہیں ہمیں اُنکی کتاب پر آزادانہ تنقید لکھنے سے روک نہیں سکے۔ تو بہ دیگراں چہ رسد۔ اگر ہمارے ہاں کتابیں بھیجیں تو صاف صاف باتیں سُننے کے لئے تیار رہیں۔ یہ ممکن ہو کہ کبھی ہماری صاف گوئی غلطی پر مبنی ہو۔ مگر یہ کوشش کی جائیگی کہ جو کچھ کہا جائے ایمانداری سے کہا جائے اور بے لاگ ہو۔

جہاں یہ بات تعجب خیز ہے کہ سیّد احمد خاں جیسے فرید الدہر کے انتقال کے بعد صرف ایک کتاب اُردو زبان میں اس کے حالات پر لکھی جائے۔ وہیں یہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ کہ "حیات جاوید" کی سی کتاب پر اسقدر تھوڑے ریویو لکھے جائیں۔ یوں تو کئی اخباروں میں مختصر طور پر رسمی تعریف چھپ گئی ہوگی مگر جہانتک ہمیں علم ہے۔ صرف تین چار مشہور اہل الرائے حضرات نے اس پر بسیط رائیں لکھیں۔ ان میں سب سے پہلی اور سب سے مفصّل رائے رسالہ معارف میں (جس کے بند ہو جانے پر رہ رہ کے افسوس ہوتا ہے) اس کے لائق ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم نے لکھی تھی۔ جو مولانا حالی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ اُنھوں نے کتاب کی تعریف کا تو حق ادا کر دیا۔ مگر تصویر کے دوسرے رُخ پر یا تو جوشِ ارادت نے اُنہیں نظر ڈالنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ یا اُنہوں نے کتاب کو انگریزی رسم تنقید کی عینک لگا کر نہیں دیکھا۔ اور انگریزی سوانح عمریوں کے معیار سے نہیں جانچا۔ اس کے علاوہ ایک ریویو علیگڈھ گزٹ میں شمس العلماء

مولوی ذکاء اللہ صاحب کے قلم سے نکلا تھا۔ مگر وہ تو بالکل مایوسی بخش تھا۔ اور جس قسم کے "ریویو" کی توقع اُن سے ہو سکتی تھی۔ اُس کے برعکس تھا۔ ہاں ایک قابلِ قدر تنقید نہایت برجستہ الفاظ اور شستہ عبارت میں ضلع علیگڈھ کے ایک فاضل رئیس مولوی حبیب الرحمٰن خاں حسرت شروانی نے لکھی تھی جو لفظ تنقید کی مستحق تھی۔ مگر وہ کتاب کے صرف ایک پہلو کا موازنہ تھا۔ اور اُس میں زیادہ تر اُس حصّہ کتاب پر اعتراضات تھے۔ جو سر سید مرحوم کی مذہبی حیثیت سے متعلق تھا۔ اور جس میں خان صاحب موصوف کے نزدیک مولانا حالی طرفداری سے جو مورّخ اور سوانح نگار سے کوسوں دور ہونی چاہئے۔ پوری گُریز نہیں کر سکے تھے۔ گو اس بارہ میں خانصاحب کے خیالات سے جو اُس مضمون میں ظاہر ہوئے تھے۔ ہمیں پورا اتفاق نہ ہو۔ تاہم اُنہیں بہ حیثیتِ مجموعی درست سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے تنقید کے اس ایک پہلو پر اس مضمون میں کچھ نہیں لکھیں گے یہ فرض حسرت شروانی بخوبی ادا کر چکے ہیں۔ ہم اس کتاب کو سوانح نگار اور ادیب کی نظر سے دیکھیں گے اور جو نقص ان اعتبارات سے اس میں نظر آئینگے وہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے۔

مشہور لوگوں کے سوانح عمری پر کتابیں لکھنا خصوصاً اُس طرز میں جو اُردو میں مولانا حالی نے اختیار کی ہے۔ ہندوستان میں ابھی ایک جدید فن ہے۔ جو مغرب سے مستعار لیا گیا ہے اور جس کے اعلیٰ نمونے اس وقت مغربی زبانوں کے ادبیہ ذخیروں میں موجود ہیں۔ پس اگر سوانح عمری کے متعلق کسی تصنیف کو جانچتے ہوئے ہم مغربی معیار پیشِ نظر رکھیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ انگریزی میں بہترین سوانح عمری وہ گنی جاتی ہے جس میں ممدوح کی بولتی چالتی تصویر دکھا دی جائے۔ اور زمانہ حال میں کئی اس قسم کی کتابیں وہاں لکھی گئی ہیں۔ مگر سب سے پہلی کتاب جس نے اس بارہ میں انگلستان میں شہرت حاصل کی اور جو شہرت لازوال ثابت ہوئی ہے۔ وہ باسول صاحب کی تصنیف کردہ

"حیاتِ جانسن" ہے۔ ڈاکٹر جانسن اٹھارہویں صدی عیسوی میں گذرے ہیں اُنہوں نے انگریزی زبان کی سب سے پہلی اور مستند لغت تصنیف کر کے نام پیدا کیا۔ اور ویسے بھی اُن کی بہت سی تصانیف نظم و نثر متداول ہیں۔ ان کی زندگی۔ طرزِ بود و باش۔ رفتار۔ گفتار۔ تقریر تحریر کا جو سچا اور ہوبہو چربا باسول نے اُتارا ہے۔ وہ اُسی پر ختم ہے۔ باسول گو مولانا حالی کی طرح اپنے ملک کے مشہور اہلِ قلم میں سے نہ تھا۔ اور نہ "حیاتِ جانسن" کے سوا کوئی اور کتاب باعثِ شہرت چھوڑ مرا ہے۔ مگر "حیاتِ جانسن" لکھنے میں اُس نے سوانح نگاری کے مراتب ایسی خوبی سے ادا کئے ہیں۔ کہ خود اپنے لئے بھی ایسا نام پیدا کر گیا۔ کہ کہا جاتا ہے کہ جبتک انگریزی زبان زندہ ہے اُس کا نام بھی زندہ رہیگا۔ اس کامیابی کا کیا راز تھا۔ صرف یہی کہ جس دن سے اُسے خیال پیدا ہوا کہ جانسن کی حیات لکھی جاوے۔ اُسی دن سے اُس نے اپنے آپ کو جانسن کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ سفر میں حضر میں ہر وقت ساتھ رہتا۔ اُس کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھتا۔ اور اُن کا گہرا نقش صفحۂ دل پر جماتا اُس کی باتوں کو بغور سنتا اور اُنہیں کانوں کے قدرتی فونوگراف میں بند کر لیتا۔ گھر پہنچتے ہی وہ نقوش صفحۂ دل سے صفحۂ کاغذ پر اُتر آتے۔ اور وہ آوازیں گوشِ ہوش کی امانت سے نکلکر حوالۂ نوکِ قلم ہو جاتیں۔ مدتوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور آخرش یہ مواد ترتیب پاکر اُس دلپذیر صورت میں آیا جسے ہم اب دیکھتے ہیں اور دیکھکر عش عش کرتے ہیں۔ مولانا حالی کو اوّل تو وہ مواقع سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ رہنے کے میسّر نہ تھے۔ لیکن جسقدر موقعے پھر بھی اُنہیں ملے۔ اُن میں اگر اس نظرِ غائر سے کام لیا جاتا جو باسول نے اپنے ممدوح کے دیکھنے کے لئے پائی تھی۔ تو بہت کچھ ہو جاتا۔ مگر مولانا معذور تھے۔ انگریزی خیالات اور علوم سے تو انہیں سوائے بالواسطہ واقفیت ہونے کے براہ راست مس نہ تھا اور خود اُردو فارسی میں یہ خیالات سوانح عمریوں کی نسبت موجود ہی نہ تھے۔ اُنہوں نے

نئے رنگ میں جو کچھ کیا اُن کے پُرانے زمانہ کی تربیت اور محدود انگریزی معلومات کے لحاظ سے تعجب خیز ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ آیا "حیات جاوید" بہ حیثیت سوانح عمری ایسی چیز ہے جیسی ہونی چاہیئے۔ یا اس سے کم۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ "حیات جاوید" اُس پایہ کی سوانح عمری نہیں۔ جو چاہیئے تھا اور ابھی ہماری زبان میں سوانح عمریاں لکھنے کے طریق میں بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ "حیات جاوید" کا بیشتر حصہ سر سید مرحوم کی بیرونی زندگی اور امور رفاہِ عام کے ساتھ اُن کے تعلقات کے بیان سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا۔ کہ اس کو پڑھ کر وہ شخص جسے پہلے مرحوم کی نسبت کچھ معلوم نہ ہو اور جس نے اُنہیں دیکھا بھی نہ ہو۔ معقول اندازہ لگا سکے۔ کہ وہ بہ حیثیتِ انسانی کس پایہ کا آدمی تھا۔ اُس میں بزرگی کی کیا کیا علامتیں تھیں۔ اُس کی بزرگی کے کیا کیا اسباب تھے اور اُس کے بچپن میں کچھ شہادت بڑے ہو کر بڑا آدمی بننے کی موجود تھی یا نہیں۔ گویا یہ حیات نہ صرف ایک تصویر کی حیثیت سے غیر مکمل ہے۔ بلکہ ایک بڑے آدمی کی بڑائی کا آغاز سے لے کر انجام تک سلسلہ دکھانے سے قاصر ہے اور انگریزی میں ایک کامیاب سوانح عمری کا یہ جزو ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک میں کسی مشہور آدمی کی اوائل عمر کے صحیح حالات جمع کرنا بہت سی مشکلات رکھتا ہے۔ اور یہ دقت ہمارے ملک میں اور بھی زیادہ ہے۔ لیکن یہی وہ حصہ سوانح عمری لکھنے کے کام کا ہے جس پر سوانح نگار کو اپنی پوری ہمت اور توجہ صرف کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اسی حصہ کے واقعات میں ممدوح کی آیندہ بڑائی کے راز چھپے ہوتے ہیں۔ اور اسی سنگلاخ زمین کے کھودنے سے سوانح نگار کو کامیابی کے جواہر بے بہا مل سکتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ کہ باوجود اس امر سے واقف ہونے کے کہ بچپن کا اثر بقیہ زندگی پر کیا ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب میں بہ وضاحت لکھتے ہیں۔ مولانا حالی نے سید احمد خاں مرحوم کے بچپن کے متعلق

یہ کیونکر باور کر لیا۔ کہ "ان کے بچپن میں جسمانی صحت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلّف فوقیت دی جا سکے۔ نہیں پائی جاتی تھی یعنی جیسے کہ بعضے بچّے ابتدا ہیں نہایت ذکی اور طبّاع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ اُن میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔" خود "حیاتِ جاوید" میں جہانتک حالات سیّد احمد خاں کے بچپن کے درج ہوئے ہیں۔ اُن میں اندرونی شہادت اُن کی ذہانت۔ طبّاعی۔ اور تیزی کی کسی حد تک موجود ہے اور ہم یقین کامل رکھتے ہیں۔ کہ اگر کسی طرح سے زیادہ گر ید اس زمانہ کی نسبت کی جاتی۔ تو اور بھی ثبوت اس امر کے ملتے۔ کہ ہونہار بروا کے پہلے ہی سے چکنے چکنے پات تھے۔ چونکہ مولانا نے اس مقصد کو اتنا اہم نہیں سمجھا جتنا کہ وہ فی الواقع ہے۔ اسی لئے اُنہیں پہلے باب میں سیّد احمد خاں کے خاندانی حالات اور ابتدائی سوانح مختصراً بیان کرنے کے بعد اس معذرت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں "سرسیّد کے خاندان کا حال جسقدر کہ ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اُس کو قدرِ ضرورت سے زیادہ خیال کریں۔ لیکن "بائیوگرفی"[1] کا اصل مقصد جو "ہیرو" کے اخلاق و عادات و خیالات کا دنیا پر روشن کرنا ہے۔ وہ اُسوقت تک پورا نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ "ہیرو" میں اخلاق و عادات اور خیالات کہاں سے آئے۔" ہمارے خیال میں بجائے اس معذرت کے اس سے بھی زیادہ تفصیل کی ضرورت تھی۔ جو کچھ سیّد احمد خاں آخر کار بنگئے اور جو مفید کاموں میں اُنہوں نے کارگذاریاں کیں اُن کا بیان اس شرح و بسط کے ساتھ اتنا ضروری نہ تھا۔ جتنا ابتدائی حالات زندگی کا۔ وہ باتیں تو اب زمانہ جانتا ہے اور انہی کی وجہ سے سب کو جستجو ہے کہ دیکھیں اس نمایاں زندگانی کی ابتدا کیسی تھی۔ اور اسی کے بیان میں سب سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔

[1] بائیوگرفی۔ سوانح عمری۔ حالاتِ زندگی۔ حیات۔

اور افسوس ہے۔ کہ ہمارے لائق مصنف نے وہیں اختصار سے کام لیا۔
بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک کے زمانے میں ضروری تفریق کرنے اور اُس کے مدارج ترتیب وار دکھانے کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ کرنے کے باعث ہی مولانا حالی ایک اور باریک سی غلطی میں پڑے ہیں اور وہ یہ کہ اُنھوں نے ابتدائی زندگی کے حالات لکھتے ہوئے بھی سیّد احمد خاں مرحوم کو سر سید کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ دیباچہ چھوڑ کر اصل کتاب صفحہ پندرہ سے شروع ہوتی ہے۔ اُس میں پہلے صفحہ پر تو بیشک یہ لکھا ہے کہ "سیّد احمد خاں، ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے" لیکن آگے چل کر اسی پہلے باب میں جا بجا انہیں سر سید۔ سر سید لکھا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض مقامات پر محض اس لفظی ہیر پھیر میں گویا ایک قسم کی تاریخی غلطی پیدا ہو گئی ہے جو مذاقِ صحیح کو کھٹکتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۲ میں لکھا ہے:۔ "۱۸۴۵ء میں سر سید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے۔ دلّی آئے"۔ مگر ۱۸۴۵ء میں سر سید کا وجود کہاں تھا۔ سیّد احمد خاں تو البتہ موجود تھے۔ مگر "سر" کا تو کسی کو خواب و خیال بھی نہ تھا۔ یا صفحہ ۳۴ میں درج ہے:۔ "سر سید کو اوّل حاتم علی خاں کی دادا نے دودھ پلایا"۔ یا صفحہ ۳۵ میں "بچپن میں سر سید پر نہ تو ایسی قید تھی الخ"۔ یہ اور ایسی اور عبارتیں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ اس بات کا التزام نہیں کیا گیا۔ کہ سیّد احمد خاں کی بچپن اور جوانی کے بیان میں اور اُس بوڑھے سیّد احمد خاں کے بیان میں جو مسلمانوں کا مسلّمہ سرگروہ اور خطاب "سر" سے مخاطب تھا۔ ایک صاف امتیازی لکیر رکھی جاوے اور دونوں کو ملا کر بے لطفی نہ پیدا کی جائے۔ سوانح عمری کیا ہوتی ہے۔ ایک سچا ناول۔ لکھنے والے کی کوشش ہونی چاہئے کہ اُس میں ناول کا سا مزا ہو۔ بلکہ اُس سے بڑھ کر ہو۔ کیونکہ ناول ملمع ہے اور سوانح عمری کی کتاب زرِ خالص۔ ناول میں بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ جُوں جُوں واقعات پیش آتے جاتے ہیں۔ اُس ترتیب کے ساتھ اُن کا تذکرہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شخص

جو آخر عمر میں کسی سلطنت یا ریاست کے وزیر کے رتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اُسے پہلے ہی سے وزیر کے خطاب سے یاد کیا جائے۔ بلکہ اس خطاب کا نام بھی نہیں آتا۔ تاوقتیکہ اس کا مناسب موقع نہ آجائے۔ بہت بہتر ہوتا۔ اگر صرف دیباچہ کو چھوڑ کر باقی کتاب میں سید احمد خاں کے نام کے ساتھ "سر" کا لفظ اُسوقت تک نہ آتا۔ جس وقت یہ خطاب اُنہیں عطا ہوا ہے اور محض اُس تاریخ کے بعد کے واقعات میں جب لفظ "سر" اُن کے نام کا جُزو بن گیا۔ یہ نام کے ساتھ شامل کیا جاتا۔

حیات نویسی کے پہلو سے جہاں مولانا حالی کی کتاب پر مندرجہ بالا اعتراض وارد ہوتا ہے وہیں اس خوبی کا اعتراف بھی کرنا واجب ہے کہ اُنہوں نے اس اصول کو کہ زندگی کے سب حالات جو معلوم ہوں من وعن کہدیئے جائیں اور کوئی کوشش بعض واقعات کو بڑھا کر دکھانے اور بعض پر پردہ ڈالنے کی نہ کی جائے۔ عمل کیا ہے۔ تاکہ لوگوں کو صحیح رائے قایم کرنیکا موقعہ ملے۔ مثلاً مولانا حالی نے سید احمد خاں کے ایام جوانی میں رنگین صحبتوں میں شریک ہونے کی جو روائتیں بیان کردی ہیں۔ اُن سے نہ صرف انتہائے حق پسندی بلکہ غیر معمولی آزاد خیالی کا ثبوت دیا ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جس کی جرأت اس ملک کے سوانح نگاروں میں بہت کم کر سکتے۔ یہ روائتیں بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں:-

"اس زمانہ میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلّی میں تھے۔ اُن کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہنکر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اُس میں بھی زرد پھول کھلے ہوتے تھے۔ اور طوائف باری باری بیٹھکر گاتی تھیں۔ سر سید کہتے تھے کہ میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اُس جلسہ میں شریک ہوتا تھا۔" ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے بیانات سے کوئی کمی اس وقعت میں جو سید مرحوم کی لوگوں کے دلوں میں ہے نہیں آسکتی۔ بلکہ یہ اور قابل تعریف

معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجود اُن شوقوں کے طبیعت میں موجود ہونے کے جو اکثر لوگوں کو مشاغل ضروری سے غافل کر دیتے ہیں۔ وہ آخر اُن کے ایسے تارک ہوئے اور فرائض قومی کو اس طرح سرانجام کیا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ مولانا حالی کا یہ لکھنا بالکل حق بجانب ہے کہ "سرسیّد نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہئے۔ گویا شعر اُس وقت اُن کے حسب حال تھا:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے"

سیّد احمد خاں کے حالاتِ ملازمت اور ترقیٔ مناصب۔ اُن کی مفید تالیفات اور اُن کی شہرت۔ اُن کے سرکاری اور غیر سرکاری اعزاز اور خطابات اور اُن کی قومی خدمات کا بیان جس بسط معلومات کے ساتھ مولانا حالی نے کیا ہے۔ وہ اس کتاب کو بہت بیش قیمت بناتا ہے۔ اور یہ وہ مواد ہے جس سے آیندہ زمانہ کا کوئی سوانح نگار جو سرسیّد کے حالات پر قلم اُٹھائے مستغنی نہیں ہو سکتا ہمیں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ کتاب کے اس حصّہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ کچھ لکھیں۔ کیونکہ اس میں مولانا نے کچھ کسر نہیں چھوڑی۔ بلکہ اقتباسات میں جو علیگڈھ کالج اور تعلیمی کانفرنس وغیرہ کے متعلق مشاہیر کی تقریروں۔ یا اخباروں کے مضامین سے کئے گئے ہیں ضرورت سے زیادہ طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ اور اچھا ہوتا اگر یہ چھپی ہوئی تقریروں کی نقلیں کم جگہ لیتیں۔ اور اُن کی جگہ کوئی دلچسپ خطوط خود سیّد احمد خاں کے لکھے ہوئے یا اور حالات جو دوسرے مقاموں پر چھپے ہوئے نہیں مل سکتے درج کئے جاتے۔ ہمیں اس بات کا ذاتی علم ہے کہ ملک میں سیّد احمد خاں کے بیشمار دوستوں کے پاس اب بھی اُن کے ایسے ایسے خطوط پڑے ہوئے ہیں جن کا شائع کرنا بہت مفید ہو سکتا ہے اور جن کے پڑھنے سے

اُن کی زندگی کے حالات پر مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔ ایسے حضرات کو چاہئے کہ اس کتاب کی طبع ثانی سے پہلے ایسی چیزیں یا اُن کی نقلیں مولانا حالی کی خدمت میں پہنچادیں۔ تاکہ وہ اُن کو کام میں لاسکیں۔ اور ان اخباروں اور تقریروں کے انتخابات کو جو بارہا چھپ کر لوگوں کی نظر سے گذر چکے ہیں نکال کر زیادہ ضروری مطالب کے لئے جگہ پیدا کی جائے۔ کیونکہ دراصل ہمیں اس سے بحث ہے کہ سیّد احمد خاں کون تھے اور کیا تھے۔ نہ اس سے کہ لوگ اُن کی تعریف میں کیا عبارت آرائی کرتے تھے۔ اور اُن انتخابات میں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زیادہ تر ایسی ہی عبارت آرائیاں ہیں۔

مولانا حالی نے اس کتاب میں کہیں کہیں ناظرین پر سیّد مرحوم کی بڑائی کا اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ گو ایسا کرنا سوانح نگار کے لئے جائز ہے۔ لیکن زیادہ خوبی اس میں سمجھی جاتی ہے۔ کہ بڑائی کا نتیجہ ناظر کی طبیعت خود بخود نکالے۔ وہ خود بخود دیکھے کہ کس معاملے میں لوگوں نے ممدوح کتاب کی نسبت غلط رائے قایم کرکے اُس پر ظلم کیا۔ کس بارہ میں اُس نے سینہ زوری سے کام لیا اور لوگ حق پر تھے۔ کس بات میں وہ زبردست تھا اور کس میں کمزور۔ خوبیاں اپنے ہمسروں سے بڑھ کر کہاں تک اُس کے حصّہ میں آئی تھیں اور انسانی کمزوریوں میں سے کون کون سی اُس میں نمایاں تر تھیں۔

اب ہم اس مشہور کتاب کا امتحان بہ حیثیت ایک سوانح عمری کے ختم کرکے اس کے ادیبانہ پہلو کو لیتے ہیں۔ اور یہاں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب نے ہمیں نہایت مایوس کیا ہے اور طرزِ عبارت میں (جسے انگریزی میں سٹائل کہتے ہیں) اور صفائی زبان میں یہ ہرگز ایسی تصنیف نہیں جس کی مولانا حالی کے سے مشاق اُستاد سے توقع تھی۔ یا جس کو آئندہ نسلوں کے لئے یا موجودہ زمانہ کے طالب علموں کے لئے بطور نمونہ پیش کیا جاسکے۔ اس میں شک نہیں کہ حیات جاوید میں کئی جگہ پُرزور اور دلاویز طرزِ عبارت کی مثالیں ملتی ہیں۔

چنانچہ سرسیّد کی محبّتِ وطن کا ذکر کرتے ہوئے۔ فاضل مصنّف نے یہ عبارت لکھی ہے:۔ اسی وطن کی محبّت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اس اُجڑے دیار کے پُرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اُٹھانے پر مجبور کیا۔ اور آئینِ اکبری کی تصحیح میں جس سے دِلّی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دُھندلی تصویر کا اُجالنا مقصود تھا۔ اُن سے فوق العادت کرائی۔ لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسیّد کی کوششیں انہیں کاموں پر ختم ہو جاتیں تو شاید اُن کو ایک محبِّ وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا۔ مگر جب اُن کی آئندہ مسلسل خدمات پر۔ جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا۔ نظر کی جاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے یہ معمولی کام اُسی طلائی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں۔ جو زمانہ مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات سے ترتیب پانے والی تھی"۔

دیباچہ کتاب میں ایک اس سے بھی پُرزور عبارت کا نمونہ ہے۔ جہاں اصولِ سوانح نگاری پر بحث کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:۔ ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے۔ اُس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ اور اُن کے پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی "بائیوگریفی" چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی۔ اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے۔ اُن کو سب نے بھلا جانا۔ کیونکہ اُن کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے۔ کیونکہ اُنھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے۔ جس نے چالیس برس برابر تعصّب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔

تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علماء و مفسرین کو للتاڑا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکّے پھوڑوں کو چھیڑا ہے۔ اور اُنکو کڑوی دوائیں پلائیں ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو "پالٹکس" کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چُپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اُس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔" روانی اور زور میں یہ عبارت عمدہ ترین عبارتوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگلستان کے مشہور فصیح برک کی کوئی تقریر پڑھ رہے ہیں یہ تو اُمید بیجا ہے کہ ساری کتاب میں ایسے زور کے فقرات ہوں۔ لیکن جسقدر ہیں۔ اُس سے زیادہ ہو سکتے تھے اور ہونے چاہئے تھے اور کھردرے اور خشک فقرے جس کثرت سے ہیں اُن سے کم ہونے چاہئیں۔ عبارت کا روکھا پن غیر مانوس اور غیر مستعمل انگریزی الفاظ کی بھرمار سے اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ انگریزی الفاظ کا جا و بیجا استعمال ہمارے خیال میں اس کتاب کے رُخسار زیبا پر سب سے بدنما داغ ہے۔ اکثر انگریزی خواں اس مرض میں مبتلا ہیں کہ اپنی اُردو تقریر و تحریر میں حد سے زیادہ انگریزی الفاظ بھر دیتے ہیں۔ یہانتک کہ ایسے لوگ جو بالکل انگریزی سے بے بہرہ ہیں۔ اُس کلام کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اہلِ نظر زباندانوں کے نزدیک یہ گناہ قابلِ معافی نہیں۔ لیکن یہ گناہ اور بھی بڑا گناہ ہو جاتا ہے جب اُس کے مرتکب ایسے اصحاب ہوں جن کے ذہن کو انگریزی زبان حقیقت میں چھو بھی نہیں گئی اور جو یونہی تقلیدی طور پر سُنے سنائے انگریزی الفاظ بکثرت اپنی تحریر میں لے آتے ہیں۔ اور اسی بنا پر ہم جناب مولانا کے قلم سے اسقدر تعداد انگریزی الفاظ کی نکلتے دیکھکر نہ صرف حیران بلکہ افسردہ ہوئے ہیں۔ اگر زبان کے مسلّمہ اُستاد اس طرح اجازتِ عام انگریزی الفاظ کے استعمال کی دینے لگیں

اور اس کی مثال قایم کرنے لگیں تو چند سال میں اُردو کے پُرانے سرمایہ میں سے ہماری کتابوں میں صرف کا۔ کے۔ کی۔ یا ہے اور تھا ہی نظر آئیں گے۔ اور زبان کی بالکل کایا پلٹ ہو جائیگی۔ اور اُس وقت یہ مسئلہ پیش آئے گا کہ اس طرح انگریزی گوشت پوست استخواں لیکر محض ہندوستانی نام رکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ کیوں سیدھی طرح ہم سب انگریزی کو اپنی علمی زبان نہ قرار دے لیں۔ اگر مولانا اس انجام کے لئے تیار ہیں تو بسم اللہ اس سے بھی زیادہ انگریزی الفاظ لکھیں۔ لیکن اگر اس انجام کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ آرزو رکھتے ہیں کہ اُردو اپنی خاص شان اور حیثیت سے دنیا میں زندہ رہے۔ تو اس میں انگریزی الفاظ اس نسبت سے داخل کریں جیسے کھانے میں نمک اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان بڑھتی بھی جائیگی۔ بعض اچھے اچھے الفاظ اُس میں شامل بھی ہوتے جائیں گے۔ لیکن اُس کی اپنی حیثیت بھی قائم رہے گی۔ ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو سرے سے انگریزی الفاظ کی شمولیت ہی کے مخالف ہیں۔ اور آسان۔ عام فہم اور مروج الفاظِ انگریزی کے استعمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اقتضائے وقت کی بیفائدہ مخالفت کرتے ہیں بلکہ اصول زبان اُردو کے خلاف کارروائی کرتے ہیں۔ یہ زبان ہندی الاصل ہے۔ مگر اس میں عربی۔ فارسی کے الفاظ بکثرت آگئے اور آکر کھپ گئے ہیں۔ یہانتک کہ بعض کی نسبت عام طور پر یہ لوگوں کو معلوم بھی نہیں کہ وہ کسی غیر زبان کے لفظ ہیں۔ تو انگریزی نے ہی کیا گناہ کیا ہے۔ کہ اس کو بالکل دخل نہ دیا جائے۔ اور اسی لئے بعض لفظ تو انگریزی سے بھی آکر اس طرح جزوِ زبان ہوئے ہیں کہ نہ صرف ان کے لیئے اور موزوں الفاظ زبان میں نہیں۔ بلکہ انکو بدلنا یا بدلنے کی کوشش کرنا داخلِ تصنع اور تکلف ہے۔ اور اکثر ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر آپ انہیں بدل کر اور الفاظ ان کی جگہ لائیں۔ تو سامع مطلب تک آسانی سے نہ پہنچ سکے۔ مثلاً ریل۔ سٹیشن۔ پلیٹ فارم۔ افسر۔ جج۔ بنچ وغیرہ۔ ان کو

چھوڑنے کی کوشش فضول ہے۔ ان کے سوا بعض اور الفاظ ہیں۔ جن کے لئے اپنے الفاظ تو ضرور موجود ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ مگر کثرتِ استعمال اور عام فہمی اُن کے بولنے اور لکھنے کی اجازت دیتی ہے مثلاً ایڈیٹر۔ مجسٹریٹ۔ آنریری ممبر۔ کمیٹی۔ کالج۔ سکول۔ یونیورسٹی۔ ہاسپٹل۔ اسسٹنٹ۔ ماسٹر۔ سٹاف۔ ٹیچر انسپکٹر۔ آفس۔ ٹائیم۔ ڈیوٹی۔ چارج وغیرہ۔ ان الفاظ کی ایک نہایت لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ اور یہ فہرست روز افزوں ہے۔ بعض محتاط طبیعتیں اب بھی موجود ہیں جو ایڈیٹر کو مرتب۔ آنریری کو اعزازی۔ ممبر کو رُکن۔ کمیٹی کو جماعت کالج کو مدرستہ العلوم۔ سکول کو مدرسہ۔ یونیورسٹی کو دارالعلوم۔ ہاسپٹل کو شفاخانہ۔ اسسٹنٹ کو مددگار یا نائب۔ ماسٹر کو اُستاد۔ سٹاف کو عملہ۔ ٹیچر کو معلم۔ انسپکٹر کو معائنہ کنندہ۔ آفس کو دفتر۔ ٹائیم کو وقت۔ ڈیوٹی کو فرض اور چارج کو جائزہ کہنا پسند کرتی ہیں۔ اور اس احتیاط کو تحریر و تقریر میں مدِّنظر رکھتی ہیں اور ہم یہ کہنے کو تیار ہیں کہ باعتبار زبان وہ پاکیزگی اور فصاحت کے زیادہ قریب ہیں۔ مگر ساتھ ہی اُن لوگوں کو جو بالعادت ان الفاظ کو اور ایسے الفاظ کو بے ارادہ استعمال کرتے رہتے ہیں معذور سمجھتے ہیں۔ اور اُن پر کچھ اعتراض نہیں کرتے۔ لیکن جب اُن حدود سے نکلکر کوئی ایسے الفاظ اردو عبارت میں لکھ دے جن کے معانی سے انگریزی نہ جاننے والے قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔ جن کا تلفظ فارسی حروف میں ہرگز صحیح طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ جنہیں ناواقف غلط پڑھیں گے اور غلط بولیں گے اور جن کے سبب عبارت مغلق ہو جائے اور عام فہم نہ رہے تو یہ صریح نقص ہے اور بڑے افسوس کی بات ہے۔ اگر یہ نقص مولانا حالی کی تصنیف اور پھر ایسی تصنیف میں ہو۔ جس کے لئے ہم حیاتِ جاوید کی دعا مانگتے ہیں۔ جو عبارت اُوپر نقل کی گئی ہے اُس میں بائیوگرفی۔ ٹائم سرور۔ لبرل۔ لائف۔ چار انگریزی الفاظ آئے ہیں۔ ان میں دو کسیقدر غیر مانوس ہیں۔ لبرل اور لائف یہ دو لفظ اخبارات کے ذریعے اکثر اردو خواں اصحاب کی نظر سے گذرے ہونگے۔ اس لئے انہیں

نظر انداز کیا جاتا ہے۔ گو ہم یہ کہنے سے رُک نہیں سکتے۔ کہ لائف کا لفظ ہیں لفظِ حیات موجود ہوتے جو بالکل وہی معنے رکھتا ہے۔ کتاب کے سرِ ورق پر لکھا جانا کھٹکتا ضرور ہے۔ مگر انہیں چھوڑ کر بائیوگرفی کی طرف آیئے۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو خوانوں میں پچاس فیصدی اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اگر اس کی جگہ لفظ سوانح عمری لکھ دیا جاتا تو معلوم نہیں کیا ہرج تھا۔ آگے آیا ٹائم سرور۔ اس میں پہلی تو کیا وجہ ہو کہ جسطرح یہ لکھا ہوا ہے اسی اردو خواں بجائے ٹائم سرور نہ پڑھیں اور دوسرے کیونکر توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اسکے معنے سمجھ جائیں۔ مگر یہاں تو ایک لفظ کیا سینکڑوں لفظوں کا جھگڑا ہے۔ چند الفاظ بطور نمونہ کے لکھے جاتے ہیں:۔ پبلک سپیکنگ‘۔ آرکیولوجی‘۔ کرٹیکل‘۔ ورکس‘۔ فزیکل‘۔ انٹیلیکٹ‘۔ یونی ٹیرین‘۔ سیر سنگ اسٹائل‘ اتھارٹی‘۔ پریچنگ‘۔ یہ اُن بیشمار الفاظ کے علاوہ ہیں جو انگریزی ہیں۔ مگر نسبتاً آسانی سے سمجھے جاسکتے ہیں۔ گو ان کا سمجھا جانا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ عبارت کی صورت بگاڑنے کا باعث ہیں یا اُن سے بہتر اُردو الفاظ مل نہیں سکتے تھے۔ مثلاً صفحہ ۱۸ پر لکھا ہے: ”کومپٹیشن کے قاعدہ نے ایجوکیٹیڈ کلاس کے سوا ہر درجہ کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے“ بڑی آسانی سے اور بغیر کسی نقصان کے اسی کے بجائے یہ کہا جا سکتا تھا: ”مقابلہ کے قاعدہ نے تعلیم یافتہ جماعت کے سوا۔ الخ“ یا صفحہ ۴۹ کے اس فقرہ میں۔ ”اُس موقعہ پر ہم سر سیّد کی ایک مختصر اسپیچ جو انہوں نے علی گڑھ میں ایک ڈنر پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے جامِ صحت پروپوز کرتے وقت کی تھی نقل کرتے ہیں“ تینوں الفاظ جن پر نشان کیا گیا ہے۔ ایسے تھے۔ جن کی بجائے اردو الفاظ استعمال ہوسکتے تھے اور لازم تھا کہ کئے جاتے۔ کیونکہ ممبر اور پارلیمنٹ دو اور انگریزی الفاظ علاوہ ایک انگریزی نام کے اس چھوٹے سے فقرہ میں موجود تھے اور اُن کے لکھنے کے بغیر چارہ نہ تھا۔

اب ہم انگریزی الفاظ کی کثرت کی بحث کو چھوڑ کر ایک اور اعتراض کی طرف آتے ہیں۔ جو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ہمارے ذہن میں آیا ہے۔ گو وہ کچھ بڑا

اعتراض نہیں۔ مگر ایسے نامور مصنّف پر اس کا وارد ہو سکنا اُسے ضروری بنا دیتا ہے۔ ایک ہی لفظ یا فقرہ کا اعادہ فصاحت کے خلاف ہے۔ اگر کہیں ایک ہی قسم کے الفاظ یا فقرات کا متواتر استعمال ناگزیر بھی ہو۔ تو اکثر اُستادانِ فن مترادف یا قریب قریب ہم معنے الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ اور تکرار سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں۔ مولانا حالی نے حسنِ کلام کی اس باریک مگر ضروری صفت کا التزام نہیں کیا بعض عبارتیں ایک ہی کتاب یا ایک ہی مقام سے نقل کرتے ہوئے "اس کے بعد" اور "پھر" کا وہ تار باندھا ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے اور کہتا ہے یا الٰہی کہیں "اس کے بعد" کا خاتمہ بھی ہوگا۔ مثال کے طور پر دیکھئے صفحہ ۱۴۷۔ جہاں یہ عبارت شروع ہوتی ہے:۔ "اس کے بعد سرسید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے"۔ ورق اُلٹ کر دیکھیں تو صفحہ ۱۴۸ کے وسط میں یہ عبارت ملتی ہے:۔ "اس کے بعد وہ ڈیون پورٹ کی کتاب سے مانٹسکیو کی رائے تعددِ ازدواج کی تائید میں نقل کرتے ہیں"۔ صفحہ ۱۴۹ پر یہ سطر نظر آتی ہے "اس کے بعد سرسید اُن اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں الخ"۔ صفحہ ۱۵۰ اس خصوصیت میں بڑھ جاتا ہے اور تین ٹکڑے عبارت کے "اس کے بعد" سے شروع ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۵۱ پر یہ مقبول لفظ دو جگہ ملتے ہیں۔ صفحہ ۱۵۲ خالی نہیں اور صفحہ ۱۵۳ پر اُن کا جلوہ ہے۔ ۱۵۴ بھی مستثنیٰ نہیں۔ کہ محروم رہتا۔ آگے چل کر "اس کے بعد" کی آمد نسبتاً ذرا دیر سے ہوتی ہے۔ مگر اوسط فی صفحہ شاید کچھ زیادہ گرنے نہیں پاتی اور یہ سلسلہ برابر ۱۶۴ تک چلا گیا ہے۔ ایک اور موقع پر صفحہ ۲۲۴ سے لیکر ۲۳۳ تک صرف ایک دو جگہ لفظ "پھر" کو چھوڑ کر یہی سلسلہ جاری ہے ہر چند کہ انتخاب عبارات کے سلسلہ میں ایسے الفاظ کا استعمال مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ اور انگریزی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مگر وہاں کاملینِ فن یہ کوشش کرتے ہیں کہ مختلف الفاظ سے وُہی مفہوم ادا کریں۔ اور ایک لفظ یا جملہ کی باری دیر میں آئے تاکہ پڑھنے والے کی طبیعت تھک نہ جاوے۔ اور جہاں تک ہو سکے انتخابات

کم آویں۔ یا ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر آویں۔ تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ دوسروں کی عبارتیں جمع کر کے اوراق پُر کر دیئے گئے ہیں۔ خود لائق مصنف اس اصول کی خوبی سے باخبر ہے چنانچہ صفحہ ۲۰۵-۲۰۶ پر دو عبارتیں نقل کرتے ہوئے دو مختلف طریق اختیار کئے گئے ہیں۔ پہلے لکھا ہے: "ایک مقام پر لکھتے ہیں"۔ پھر کہا ہے "ایک جگہ لکھتے ہیں" اور اس کا اثر اس حالت سے بہت بہتر ہے کہ دونو جگہ "مقام" کا لفظ لکھا جاتا۔ ان چھوٹے چھوٹے نکات سے بے پروائی بھی کلام کے رخِ زیبا پر ایک دھبا سا لگاتی ہے۔ اور یہ بات انگریزی اصولِ تنقید کے موافق "دو شائل" کے نقائص میں داخل اور اُس کی دلاویزی میں خلل انداز ہے۔ حقیقت میں مولانا حالیؔ کے کلام میں یہ نقص انگریزی سادگی کی تقلید سے پیدا ہوا ہے۔ انگریزی میں سادگی کے ساتھ ساتھ طرزِ عبارت میں بعض ایسی خوبیاں پیدا کرنے کی گنجائش ہے جو اسے بہت دلچسپ اور پُر زور بنا دیتی ہیں۔ مگر اردو میں اگر فارسی رنگینی اور انگریزی سادگی کے بین بین ایک خاص رنگ اختیار نہ کیا جائے تو محض انگریزی طرزِ تحریر نہایت روکھی سی رہتی ہے۔ انگریزیت کے شوق نے مولانا کو کئی جگہ عجیب مشکلات میں ڈالا ہے۔ چاہیئے تھا کہ جب وہ انگریزی داں نہیں تو انگریزی الفاظ یا عبارات یا اشاراتِ تاریخی سے حتی الوسع پہلو تہی کرتے۔ مگر وہ اُن میں پڑے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض مقامات پر معلومات پر حرف گیری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔ (صفحہ ۱۸ سطر ۱۴) "یورپ اور امریکا میں اب تک جسقدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں۔ اُن کے بانی مُبانی تقریباً تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے۔ لوتھر۔ کالون۔ بیکن۔ ملٹن نیوٹن۔ کلمبس۔ بنجمین۔ فرینکلن۔ جارج سٹیفن۔ واشنگٹن۔ ہمپڈن میٹنی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے"۔ علاوہ اس کے کہ اس فہرست میں کئی ایسے نام جو شوقِ مذہب میں خصوصیت رکھتے تھے نہیں آئے۔ اور بعض ایسے آئے ہیں جنہیں شاید بہت خصوصیت مذہب سے نہ تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ بیکن

کا نام اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ بیکن کی نسبت عام تاریخی رائے مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے اچھی نہیں۔ گو اس کے علم وفضل کا ایک زمانہ قائل ہے۔ شاید اس کی رشوت ستانی جس میں وہ خاصکر بدنام ہوا تھا "پابندئ مذہب کا تقاضا ہوگی!

ایک اور مثال لیجئے صفحہ ۲۱۴ پر لکھا ہے "منجملہ اُن بیشمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس حادثۂ عظیم پر کہے گئے ہیں۔ چند اشعار ایک یورپین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیئے ہیں۔ چونکہ لٹریری دُنیا میں یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے۔ اس لئے ہم اُس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام پر لکھتے ہیں" اول تو ہم مولانا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ خدارا ہمیں بتلائیں کہ یہاں لفظ سونٹ کی کیا ضرورت تھی۔ جب آگے لفظ مرثیہ موجود تھا۔ جواب خطوط وحدانی میں گھرا ہوا ہے۔ دوسرے یہ باادب عرض کیا چاہتے ہیں۔ کہ جہانتک انگریزی زبان کی نسبت ہمارا محدود علم ہے۔ اس کے اعتبار سے سونٹ مرثیہ کے معنے نہیں رکھتا۔ اور عموماً عشقیہ اشعار پر جن میں چند عروضی خصوصیات کا التزام کیا گیا ہو۔ اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان مثالوں کے ذکر سے غرض یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ باوجود جناب مولانا کی کوشش کے بعض باریک غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جو اس حیثیت سے کہ یہ کتاب ایک فاضل ادیب کے قلم سے نکلی ہے اور ادبِ اردو میں مستقل جگہ پانے کی امیدوار ہے۔ متقاضی ہیں کہ اُن کی اصلاح کی جائے۔

اعتراضاتِ مذکورۂ بالا کے علاوہ بعض اور متفرق اعتراضات بھی ہیں جو قابلِ غور ہیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں: "ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال اور اُن کی تفصیل مفصل طور پر بیان کی جائے۔ کیونکہ اُن تمام عمارتوں کا اسقدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعۂ زمین کو چند سال میں قومی چندہ سے

گلزار بنادیا اور سینکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کردینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے اُنہی بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے۔ جن کا ذکر اُن کی لائف میں کرنا ضرور ہے لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے نواب محسن الملک کا ارادہ کالج کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے۔ اور اُمید ہے کہ اس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائیگا۔ اس لئے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے"۔ یقین ہے کہ اکثر اصحاب سطور بالا کو تحیر سے پڑھینگے۔ اگر عمارات کا بیان فی الواقع ضروری تھا۔ تو یہ علم کہ کوئی اور صاحب اس مضمون پر ایک کتاب لکھنے کو ہیں۔ ایک سوانح نگار کو اُس کے اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں کرسکتا۔ اُس کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جو چیز وہ تیار کرتا ہے وہ اپنے آپ میں مکمل ہو۔ یہانتک کہ اپنی ہی کسی دوسری تصنیف کا حوالہ دینا بھی بہت موزوں نہیں۔ چہ جائیکہ کسی دوسرے مصنف کی تصنیف کے بھروسے رہنا اور وہ بھی ایسی جو ابھی تکمیل کو نہیں پہنچی اور جس کے متعلق سوا یسے اسباب پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہ شائع ہی نہ ہو۔ اگر اُس کی نیت یہ ہے کہ اُس کی تصنیف محض موجودہ نسل کے کسی فوری شوق کو پورا نہ کرے۔ بلکہ آیندہ نسلوں کے لئے بھی مفید اور کار آمد ہو سکے اور مستقل قدر کے قابل ہو۔ تو اُسے چاہیئے کہ جو کچھ اس میں کہا جانا چاہیئے۔ سب اُسی ایک کتاب میں بند کردے۔ خواہ اُسے جابجا اختصار سے ہی کام لینا پڑے۔ کیونکہ یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کتاب کے سارے ناظرین کو وہ دوسری کتاب بھی جس کی وجہ سے ایک ضروری حصہ چھوڑا جاتا ہے۔ میسر ہو جائیگی۔ موجودہ صورت میں یہ اعتراض نہ صرف اُصولی اعتراض ہے۔ بلکہ عملی طور پر نظر آگیا ہے۔ کیونکہ وہ کتاب آج تک نہیں تیار ہوئی۔

اس اصول کو مدنظر رکھنے کی وجہ سے کہ ایسی کتابیں صرف معاصرین کے لئے

نہیں ہوتیں۔ بلکہ مستقبل سے بھی اُن کا تعلق ہوتا ہے۔ ایک اور غلطی ہے۔ جو "حیاتِ جاوید" میں کہیں کہیں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ وہ واقعات جو اسوقت ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ جب مصنّف ترتیبِ کتاب میں مصروف تھا۔ درج کردیئے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض کتاب کے چھپنے تک تغیّر پا چکے ہیں۔ مثلاً سیّد محمود مرحوم اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب میں جو عارضی مصالحت سرسیّد کی انتقال کے بعد ہوئی تھی۔ اُس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ جولائی میں نوّاب لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے مسلمانوں کی بدبختی پر رحم فرما کر آنریبل سیّد محمود اور مولوی سمیع اللہ خاں سی۔ ایم۔ جی کے باہم صفائی کرادی ہے۔ اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ اس صفائی کا انجام بہتر ہوگا" مگر افسوس کہ یہ اُمید کتاب چھپنے سے پہلے منقطع ہو چکی تھی۔ پس ایسے واقعے کو اس طرح ذکر کرنے سے کیا فائدہ ہوا؟ علاوہ بریں "گذشتہ جولائی" سے معلوم نہیں کیا مطلب ہے۔ آیا سنہ ۱۹۰۱ء یا سنہ ۱۹۰۰ء کا ماہ جولائی۔ جیسا کہ کتاب کے سرِورق سے مفہوم ہوسکتا ہے۔ یا اس سے کسی پہلے سنہ کا ماہ جولائی۔ جیسا کہ غالباً اصل واقعہ ہے۔

تناسبِ واقعات باعتبار اہمیت بھی اس کتاب میں بعض جگہ نبھ نہیں سکا یعنی بعض ضروری اور اہم باتیں اجمال سے ذکر کردی گئی ہیں۔ اور بعض غیر ضروری باتیں جن کے ذکر سے ایسی سوانح عمری کے اوراق اگر بچے ہی رہتے تو بہتر ہوتا۔ کسی قدر بسط سے بیان کی گئی ہیں۔ ان دوسری قسم کی باتوں کی مثال لاہور کے ایک اخبار نویس کی خط و کتابت کا اور اُس کے پہلے مدّاحِ سرسیّد اور بعد میں مخالف ہونے کا تذکرہ ہے۔ مولانا حالی نے اندازہ نہیں فرمایا کہ سرسیّد کی عظیم الشان زندگی کے واقعات میں ایسے معمولی درجے کے آدمیوں کی حرکاتِ موافق و مخالف کس حساب میں ہوتی ہیں۔ اور جیسا کہ بڑے آدمی اپنی زیست کے زمانے میں اُن کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے اور اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی اُن کے

سوانح نگار کو چاہئے کہ ایسے اشخاص کا ذکر کر کے خواہ مخواہ اُن لوگوں کو اُن کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہ دے۔ جس شخص کی زندگی کا مقصد ایک گری ہوئی قوم کا سنبھالنا۔ اُس کی حالت کو سنوارنا اور اُس کو مذلّت کے گڑھے سے عزّت کی بلندی تک پہنچانا ہو۔ اُسے کہاں دماغ کہ پوچھتا پھرے کہ ع بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد۔ سرسیّد کو ان باتوں کی پرواہی نہ تھی کہ کون اخبار اُن کے موافق ہے اور کون مخالف۔ کون صاحب اُن کے مدحیہ قصیدے پڑھتے ہیں اور کون تکفیر کے فتووں پر دستخط کراتے پھرتے ہیں۔ اُنہیں اپنے کام سے کام تھا۔ اور یہی مولانا حاؔلی کو چاہئے تھا۔ اُنہوں نے ایک مختصر سے واقعے کا جس کا نتیجہ اُس وقت بھی سوائے اس کے کچھ نہیں ہوا تھا کہ اُس شخص کو جس کی حرکاتِ ناشائستہ ظاہر ہو گئی تھیں۔ اُس جماعت سے جس میں رہ کر پردۂ دوستی میں دُشمنی کرنا چاہتا تھا۔ نکال دیا گیا۔ اس کتاب میں ذکر کرنے سے اُسے ایک اہمیّت عطا کی ہے۔ جس کا وہ استحقاق نہیں رکھتا۔

ایسے ہی کچھ اور متفرق باتیں لکھی جاسکتی ہیں۔ جن پر کم و بیش اعتراض ہو سکتا ہے لیکن ایک ایسی ضخیم کتاب میں ایسے نقائص کا راہ پا جانا کچھ تعجب کا محل نہیں۔ بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ اُردو زبان میں انگریزی طرز کی سب سے بڑے حجم کی بسبب سے مفصّل نتیجہ خیز اور مفید سوانح عمری لکھنے کا فخر ایک ایسے مصنّف کو حاصل ہوا ہے۔ جسے علومِ انگریزی سے واقفیت صرف بالواسطہ ہے۔ اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اگر مولانا حالی نے اُن معروضات میں سے بعض پر جو اس مضمون میں کی گئی ہیں۔ توجہ فرمائی اور دوسری اشاعت کو نظرِ ثانی سے جلا دیدی۔ تو اُن کی کُتبِ نثر میں سب سے بلند پایہ تصنیف یہی سمجھی جائے گی۔ اور حقیقت میں اس عزّت کی یہ مستحق ہوگی +

بن کھلے مرجھا گئے

دنیا میں انسان کے طرح طرح کے فرائض ہیں بعض ایسے ہیں جن کا ادا کرنا موجب فرحت ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کا ادا کرنا باعث رنج و کلفت۔ مگر رنجدہ فرائض میں شاید اس سے بڑھ کر کوئی نہیں کہ کسی دوست کے بے وقت انتقال پر اظہار افسوس کرنا پڑے۔ یہ وہ فرض ہے جس کے متعلق ہر شخص کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ اُس کے ادا کرنے کے لئے باقی نہ رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس آرزو میں ایک قسم کی خودغرضی نہاں ہے۔ مگر یہ ہے تقاضائے فطرتِ انسانی۔ لیکن مشیتِ ایزدی ایسی ہے کہ جوان بیٹا سامنے جان بحق ہو اور عمر رسیدہ باپ اُس کی یاد میں سر دُھنے۔ لڑکی گذرجائے اور بوڑھی ماں اُس کے لئے نوحہ گر ہو۔ ایک بھائی چل دے اور دوسرا روئے کو زندہ رہجائے دوست سفر آخرت طے کرنے میں عجلت کرے اور ہم پیغام اجل کے منتظر بیٹھے رہیں۔ اس لئے انسان اس مشیت سے سر نہیں پھیر سکتا۔ اور مجبور ہوتا ہے کہ وہ سینے کے بخار آہ و نالے سے یا اظہار رنج والم سے نکالے۔ ایسی ہی ضرورت ہمیں آج مجبور کرتی ہے۔ کہ عنوان مندرجۂ بالا کے نیچے سید شریف حسین صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر نارمل سکول لکھنؤ کی بے وقت وفات سے اپنے ناظرین کو مطلع کریں۔ اور اُن کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہوئے مرحوم کی پسماندگان اور خصوصاً اُن کے بدنصیب باپ سے دلی ہمدردی کا اظہار کریں۔ جو صدمہ ہمیں اس خبر وحشت اثر کے سننے سے ہوا ہے وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ جب گذشتہ مہینہ کا مخزن شائع ہو کر ناظرین کی خدمت میں روانہ ہونے کو تھا۔ اور اُس کے ذریعہ وقائع بابر کے عنوان سے مرحوم کا ایک نہایت دلچسپ تاریخی مضمون اُن کے خاص اندازِ بیان میں شائع ہونے کو تھا۔ اچانک ہم نے سُنا کہ جس مضمون کے لئے ہم اہل ذوق سے مید داد کے منتظر تھے اس مضمون کا لکھنے والا جہان سے اُٹھ گیا

اور انسانی مدح وذم سے بالاتر ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن (ہم خدا کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اُس کی باتیں وہی جانے۔ مگر انسان اپنی کمزوری میں یہ کہنے سے بمشکل رُک سکتا ہے کہ یہ مصلحت فہم انسانی سے متجاوز ہے کہ ایک شخص بیس سال تک تیاری میں بسر کرے اور جب وہ خدمات ملکی اور قومی کے لئے تیار ہو چکے تو اُسے ناگہانی بُلاوا آجائے۔ مرحوم سے راقم کی ملاقات نہ تھی۔ مگر سلسلہ خط وکتابت سے اسقدر اتحاد خیالات پیدا ہوگیا تھا کہ آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی برسوں کا ملنے والا ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا ہے۔ اُن کو مخزن سے دِلی اُنس تھا۔ اور وہ اسے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جس کا اظہار اُنہوں نے متعدد موقعوں پر فرمایا۔ ایک دفعہ جب صوبجات متحدہ کے محکمۂ تعلیم نے اُنہیں وہاں کے نصاب اُردو مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا تو انہوں نے مخزن کے بعض مضامینِ نظم ونثر داخلِ نصاب کرنے کا ارادہ کیا اور ایک ضابطہ کی چٹھی اس مضمون کی لکھ کر مضامین نصاب میں لینے کی اجازت چاہی۔ جو خوشی سے دی گئی۔ بلکہ اُن کی قدردانی کا شکریہ ادا کیا گیا۔ ایک دفعہ جب راقم نے عزمِ سفرِ ولائت کے سبب اُن کی خدمت میں درخواست کی کہ چندماہ کے لئے مضامین اکٹھے عنایت کردیں جو ترتیب دیئے جائیں۔ تو اُنہوں نے نہایت مہربانی سے چار پانچ مضمون اور ایک نظم اپنے والد ماجد مولوی سیّد احمد کبیر صاحب کی جو محکمۂ تعلیم پنجاب کے قدیم متعلقین میں بلحاظ علمی ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں ہم کو بھیجدیئے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس نقصان کی جو اُن کے انتقال پُرملال سے ملک کے تعلیمی کاموں اور تصنیف وتالیف کے ذخیرہ کو بالعموم اور اس ناچیز رسالہ کو بالخصوص ہوا ہے۔ کیونکہ تلافی ہو سکے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے چند سال میں ہی علمی حلقوں میں ایک شہرت پیدا کرلی تھی۔ مگر ابھی ابتدا تھی۔ ابھی وہ باغ علم کے ایک غنچۂ ناشگفتہ تھے۔ جنہیں اگر زمانہ مہلت دیتا اور جو اگر پوری طرح کھلنا پاتے تو صاحبانِ مذاق کی دماغ اُنکی قابلیت

کی خوشبو سے معطّر ہوتے اور چمنِ نثرِ اردو اس گلِ گلزار خوبی کے رنگ و بُو پر اتراتا۔ مگر تقدیر میں یہ نہ تھا۔ اُنہوں نے ۲۲ ماہ جنوری ۱۹۰۸ء کو بعارضہ بخار اور کھانسی اس دنیا سے رحلت کی۔ اور ایک خاندان جس کا سہارا اُن پر تھا۔ اور سینکڑوں دوست اور مدّاح نوحہ گر چھوڑ گئے۔ انشاء اللہ اُن کے مضامین کے ذریعے اُن کی یاد ان اوراق میں تازہ رکھی جائیگی۔

انجمنِ اُردو

گذشتہ چند سالوں میں جو کوششیں زبانِ اردو کے ذخیرۂ علمی کی ترقی کے لئے ہوئیں۔ اُن میں "انجمن ترقئ اردو" کا قائم ہونا خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے یوں تو اس کے اراکین کی تعداد روز افزوں ہے اور اس میں ملک کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان اور زبانِ اردو کے سب بہی خواہ۔ عام اس سے کہ وہ کس مذہب و ملّت سے تعلّق رکھتے ہوں شامل ہیں۔ لیکن جن چند حضرات کے اسمائے گرامی اور تصاویر سے پچھلے پرچہ کا ورق اوّل مزیّن تھا۔ وہ ایسے بزرگ ہیں۔ جو اس تحریک کے بانی ہیں اور جن کے احسانات مختلف وجوہات سے زبانِ اُردو میں یادگار رہیں گے۔ اس مفید انجمن کی بنیاد ڈالنا اور اس کے ذریعے سے قیام و ترقئ زبان کی تدابیر کرنا۔ گو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک نہایت ضروری اور اہم کام تھا۔ جو ان حضرات کی کوششوں سے سرانجام ہوا۔ لیکن ان کی پائدار ناموری محض اس نئی تحریک پر مبنی نہیں ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے اُنیسویں صدی عیسوی کے رُبعِ آخر میں اردو زبان کے ذخائر کے بڑھانے میں نمایاں خدمتیں کی ہیں اور جن کی عمریں مشاغلِ علمی کی نذر ہوئی ہیں۔

گروپ (مجموعۂ تصاویر) میں دائیں ہاتھ پر سب سے پہلے شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب حالی تشریف فرما ہیں۔ گو خطاب شمس العلما سرکاری طور پر

حال ہی میں آپ کو عطا ہوا ہے اور ہم اس اعزاز اور اعترافِ خدمات پر اُنہیں دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ تاہم فی الواقع وہ دیر سے اس خطاب کا اور اس سے بہتر خطابات کا استحقاق حاصل کر چکے ہیں اور اہل نظر کے دلوں میں اُن کی اور اُن کے پُر تاثیر کلام کی جگہ ہے۔ وضع میں جس سادگی کا رنگ تصویر میں نظر آتا ہے۔ یہ اُن کی بے تصنع طبیعت کا خداداد حصّہ ہے۔ یہ لباس اور طریق بود و باش۔ طرزِ گفتگو اور روشِ ملاقات تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ کلام میں بھی جلوہ افروز ہے۔ یوں تو وہ فرماتے ہیں ؎

کیجے کیا حالیؔ نہ کیجے سادگی گر اختیار — بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر وہ چاہتے تو رنگیں بیانی میں کسی سے کم نہ رہتے۔ سخن کے لئے مناسبتِ طبیعت قدرت سے عطا ہوئی ہے۔ اس پر غالبِ رنگین بیاں کی صحبت اور اصلاح کا اثر اور دِلّی کے شاعری کے دورِ آخر کی خُرده نوشی۔ یہ وہ نعمتیں ہیں جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہیں اور جسے ہوئی ہیں وہ اپنے رنگ میں کامل ہو گیا۔ مولانا بھی اپنے رنگ کے مسلّمہ اُستاد ہیں۔ بات یہ ہے کہ رنگ اُنہوں نے خود سادہ انتخاب کیا اور اس میں وہ مثال قائم کی ہے جس کی نظیر تاریخ زبانِ اُردو کے اوراق میں کم ملتی ہے۔ آپ کی تصانیفِ نظم میں عام رائے دوام کا سہرا مسدسِ مدّ و جزرِ اسلام کے سر باندھتی ہے۔ مگر ہمارے خیال میں دیوانِ حالی بھی نہایت قدر کے قابل ہے اور اس میں خصوصاً آخری حصّے جس میں حکیم محمود خاں مرحوم کا مرثیہ اور بھائی کے انتقال اور غالبؔ کی وفات کے متعلق جو درد انگیز بند ہیں نہایت ہی دیرپا شہرت پانے والی چیزیں ہیں۔ قومی مجالس کے لئے جو کچھ کبھی کبھی مولانا حالی کے قلم سے نکلتا ہے۔ وہ فلسفۂ جدید اور معلوماتِ طبعی سے بھرا ہوتا ہے۔ اور جس خوبی سے دقیق اور مشکل مسائلِ سائنس کو مولانا نظم میں ادا کرتے ہیں۔ وہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ نثر میں بھی آپ کی کئی کتابیں متداول اور مقبول ہیں۔ از انجملہ حیاتِ سعدی۔ یادگارِ غالب۔ حیاتِ جاوید اور دیوان کے

پہلے دو سو صفحوں کے قریب نثر کا دیباچہ خاص دلچسپی کی چیز بن رہی ہیں۔ اردو علم ادب کے لئے آپ کی ذات مغتنمات میں سے ہے۔ اور انجمن اردو کے لئے آپ کی شرکت مائہ ناز ہے۔ آپ ہر چند شہرت سے نفور اور گوشہ گزینی کے شیدائی ہیں۔ مگر شہرت خود ان کی متلاشی رہتی ہے۔ حال میں اُن کا نام بذریعہ رباعیاتِ حالی کے انگریزی ترجمے کے انگلستان تک پہنچ گیا ہے۔ یہ ترجمہ مسٹر جی ای وارڈ صاحب بہادر ایم۔ اے نے جو سول سروس سے پنشن یاب ہو چکے ہیں بکمالِ لیاقت تیار کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ رومن حروف میں اصل رباعیات بھی درج کی ہیں مولانا حالی مخزن کے اوّلین سرپرستوں میں ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے چندہ ارسال فرما کر ہماری ہمت بڑھائی تھی۔ اور گو اب بوجہ کم فرصتی اور ضعفِ صحت مخزن کو باقاعدہ نہیں دیکھتے۔ تاہم انہیں حق ہے کہ اسے خطاب کر کے فرماویں ؎

اوّل آنکس کہ خریدار شدش من بودم باعثِ گرمی بازار شدش من بودم

مولانا حالی کے پاس جناب مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب بہادر کھڑے ہیں۔ از روئے قاعدہ انہیں اس انجمن میں سب سے آگے کرسی نشین ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ابتدائے قیام انجمن سے آپ اس مجلس کے صدر رہے ہیں۔ اور آپ کے مفید مشورے سے کئی علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے کے لئے منتخب ہوئیں۔ مگر آپ ازراہ انکسار جو علما کا خاصہ ہے۔ اور جو آپ کے مزاج میں بکثرت موجود ہے۔ مستعد اُستاد ہیں۔ آپ ہی کی حوصلہ افزائی سے اراکین کی ہمت بندھی رہی۔ آپ سالِ حال کے ابتدائی مہینوں میں ہندوستان سے رخصت ہو کر لندن میں وزیر ہند کے دفتر کے عظیم الشان کتب خانے میں ایک معزز عہدے پر تشریف لے گئے تھے۔ اور اُس زمانہ سے گویا صدارت سے مستعفی ہیں۔ مگر آپ کو انجمن سے برابر دلچسپی ہے۔ اور اردو علم ادب کے اعلیٰ درجے کے بہی خواہوں میں ہیں۔ اسی سلسلے میں اُنہوں نے رسالہ مخزن کی بھی

خریداری فرما کر اس کی قدر افزائی فرمائی ہے۔ اور وہ اب بھی باوجود اپنے کثیر مشاغل علمی اور فکر تالیف و تصنیف کے اس کے دیکھنے کے لئے وقت نکالتے ہیں۔

شمس العلما مولانا حافظ نذیر احمد خاں صاحب دہلوی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی کے کمالات صُوری و معنوی سے کون واقف نہیں۔ کمالاتِ صُوری سے شاید خود مولانا کو انکار ہو مگر وہ ہزارہا آدمی جنہوں نے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بڑے پبلک جلسوں کے موقعہ پر انہیں دیکھا ہے اور اُن کی زبردست تقریریں سُنی ہیں وہ شہادت دیں گے کہ قدرت نے جس فیاضی سے انکو دل و دماغ کی خوبیوں سے بہرہ ور کیا ہے اور جس سخاوت سے اُن کے زبان و قلم میں تاثیر دی ہے۔ اُسی فیاضی سے اُن کے بنانے میں بھی کام لیا ہو جہاں اُن کی بلند اور کشادہ پیشانی اُن کی پُردور قوتِ متخیّلہ پر دال ہے۔ وہیں اُن کا کلّہ۔ اُن کا جبڑا۔ اُن کی ناک اور اُن کا گلا سب اس امر کے شاہد ہیں کہ انہیں تقریر کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک مجلس میں کثرتِ ہجوم سے کسیقدر شور و غل تھا۔ مولوی صاحب کی تقریر شروع تھی۔ مگر غل کے سبب دور کھڑے ہوئے لوگ پوری طرح نہیں سُن سکتے تھے۔ کسی نے آواز دی "ذرا زور سے" مولوی صاحب نے فرمایا۔ "اب اگر مجھ سے بھی ذرا زور سے بولنے کی فرمائشیں ہونے لگیں تو مجھ سے جہیر الصّورت کوئی اور ڈھونڈھ لاؤ"! اور یہ دعوے اُنکا بیجانہ تھا۔ ہم نے ہندوستان بھر کے نامور مقرّروں کو سُنا ہے۔ مگر جو آواز شمس العلما میں پائی ہے کسی میں نہیں دیکھی۔ اور لوگ جب چلّا کر بولتے ہیں تو آواز بلند ہوتی ہے۔ مولوی صاحب یوں تقریر کرتے ہیں جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہوں اور آواز میں ایک گونج سی ہوتی ہے۔ جو بسا اوقات دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ مجلس میں یوں بھر کے بولتے ہیں جیسے شیر ڈکار رہا ہو۔ ہم تو انہیں "ہزبر بیشۂ فصاحت" کا خطاب دیتے ہیں۔ زبان میں روانی اور زور آپکا

خاصہ ہے۔ سلاست سے ذرا گریز ہے۔ مگر سب باتیں ایک ہی وجود میں کیونکر جمع ہو جائیں۔ اِس پر بھی جتنی خوبیاں اس فردِ واحد میں ہیں۔ کم دیکھنے میں آتی ہیں اور زمانہ ہر وقت ایسے افراد پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ خدا کرے اُن کا سایہ دیر تک اُردو کے سر پر قائم رہے۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جن کو آنیوالی نسلوں کی نظریں ڈھونڈھا کریں گی اور نہ پائینگی۔ نثر میں مرأت العروس۔ بنات النعش توبۃ النصوح۔ ایامیٰ۔ محصنات۔ ابن الوقت۔ رویائے صادقہ سے کون سا معقول کتب خانہ خالی ہوگا۔ اور میدانِ نظم میں آپ کی کبھی کبھار کی جولانیاں عموماً نگاہِ پسندیدگی سے دیکھی گئی ہیں۔ آپ عموماً اخبارات اور رسالوں سے کم محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ حصّہ وقت کا صرفِ تصنیف و کتب بینی ہوتا ہو۔ مگر مخزن کو مدت تک آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے اور قیمت بھی ملی ہے۔ آپ نے اس رسالہ کا پہلا پرچہ دیکھتے ہی خود بخود مضمون عطا کرنیکا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ مگر بوجہ کثرتِ کار آجتک ایفا کی نوبت نہ آئی۔ ایک دفعہ ہم نے یاد دلایا۔ تو اُن دنوں مزاج ناساز تھا۔ اظہارِ مجبوری فرمایا۔ اب بھی ہم مایوس نہیں عجب نہیں پُرانا عہد یاد آجائے۔

مولانا نذیر احمد صاحب کے پاس نواب محسن الملک صاحب بہادر جلوہ افروز ہیں۔ سرسید مرحوم کے جانشین اور علیگڈہ کالج کے مشہور سکرٹری کا نام ایسا نہیں جس کے متعلق بیان کی ضرورت ہو۔ مگر یہاں ہمیں اُن کی بے نظیر خدماتِ قومی۔ یا اُن کے تاریخی کارناموں سے جو تدبر کے متعلق ریاست حیدر آباد میں ظہور میں آئے۔ بحث نہیں ہے۔ بلکہ تہذیب الاخلاق کے اُس سب سے چیدہ مضمون نگار سے بحث ہے۔ جو اردو لٹریچر کے اُس پہلے نامور علمی رسالے میں "مہدی علی" کے نام سے ایسے آرٹیکل لکھتا تھا جن میں سے بعض کا آجتک جواب نہیں ہو سکا حالانکہ اس زمانے کے بعد اور انہی حضرات کی کوششوں سے بڑے بڑے مضمون نویس پیدا ہوئے۔ بڑے نامی اخبار اور رسالے نکلے اور چمکے

اور اردو لٹریچر نے نمایاں ترقّی کی۔ اور صرف تحریر پر کیا منحصر ہے تقریر میں اس جادو بیان شخص کے مُنہ سے وہ پھول جھڑتے ہیں۔ کہ بیساختہ آفرین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ نہ معلوم کس مدرسے میں اور کس اُستاد سے یہ سبق پڑھا۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ باوجود انگریزی نہ جاننے کے انگریزی فن فصاحت کے قواعد کے اس درجہ مطابق تقریر ہوتی ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس کا لفظی ترجمہ انگریزی میں کر دیجئے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ اصل انگریزی تقریر تھی اور ترجمے کی کوئی شان اس میں نظر نہ آئیگی۔ اس خاص اعتبار سے ہم اُردو زبان کے مقرروں میں مولوی سید مہدی علی خاں صاحب کا ہم پلّہ کوئی نہیں دیکھتے اور اردو میں تقریر کے اس رنگ کے موجد ہونے کا فخر سرسید مرحوم کے بعد انہی کو حاصل ہے۔ دونو کے طرز میں ایک حد تک مشابہت ہے۔ مگر سرسید زیادہ سادگی کے دلدادہ تھے اور سادگی میں زور پیدا کر دیتے تھے۔ نواب محسن الملک کی اثر پر نفیس استعارات اور دلفریب تشبیہات کے سبب سے رنگین ہوتی ہے۔ انجمن اردو سے نواب صاحب کو خاص دلچسپی ہے اور اُردو زبان کی جو خدمات اُنہوں نے کی ہیں گو ان کے تذکرے کے ورق پر۔ اردو کی حمایت سے ایک دفعہ مستعفی ہونے کا داغ موجود ہے۔ تاہم وہ اتنی لمبی۔ اتنی مستقل اور اتنی سرگرم خدمات ہیں کہ وہ داغ اُنکے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ خصوصاً جب یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ ایک اضطراری فعل۔ مجبوری کی حالت میں۔ ایک اہم قومی غرض سے تھا۔ ہمیں یہ عزت حاصل ہے کہ ہمارا نام نواب صاحب موصوف کے نیاز مندانِ خاص کی فہرست میں مندرج ہے۔ اور مخزن کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ اُن کے پاس پہنچتا ہے۔ اُن کی نظر سے گذرنیکا موقع اسے ملا ہے یا نہیں۔ یا کم ملا ہے یا اکثر۔ اس کا ہمیں علم نہیں۔ کیونکہ اس بارے میں ہمیں نواب صاحب نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔

شمس العلما۔ مولانا شبلی نعمانی اس انجمن کے سکرٹری اور روح رواں ہیں علم تاریخ پر آپ کا عبور جس درجے کا ہے اُس کا تو ایک زمانہ معترف ہے۔ ہمیں صرف

اتنا کہنے کی ضرورت ہے کہ اُردو تاریخی کتابوں کا ایک پُرلطف اور مفید سلسلہ انہی کے مساعی سے موجود ہوگیا ہے اور وہ کتابیں باوجود تاریخ کے متعلق ہونے کے ادب کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہیں اور جہاں ہزارہا لوگ انہیں ان کی تاریخی خوبیوں کے اعتبار سے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ وہیں ہزارہا ایسے بھی ہوں گے جو انہیں علم ادب میں سلاست اور صفائی بیان کا نمونہ سمجھیں گے۔ البتہ جو بات یہاں خصوصیت سے کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ انجمن اُردو کے لئے مولوی صاحب سے موزوں تر ناظم کا انتخاب مشکل تھا۔ مولوی صاحب تحقیق محاورہ کے شائق اور صفائی زبان کے دلدادہ ہیں۔ نقادِ سخن اعلیٰ درجہ کے ہیں نظم میں اُن کی تنقید اس لئے بیش بہا ہے کہ اساتذۂ ماضی و حال کا چیدہ کلام انہیں بر زبان ہے۔ اور نثر میں اس لئے کہ خود نثر اُردو میں بے نظیر مہارت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی مذاق سے آشنا ہیں اور جن تحریرات میں اُس مذاق کی چاشنی ہو۔ اُن سے بھی اُسی طرح محظوظ ہو سکتے ہیں۔ جیسے خالص مشرقی مذاق کی تصنیفات سے۔ اُن کے اس مغربی مذاق میں اُنکی اپنی تلاش انگریزی داں احباب کی صحبت اور سفرِ روم کے نتائج کے علاوہ انکے دیرینہ دوست مسٹر آرنلڈ صاحب بہادر کا بھی حصہ ہے اور بہت سی معلومات انگریزی کتابوں اور مصنفوں اور فرانسیسی علما کے متعلق ہیں جن میں آرنلڈ صاحب کی برسوں کی رفاقت کا اثر جلوہ گر ہے جو شخص ان اسباب سے واقف نہ ہو وہ مولوی صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی گفتگو سے مستفید ہو تو متعجب ہوتا ہے کہ انگریزی داں نہ ہونے کے باوجود اُن کو یہ معلومات کیونکر بہم پہنچیں خاصکر جب وہ ایسی کتب فلسفہ اور سائنس کے نام لیتے ہیں۔ جو اکثر انگریزی دانوں کو بھی معلوم نہیں۔ اسی لئے ہمارا یہ خیال ہے کہ انجمن اُردو کے لئے ایسے ہی جامع مذاق کے عالم کی ضرورت تھی۔ انہیں علوم کے جواہر سے کام ہے خواہ وہ ہندی کان سے نکلیں۔ خواہ ایرانی سے۔ عرب کان کن انہیں نکالیں۔ یا فرنگی مسلمانوں کے ہاں سے ہاتھ لگیں یا ہندوؤں کے ہاں سے۔ سنسکرت کی کتابوں میں ملیں

یا فارسی کی۔ زبان کے بڑہانے سے غرض ہے۔ خواہ انگریزی سے الفاظ مستعار لئے جاویں یا سنسکرت سے۔ عربی کے ذخیروں کو لوٹا جاوے یا فارسی کے اور اگر ان کی اور ان کی جماعت کی سرگرمی اس رفتار سے جاری رہی تو بہت عرصہ نہیں گذریگا کہ زبانِ اُردو اپنا رتبہ اب سے کئی گنا بڑہا ہوا دیکھیگی۔ اور دوسری زبانوں کے علماء سے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ مولانا سے مخزن کو جو خصوصیت حاصل ہے۔ وہ دیگر بزرگان میں سے کسی سے نہیں۔ گو ہر ایک سے کم و بیش علاقہ ہے۔ ابتدا ر کار سے اب تک مولوی صاحب سے ہمیں کئی مفید مشورے ملے ہیں۔ عمدہ تنقیدیں ذاتی طور پر ہمیں اُنہوں نے بھیجی ہیں۔ دل دہی کی ہے۔ ہمت بڑہائی ہے۔ خریدار دیئے ہیں۔ اور آخر میں مضمون عطا فرمانے کا دیرینہ وعدہ بھی پورا کر دیا ہے۔

اس معزز گروپ کی تفصیل جناب نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب بہادر کے نام پر ختم ہوتی ہے۔ مولوی صاحب سے بھی ہمیں یہاں نہ تو اُن کی حیثیت سے بحث ہے جو حیدر آباد میں اُنہیں حاصل تھی جب وہ ایک زبردست وزارت کے نفسِ ناطقہ تھے اور جہاں اُنہوں نے ایک نہایت اہم۔ نہایت نازک ذمہ داری کو اعلیٰ درجے کی دیانت اور حسنِ تدبیر سے نبہایا۔ جس کی حکایتیں آجتک اہلِ حیدر آباد کی زبانوں پر ہیں۔ اور نہ اُن کی موجودہ پولیٹکل اور سوشل سرگرمیوں کا تذکرہ یہاں مقصود ہے۔ جن کے ذریعے سے وہ ابنائے وطن کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ بلکہ یہاں بھی مثل نواب محسن الملک کے تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر کے قوتِ بازو سے ہی واسطہ ہے۔ جو تحریریں آپ کے قلم سے نکلی ہیں۔ اور جو تقریریں آپ نے کیں۔ اور آجتک کرتے ہیں۔ اُن میں ایک خصوصیت ہے۔ اور وہ یہ کہ سلسلۂ دلیل نہیں ٹوٹنے پاتا اور اُن کے منطق پر حرف گیری مشکل ہے۔ اور اس کے ساتھ بیان میں سلاست اور محاورۂ زبان کی طرف توجہ خاص رہتی ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہیں اور یہی

انجمن اردو کے اغراض سے دلی ہمدردی کے ساتھ ملکر محسنینِ اردو کے حلقے میں انہیں جگہ دلاتی ہے۔ مخزن کو بھی فہرست خریداران میں آپ کی شرکت سے فخر حاصل ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ گروپ نہایت وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا اور اتنے بزرگوں کی یکجا زیارت، ناظرینِ مخزن کے لئے باعثِ مسرت ہوگی۔

اطالین نمایش

جن ذرائع سے مغربی دنیا میں علوم وفنون کی ترقی کی کل کو چلایا گیا ہے۔ ان میں ایک مقبول اور دلپسند ذریعہ نمائشیں ہیں۔ نمائشیں کئی طرح کی ہوتی ہیں سب سے اعلیٰ تو وہ ہیں جو مختلف ملکوں کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہیں اور تمام شائستہ دنیا پر کم وبیش اثر ڈالتی ہیں۔ زمانہ حال میں اس قسم کی نمائشوں میں چکاگو کی مشہور نمائش۔ پیرس کی عالمگیر اگزبشن اور سب سے نئی سنٹ لوئس کی نمائش قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نمائشیں تو تاریخی یادگاریں ہیں اور جب اقوامِ مغرب کی ترقی کی تاریخ لکھی جائیگی تو اس میں ان نمائشوں کے سال سنگِ نشان کا کام دیں گے۔ ان کے لئے روپیہ اسقدر درکار ہے۔ کہ اکثر مغربی قومیں باوجود اپنے تموّل کے ان کے مصارف سے عاجز آتی جاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سنٹ لوئیس میں خاطرخواہ مالی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لئے ان نمائشوں کا مفصل تذکرہ ہم غریبوں کے لئے جو ایک نادار ملک میں پیدا ہوئے ہیں مفید نہیں ہم ابھی اُس مقام سے جس کا تقاضا ایسی نمائشوں کا اہتمام ہوتا ہے منزلوں دور ہیں۔ ان کے سوا یورپ اور امریکہ میں کئی نمائشیں بعض فنون کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مثلاً زراعت کی نمائش جدا۔ جس میں مختلف قسم کے بیج۔ کھاد۔ آلات کشاورزی اور دیگر اسباب زراعت دکھائے جاتے ہیں۔ دودھ اور مکھن کی نمائش

الگ جس میں مختلف کارخانوں کو باہمی مقابلہ کا علیحدہ موقعہ دیا جاتا ہے۔ پنساری اور عطّار اپنی نمائش علیحدہ رکھتے ہیں۔ فوجی نمائش جداگانہ ہے۔ تصویروں کی نمائش ایک مستقل چیز ہے۔ جس میں صاحبانِ فن اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ غرض ہر پیشے اور ہر ہُنر کے لوگ اپنی ترقی کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ مگران دونوں قسموں کے علاوہ ایک اور قسم نمائش کی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں کو چھوٹے سے پیمانے پر واقفیت عامہ بڑھانے کا موقعہ مل جائے اور ساتھ ہی تفریح کا مقصد بھی حاصل ہو۔ یہ نمائشیں ہمارے ہاں کے میلوں کا جواب ہیں۔ اور انہیں مہذب میلوں کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میلا ایک دو دن کی دل لگی۔ چند گھنٹوں کی گھبراہٹ۔ جانے کی دھوم دھام۔ واپس آنے کی مارا مار۔ دھکّے کھانے کے لُطف اور بد پرہیزی کرنے کی اجازت کا نام ہوتا ہے اور اس کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ جو بچپن اور آغازِ شباب تک تو اس سے حاصل ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد دن بدن زائل ہونے لگتی ہے اور آخر جاتی رہتی ہے۔ مگر یہ مہذب میلا ہفتوں بلکہ مہینوں رہتے ہیں۔ لوگ اطمینان سے اُن میں جاتے ہیں۔ بیفکری سے ان میں چلتے پھرتے ہیں۔ ہر طرح کے تماشے اور دلچسپی کے سامان ایک احاطے کے اندر جمع ہیں۔ جن سے ہر شخص حسب مذاق و توفیق فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور اُن میں جانا اور اُنہیں دیکھنا سَیر کی سَیر۔ اور تعلیم کی تعلیم ہوتی ہے۔ لندن کے اس قسم کے میلوں میں سے ایک میلا چند ہفتے ہوئے ختم ہوا ہے۔ جب میں مئی کے مہینے یہاں آیا آغاز شروع تھا اور اکتوبر کے اخیر تک رہا۔ اس میلے کی ترکیب یہ ہے کہ ایک وسیع احاطہ اس کے منتظموں نے گھیر رکھا ہے۔ جس کا نام ارلز کورٹ ہے۔ اس میں ہر سال نئی نمائش ہوتی ہے جو کئی مہینے تک رہتی ہے۔ چند سال ہوئے یہاں پیرس کی زندگی کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک برس یہاں "نمائش آتش" تھی۔ جس میں مکانات کا جلنا۔ آگ بجھانے والی فوج کا مستعدی سے

اُن کے بچانے کو دوڑنا اور جانفشانی سے لوگوں کے جان و مال کو بچالینا دکھایا گیا تھا۔ اس مرتبہ ملک اطالیہ کی باری تھی۔ اور نمائش میں جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ آپ اچانک آنکھ بند کر کے اطالیہ کے مشہور مقامات میں سے کسی کی سیر کر رہے ہیں۔ داخل ہوتے ہی دربان اطالیہ کے لباس میں ملبوس نظر آتے تھے۔ دوکانیں وہیں کی سنگتراشی، مصوری اور دیگر صنعتوں کے نمونوں سے پُر ہیں۔ جہاں کہیں لوگوں کے واسطے کھانے پینے کا سامان مہیا گیا تھا۔ وہاں خادم اور خادمہ خاص وردیاں پہنے تھے جن کی کاٹ تراش اطالیہ کی وضع کی نقل تھی۔ احاطہ کی دیواریں رنگا رنگ کے پردوں کی بنی تھیں۔ جن پر اطالیہ کے قدرتی مناظر کے نقشے آنکھ کو دھوکا دیتے تھے۔ کہ وہ سچ مچ جنوبِ یورپ کے مناظر دیکھ رہی ہے۔ احاطہ کئی حصوں میں منقسم تھا۔ جن میں سے بعض حصے مسقف تھے اور بعض کھلے۔ مسقف حصوں میں صناعی کی نمائش اور دوکانیں تھیں۔ اور کھلے حصوں میں سیر و تفریح کی باتیں۔ ایک صحن پھولوں کی کیاریوں سے رشکِ گلشن بنا ہوا تھا۔ اور اُس کے وسط میں بینڈ کے لئے جگہ تھی۔ جہاں مقررہ اوقات پر ہر روز باجا بجتا تھا اور موسیقی کے دلدادہ اس کے گرد کرسیوں پر بیٹھے باجا سنتے رہتے تھے۔ مگر جو حصہ اس نمائش کا مجھے سب سے دلچسپ معلوم ہوتا تھا وہ ایک اور صحن تھا۔ جو دو بلند عمارتوں کے درمیان واقع تھا۔ اور جس میں ایک خوبصورت حوض صاف پانی سے لبالب بھرا رہتا تھا۔ اس حوض کے دونوں طرف ایک نہر سی بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے وسط میں ایک کل تھی۔ جسے اُڑنے کی کل کہتے تھے۔ اس کے اندر کشتیاں تھیں۔ ان میں لوگ بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کشتیاں نہایت مضبوط رسّوں سے آویزاں تھیں اور اُن تمام رسّوں کے سرے ایک بڑے ستون کے سرے سے لوہے کے حلقوں کے ذریعے سے بندھے تھے۔ یہ ستون دُخانی کل کے ذریعے سے گھومتا تھا۔ تو ساری کشتیوں کو حرکت ہوتی تھی۔ یہانتک کہ چکر کھاتے کھاتے ایسا درجہ آتا تھا کہ کشتیاں ہوا میں اُڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کل کا اصول بالکل وہی تھا۔

جو اُن چکروں کا ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں عام میلوں پر موجود ہوتے ہیں اور جن کے ذریعے سے کاٹھ کے گھوڑے جن پر شوقین لوگ سوار ہوتے ہیں گھومنے لگتے ہیں۔ مگر اسی خیال کی ترقی سے ایسی نفاست پیدا ہوئی تھی کہ اس مشین کو دور سے چلتے دیکھنا نہایت ہی مزا دیتا تھا اور اس میں سوار ہونا اس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اور اسی لئے نہ صرف تماشائیوں کا ایک گروہ کثیر اس کے گرد جمع رہتا تھا بلکہ سوار ہونے والوں کا بھی ہجوم ہوتا تھا اور میرا خیال ہے کہ سارے تماشوں میں یہی سب سے مقبول تھا۔ اور اس کے مالک کو سب سے زیادہ نفع ہوا۔ حوض کے وسط میں اس کا نصب ہونا اس کے لطف کو دوبالا کرتا تھا۔ اور رات کے وقت جب حوض پر چاروں طرف سبز و سرخ شیشوں میں چراغ جلتے تھے اور سارے شہر میں روشنی ہوتی تھی تو اس مشین کی سیر عجب بہار دیتی تھی۔ اس پر بیٹھکر گھومنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ رنگین روشنی کی مسلسل قطاریں چکر لگا رہی ہیں۔ ایک عجیب بات اس کے متعلق یہ تھی کہ اس میں میمیں بکثرت سوار ہوتی تھیں۔ گو میں نے کئی مردوں کو اس سواری سے گھبراتے دیکھا اور یہ کہتے سنا کہ خواہ کتنی ہی احتیاطیں کر لی گئی ہیں۔ پھر بھی خطرناک ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں عورتیں عموماً بزدلی کی کمزوری سے خالی ہیں اور بہت سے مردانہ کھیل شوق سے کھیلتی ہیں۔ سمندر میں غوطے لگانا پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا اُن کے لئے ایسا ہی آسان اور اُن کو اتنا ہی مرغوب ہے جتنا مردوں کو۔ مگر طرفہ یہ ہے کہ ان کشتیوں میں سوار ہوتے وقت یا اور کسی ہنسی خوشی کے موقعے پر اظہارِ نزاکت سے بھی دریغ نہیں کرتیں اور کشتیوں کے چلتے ہی وہ چیخیں مارتی ہیں۔ کہ اگر چیخوں کے بعد فوراً قہقہے کی آواز تسلی نہ دیدے تو سُننے والے ڈر جائیں کہ کوئی حادثہ ہو گیا۔

اس حوض کے پانی سے دو اَور کام لئے گئے تھے۔ اس کے دونوں طرف نہریں سی نکلتی تھیں۔ ان میں سے ایک کے اختتام پر ایک ڈھلواں آہنی سڑک

بنی تھی جس کے نیچے مضبوط لکڑی کے شہتیریوں سے ڈھلواں فرش بنایا گیا تھا
اس سڑک پر ایک پہیّوں والی کشتی بجلی کے زور سے چلتی تھی اور ڈھلوان سے
زور شور کے ساتھ اُترتی ہوئی دھم سے پانی میں گرتی تھی اور گر کر جھاگ اُچھالتی
ہوئی اُچھلتی تھی اور پھر نہر میں تیرتی ہوئی کنارے جالگتی تھی۔ اس کھیل کو بھی
قبولِ عام کا فخر حاصل تھا اور رونق کے دن تو ہزاروں آدمی دن بھر میں اس
میں سوار ہوتے تھے۔ اور کشتی اوپر سے ایسی ترکیب سے گرائی جاتی تھی کہ کسی
کو کبھی دھماکے سے نقصان نہیں ہوا۔ حالانکہ بظاہر اس کا ڈھلوان سے لڑھکتا
ہوا آنا اور پانی میں گرنا سخت خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اسی نہر کے دوسرے حصّے
سے یہ کام لیا گیا تھا کہ وہ ایک مصنوعی غار میں سے ہو کر گذرتا تھا جو اطالیہ کی
قدرتی غاروں کی نقل تھی۔ اور جس کے اندر لوگ کشتیوں میں بیٹھکر ہو آتے تھے۔
ان غاروں کو گروٹو کہتے ہیں۔ اور ان کی ساخت اس قسم کی ہوتی ہے کہ کہیں
کہیں روشنی کی شعاع اندر آگھستی ہے اور طرح طرح کے رنگ نظر آتے ہیں
اور کہیں بالکل تاریکی ہوتی ہے۔ سیاح ان غاروں میں بڑی خوشی سے گھستے
ہیں۔ اس شوق کو ایک چھوٹے پیمانے پر پورا کرنے کا سامان یہیں کر دیا گیا
تھا۔ اسی سلسلے میں تھوڑی دور ایک اور جگہ تھی جسے دیکھکر یہ گمان ہوتا تھا کہ ملک
اطالیہ کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر کسی جادو کے ذریعے سے لندن میں لاکر سجا دیا ہے
یعنی وہاں کے مشہور تاریخی شہر وینس کی نقل پیش کی گئی تھی۔ اس مصنوعی وینس
کے دروازے کے اندر جاتے ہی کیا نظر آتا تھا؟ جنوبی یورپ کا صاف نیلگوں
آسمان۔ اُس پر بیشمار تارے۔ گلی کوچوں کے بجائے پانی کی نہریں رواں تھیں
جن میں کشتیاں چل رہی تھیں اور لوگ اُن میں بیٹھکر دوستوں کو ملنے ایک گھر سے
دوسرے گھر جاتے تھے اور دکانوں سے سودا سلف خریدتے تھے۔ کشتی والے
اپنی دھن میں کچھ الاپتے جاتے تھے اور کشتی کھیتے جاتے تھے۔ مکانوں کا نقشہ
ہُوبہُو وینس کا تھا اور وسطِ شہر میں ایک چوک تھا جہاں خاص اطالیہ کے گویوں

کی ایک جماعت وہیں کی زبان میں پیارے پیارے گیت گا رہی تھی۔ یہ ایسے گیت تھے جو ہمارے ایشیائی راگوں سے بہت ملتے۔ اور انگریزی طرز وں سے بالکل جدا تھے۔

اُڑنے کی مشین اور پانی میں گرنے والی کشتی کچھ اس نمائش کی خصوصیات میں نہ تھیں۔ کرسٹل پیلیس میں بھی موجود ہیں۔ مگر یہاں زیادہ اچھی بنائی گئی تھیں لیکن گرونو کی سیر اور وینس کا نقشہ یہ اسی کا خاص حصہ تھیں اور کہیں اور نظر آسکتی تھیں ان کے سوا ایک بڑی خصوصیت اس نمائش کی ایک بہت ہی بڑا پہیہ ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ پیرس کے ایفل ٹاور کا جواب ہے۔ اس کی بلندی کا یہ حال ہے کہ اگر اُن گاڑیوں میں جو اس میں لگی ہیں بیٹھ جاؤ اور یہ گھمایا جاوے۔ تو جس وقت آپ انتہائے بلندی پر پہنچ جاویں تو لندن باوجود اپنی وسعت کے آپ کی آنکھ کی پُتلی میں سما جائے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ سیر بہت مقبول نہیں ہوئی اور اس کثیر خرچ کے اعتبار سے جو اس کے بنانے میں ہوا ہوگا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کو بہت فائدہ ہوا ہو۔ تاہم یہ پہیہ بھی چلتا ہی رہتا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ لوگ اس پر کبھی سوار ہو ہی لیتے تھے۔ ایک دفعہ عجب تماشا ہوا لوگ اس پر سوار تھے اور بیشتر اوپر کی طرف حرکت کر چکے تھے کہ پہیے کی کل بگڑ گئی اور حرکت بند ہوگئی جو اوپر تھے وہ اوپر رہ گئے اور چونکہ رات کو کل کی مرمت نہیں ہو سکی اس لئے اُنہیں صبح تک آسمان اور زمین کے درمیان بے خواب وخور معلق رہنا پڑا۔ نقصان تو سخت نہ ہوا۔ کیونکہ خدا کے فضل سے جانیں بچ گئیں۔ اور کمپنی والوں نے سب صاحبان کو پانچ پانچ پونڈ بطور ہرجانے کے نذر کئے بعض لوگ تو اُن میں ایسے تھے کہ اُن کی تکلیف کا یہ کافی معاوضہ نہ تھا۔ لیکن بہت سے ایسے تھے جن کے وسائل محدود تھے اور اُنہیں ایک رات کی تکلیف کے عوض میں ستّر اسّی روپے مل جانا غنیمت معلوم ہوا۔ شہر بھر میں اس واقعہ کا کئی دن چرچا رہا اور لطیفہ یہ ہوا کہ اس واقعے کے بعد بجائے پہیے کی طرف رجوع کم ہونے کے چند

دن تک ایک کثیر تعداد لوگوں کی اس میں سوار ہونے کو آتی رہی۔ اس خیال سے کہ اگر پھر کوئی ویسی ہی دقت پیش آئے تو پانچ پانچ پونڈ ملیں۔ مگر نہ ایسی اُفتاد روز ہوتی ہے اور نہ ایسی رقم بے محنت آئے دن ہاتھ لگتی ہے۔

اس قسم کی بہت سی کھیل تماشے کی چیزیں تھیں۔ جن کے ذریعے سے ہزاروں پونڈ روز نمائش گاہ میں آتے تھے۔ مگر کچھ کھیل تماشے کی چیزوں پر ہی تماشا ختم نہ تھا۔ اسی نمائش میں اطالیہ کی بندوقوں اور توپوں کے نمونے تھے۔ جن سے ملک کے اسلحہ اور اُس کی جنگی حالت کا پتہ چلے۔ اسی میں وہاں کی تصاویر تھیں۔ جن سے فنِ نقاشی کی ترقی کا حال کھلے۔ اسی میں سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کے خوبصورت اور سڈول بُت تھے۔ جو سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے کہلا سکتے تھے۔ اسی میں لکڑی کا اچھا اچھا کام تھا۔ اور اسی میں اطالیہ کی دوسری صنعتوں کے نمونے دکھلائے گئے تھے۔ کہیں سوّیاں تیار ہو رہی تھیں۔ کہیں شیشے اور بلّور کا کام دیکھنے والوں کے سامنے بنایا جاتا تھا۔ کہیں چکنی مٹی کے چھوٹے چھوٹے بت ایک شخص اس خوبی سے منٹوں میں بنا کر رکھتا جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ غرض سارا میلا ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھا۔ اور اس کی بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جو قابلِ تقلید معلوم ہوتی تھیں۔ تاکہ ہم لوگ اگر میلوں کے بغیر گذارہ نہ کر سکیں اور فطرتِ انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید نہ کر سکیں گے تو اتنا تو ہو کہ جو کچھ کیا جائے سلیقے سے کیا جائے اور اس میں کچھ فائدہ مدِ نظر رکھ لیا جائے۔

مدفنِ بزرگاں

(انگلستان کے مشاہیر کا مرقد۔ ویسٹ منسٹر ایبے)

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہ خاک　　دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز (حالی)

دہلی مرحوم (خدا اُسے دوبارہ زندہ کرے) ایک زمانے میں مشاہیر عالم کا مرجع

تھی۔ بڑے بڑے باکمال دُور دُور سے اُس کی طرف کھنچے ہوئے آئے اور آخر وہیں کے ہو رہے۔ وہیں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔ خود وہاں کی مردم خیز زمین سے کئی نامور اُٹھے اور بالآخر وہی سرزمین اُن کی آرامگاہ بنی۔ اسی لئے مولانا حالی کو اس کے وسیع کھنڈروں کا ذکر کرتے ہوئے کہنا پڑا کہ اس ویرانے میں اتنا خزانہ مدفون ہے کہ کہیں نہ ہوگا۔ لندن کے مشہور قبرستان ویسٹ منسٹر ایبے کو دیکھ کر مجھے مولانا حالی کا شعر یاد آیا اور دہلی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ بھی ایک خزانہ تھا اور یہ بھی ایک خزانہ ہے اور بعض اعتبارات سے اُس سے بھی بڑا خزانہ ہے۔ کیوں نہ ہو۔ دہلی ہندوستان کا بڑا شہر تھا۔ اور لندن اس وقت دنیا کا بڑا شہر ہے۔ اُس خزانے کے قدردان دنیا سے اُٹھ گئے۔ اور اس خزانے کے محافظ اور قدرشناس موجود ہیں۔ ایک بات جو خاکِ دہلی کی خصوصیت ہے۔ وہ خاکِ ویسٹ منسٹر کو حاصل نہیں۔ ایک چیز جو ویسٹ منسٹر میں ہے وہ دہلی کو میسّر نہیں۔ خاکِ دہلی ہے مہمان نواز۔ عرب ہو یا ترک۔ ایرانی ہو یا ہندی اسے سب عزیز ہیں۔ اور سب کو اپنے آغوشِ شفقت میں لیتی ہے۔ مگر ویسٹ منسٹر کی چار دیواری میں جگہ پانا مشکل ہے۔ اور دن بدن مشکل ہوتا جاتا ہے۔ ہاں ویسٹ منسٹر کو جو امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ ایک محدود رقبے میں سینکڑوں ناموروں کے جسدِ خاکی مدفون ہیں۔ بجائیکہ دہلی میں میلوں کا چکر لگانے پر بھی اتنا مجمع یکجا نہیں مل سکتا۔ وہاں گوہر سنگریزوں میں ملے ہوئے پڑے ہیں اور معمولی آنکھ کا یہ کام نہیں ہے کہ بتا سکے کہ گوہر کون سا ہے اور سنگ کونسا۔ لندن کو عجیب وغریب اتفاقات سے یہ بات حاصل ہوگئی ہے کہ ایک بڑے گرجے کی چار دیواروں میں انگلستان کی تمام گذشتہ بڑائی کی یادگاریں جمع ہیں اور ایک مقام کی زیارت زیادہ گردش کی ضرورت باقی نہیں چھوڑتی۔ بڑے بڑے تاجورانِ گردنکش اسی احاطے کے اندر لیٹے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے جاں نثار اُن کی قبروں کے گرد ویسے ہی جمع ہیں جیسے اُن کی زندگی میں اُن کے گرد حلقہ باندھ

رہتے تھے۔ اسی احاطے میں بہادرانِ انگلستان میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے کے بعد آرام سے سوئے ہیں۔ اُن کی قبروں کے کتبے موجودہ زمانے کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اور اُن کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ اگر پائدار شہرت چاہتے ہو تو ان جوانمردوں کے نقش قدم پر چلو۔ قوم کی خدمت میں جانیں لڑاؤ۔ تو ان کے پہلو میں جگہ پاؤ۔ یہیں وہ مدبّر آرام کر رہے ہیں۔ جن کے ناخنِ تدبیر نے بڑی بڑی پولیٹکل گتھیاں سلجھائیں۔ اور جن کی دانائی اور حُسن انتظام نے انگلستان کو ایک چھوٹے سے جزیرے کی چھوٹی سی سلطنت سے ایک عظیم الشان شاہنشاہ کے رُتبے تک پہنچا دیا۔ اور شاہ انگلستان کو قیصر بنا دیا۔ اسی تعمیرِ کہن کے گوشوں میں وہ اہل قلم پڑے ہوئے ہیں۔ جن کے قلم کی جنبش ہزارہا دلوں کو ہلا دیتی تھی، اور جن کے تصانیفِ نظم و نثر کو اہل انگلستان آج تک اپنی بہترین وراثت سمجھتے ہیں

بزرگان انگلستان کا یہ مدفن پہلے کیتھلک راہبوں کے ایک فرقے کی قیامگاہ تھا۔ جس کی بنا ہزار برس ہوئے ڈالی گئی تھی۔ خیال بے اختیار لندن کی اُس ابتدائی حالت کی طرف دوڑتا ہے۔ جب اس کی اس بڑائی کے نشان بھی نہ تھے۔ ہاں لندن کا دیرینہ دوست دریائے ٹیمز جب بھی اس ایبے کے قریب بہتا تھا۔ اور اب بھی ہے۔ مگر جہاں اب پارلیمنٹ کی سر بفلک عمارت کھڑی ہے۔ وہاں ایک چھوٹا سا محل تھا اور جہاں ویسٹ منسٹر کی خوبصورت سڑکیں اور عالیشان ہوٹل اور عمارتیں ہیں۔ وہاں دلدل تھی اور جہاں ایبے ہے یہ حصّہ اُبھرا ہوا ایک ننھا سا جزیرہ تھا۔ جو پانی اور دلدل سے گھرا ہوا تھا۔ اس جزیرے پر اُن راہبوں نے بسیرا لیا۔ اور اُن کے لئے چھوٹی سی عمارت بنائی گئی اس میں کوئی دس بارہ راہب رہتے تھے۔ سنہ ۱۰۶۵ء میں شاہ اڈورڈ نے جو دینداری میں مشہور تھا اور کانفیسر کے لقب سے ممتاز ہوا۔ اس عمارت کو بڑھایا۔ اور ستر راہبوں کی آسائش کے لئے عمارت بنا دی۔ جس کے بعض حصّے آج تک قائم ہیں۔ علاوہ دینداری ۔۔کے کانفیسر کی اس خانقاہ سے خاص دلچسپی کا باعث

یہ تھا کہ اُس کا محل اس کے قریب تھا اور وہ اس میں دفن ہونا چاہتا تھا۔ یہ بادشاہ اڈورڈ اول سے بھی پہلے ہوا ہے اور ۱۰۴۲ء سے ۱۰۶۶ء تک حکمراں رہا۔ اسے نارمن طرزِ[۱] تعمیر پسند تھی۔ اور اسی لئے ایبے کی تعمیر نارمنڈی (علاقہ فرانس) کے نمونے پر ہوئی۔ انگلستان میں اس طرز کا یہ پہلا نمونہ تھا۔ اور اس کے بعد گرجے عموماً اسی نقشے پر بننے شروع ہوئے۔

اصلاحِ مذہب عیسوی کے اُس زبردست سیلاب میں جو ہنری ہشتم کے عہد میں آیا۔ اور جس نے کیتھولک عقیدے کے سب نشان مٹا دیئے۔ عجب نہیں تھا کہ یہ ایبے بھی بہ جاتی۔ مگر اس کی قسمت میں یہ خزانہ لکھا تھا۔ اُس سیل کی دستبرد سے بچ گئی۔ اور بجائے ایبٹ[۲] کے اُس کے لئے ڈین[۳] مقرر کر دیا گیا چونکہ یہ گرجا محل شاہی کے قریب واقع تھا۔ اس لئے عموماً بادشاہوں کی نظرِ عنایت اس پر رہی "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کا ظہور تو وقتاً فوقتاً ہوتا رہا مگر سب اسی قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے یہاں تک کہ سب بادشاہ اسی میں دفن ہونے لگے اور یہی جگہ تاجپوشی کیلئے مخصوص ہو گئی۔ تاجپوشی جو ایک خوشی کا موقع ہے۔ اس کا ایسا گہرا تعلق ایک مدفن سے ہونا بادی النظر میں نہایت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ اور خیال آتا ہے کہ انگریز بھی باوجود آزاد خیالی کے دعوے کے اسقدر بندۂ رسم و رواج ہیں کہ اس پرانی رسم کو جو موقعۂ تاجپوشی کے بالکل مناسب نہیں ترک کر سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریز بہ حیثیتِ قومی رسم پرستی میں کسی اور قوم سے کم نہیں۔ اور اس رواج میں بھی رسم پرستی کو خاصہ دخل ہے۔ مگر ذرا غور کرنے سے اس رواج کی معقولیت صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ بادشاہ جب اس مقامِ عبرت میں سر پر تاج رکھتا ہے۔ تو دنیوی بڑائی کا انجام اس کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اور وہ اس بات کو محسوس کرتا ہے۔ کہ جو اختیار اور جو اقتدار اس تاج سے وابستہ ہے وہ چند روزہ ہے۔ اور اُس پر پھولنا مناسب نہیں۔ کوشش یہ

[۱] لاہور کی نئی عمارتوں میں گورنمنٹ کالج کی عمارت کے بعض حصے اس طرزِ تعمیر کی نقل ہیں
[۲] راہبوں کا افسر ۱۲ [۳] انگریزی اصلاح شدہ گرجے کا افسر ۱۲

چاہیئے۔ کہ اُس اختیار کو ایسی طرح برتا جائے۔ کہ پس مرگ لوگ خوشی سے اُسے ان بزرگوں کے پہلو میں لاکر سُلائیں۔ اور نیکی سے یاد کریں۔ رسم تاج پوشی اڈورڈ کانفیسر کے مزار کے قریب جو گویا اس ایبے کا مرکز ہے۔ ادا کی جاتی ہے۔ یہ ایک بڑا چبوترہ سا ہے۔ جس پر لکڑی کے خستہ سے زینے چڑھتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک انگریز مصنف یہ رائے ظاہر کرتا ہے:۔

"یاد رہے۔ کہ یہاں آپ اُسی مقام پر ہیں جو ساری عمارت میں مقدس ترین مانا جاتا ہے۔ کسقدر بلندی پر جناب کانفیسر آرام میں ہیں۔ شاہ ہنری سوم نے ۱۲۶۹ء میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ اُن کے تابوت کو یہاں لاکر دفن کیا تھا۔ یہی وہ محرابیں ہیں جہاں شاہ و گدا زانو ٹیک کے دعائے توبہ کرتے تھے۔ یا بیماری سے صحت پانے کے امیدوار ہوتے تھے۔ آپ کے گرد و پیش شاہوں کے مقبرے ہیں۔ اور آپ کے پاؤں تلے شاہزادوں اور شہزادیوں کی مٹی ہے۔ کتاب کے اوراق جن میں اس مدفن کے حالات درج ہیں۔ پھر کسی وقت فرصت میں اُلٹ لیجئے گا۔ سردست اُس کے عالی رتبہ تعمیر کنندہ ہنری سوم کی شاندار قبر کی طرف آنکھ اُٹھایئے جو جانبِ شمال واقع ہے۔ وہ خود تو یہاں ہیں۔ مگر دل اُن کا اور جگہ اپنی ماں کے قریب ہے۔ جانب مغرب اُن سادہ بے زینت سلوں کے نیچے اُس کا نامور لخت جگر شاہ اڈورڈ اوّل لیٹا ہوا ہے جس کی حکومت دانائی کا نمونہ تھی اور جس نے سکاٹلینڈ والوں کی گردن پر جُوا ڈالا۔ جانب مشرق شاہ اڈورڈ کی پیاری بیگم۔ ملکہ الی نور کی قبر ہے جس کی خاطر جہاں کہیں اس کا جنازہ ٹھہرایا جاتا تھا۔ کراس یعنی صلیبی نشان بنائے گئے تھے اور جن میں سے ایک (لندن کے مشہور چوک) چیرنگ کراس کے نام کا باعث ہوئی۔ اب مغربی جانب کو چلئے تو اڈورڈ دوم کی شاہی ڈھال اور تلوار رکھی ہے اور کرسی تاجپوشی موجود ہے۔ یہ کرسی اڈورڈ اوّل کے حکم سے بنی تھی۔ اور اس کے نیچے سنگ تقدیر رکھا ہے۔ جو اڈورڈ اوّل کو سکاٹلینڈ میں ملا تھا۔ اسی کرسی اور

اسی ناہموار سے پتھر پر سارے شاہان انگلستان اُس زمانے سے آجتک تخت نشین ہوئے ہیں۔ اس کی نسبت ایک عجیب روایت یہ ہے کہ یہی پتھر حضرت یعقوب کا سنگِ بالیں بنا تھا۔ اور پھر کنعان سے مصر میں پہنچا۔ مصر سے ہسپانیہ آیا۔ ہسپانیہ سے آئرلینڈ اور آئرلینڈ سے سکاٹلینڈ۔"

یونتو اس مدفن کا ہر حصّہ تاریخ انگلستان کا ایک باب ہے اور اس لئے دلچسپی سے بھرا ہوا ہے۔ مگر دو حصّے عام زائرین کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہیں ایک وہ جس میں مشہور مدبران ملک کی قبور اور یادگاریں ہیں اور دوسرا وہ جسے گوشۂ شعراء کہتے ہیں۔ زندگی میں تو یہ لوگ مقناطیسی کشش میں ممتاز تھے ہی مگر خدا جانے کس بلا کا جادو ان کے خمیر میں تھا۔ کہ پسِ مرگ ان کی خاک بھی دامنگیر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ایک ایک کے سرہانے چشم عبرت کھولے بیٹھے رہیں۔ کیا خوش قسمت تھے یہ لوگ اور کیا مبارک تھی ان کی زندگی۔ کہ جئے تو دنیا کو اپنے علم وعقل سے نفع پہنچایا اور مرے تو ایسی نشانیاں اپنی محنت اور ہمت کی چھوڑ گئے۔ کہ آئندہ نسلیں بھی اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔ مدبروں میں سے بعض کو شاندار یادگاریں اور شاندار کتبے نصیب ہوئے ہیں۔ جن کے ذریعے سے سپاس گذار قوم نے اپنے خادموں کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ مگر بعض نے یہاں بھی اپنی سادگی کو نباہا ہے اور مدتِ عمر سادگی کے ساتھ بسر کرنے کے بعد اُنہیں یہ گوارا نہیں ہوا۔ کہ مر کر شاندار نظر آئیں۔ گلیڈسٹون کا کتبہ اس خیال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُس سے سادہ کتبہ ایسے بلند پایہ وزیر دولت کے لئے ہو نہیں سکتا تھا اُس پر اس کے نام اور سنہ ولادت و انتقال کے سوا صرف یہ الفاظ ہیں:۔

"چار دفعہ وزیر اعظم انگلستان"

اگر کوئی غور سے دیکھے تو ان کتبوں کے الفاظ نہیں۔ ان پتھروں کی سِلوں میں ان کے رنگ ہیں۔ ان کی شکل میں۔ اُن بزرگوں کی تاریخ اور خصائل کا خلاصہ موجود ہے شعراء اور مصنّفین کے مدفن عام طور پر زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

بادشاہوں کی قبر پر تو کوئی پھول چڑھانے نہیں آتا۔ مگر چارلس ڈکنز یا ولسٹ کی قبر پر اکثر پھول نظر آتے ہیں۔ اس کی ہردلعزیزی روز افزوں ہے۔ اور مزا یہ ہو کہ بعض لوگ ساتھ رقعے لکھ کر بھیجتے ہیں جن میں اس کی نسبت اپنی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح دیگر مصنّفین کی قبروں پر ان کے مدّاح کبھی کبھی پھول چڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ اقلیمِ عقل و ذہانت کے بادشاہ گذرے ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ قلوبِ انسانی پر جو دیرپا حکومت اور اثر ان کو حاصل ہے۔ وہ اُن بادشاہو نہیں جن کی قوت تیغ و سناں سے تھی اور جن کی شان مال و دولت پر مبنی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس حصّے میں سونے والے سب کشورِ سخن کے تاجور ہی ہیں۔ کیونکہ جیسا ملکی سلطنت کے لئے جھوٹے دعویدار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس شاہی کے بھی مستحق اور غیر مستحق دونوں ہر وقت موجود رہتے ہیں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مستحق اپنی زندگی میں زیادہ قبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور اُن کے معاصرین۔ اُنہیں "کنجِ شہرت" میں جگہ دیتے ہیں۔ لیکن زمانہ ایسی غلطیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایبے میں بھی کئی لوگ ایسے پڑے ہیں۔ جن کے نام اب زمانہ مٹا چکا ہے اور کئی ایسے ہیں جن کی شہرت میں امتدادِ ماہ و سال کچھ خلل نہیں ڈال سکتا۔ اسی لئے سپکٹیٹر کا مشہور اڈیٹر اڈیسن جو آپ خود حلقۂ مشاہیر میں شامل ہے اور ویسٹ منسٹر ایبے میں جگہ پائے ہوئے ہے لکھتا ہے۔ کہ میں جب گوشۂ شعرا میں گیا تو میں نے وہاں کئی ایسے شاعر دیکھے جن کی شان میں کوئی یادگار وہاں برپا نہیں کی گئی تھی اور کئی ایسی یادگاریں دیکھیں جن کے پاس شاعر نہ تھے۔" مگر غیر مشہور لوگوں کو چھوڑ کر بھی اتنی تعداد مشاہیر کی ہے۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ویسٹ منسٹر ایبے بیشک عجائباتِ انگلستان میں سے ہے۔ لیکن دو باتیں اس میں ایسی ہیں۔ جو ایشیائی مذاق کو کھٹکتی ہیں۔ ان میں ایک تو لاعلاج ہے اور اس کے باعث تو ہر مشرقی سیاح کو ضرور کم و بیش مایوسی ہوگی۔ لیکن دوسری

علاج پذیر ہے۔ اور افسوس ہوگا۔ اگر اس کی کوئی اصلاح ممکن نہ ہو۔ پہلی چیز جو یہاں ان آنکھوں کو جو مشرقی دنیا کے عالیشان مقبروں کے نظارے کی عادی ہیں۔ جن کے بلند اور سفید گنبدوں اور میناروں پر آفتاب اپنی پہلی کرن ڈالتا اور اور ابرِ رحمت اپنی پہلی بوند برساتا ہے۔ مایوس کرتی ہے۔ وہ ایبے کی باہر سے سیاہ دیواریں۔ اُس کے چھوٹے اور پست دروازے۔ اور اس کے اندر کے حصّوں میں سے بعض کی تاریکی ہے۔ مشرقی خیالات میں۔ قبرستان کے ساتھ سبزہ و گل ملے ہوئے ہیں۔ بادشاہوں اور امرا کی قبریں اگر چھت سے ڈھپی ہوتی ہیں تو اُن کے گرد درخت اور بہتا ہوا پانی اور سبزہ موجود ہوتا ہے۔ اور اگر متوسط درجہ کے لوگوں اور غربا کو یہ شان میسّر نہ ہو تو خود رو سبزہ ہر برسات میں اُن کا قبر پوش ہوتا ہے اور جنگل کے درخت اُن کی قبروں پر سایہ کئے ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہاں سب قبریں اس پُرانے گرجے کی چار دیواری سے گھری ہوئی اور اُس کی دیرینہ چھت کے زیرِ سایہ ہیں۔ جو خیالی تصویر اس مقام کی کتابوں میں اس کا نام پڑھتے پڑھتے ہمارے ذہن میں جم گئی تھی۔ حقیقت اُس سے بالکل جُدا ہے۔ اور اس بڑے مدفن کا زائر ظاہری شان کی جسقدر کم توقع دل میں لیکر آئے۔ اُتنا ہی اس کے لئے اچھا ہے۔ دوسری چیز جو ایشیائی طبیعت کو ناگوار ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں لوگ ان ناموروں کی قبروں پر بے دھڑک قدم رکھ دیتے ہیں۔ اور قبور کی سِلیں اس طرح فرشِ زمین سے ملی ہوئی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے اسقدر قریب ہیں۔ کہ تاوقتیکہ خاص کوشش نہ کی جائے اُن کو روندنے کے بغیر ایبے میں چلنا محال ہے۔ ٹینی سن اور براؤننگ۔ ڈکنز اور مکالے جیسے یکتا ایسے لٹائے گئے ہیں کہ اُن کے زائر اُن کے اوپر چلتے ہیں۔ مانا کہ اب وہ پیوندِ خاک ہو گئے ہیں اور مغربی خیالاتِ تعظیمِ قبور کی اس ظاہری حرمت کے چنداں متقاضی نہیں۔ تاہم یہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ خاک تو ہے۔ مگر ایسے دل و دماغ کے بزرگوں کی جن کی زندگی میں لوگ اُن کے لباس کو چھو لینا فخر سمجھتے۔ اور گو وہ اس جہان سے

چل بسے۔ تاہم ان کی مٹی ابتک اتنی قدر کی تو مستحق ہے کہ بیدریغ روندی نہ جائے ملکہ الزبتھ آیبے کے جس گوشے میں سو رہی ہے۔ اور جہاں اس کی قبر پر ایک بلند اور ممتاز چبوترہ ہے۔ اُسی گوشے میں دہلیز کے قریب فرش کے برابر ایڈیسن مدفون ہے۔ جو کوئی ملکہ کی قبر دیکھنے جاتا ہے وہ ایڈیسن کی قبر کو روندتا ہوا جاتا ہے۔ یہ حالت دیکھکر مجھے خیال آیا کہ کاش ایڈیسن کسی اور گوشے میں دفن ہوتا۔ جہاں خواہ کم لوگ جاتے۔ مگر پامالی بھی کم نصیب ہوتی۔ اگر سنگِ مزار بول سکتا تو متوفی کی طرف سے یہ شعر پڑھتا ؎

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو
ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

یہ تو مشکل ہے کہ اہلِ مغرب قبور کے متعلق ادب کا وہ لطیف اور نازک درجہ حاصل کریں جو اہلِ مشرق کا خاصہ ہے۔ مگر کم از کم یہ طریق جواب مروّج ہے۔ ضرور قابلِ ترمیم ہے اور اس میں انہیں ایشیا سے سبق لینا چاہئے۔ اس طرح ایشیا کو اپنے قابل لوگوں کی دِلی قدردانی میں اہل مغرب کی مثال سے بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور جس دن ایشیا کے بڑے شہر اپنی اپنی جگہ ویسٹ منسٹر ایبے کا جواب رکھیں گے۔ وہ دن ترقی کی مبارک فال لائیگا۔

ہربرٹ سپنسر

(سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۹۰۳ء تک)

فلسفۂ جدید کی تاریخ گذشتہ صدی کے ناموروں میں ہربرٹ سپنسر سے بڑا آدمی شاید مشکل ہی سے پیش کر سکے۔ اس عالی دماغ شخص کے حالاتِ زندگی کون نہیں سُننا چاہتا۔ اور اگر خود سپنسر کی زبانی سُنے جا سکیں تو ازیں چہ بہتر۔ حال میں اس کی اپنی تصنیف کی ہوئی سوانح عمری دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سپنسر اُن لوگوں میں سے تھا جو اپنی رسائیِ ذہن اور قدرتی طبّاعی کے سوا

تلمذ کے ممنون یا کسی یونیورسٹی کی تعلیم کے مشکور نہیں ہوتے اور محض اپنی محنت اور ہمت سے وہ نام پیدا کرتے ہیں کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ اہل علم کی دلوں پر ابھی اس بلند پایہ فلسفی کے دنیا سے اُٹھ جانے کا داغ تازہ ہے اور اس لئے اُس کے حالات اور بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ سپنسر نے اس کتاب میں اپنے حالات کی تفصیل اور اپنے خیالات کی توضیح میں اُسی شوقِ تجزیہ سے کام لیا ہے جس سے علم کیمیا کا ماہر حقیقتِ اشیاء دریافت کرتے وقت اور علم نباتات جاننے والا کسی پھول یا پتّے کی تشریح کرتے ہوئے لیتا ہے۔ عبارت کے لحاظ سے یہ کتاب اس کے طرزِ تحریر کا عمدہ نہیں کہی جاسکتی۔ کیونکہ اس نے اسے عجیب دقتوں کے باوجود تکمیل کو پہنچایا۔ پہلے ۱۸۷۵ء میں اُس نے اپنی زندگی کے واقعات کا ایک ڈھانچ سا کئی نشستوں میں کسی سے لکھوایا۔ وہ بولتا جاتا تھا اور کاتب لکھتا جاتا تھا۔ پھر اور کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہوگیا اور سوانح عمری کی ترتیب کا کام ویسے ہی پڑا رہا۔ کوئی دس سال بعد اس کی صحت پہلی دفعہ بگڑی اور دماغی محنت کی کثرت کے سبب ایسا معلوم ہوا کہ شاید قوٰی نے جواب دیدیا ہے۔ مگر ایسے آدمی سے نچلا کب بیٹھا جاتا تھا سوانح عمری کے وہ اوراقِ پریشاں یاد آئے اور ۱۸۸۶ء میں اسے تشغلِ بیکاری سمجھ کر پھر اُٹھالیا۔ کیونکہ کوئی ایسا کام جس کے لئے زیادہ دماغ سوزی درکار ہو اُن دنوں ممکن نہ تھا۔ دن میں کسی وقت جب طبیعت بیکاری سے بالکل گھبرا جاتی تو ۱۸۷۵ء کی یادداشتوں کو ذرا وضاحت سے لکھ لیتا۔ مگر واقعات بپابندیِ تاریخِ وقوع درج نہ ہو سکے۔ سپنسر کو ہر وقت یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ شاید مفصل حالات کے قلمبند کرنے کے لئے اُس کی زندگی وفا نہ کرے۔ اس لئے اُس نے ارادہ کر لیا کہ پہلے ضروری باتیں لکھدی جاویں۔ مگر اسی اثنا میں صحت درست ہو چلی اور اُس نے بعد ازاں کئی باتیں جو پہلے چھوٹ گئی تھیں۔ جابجا بڑھا دیں۔ ان اسباب سے ترتیب اور خوبیٔ عبارت میں تو خلل آگیا۔ تاہم ہمیں

اُس کا مشکور ہونا چاہئے کہ ہمارے لئے اپنی مستند تصویر چھوڑ گیا۔ جسے اُسکے بعد اشاعت نصیب ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ ابتدائے عمر میں سپنسر بالکل معمولی قابلیت کا آدمی نظر آتا ہے۔ ریاضی میں تھوڑی سی واقفیت کے سوا جو مدرسے میں پیدا کی اور سائنس سے کچھ خفیف شناسائی کے علاوہ جو بطور خود قدرتی مذاق کی وجہ سے حاصل کی سپنسر اس چیز سے جسے عرف میں "تعلیم" کہتے ہیں۔ بے بہرہ تھا۔ اٹھارویں برس میں وہ اپنی تعلیمی حالت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:۔

ریاضی خاصی آچلی تھی۔ اور اسی لئے قوّت استدلال مضبوط ہو گئی تھی۔ مگر زبانیں سیکھنے میں مجھے بہت کم کامیابی ہوئی۔ فرانسیسی کا تو سوائے گرامر کے ابتدائی حصے اور ایک فقروں کی کتاب کے چند صفحوں کے میں کچھ نہ پڑھ سکا یونانی میں بھی قدرے صرف نحو اور انجیل کے چند بابوں کا ترجمہ اور لاطینی کی کسی آسان سی کتاب کا ترجمہ میں کر سکتا تھا۔ مگر اس میں غلطیاں رہ جاتی تھیں ہئیتِ میں تعلیم کا احاطہ محدود تھا۔ تاریخ تو پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی۔ عام علم ادب کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ عملی علوم طبیعات داخلِ نصاب نہ تھے۔ اور نظم اور افسانے خارج از علوم سمجھے جاتے تھے"۔

سپنسر کی باقاعدہ درسی تعلیم کا مندرجہ بالا تفصیل پر خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ فن انجنیری کی تحصیل میں لگا دیا گیا۔ اور اکیس برس تک اسی شغل میں مشغول رہا۔ کبھی لندن کے ریل کے کارخانوں میں اور کبھی برمنگھم میں وہ کام سیکھتا رہا شوقِ علم اُسے اس عرصے میں بھی طبیعت کو گدگدائے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس لئے وہ اوقاتِ فرصت میں ریاضیات میں اپنا علم بڑھاتا رہا۔ اس زمانے میں سپنسر نے جو خطوط اپنے باپ کو لکھے ہیں وہ مسائل اُقلیدس سے پُر ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ اپنے فن کے متعلق یا علم طبعی کے متعلق بھی اُن میں بحث کرتا تھا۔ اس کا باپ فزکس (طبیعات) اور کمسٹری (علم کیمیا) کا شائق تھا۔ اور کچھ لوگ اس سے یہ

یہ علوم پڑھتے تھے۔ اس لئے سپنسر کو بھی بچپن ہی سے ان میں تھوڑا سا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ جن دنوں وہ کام سیکھ رہا تھا۔ ان دنوں میں چند لکچر علم کیمیا پر ہوئے اور ان کے سننے سے اس علم کی چند کتابیں پڑھنے کی طرف رغبت ہوئی۔ اور اسی زمانے میں ایک کتاب علم طبقات الارض کی خریدی اور پڑھی۔ مگر ان علمی چیزوں کی طرف میلان کے سوا اس زمانے میں گہرے فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ اس وقت کوئی اس نوجوان انجنیر کو دیکھکر گمان تک نہیں کرسکتا تھا۔ کہ علم مابعد الطبیعۃ کے مطالعے کے لئے جس نازک خیالی کی ضرورت ہے اور جسقدر جذبات سے بھری ہوئی طبیعت درکار ہے۔ اُس کا کوئی حصّہ اس شخص میں موجود ہے۔ یہ باتیں عموماً مذہبی طبائع میں ہوتی ہیں اور مذہب سے سپنسر کو بالکل ناموافقت تھی۔ یہ ناموافقت ایک حد تک تو بعض موروثی خواص کا نتیجہ تھی اور ایک حد تک اس کی خصوصیت تھی۔ اپنے بزرگوں کے خواص وہ یوں شمار کرتا ہے "آزادہ روی۔ خودرائی۔ انکار تقلید اور سیاسی۔ تمدنی اور اخلاقی اُمور میں اپنی رائے کا صاف اور بیدھڑک اظہار۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں۔ اگر ایسے بزرگوں کی اولاد مذہب سے اس درجہ بے پرواہ ہو۔ جیسا کہ سپنسر ذیل کی عبارت میں نظر آتا ہے "مذہب عیسائیت باعتبار میرے جذبات اور میرے قوائے ذہنی کے میری فطرت سے بیگانہ ہے۔ بہت لوگوں کو عبادت مذہبی سے ایک قسم کی فرحت ہوتی ہے۔ مگر مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ البتہ گرجے کی موسیقی سے جو اثر قلب پر ہوتا ہے اُسے مستثنٰی رکھتا ہوں۔ مگر ایک شخصی وجود کی مدح و ثنا اور اس کے سامنے اپنی اطاعت، اور عجز کا اظہار ایسی آوازیں ہیں جن کی صدا میرے دل سے کبھی نہیں اُٹھی۔"

تحصیل فن کے زمانے میں سپنسر کو نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر اکیسویں برس میں ہی اُس نے اس ملازمت کو خیرباد کہا۔ تاکہ ایک کل بنانے میں جو برقی اور مقناطیسی دونوں قوتوں سے کام لے۔ اور جس کی تجویز اس کے باپ کو سوجھی تھی

اپنا سارا وقت صرف کر سکے۔ لیکن ایک مہینے کی لگاتار محنت سے یہ معلوم ہوا کہ وہ تجویز عملی صورت میں نہیں آسکتی۔ مایوس ہو کے رہ گیا۔ اس کے بعد سات سال تک بے ٹھکانہ سی زندگی کٹی۔ کئی دفعہ انجنیری کی عارضی ملازمت منظور کی۔ پر سات برس میں کل ڈیڑھ برس ملازمت کا آیا اور باقی وقت "نئی تجویزیں سوچنے اور اُن کا امتحان کرنے میں ضائع ہوا۔ بغیر اس کے کہ اُن سے کوئی عملی نتیجہ مترتب ہو" ان تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ کوئی نئی دریافت یا ایجاد ایسی ہو جس سے مالی نفع پہنچے۔ لیکن یہ محنت رائگاں گئی اور گو بعض چیزیں ابتدا میں اُمید دلانے والی نظر آئیں۔ امید جلد مبدل بہ مایوسی ہوتی گئی۔

سنہ ۱۸۴۲ء میں جب اُس کی عمر بائیس برس کی تھی۔ ہم اُسے میدانِ تصنیف میں قدم رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اُس کی پہلی کتاب ایک پولٹیکل رسالہ تھا۔ جس میں "حکومت کے حدود مناسب مقرر کئے گئے تھے۔ اس میں بعض رائیں ایسی تھیں جنہیں بعد میں سپنسر کو بدلنا پڑا۔ مگر غور سے دیکھیں تو اسکے پولٹیکل فلسفے کے سب اصول اس رسالہ میں آ گئے تھے۔ اس کا بیان ہے کہ اسی رسالے سے بعد کی مشہور کتابیں نکلیں۔ کتاب سوشل سٹیٹکس کا خیال اسی سے پیدا ہوا اور جن تمدنی امور سے اُس میں بحث تھی۔ اُن پر غور کرتے ہوئے پرنسپلز اف سائی کولوجی (یعنی علم النفس کے اصول) کی نوبت آئی۔

سنہ ۱۸۴۶ء میں سپنسر نے چند کتابوں کا مسلسل مطالعہ شروع کیا۔ تاکہ فلسفہ پر کتاب لکھے۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں اس کے پاس مجوزہ کتاب "مارل فلاسفی" کے لئے کافی مواد جمع ہو گیا۔ اور یہ مواد اس کے دماغ میں گھومنے لگا۔" اور اسی سال کے ماہ ستمبر میں اُس نے دیباچے کے تیس صفحے لکھکر اپنے باپ کے پاس بھیجدیئے۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں گو ابھی مستقبل کے متعلق وہ معرضِ امید و بیم میں تھا۔ تاہم ڈربی کے گرد و نواح کے کھیتوں میں گھومتے ہوئے وہ اس کتاب کے اگلے باب سوچتا رہا۔ اور یہ اس کی عادت تھی کہ سوچ کے لئے اُس کی طبیعت سیر ہی میں حاضر

ہوتی تھی بسنہ۱۸۴۵ء میں آئندہ کی تجاویز ایسی غیر متیقن تھیں۔ کہ اس کا ارادہ ہو رہا تھا کہ نیوزیلینڈ میں جا بسے۔ کبھی یہ ارادہ ہوتا تھا کہ باپ کے ساتھ شریک ہوکر ایک نیا مدرسہ جاری کرے۔ مگر اختتام سال سے پہلے اس کو اخبار "اکونومسٹ" کی نائب اڈیٹری مل گئی اور اس تشویش کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد اُس کی زندگی ثابت قدمی کے ساتھ ایک منزل کی طرف ترقی کرتی گئی۔ سب سے پہلے کتاب "سوشل سٹیٹیکس" تیار ہوئی۔ لندن میں جو پہلا سال گذرا اُس کی راتیں اس تصنیف کے لئے وقف رہیں۔ طرزِ تحریر کی طرف اس زمانے میں بہت توجہ تھی بسنہ۱۸۵۱ء کے آخر میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

سنہ۱۸۵۰ء اور سنہ۱۸۶۰ء کے درمیان جو دس سال کا عرصہ گذرا۔ اس کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہی ہے کہ اس عرصے میں سپنسر کے دل میں ایک نظام فلسفی کے خیال کا ارتقا جاری رہا۔ انہی دنوں میں جارج الیٹ (مشہور افسانہ نگار) سے اس کی ملاقات ہوئی اور جارج لوئیس (مصنّف تاریخ فلسفہ) ہکسلے اور ٹنڈل (مشہور سائنس دان) سے دوستی اور رسم پیدا ہوئی۔ جو مدت العمر قائم رہی۔ لوئیس کی دوستی کے لحاظ سے اُس نے لوئیس کی مشہور و معروف کتاب "تاریخ فلسفہ" پڑھی اور اُس کا تعارف فلسفیانہ خیالات سے اسی کتاب کی بدولت ہوا۔ وہ خود معترف ہے کہ اس وقت تک فلسفی مسائل کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے کا چھڑنا تھا کہ پھر بقیۂ عمر فلسفی تصانیف کی ہی نذر ہوگئی سنہ۱۸۶۲ء میں اس کی نامور کتاب "اے سسٹم آف سنتھٹک فلسفی" شائع ہوئی اور سنہ۱۸۹۶ء میں اس کی طبع ثانی کی نوبت آئی سپنسر کا فلسفہ بہ حیثیت جدت اور زور بیان میدانِ قبولیت میں تو گوئے سبقت لے گیا۔ مگر واقفانِ فن کی نقادانہ رائے یہ ہے کہ اس میں ابتدائی تعلیم میں فلسفے کی ناواقفیت کے آثار موجود ہیں اور نتائج کے استنباط میں لغزش کئی جگہ نظر آتی ہے۔ تاہم اس کی کتابیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں اور یہ رنگ

وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائینگی۔

اُنیسویں صدی کے عقائد میں قانونِ ارتقا (ایوولیوشن) سب سے زیادہ مقبول نظر آتا ہے۔ اور گو یہ کہنا آسان نہیں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دنیا اس مسئلہ کو اُسی طرح تسلیم کریگی جس طرح اُنیسویں صدی کے اخیر میں کرتی تھی۔ تاہم اس کی موجودہ وقعت کا لحاظ اس کے سب سے بڑے حامی کی توقیر پر مجبور کرتا ہے۔ ڈاروِن اس نئے زمانے میں اس کا محرک اور سپنسر اس کا بڑا مویدتھا۔ اور اس بارے میں اس کے عقائد کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارات سے جو اس کی پہلی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ ہو سکتا ہے۔

"ترقی کوئی اتفاقی امر نہیں۔ بلکہ لازمۂ ہستی ہے۔ تہذیب بجائے مصنوعی چیز ہونے کے فطرت کا اُسی طرح ایک حصّہ ہے۔ جیسے جنین کا ترقی کرتے کرتے بچّے کی صورت اختیار کرنا اور کلی کا کھل کر پھول بننا۔ جو جو تبدیلیاں بنی نوع انسان میں واقع ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں وہ اُسی قانون کا نتیجہ ہیں جو ساری ذی حیات مخلوقات پر حاوی ہے۔ اور بشرطیکہ نسل انسانی قائم اور ترکیب اشیاء بحالتِ موجودہ رہے۔ ان تبدیلیوں کا لازمی نتیجہ تکمیل ہے۔ جیسا کہ یہ یقینی ہے کہ درخت اکیلا نمو پاتا رہے تو تناور ہو جاتا ہے۔ اور اگر جھنڈ میں سے ایک ہو تو پتلا سا رہتا ہے۔ یا جیسا کہ گھوڑا حسبِ ضرورت گاڑی میں جوتنے کے لائق یا گھوڑ دوڑ میں دوڑنے کے لائق بنتا ہے۔ اسی طرح یہ یقینی ہے کہ انسان کے قوا جسمانی و ذہنی اس کی تمدنی حالت کے عین متناسب رہنے کے لئے سانچے میں ڈھلتے ہیں اور اسی طرح لازم ہے کہ وہ چیزیں جنہیں ہم بُرائی اور بد اخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں رفتہ رفتہ غیر موجود ہو جائیں اور انسان انسانِ کامل بن جائے" پھر اُسی کتاب کے ایک اور حصّے میں:۔

"ایک زبردست حرکت ہے جو ہمیشہ تکمیل کی طرف لیجا رہی ہے۔ اس کی عمومیت اس درجے کی ہے کہ تمام خفیف بے قاعدگیاں اور کوتاہیاں اُسکے

آ گئے پہنچ ہیں جیساکہ زمین کی گولائی کے خم کے سامنے کوہ و وادی دونوں بے حقیقت ہیں۔ نظرِ غائر نقائص میں بھی خواہش تکمیل کی جد وجہد کا ظہور پاتی ہے۔ غور کرنے والے شخص کو جو بات سب سے بڑھ کر حیرت میں ڈالتی ہے اصلی کفایتِ اشیا ہے۔ اور وہ بظاہر پیچیدہ مگر درحقیقت سادہ اصول جس سے ہر نقص کی اصلاح خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ وہی اصول جس سے نجوم بعد حرکت اپنی اپنی جگہ قایم رہتے ہیں۔ جس سے زخمی انگلی خود بخود درست ہو جاتی ہے۔ جو نظامِ تمدن کے پلڑے برابر رکھتا ہے۔ جو نابینا آدمی کی شنوائی بڑھا دیتا ہے۔ جو قیمت کو پیداوار کی مقدار کے متناسب کرتا ہے اور جو ایک پودے کو نئی آب وہوا کا عادی بنا دیتا ہے۔ سوچنے والا آدمی روز بروز انتظامِ فطرت میں نیا حسن دیکھنے لگتا ہے۔ چشمِ بصیرت کھلتے ہی اُسے اعلیٰ موزونیت دکھانے لگتی اور اُس کے دل میں گہرا عقیدہ جمانے لگتی ہے۔ جب اس کے قلب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اُسے کسی سطحی خیال کے شخص کا اُٹھ کر یہ دعویٰ کرنا کہ وہ کسی طرح فطرت کی اصلاح کر سکتا ہے اور اس بے عیب جامے میں تھگلی لگا سکتا ہے۔ کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ ان حضرت کی صورت تو ملاحظہ ہو۔ کہ ایسے عجائبات سے تو گھرے ہوئے ہیں اور پھر انہیں یہ جرأت ہے کہ اس امر کا اعلان کریں کہ انہوں نے اور ان کے چند ہمعصروں نے باہمی مشورہ کرکے خدائی انتظام میں اصلاح کا کوئی طریقہ ایجاد کیا ہے! یہ دخل درمعقولات دینے والے۔ یہ خود بخود دنیا جہان کی خبر گیری کا بیڑا اُٹھانے والے۔ قوانین قدرت پر اسقدر کم اور اپنی قابلیت پر اسقدر زیادہ بھروسا رکھتے ہیں۔ کہ اگر ان کی چلنے پائے تو آج ہی سورج اور زمین کو ایک مضبوط زنجیر سے جکڑ دیں۔ کہ کہیں وہ قوت جو اس وقت دونوں کو قائم رکھتی ہوتی ہے اچانک عمل کرنے سے نہ رہ جائے۔ گویا ان کے نزدیک کوئی قاعدہ جو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے ہیں قوانین کے مشابہ نہ ہو قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ ہے خلاصہ اُن حیرت انگیز عقائد کا جو ان ترمیم کنندگانِ تخلیق کا شعار ہیں۔"

مندرجہ بالا عبارات ظاہر کرتی ہیں۔ کہ سپنسر گو بعض باتوں میں نیا تھا۔ مگر اس پرانے مسئلہ میں کہ دنیا کی تجویز اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ متقدمین سے نہایت خوش عقیدہ لوگوں کا ہم خیال ہے۔ اس کی تصانیف کے بعض حصے جہاں لامذہبی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہیں ایسی عبارتیں خدا کی خدائی کا بے اختیارانہ اعتراف کر رہی ہیں۔ اور انہیں پڑھتے ہوئے حالی کا وہ شعر یاد آتا ہے ؎

مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہو ضرور — بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہو کھٹکا تیرا

اس کی آخری کتاب یعنی سوانح عمری میں جو اس کے پسِ مرگ شائع ہوئی ہے۔ نہایت دلچسپ بات یہی ہے۔ کہ اس نے اپنے حالات اور خیالات بلا کم و کاست لکھ دیئے ہیں اور اپنے نقائص کا بے حجاب اقرار کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی خوبیوں کا گہرا نقش دل پر بیٹھتا جاتا ہے اور خوبیاں عیوب کو بھلا دیتی ہیں۔ اس کی اعلیٰ درجہ کی دیانتداری۔ بے دھڑک اخلاقی جرأت۔ مثالیہ کی بلندی۔ بیحد مشکلات کے باوجود اپنے مثالیہ کو عملی صورت دینا۔ عادات کی سادگی۔ ابنائے جنس کی صحبت کی جستجو۔ بچّوں کی محبت اور دیرپا دوستیاں قایم کرنے کی قابلیت ایسی خصلتیں ہیں۔ جن کی تعریف کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا اور اور اس سوانح عمری کو پڑھنے والا کتاب کو پسند کرتے وقت مصنف کی بہ حیثیتِ انسانی سچّی تعظیم اپنے دل میں پاتا ہے۔ اور اس بڑے فلسفی کے خیالات سے خواہ اُسے اتفاق ہو یا نہ ہو۔ اس کو بڑا آدمی تسلیم کرنے میں انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

کشتی اور طوفان

وہ دردناک نظّارہ مشکل سے بھولیگا۔ جب میں نے ایک ساون کشتی اور اُس کی سواریوں کو۔ ساحل کے قریب۔ ہزارہا لوگوں کے پیشِ نظر۔ طوفان کی لہروں کے زبردست تھپیڑوں سے عاجز آ کر۔ ڈوبتے دیکھا۔

فرانس کا شمالی ساحل تھا۔ اور اتوار کا دن۔ ہزاروں تماشائی زن و مرد ساحل کے قریب اونچے بند پر بیٹھے طوفان اور تلاطمِ دریا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سکون کے وقت تو سمندر کے منظر کو دلکشا ماننے میں شاید کسی کو بھی کلام نہ ہو۔ لیکن تلاطم کے وقت کا منظر بھی ایک پُر شوکت دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشرطیکہ آپ سبکسارانِ ساحل میں ہوں۔ مگر یہ دلچسپی اُسی وقت تک ہے کہ سامنے سمندر ہی سمندر ہو کسی انسان کی جان یا کسی کشتی کی قسمت طوفان کے پنجے میں نہ ہو۔ ورنہ فوراً سخت سے سخت دل موم ہونے لگتے ہیں۔ اور دلوں سے دعائیں بے اختیار اُٹھتی ہیں۔ کہ الٰہی ان جانوں کی خیر ہو جو اس پُر شور حالت میں توکل بخدا پانی میں ناؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ جس دن کا میں ذکر کرتا ہوں۔ اُس دن سمندر زوروں پر تھا موجیں بلّیوں اُچھلتی تھیں۔ اور کبھی کبھی پانی ساحل کی ساری خشکی طے کر کے بند سے آکر ٹکراتا تھا اور اس طرح اُچھلتا تھا کہ بند کے اوپر کی زمین تر ہو جاتی تھی۔ اور جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے کپڑے بھیگ جاتے تھے۔ لیکن تعطیل کا دن، فراغت کا زمانہ۔ سمندر کی یہ بے اعتدالیاں ہنسی میں ٹال دی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے دامن تک اگر سمندر اپنا دستِ گستاخ بڑھاتا تھا تو کئی اور مشتاق ہاتھ بچانے دوڑتے تھے۔ اور چھتری کی ڈھال سامنے کر دیتے تھے اور عورت ہنستی ہوئی شکریہ ادا کرتی تھی۔ اگر کسی مرد کا دامن آبِ شور سے تر ہو جاتا تھا تو عورتیں تالی بجاتی تھیں اور وہ قہقہے پڑتے تھے کہ الاماں۔ لوگ بھیگتے تھے۔ اور پروا نہ کرتے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے ٹلتا نہیں تھا۔ ایک طرف باجا بج رہا تھا اور سینکڑوں لوگ اُس کے گرد جمع تھے۔ اور جو دور تھے وہ بھی اُس کی سُریلی صداؤں کے مزے لے رہے تھے۔ کہ اچانک ایک توپ کی آواز آئی۔ چار بجے کے قریب توپ کیوں چلی؟ اب سب حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جاننے والے جان گئے کہ کوئی جہاز یا کوئی کشتی خطرے میں ہے اور یہ توپ بندرگاہ کے اُس مینار سے چلی ہے جہاں ایک تجربہ کار بحری افسر اس نگہداشت پر متعین رہتا ہے کہ نواحِ بندر

میں اگر کوئی ایسا حادثہ ہو تو فوراً اُس کی اطلاع دے۔ نگاہیں سمندر کی طرف دوڑیں اور ایک بادبان پر پڑیں۔ جو اپنے کام سے عاری ہو چکا تھا۔ اور اُس سے ایک مستول پر اُتریں جو سرنگوں ہوتا جاتا تھا۔ کشتی کا ایک سرا پانی میں تھا اور دوسرا پانی کے اوپر تھا۔ اور اس طرف مستول سے مضطربانہ پیٹتے ہوئے دو آدمی نظر آتے تھے۔ سینکڑوں زن و مرد بیقراری کے ساتھ بند سے نیچے اُتر کر پانی کے قریب جانے لگے۔ اور بعض پیراک کپڑے اُتار کر پانی میں کود پڑے کہ کشتی تک پہنچکر اُس کی مدد کریں۔ تھوڑی دیر میں دو کشتیاں پانی میں ڈالی گئیں جن میں وردی پوش ملّاح ایک ایسی سوسائٹی کے ملازم تھے جس کا کام ڈوبتوں کی جانیں بچانا ہے اور جو عموماً سمندر کے کنارے پھرتے رہتے ہیں۔ کہ اگر کوئی ناواقف دور تک نہاتا ہوا چلا جائے اور غوطے کھانے لگے یا اور کوئی واقعہ ہو تو مدد کو پہنچیں۔ مگر موجوں کی یہ حالت تھی کہ دونوں کشتیوں میں سے ایک بھی وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں کشتی ڈوب رہی تھی۔ یہ لوگ ہمّت کر کے اُس طرف کو بڑھتے تھے۔ مگر ایک ہی موج ایسی آتی تھی کہ مار کر پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ اُتنے قدم بڑھنے نہیں پاتے تھے جتنے پیچھے دھکیل دیئے جاتے تھے۔ گویا سمندر زبانِ موج سے ان پر عتاب کرتا ہوا کہتا تھا "او۔ انسانِ ضعیف کے بے ادب ہاتھو۔ ہٹو۔ اور اپنی بساط سے بڑھنے کی جرأت نہ کرو۔ یہ کشتی اور اُس کی سواریاں میرا شکار ہیں۔ اور کس کی مجال ہے کہ میرا شکار مجھ سے چھینے اور میں کیا ہوں میں بھی نہنگِ اجل کا ایک مُنہ ہوں۔ اُس نہنگ کا نوالہ اب تمہارے ہاتھ کیونکر آ سکتا ہے" اسی طرح وہ دلاور اور ہمدرد پیراک جو اِکّا دُکّا کود پڑے تھے۔ لطمۂ موج سے عاجز آ کر کنارے پر کھڑے بے بسی سے یہ خوفناک تماشا دیکھ رہے تھے۔ کشتی بان کے کئی یار دوست جان پہچان وہیں کنارے پر موجود تھے اور ہاتھ مل رہے تھے۔ مگر کیا ہوتا تھا۔ کشتی دو چار دفعہ ڈوبی اور اُبھری آخر صرف بادبان کا ایک حصّہ پانی کے اوپر تھا۔ اور باقی سب پانی کے نیچے۔ ذرا دیر میں وہ بادبان بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور کشتی نذرِ طوفان ہو گئی۔

اس ہیبت ناک سین کے دیکھنے والوں کے چہرے اُس وقت دیکھنے کے لائق تھے۔ ایک مایوسی تھی جو سب چہروں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک رنج تھا جو سب دلوں پر مسلط تھا۔ ایک پریشانی تھی جو سب طرف آشکار تھی۔ ایسی ہی گھڑیوں میں بنی نوع انسان کی وہ باہمی لازوال یگانگت ثابت ہوتی ہے۔ جس سے کیا اشخاص کیا اقوام کامیابی کے نشے اور دولت کمانے کی جدوجہد میں چشم پوشی کر لیتی ہیں۔ وہاں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ انگریز بھی تھے اور فرانسیسی بھی۔ پراٹسٹنٹ بھی تھے اور کیتھالک بھی۔ چند سیاہ فام حبشی تھے اور چند گندم گون مصری۔ مراقش اور الجزائر کے کئی تاجر اپنی سُرخ ٹوپیاں پہنے کھڑے تھے۔ اور میں ایک ہندی بھی اُسی گروہ کا ایک جزوِ قلیل تھا۔ مگر ہر ایک نبض ایک رفتار پر تھی۔ گویا ایک نبض تھی جو ان جانوں کے اس طرح ضایع ہونے کے صدمے سے مضطربانہ حرکت میں تھی۔ ایک دوسرے سے پوچھتا تھا کہ مرنیوالے کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔ پہلے تو جتنے مُنہ تھے اُتنی زبانیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ آخر ایک شخص سے جس نے اس کشتی کو روانہ ہوتے دیکھا تھا۔ معلوم ہوا۔ کہ کشتی میں چھ آدمی تھے۔ ایک کشتی بان اور دو اُس کے بچے۔ ایک چودہ سال کا جو کشتی چلانے میں مدد دیتا تھا۔ اور دوسرا آٹھ نو سال کا جس کو وہ اکیلا گھر میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں مر چکی تھی۔ یہ شخص کشتی لئے کنارے پر بیٹھا تھا۔ کہ تین مسافر آئے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ اُنہوں نے کہا ہم سمندر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دو اور کشتی والوں نے انکار کیا کہ آج طوفان آرہا ہے اس حالت میں کشتی دریا میں نہیں ڈالی جاسکتی۔ وہ مایوس ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں پھر اور موقع نہیں ہے۔ کل واپس جانا ہے۔ یہ کشتی بان دلیر تھا۔ اُس نے کہا۔ آؤ۔ میں لے چلتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے سوار ہو لئے۔ اور کشتی چلی۔ آدمی تھا کاریگر۔ خاصی دیر تک باوجود طوفان کے چلاتا رہا۔ مگر اُس کی اس دلیری اور اُن کے اس شوق کی آڑ میں موت شکار کھیل رہی تھی۔ ایک تھپیڑا ایسے زور کا آیا

کہ کشتی اس کے قابو میں نہ رہی اور اُلٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ نہ کہیں ٹھکانا لگنا تھا نہ لگا۔

اب اُن آفت رسیدوں کی کہانی سنو جو سیر کرنے نکلے تھے۔ وہ تھے ایک میاں۔ ایک بی بی۔ اور ایک میاں کا بھائی۔ میاں بی بی میں کچھ عرصہ سے عشق صادق تھا اور آخر دونوں نکاح پر متفق ہو گئے تھے۔ اتوار کا یہ حادثہ ہے۔ اور ہفتے کے دن اُن کا بیاہ ہوا تھا۔ دونوں کے ماباپ زندہ تھے اور بیاہ ہوتے ہی یہ اُن سے ہنسی خوشی رخصت ہوئے تھے کہ اتوار کا دن بولوں کاٹ کر پیر کو گھر آجائیں گے۔ ہفتے کو جب پادری ان کے ہاتھ ملا کر ان کو دعا دے رہا ہوگا۔ تو اُسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ نکاح آسمان کے لئے باندہ رہا ہے۔ اور زمین پر اس نکاح کی مُدت چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر وہ چوبیس گھنٹے ایسے تھے کہ ان پر چوبیس سال کی خوشی قربان کر دینی چاہیئے۔ کیونکہ اُن کا جو انجام ہوا وہ ہر چند پُر درد اور غمناک ہے۔ مگر ایسا انجام ہے کہ کوئی طالب و مطلوب اُس سے بڑھ کر آرزو نہیں کر سکتے۔ دونوں ڈوبے تو اکٹھے ڈوبے۔ شب بھر موجوں کے سامنے اکٹھے سینہ سپر رہے۔ اور جب دنیا بھر نے یہ سمجھ لیا کہ قعرِ سمندر میں جہاں لاکھوں بندگانِ خدا کی بے نشان قبریں بنتی ہیں۔ ان کا بھی مزار بن چکا۔ تو اچانک سمندر کے جی میں یہ آئی کہ ان کا عشق صادق کم از کم پختہ اور مشترکہ مزار کا مستحق ہے چلو۔ ان کی لاشیں اُگل دو۔ باقی سب کو تو ہضم کر گیا۔ لیکن ان دونوں کو پیر کے روز ساحل پر پھینک دیا۔ پیر کو دریا کا سکون دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ کہ کل یہیں اس زور کا طوفان تھا۔ اور جہاں کشتی ڈوبی تھی اُس جگہ کے قریب خشکی ہو گئی تھی۔ وہاں دو موم کی تصویریں پڑی تھیں۔ بیوی اپنے جاں نثار شوہر سے لپٹی ہوئی۔ بال چہرے پر پریشان۔ مگر صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سو رہی ہے میاں کے چہرے پر یہ سکون نہ تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا۔ کہ جوانمرد نے موجوں سے لڑتے لڑتے جان دی ہے۔ اور جد و جہد کا نقش چہرے پر

یادگار رہ گیا ہے ؎

شناورانِ محبت تو سینکڑوں ہیں۔ مگر
جو ڈوب جائے وہ یکتا ہے آشنائی کا

پولٹیکل ڈراما

"جنگِ روس وجاپان" کے عنوان سے حیدر آباد کے مشہور و مقبول رسالہ دکن ریویو میں ایک قابلِ قدر اور نتیجہ خیز مضمون شائع ہوا ہے۔ جسے اردو میں پہلا پولٹیکل ڈراما کہہ سکتے ہیں جب خود ڈراما ہی اردو میں ایک نئی چیز ہے اور چند تازہ کتابوں کے سوا کام کے ناٹک ابھی ہماری زبان ہیں نایاب ہیں۔ تو ڈرامے کی مختلف اصنام کی نوبت کہاں سے آتی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ روزمرہ کے واقعات اور سیاسی خیالات کے ذہن نشین کرنے کے لئے واقعات کو افسانے کا لباس پہنانا یا ڈرامے کے دلچسپ مکالموں کی صورت میں ادا کرنا ایک نہایت ہی موثر پیرائہ بیان ہے اور مغربی دُنیا کے صاحبانِ تصنیف اس سے عموماً بڑے بڑے کام لیتے ہیں۔ دکن ریویو کے باخبر اڈیٹر محمد ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے نے اس مثال سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور جاپان کی نمایاں فتح کی یادگار میں ایک ایسی چیز لکھی ہے۔ جس کا اثر ہندوستان کے ہر حصّے میں محسوس ہونا چاہئے۔ یہ ڈراما ریویو کے دو سو صفحے کے قریب گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کی اشاعت کی خاطر چار مہینوں کے پرچے یکجا چھاپے گئے ہیں قصّے کے شروع ہونے سے پہلے ایک تمہیدی مضمون مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سابق اڈیٹر رسالہ افسر کا لکھا ہوا ہے۔ جو بجائے خود بہت تعریف کے قابل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈراما تو ایک بہانہ ہے۔ قابل مصنف کا مدعا اپنے ملک میں شوقِ ترقی پھیلانا ہے۔ اور اس مدعا کے حصول کے لئے اس

تصنیف کے بعض حصے نہایت موزوں ہیں۔ ہمارے ذخیرۂ ادب کو ایسی کتابوں کی بیحد ضرورت ہے۔ جو سیاسیات کے مسئلے دلچسپ طریقوں سے اور عام فہم پیرائے میں اردو داں جماعت کے روبرو پیش کریں۔ اور ہمارے ہموطنوں میں ان مسائل پر غور و فکر کرنے کی عادت ڈالیں اور انہیں دنیا کے دوسرے ملکوں کی علمی قوّت کی تقلید کے لایق بنائیں۔

یہ ڈراما چار باب پر منقسم ہے اور ہر باب میں متعدد سین ہیں۔ پہلا پردہ اٹھتے ہی شہنشاہ مکاڈو کی مجلس شورٰی دکھاتا ہے۔ جس میں شہنشاہ اپنے اراکین سے یوں مخاطب ہوتا ہے ؎

گرچہ افسانۂ مشرق میں نہ بج رہا ہو کوس وقار اپنا | نواحِ مغرب میں لیکن ابتک جما نہیں اعتبار اپنا
مزا تو جب ہو کہ جرمنی اور فرانس مانیں ہمارا لوہا | ہمارے آگے سرِ تفاخر جھکائے مغرور زار اپنا

دربار کے امرا شہنشاہ کے ہم خیال اور ہم آہنگ ہیں۔ اور روس سے جنگ ٹھن جاتی ہے۔ دوسرا پردہ محل شاہی سے ہمیں ایک غریب بڑھیا کی جھونپڑی میں لے جاتا ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے اوکیو کو خدمتِ ملک و قوم کے لئے آزاد کردینے کی غرض سے جان پر کھیل جاتی ہے۔ یہی اوکیو جس سے ہمیں ابتدا سے ہی ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اس قصّے کا "ہیرو" بنتا ہے۔ اور اسی کی بدولت اس ڈرامے میں حسن و عشق کی چاشنی پیدا کی جاتی ہے۔ تیسرا پردہ ہمیں مشرق کی سرزمین سے منتقل کرکے دفعتاً مغرب کا نقشہ دکھاتا ہے۔ اور زارِ روس اپنے مشیروں سے سرگرم مشورت نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے متکبّر امرا لڑائی پر آمادہ کرتے ہیں دونوں درباروں کا نقشہ کھینچنے میں اُن کی اندرونی حالت کا مقابلہ کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔ اور مکاڈو اور زار کے خیالات اور جذبات کا فرق دکھایا گیا ہے اسیطرح جاپان اور روس دونو ملکوں کے رہنے والوں کی حالت کا مقابلہ جابجا کیا گیا ہے جاپانی اپنے حاکم سے خوش اور اپنے ملک پر جان فدا کرنے کو تیار دکھائی دیتے ہیں اور روسی مدّتوں کے ظلم و تعدّی سے تنگ آکر زار اور اُس کی حکومت کی تزلزل کے

خواہاں ہیں۔ اور جاپانیوں کو زار کے لئے ایک خدا ساز سامانِ تہدید سمجھتے ہیں۔ جاپانی افسروں کا ایثار اس سے ظاہر ہے کہ اوکیو اپنی ایمی کو جس کا وہ سچا جاں نثار اور عاشق ہے۔ خدا کے حوالے کر کے جنگ میں سربازی کو جاتا ہے اور روسی افسروں کی تباہی اُن کی عیاشی سے ہویدا ہے کہ میدانِ کارزار میں بھی ناچ کے جلسے رچاتے ہیں اور وہاں امیر البحر ایک افسر کی بیوی کو بھگانے کی فکر میں نظر آتا ہے۔

دوسرا باب جس پردے سے شروع ہوتا ہے وہ آبنائے کوریا کا منظر ہے اور جاپانی امیر البحر ٹوگو کے جہاز وہاں مقیم نظر آتے ہیں۔ امیر البحر اور اُس کے افسروں کا مکالمہ پُرحوصلہ خیالات سے لبریز ہے۔ اور دوسرا سین آہن پوش جہاز آساما کی تصویر دکھاتا ہے۔ جہاں کپتان صاحب اُن سپاہیوں اور افسروں کا جامِ صحت پی رہے ہیں ”جو پورٹ آرتھر کا دہانہ بند کرنے والی مہم کے ہمراہ جانے کے لئے“ نامزد ہوئے ہیں۔ یہ جامِ صحت شراب کی جگہ پانی کا جام ہے اور کپتان صاحب کی تقریر میں ایک بلا کا کاٹتا ہوا فقرہ اہلِ یورپ کے شوقِ شراب نوشی کے متعلق ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔ ”یہ پانی کا پیالہ جو میں اس وقت تمہیں پینے کے لئے دیتا ہوں۔ اس سے مجھے تمہاری جرأت یا حوصلہ بڑھانا مقصود نہیں۔ بلکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تم اس آہن پوش کے چیدہ جانبازوں میں سے ہو ہم لوگوں کے لئے اس سے بڑھ کر ذلت اور شرم کی اَور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ مقامِ ہلاکت میں جاتے وقت اہلِ یورپ کی اُس مصنوعی جرأت کا سہارا ڈھونڈیں جو شراب کے پیالے کی تہ میں چھپی ہوئی ہوتی ہے“ دونو حریفوں کے عادات و اطوار کے امتیاز کو ایک فقرے میں ادا کر دینے کے لئے اس سے بہتر ترکیب مشکل تھی تیسرا سین ہمیں پھر زار کے محل کی سیر کراتا ہے۔ جہاں امرا کی باہمی رقابتیں اور اپنے اپنے رُفقا کی طرفداریاں بڑے زور سے موجود ہیں اور خود غرضی حُبِّ وطن کا بھیس لئے کھڑی ہے۔ اُن کی باتیں سنو تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُس کی عزت کے دل سے خواہاں ہیں۔ اور اُن کے طرزِ عمل کو دیکھو تو اپنے ملک کی صاف جڑ کاٹتے معلوم

ہوتے ہیں۔ چوتھا سین روسی مسلمانوں کی ایک مجلس اور اُن کی بددلی کا نقشہ ہے اور پانچویں۔ چھٹے۔ اور ساتویں میں باغی روسیوں کی سازشیں۔ اور ایک عورت کے سبب سے ان کی سب سے بڑی سازش کا افشا۔ اس عورت کا قید ہونا اور اپنے عاشق کے ذریعے سے۔ جو فوج میں عہدہ دار ہے اس کا بچ نکلنا بیان کیا گیا ہے آٹھواں پردہ اُس عورت کو مردانہ بھیس بدلے ہوئے پاتا ہے اور وہ اپنے رہا کرنے والے عاشق کی نوکری کر کے اُس کے ساتھ لڑائی میں جاتی ہے۔ ان دونو کی سچی دلدادگی کا تذکرہ بھی ضمناً دلچسپی رکھتا ہے۔ ان سے ہماری آخری ملاقات ڈرامے کے اختتام کے قریب ہوتی ہے۔ جہاں وہ فوجی افسر زخم کھا کر ہسپتال میں جان دیدیتا ہے اور اُس کی فدائی محبوبہ بستر مرگ پر اس سے بیاہی جاتی ہے اور خود بھی وہیں جان دیدیتی ہے۔

تیسرے باب میں ہم اوکیو سے پھر روشناس ہوتے ہیں۔ مگر حضرت پہچانے نہیں پڑتے۔ پہچانے کیونکر جائیں۔ ایک چینی کسان کے بھیس میں دشمن کے خیموں میں گھس کر جاسوسی کر رہے ہیں اور ایسے اُستاد ثابت ہوتے ہیں کہ غنیم کے ہاں سے مجوزہ نقشۂ جنگ تک اُڑا لاتے ہیں۔ اس سے مصنّف کا مطلب جاپانیوں کے اُس کمال کی داد دینا ہے جو انہوں نے اپنے محکمۂ اطلاع میں دکھایا اور جس کے سامنے روسی محکمۂ اطلاع کا انتظام بالکل ناقص تھا۔ جاپانی جان پر کھیل کر ہر طرح کی خبریں لے آتے تھے اور روسی اوّل تو اُس طرح آنے کی جرأت ہی نہ کرتے تھے اور اگر کرتے تھے تو مُنہ کی کھاتے تھے اور اپنے بھدّے پن سے پکڑے جاتے تھے۔ دوسرا پردہ اوکیو کو اپنے کیمپ میں دیکھتا ہے اور تیسرے میں اس کی محبوبہ دلنواز ایمی جو ایک امیر کبیر کی بیٹی ہے۔ اپنی سہیلی سے ہم کلام ہے اور اسی موقعہ پر اُنہیں اوکیو کا خط ملتا ہے۔ جس میں فتح پانو کی خوشخبری مندرج ہوتی ہے۔ اور اس باب کا آخری پردہ اُن خیالات کا اظہار ہے جو قسطنطنیہ میں سلطان المعظم کے ہاں رُوس کے پے در پے شکستوں اور جاپان کی فتوحات کو دیکھ کر پیدا

ہوئے ہو گئے۔

چوتھا باب ہمیں روزونسکی کا وہ بدقسمت بیڑا دکھاتا ہے جو نہایت شدومد کے ساتھ بالٹک سے روانہ ہوا تھا اور جس سے یہ توقع تھی کہ جاتے ہی جاپانی جہازوں کے دھوئیں اُڑا دیگا۔ یہی وہ امیر البحر تھا جس نے چھوٹتے ہی چند انگریزی ماہی گیروں پر تو بزدلانہ ہاتھ صاف کیا۔ لیکن آگے چل کر فرانسیسی بندرگاہوں میں طرح طرح کے بہانوں سے پناہ ڈھونڈھنے لگا۔ اور ٹوگو کے مقابلے سے جان چرا تا رہا۔ اور آخر جب اس کے سامنے آیا تو اس کا بیڑا بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ مصنّف اس سین میں غریب ماہی گیروں پر جو ظلم ہوا وہ ناظرین کو دکھاتا ہے۔ لیکن توجہ اس تصویر غم سے گھبرا کر دوسرے سین کی طرف بھاگتی ہے جہاں یاکیبا زا ایمی جس کے دل میں ملک کی محبّت اوکیتو سے بڑھ کر اور اوکیتو کی الفت ملک سے بڑھ کر باری باری موج زن ہے۔ سمندر کے کنارے بیٹھی سمندر کی لہروں سے باتیں کر رہی ہو اور کہتی ہے:-

اے دریا کی مست لہرو	اُٹھو اُبھرو اُترو ٹھہرو
ختم سفر ہوتا ہے تمہارا	آپہنچا دریا کا کنارا
محنت لگ گئی ساری ٹھکانے	مشکل کی آسان خدا نے
مضطرب و بیتاب ہو پھر کیوں	رنگ رُخ سیماب ہو پھر کیوں
ساحل کا ٹھکرانا کیسا	ماتھے پہ بل لانا کیسا

یہ باب آخری ہے اور اس میں پچھلے بابوں سے بہت زیادہ سین ہیں۔ قصّے کا انجام تو وہی ہے جو دنیا بھر کو معلوم ہے۔ متواتر فتوحاتِ جاپان کے بعد امریکا کے توسط سے روس اور جاپان میں صلح ہو جاتی ہے۔ شخصی معاملات میں سب سے بڑھکر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اوکیتو کامیابی کے ساتھ گھر لوٹتا ہے۔ ایمی کا باپ اسے فرزندی میں قبول کر لیتا ہے۔ اور دونو کی شادی دھوم دھام سے رچتی ہے۔ ان مطالب کے بیان کے لئے چار پانچ سین کافی ہوتے۔ مگر مصنّف نے اس باب کو

بارہ سین تک پہنچایا ہے اور وہ اس طرح کہ تمام دنیا کے مشہور دارالخلافوں میں جو رائیں اس واقعہ پر دی جاسکتی تھیں۔ اُن کا خلاصہ کیا ہے۔ کہیں کابل کا دربار ہے۔ کہیں لنڈن کا۔ کہیں قیصر ولیم جاپانی فتوحات پر رائے زنی کر رہے ہیں۔ اور کہیں امریکہ کے پریسیڈنٹ روزولٹ۔ یہ سب لوگ باتیں تو کام کی کرتے ہیں۔ اور ایک پولٹیکل ڈرامے میں ایسے مکالمے جو ان فصلوں میں درج ہیں جائز بھی سمجھے جانے چاہئیں۔ تاہم یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ان کے اضافے سے کسیقدر غیرضروری طوالت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا اثر قصّے کی دلچسپی پر اچھا نہیں پڑتا۔

ہم نے اس قصّے کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ مگر پھر بھی کئی عمدہ سین رہ گئے ہیں۔ جن کا ذکر نہیں ہو سکا۔ اور مناسب بھی یہی تھا۔ کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پورا خلاصہ دیکر لوگوں کو اصل سے مستغنی کر دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُردو خوانوں کی کثیر جماعت کے بیشتر افراد اصل کتاب سے مستفید ہوں اور اس لئے ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر اس کو علیحدہ کتاب کی صورت میں چھاپ کر عام طور پر ملک میں پھیلایا جائے تو بہت مفید ہو۔ اور جبتک ایسا نہیں ہوتا۔ شائقین دکن ریویو کا پرچہ بابت ستمبر و اکتوبر و نومبر و دسمبر ۱۹۰۵ء ایڈیٹر صاحب سے منگوا کر پڑھیں۔ اور مصنّف کی محنت اور حبِّ وطن کی داد دیں۔

یہانتک تو تھا اس تصنیف کا خلاصہ اور اس کی خوبیوں کا اعتراف۔ مگر ابھی تنقید کا دوسرا پہلو باقی ہے کہ جو کمی اس میں رہ گئی ہو۔ اس کا اظہار بھی خوبیوں کے ساتھ کیا جائے تا کہ قابل مصنّف دوسری اشاعت کے موقعہ پر (جس کی امید قوی ہے کہ ضرورت پڑیگی) یا آیندہ اسی قسم کی تصنیف کے وقت، اس کمی کی تلافی کر سکے۔

سب سے بڑھ کر جو شکایت اس دلچسپ کتاب سے ہمیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسے ڈراما کہا گیا ہے۔ مگر اصلی معنوں میں ڈراما بنانے کی پوری کوشش نہیں کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی میں کئی ڈرامے ایسے ہیں۔ جو کبھی فی الواقع

تماشے کے طور پر ایکٹ نہیں کئے گئے۔ صرف کتب خانوں کی زینت رہے ہیں اور کمرے میں بیٹھکر پڑھنے کے کام آئے ہیں۔ اگر ہمارے دوست کا بھی اس ڈرامے سے اتنا ہی مدعا ہے تو خیر۔ انہیں اس ارادے میں کامیابی ہے لیکن اگر ڈرامے سے مراد ہے ایسی تصنیف جو سٹیج کے لئے موزوں ہو۔ اور جسے اگر کوئی ہوشیار ناٹک والے تماشے کے طور پر دکھائیں تو ہزارہا لوگ اسے دیکھنے کے لئے کھنچے آویں۔ تو اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کی ضرورت اور ترقی کی گنجائش ہے۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو نظم و نثر دونوں میں مہارت اور مشق رکھتے ہیں۔ اپنی اس دوہری قوت سے کام لیا ہے اور اکثر مکالمے نظم کر ڈالے ہیں۔ اور اس نظم کے حق میں یہ کہنا انصاف ہے کہ اکثر ناٹک کے تماشوں میں جو نظم پیش کی جاتی ہے۔ وہ اس کے مقابل میں نظم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ اس ڈرامے میں اکثر اشعار اچھے پائے گئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ان غزلوں میں سے اکثر سٹیج کی گوں کی نہیں۔ وہاں نہ بڑے بڑے لفظوں کی گنجائش ہے۔ نہ مشکل بندشوں کی۔ اور اگر اشعار اس غرض سے درج کئے گئے ہیں کہ جن کی طرف سے وہ لکھے گئے ہیں وہ انہیں گائیں تو اتنی لمبی غزلیں گاتے گاتے اُن کے گلے بیٹھ جائیں گے۔

چند مثالیں مندرجہ بالا اعتراض کی توضیح کو کافی ہونگی۔ اُس مراسلے کو لیجئے جو باب اوّل کے تیسرے سین میں روس کا وزیر صیغہ خارجیہ زار کو پڑھ کے سناتا ہے۔ اس کے اٹھارہ شعر ہیں اور یوں شروع ہوتا ہے:-

اے شہنشاہِ فلک پایۂ و خورشید رکاب ۔۔۔ اے جہاں دار ملک سایۂ و ناہید جناب
جسکی شان اور جلالت کے مقابل میں ہوئی ۔۔۔ شوکتِ صدر نشینانِ زمن نقش بر آب
غیرتِ ابرِ گہر بیز ترا لطف و کرم ۔۔۔ صورتِ برق شرر ریز ترا قہر و عتاب

یا ساتویں سین میں اُس نظم کو دیکھئے جو اوکیو مکاڈو سے خطاب کر کے پڑھتا ہے:-

اے شہنشاہِ فلک درگہ خورشید نشاں ۔۔۔ رونقِ بزمِ جہاں فخرِ سلاطینِ زماں

مرکزِ دائرۂ دولت و اقبال و شکوہ　　مصدرِ قاعدۂ مکرمت و شوکت و شاں
منتہائے نظر دانش و تدبیر و خرد　　مبتدائے خبرِ عافیت و امن و اماں

یا جہاں ہز مجسٹی سراج الملۃ والدّین امیر کابل کے دربار میں صدرِ اعظم یوں افتتاحِ کلام کرتے ہیں:۔

چہکنے لگے شاخساروں میں بلبل　　چٹکنے لگے غنچے کھِلنے لگے گُل
زمانہ ہوا محوِ جشنِ بہاراں　　پیالہ ہوا لالہ شبنم بنی مُل
چمن میں ہیں انبارِ نسرین و گُل کے　　مزا دے رہی ہے بہارِ تقابل
پکارے یہ کہتی ہیں سنبل کی زلفیں　　غلط ہے کہ باطل ہے دورِ تسلسل
نوا ریز ہیں نغمہ سنجانِ گلشن　　دکھاتے ہیں شانِ کمالِ تغزل
ہیں صرفِ دعا گوئیِ خانِ اعظم　　ہیں واقف ثنا خوانیِ شاہِ کابل
امیرِ فلک قدر فخرِ اماثل　　نہیں کنزِ اکرام و گنجِ تفضل

یہ تینوں ٹکڑے نظم کے جو مثال کے طور پر لئے گئے ہیں قصیدے کے رنگ میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ وہ رنگ ہے جس کے لئے ہمارے دوست ظفر علی خاں صاحب کی طبیعت خصوصیت سے موزوں واقع ہوئی ہے۔ اگر انہوں نے کوئی قصیدہ لکھا ہوتا اور اس میں یہ اشعار آتے تو ہم ان شعروں کی دل کھول کر داد دیتے۔ مگر اس ڈرامے کے مکالموں میں یہ برمحل نہیں معلوم ہوتے۔ ڈرامے کے مکالموں کے لئے سب سے ضروری چیز ہے اُن کا نیچرل ہونا اور وہی ان اشعار میں موجود نہیں۔ اوّل تو یہی بہت موزوں نہیں کہ نائب السلطنۃ کی مراسلات منظوم ہوں اور صدرِ اعظم سیاسیات کی گفتگو چھیڑنے کے لئے قصیدہ کہنے لگیں اور پھر قصیدہ بھی کیسا جو فوراً ممدوح کی ثنا سے شروع ہونے کی بجائے ایک لمبی تشبیب سے شروع ہو۔ جیسا کہ آخری نمونے سے ظاہر ہے۔ یہ گل و مل۔ یہ سنبل کی زلفیں۔ یہ تغزل۔ یہ تشبیب سب ایک پولیٹکل ڈرامے میں کیونکر کھپ سکتے ہیں۔

جو مثالیں اوپر بیان ہوئیں اُن سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ کہ اس ڈرامے میں حصّۂ نظم سب اسی طرح کا ہے۔ نہیں بعض مقامات میں طبّاع مصنّف نے سادہ اور پُر زور اشعار لکھنے میں کمال دکھایا ہے۔ اور وہ اشعار ایسے ہیں کہ اگر یہ ڈراما سٹیج پر دکھایا جائے تو نہایت موثر ثابت ہوں۔ ایسے اشعار کا ایک نمونہ آپ ایمی کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ ایک دوسرا نمونہ اوکیو سے سُن لیجے۔ جو اُس سے رخصت ہوتے وقت یوں سخن سرا ہوتا ہے:۔

تیری آنکھیں ہیں مجھے مست بنانے والی ۔۔۔ بادۂ ناب کے دو گھونٹ پلانے والی
اس محبّت کا بُرا ہو کہ یہ وہ آتش ہے ۔۔۔ جو مرے ساتھ تمہیں بھی ہے جلانے والی
شکوہ بے سود ہے آنا تھا طبیعت کو ضرور ۔۔۔ کہ بلا ٹل نہیں سکتی کبھی آنے والی
کیا عجب ہے کہ محبّت تری ثابت ہو جائے ۔۔۔ مری تقدیر کے لکھے کو مٹانے والی
کیا عجب ہے کہ یہی جنگ بنے آخر میں ۔۔۔ تجھ کو مجھ سے تو مجھے تجھ سے ملانے والی

یہ وہ اشعار ہیں جو سٹیج پر کسی خوش گلو اور ماہرِ فن ایکٹر کی زبان سے نکل کر سینکڑوں دلوں کو بیتاب کر دیں۔ اور جو گائے جانے کے لئے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

مکاڈو کے وہ اشعار جن میں وہ ایشیا کے مستقبل کا بیان کرتا ہے۔ اور جاپان کے فرائض اس مقصد کے حصول کے متعلق ظاہر کرتا ہے۔ ہمیں خاصکر پسند ہیں۔ اور پولیٹیکل پہلو سے اہلِ ہند میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے اس ڈرامے کے بہترین اشعار میں ہیں:۔

ہے بننا ہمیں رہ نما ایشیا کا ۔۔۔ جلانا ہے ہم کو دیا ایشیا کا
وہ تہذیب جو ہوگئی ہے پُرانی ۔۔۔ اسے کیجئے وہ بادۂ ارغوانی
وُہی آگ اگلی سی جس میں بھری ہے ۔۔۔ وہی مے ہے بوتل مگر دوسری ہے
بھرینگے ہم اُس کو نئی ساتگیں میں ۔۔۔ پلا دینگے بھر بھر کے جاپان و چین میں
اسے پی کے جو مست و آزاد ہونگے ۔۔۔ وہ حکمت میں یورپ کے اُستاد ہونگے

باوجودیکہ یہ اشعار جوش سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور تاثیر میں نظم عموماً نثر سے بڑھکر

ہوتی ہے۔ مگر نثر کے بعض سیدھے سادے جملوں میں بھی کبھی کبھی غضب کا جادو ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے چند جملے اس کتاب میں آئے ہیں۔ مثلاً جہاں آوکیو اپنی ماں کے گذر جانے کے بعد تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے:۔

"دنیائے ناپائدار میں میں اکیلا رہ گیا۔ خویشں واقربا اور اعزہ واحباب پیوندِ زندگانی ہوا کرتے ہیں۔ میرا نہ کوئی قریبی رشتہ دار ہے نہ کوئی دلی دوست۔ اب جینے میں کیا لطف رہا۔ میرے گھر کی مرادوں اور خوشیوں کی کل کائنات ایک مری بیوہ ماں تھی۔ اُس کا جو حشر ہوا وہ ملک میں آشکار ہے۔ وہ مجھے بتاتی گئی ہے کہ مجھے اس دنیا میں رہ کر کیا کرنا چاہیئے۔ وہ میرے مقدر کا پروگرام اپنے خون سے تیار کرتی گئی ہے۔"

جہاں مصنّف کے قلم سے ایسے پُرزور جملے نکل گئے ہیں۔ جن پر وہ ناز کر سکتا ہے۔ وہیں ایک آدہ جگہ نہایت رکیک عبارت لکھی گئی ہے جو باقی کتاب کی شان کے خلاف ہے۔ مثلاً دوسرے باب کے چوتھے سین میں جہاں ایک تمسخر آمیز مخمّس لکھی گئی ہے۔ اس میں دوسرا بند ایسا ہے جو کسی اعتبار سے جائز نہیں رکھا جا سکتا اور خصوصاً اس بند کو نکال ڈالیں۔

ایک اور ضروری امر جتلانے کے قابل ہے۔ اور وہ یہ کہ گو اس کتاب کا مقصد ہندوستان میں حبِ وطن کی گرمجوشی پیدا کرنا ہے۔ لیکن ہندوستان ہی میں اس کا کوئی سین نہیں رکھا گیا۔ ہندوستان سے اس کا کچھ تعلق پیدا کرنے کے لئے اتنا کیا گیا ہے کہ دو قابل ہندوستانی یعنی اقبال خاں اور مظفر خاں رزمگاہ سے متعلّق کر دیئے گئے ہیں۔ اور وہاں اپنے ملک کی حالت پر گفتگو کرتے ہیں۔ مگر ہمارے خیال میں یہ کافی نہیں ہے۔ چاہئے تھا کہ جیسے باقی دنیا پر اس عالیشان معرکے کا اثر دکھایا گیا ہے۔ اُسی طرح یہ بھی دکھایا جاتا کہ ہندوستان میں اس کے بعد کیا خیالات اور تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اور اُس جوش سے جو اہلِ ہند کے دلوں میں جاپانیوں کی کامیابی دیکھکر پیدا ہوا۔ پائداری کی کہانتک اُمید ہے۔

ان قابلِ تلافی امور سے قطع نظر کر کے بہ حیثیتِ مجموعی مولوی ظفر علی خاں صاحب کی یہ تصنیف نہایت قدر کے قابل ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ ملک اُنکی حوصلہ افزائی کرنے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

دو سہ روز آشنائی بشناختن نیرزد

یہ مصرع جو اس مضمون کا عنوان ہے۔ اُن اقوال کی مثال ہے جن میں شعرا ایک خاص جوش اور وجد کی حالت میں بہت سے جذباتِ انسانی کو چند لفظوں میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ یا بہت سے سالوں کے تجربے اور مشاہدے کو ایک مصرع یا ایک شعر کے تنگ حدود میں بند کر لیتے ہیں۔ شعر میں جو ایک غیر معمولی اثر اور قوت ہوتی ہے جو بعض اوقات آدمی کے دل پر بےطرح قابو پا لیتی ہے وہ الفاظ کی ایک مناسب اور موزوں ترتیب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن اس ترتیب کا مادہ خدا نے ہر شخص کو عطا نہیں کیا۔ اور سوائے اُن لوگوں کے جن کے حصّے میں مذاقِ شاعری قدرت نے رکھا ہو۔ کسی کو یہ طاقت نہیں کہ محض لفظوں کے ہیر پھیر میں دلوں پر حاوی ہو جائے۔ مذاقِ شاعری سے مراد طبیعت کی وہ موزونیت نہیں جو عروض کے چند ابتدائی قواعد کے مطابق تک بندی کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ اور جس کا شمالی ہندوستان میں تقریباً ہر باشندے کو عمر کے ایک نہ ایک حصّے میں دعویٰ ہوتا ہے۔ بلکہ قدرت کا بنایا ہوا شاعر ہم اسکو مانتے ہیں جس کا دل شاعر ہو۔ دل کا شاعر ہونا اُردو میں ذرا غیر مانوس محاورہ ہے اور اکثر لوگوں کے کان جو انگریزی نہیں پڑھے اس سے، غالباً نا آشنا ہونگے اس لئے اس کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ دل کے شاعر ہونے کے بظاہر تو معنے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ دل غزلیں اور مخمس اور مسدّس بناتا ہو۔ اور تاریخیں نکالتا ہو اور ایک مثنوی عشقیہ بھی لکھ چکا ہو۔ ایک آدھ مرثیہ یا سلام بھی اُسکی تصنیفات

میں ہو۔ شعر کی جو مختلف صنائع ہیں اُن سے بھی واقف ہو۔ ایک سہرا بھی کسی کی مبارکباد کو نہ سہی۔ ذوق و غالب کے جواب میں ہی کہہ رکھے اور کبھی کسی مشاعرہ میں بھی پڑھا ہو۔ لیکن انگریزی میں شاعردل اور بھی معنے رکھتا ہے۔

وہ دل جس میں درد ہو۔ رقت ہو۔ سوز ہو۔ گداز ہو۔ وہ دل جو قدرت اور اُسکے گوناگون تماشوں میں اپنے ساتھ کچھ یگانگت پائے۔ وہ دل جو قدرت سے قادر کا پتہ لگائے۔ وہ دل جو خالق کے سبب اُس کی مخلوق کا بھلا چاہے۔ وہ دل جو زندگی کے مقصد کا متلاشی ہو۔ اور وہ دل جو ان تمام مدارج کو طے کر کے خود فراموشی اور محویت کے ایک ایسے درجے پر پہنچے جس میں وہ عام انسانوں کے طبقے سے اوپر نظر آئے۔

یہ کہنے سے کہ انگریزی میں شاعردل کے یہ معنی ہیں یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہماری شعرا میں ان اوصاف سے متصف شاعر نہیں گذرے۔ ہمارے شعرا میں سے بعض میں صانع قدرت نے یہ صفات کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا پرتو اُن کے کسی نہ کسی شعر میں۔ رباعی میں۔ قطعے میں جلوہ افگن ہے۔ بلکہ یہ مدعا ہے کہ ان اوصاف کو لوازم شاعری ٹھہرانا اور ان اشخاص کو جو ان سے بے بہرہ ہوں۔ غیر شاعر سمجھنا یہ اہلِ یورپ کی ہی کتابوں میں دیکھا گیا ہے۔ اور وقت آگیا ہے کہ ہندوستان میں بھی اس اصول کی پابندی شروع ہو۔ اور جو لوگ اس معیار میں پورے نہ اُتریں۔ اُن سے شاعری کا خطاب چھین لیا جاوے۔ محض قافیہ اور ردیف کے سمجھنے اور پرانی لکیر پر چلکر دو چار غزلیں کہہ دینے کا نام ہی شاعری نہ رکھا جاوے۔ اس سے ہمارے پرانے اعلیٰ درجے کے شعرا کی ناموری میں جیسے کہ میر۔ مصحفی۔ ذوق۔ غالب۔ آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر ہیں تو کوئی کمی نہیں آئیگی۔ لیکن بہت کچھ رطب و یابس جو ہمارے لٹریچر میں بھرا ہوا ہے۔ چھنٹ جائے گا۔ اور شاعری کے پہچاننے کا صحیح مذاق ملک میں پیدا ہو جائیگا۔ اور لوگ اس قابل ہو جائیں گے کہ ایک ایسے مصرعے کو جو ان چند سطور کا زیب عنوان ہے۔ پڑھ کر

محض اس کی لفظی خوبی اور بندش ہی کو نہ دیکھیں گے۔ بلکہ اُن خیالات پر بھی غور کرینگے جن کے ہجوم کرنے سے شاعر کی زبان پر مصرع بے اختیار آگیا ہوگا۔ اور جس کے بعد ایک مصرع اس کے پہلے لگا کر یوں شعر مکمل کر لیا ہوگا۔

مکن آشنائی اے دل بہ کسے کہ نزد دانا
دو سہ روز آشنائی بشناختن نیرزد

بادی النظر میں یہ شعر ایسا قابلِ قدر نہیں معلوم ہوتا۔ یہ خیال ہیں آتا ہے کہ اگر کوئی اس پر عمل کرے تو اس ڈر کے مارے کہ آشنائی چند روزہ ہے۔ کسی سے آشنائی ہی نہ کرے۔ دنیا کے دن بے یار و مددگار بے دوست و آشنا کاٹ لے اور چل بسے۔ اس صورت میں تمام دُنیا کے داناؤں کی کثرت رائے اس کے برخلاف ہو گی۔ کیونکہ ان سب نے باوجود دنیا کی بے ثباتی کے دُنیا میں دوستی کو بہت بڑھایا ہے۔ اور ہر شخص کے لئے دلی دوست پیدا کرنے اور اُن کی خدمت کرنے کی تاکید کی ہے اور سچے دوست کو دنیا میں سب سے بڑی نعمت قرار دیا ہے۔ شعرا نے دوستوں کی دوستی کی تعریفیں کی ہیں۔ فسانوں میں یاروں کی غمگساری کی حکایتیں ہیں۔ اور تاریخوں میں باوفا اصحاب کی وفاداری کی روایتیں ہیں۔ مسلمانوں کے ہادیٔ برحق نے دوستوں کے حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اور اُن کے بعد کے بزرگانِ دین کا بھی یہی مسلک رہا ہے پس "مکن آشنائی" پر کیونکر عمل ہو سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ شعر نہ تو آشنائی کا مانع اور متقدمین کے عمل کے متضاد ہے۔ بلکہ عین اس کے موافق ہے۔ اور اطمینانِ قلبِ انسانی جو شعر اور فلسفے کا اعلیٰ مقصد ہے ایسا نسخہ لئے ہوئے ہے۔ جو دلوں کو پریشانی سے بچانے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

اس شعر کی سچائی کی تصدیق کسی ایسے حرماں نصیب سے کیجئے جس نے مدت کی تلاش کے بعد اپنے دل کی پسند کے مطابق ایک شخص دیکھا ہو۔ کسی ذریعے سے

اس کے ساتھ ملاقات پیدا کرنے کی کوشش کی ہو۔ اُس میں ناکامیاب ہوا ہو۔ پھر اور کوئی ذریعہ ڈھونڈھا ہو۔ مگر وہاں بھی ناکامی نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا ہو۔ کوئی اور ترکیب سوچی ہو۔ مگر پھر بھی تیر نشانے پر نہ بیٹھا ہو۔ آخر ملاقات ہوئی ہو۔ اب ملاقات بڑہانے کی فکر ہو۔ مگر جس کا یہ مشتاق ہو وہ اس سے دُور دُور کی سلام علیک ہی پسند کرے۔ مشکلوں سے اس نے ربط بڑہایا ہو۔ پھر ربط بڑہنے کی حالت میں چند امتحانات اس پر آئے ہوں۔ اور اُن میں بھی یہ پورا اُترا ہو۔ اور عین اُس وقت جب وہ یہ سمجھے کہ جسے میں چاہتا تھا وہ میرا ہو لیا۔ تو کوئی ایسی غلط فہمی درمیان آجائے کہ شخص موصوف پھر بدگمان ہو جائے اور منائے نہ منے اور بات ایسی بگڑے کہ بنائے نہ بنے۔ کیا یہ اس حالت میں اس کے منہ سے بیساختہ نہ نکل جائیگا؟ کہ ع دوسہ روز آشنائی بشناختن نیرزد۔

کیا اس کو وہ دو چار دن جو باہم ارتباط میں گذرے اس زمانۂ دراز کو سامنے جو اشتیاق میں گذرا تھا بہت ہی کم نظر نہ آئیں گے؟ اور کیا وہ یہ نہ کہیگا کہ "شناختن" کی تکلیف کی قیمت بھی ادا نہ ہوئی۔

اس سے بھی زیادہ تصدیق کی ضرورت ہو تو کسی ایسے شخص کو ڈھونڈھو جس نے ایسی تلاش سے جیسی اوپر بیان کی گئی ہے۔ بیس بائیس سال میں دو چار دوست پیدا کئے ہوں جس نے اس عرصے میں والدین اور اعزّہ و اقربا کی بےغرض محبّت کی قدر کرنی سیکھی ہو۔ اور جس کے دل میں اس کے عوض دینے کے نیک ارادے ہوں۔ جس نے بہت انتظار کے بعد اپنے مطلب کی بیوی پائی ہو۔ اور نکاح کے بعد یہ محسوس کیا ہو کہ دنیا میں پوری خوشی باعصمت اور تعلیم یافتہ بیوی کے مل جانے سے ہے۔ اور جس نے مناسب نکاح کا پہلا اور سب سے عمدہ میوہ ایک صحیح اور خوش رُو بچّہ ابھی دیکھا ہو۔ اور جو بچپن سے لیکر اس وقت تک کے دراز عرصے میں دنیا کی سب چیزوں سے محض آشنا ہوا ہو اور اس آشنائی کے لطفوں سے کچھ عرصے تک حاصل کرنے کے خیال میں ہو۔ کہ اچانک اُسے پیام اجل آجائے

اور وہ تمام امیدوں اور آرزوؤں کو خیر باد کہتا ہوا۔ اور در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتا ہوا عالمِ بالا کو سدھارنے لگے۔ اگر اس وقت کان لگا کر اس کی کمزور آواز سنو یا اگر لب بند ہوں تو اس کی صدائے دل سنو تو یہ کہہ رہا ہوگا۔ کہ ع

دو سہ روزہ آشنائی بشناختن نیرزد

اچھا ان خیالی مثالوں کو چھوڑ کر سرسید احمد خاں مرحوم کی واقعی مثال کو لیں۔ اس کے بچپن کو دیکھیں۔ اس کی جوانی پر نظر ڈالیں۔ اس کے اَدھیڑپن کے زمانے پر غور کریں اور اس کے بڑھاپے کو خیال میں لائیں۔ شروع سے یہ دُھن اس کے سر میں سمائی ہوئی تھی کہ قومِ مسلمانان جو علومِ زمانۂ حال سے نفور ہے۔ ان کی طرف راغب ہو۔ جہالت اور مذہب کی نسبت توہمات بیجا اور خیالات باطل جو ان کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ ان سے دور ہوں۔ وہ اسلام کی حقیقت کو پہنچیں۔ اور اس کے اصول پر کاربند ہوں۔ اور اُن بدعات کو جو دوسری اقوام کی رسومات کے اثر سے اُن میں پیدا ہوئی ہیں چھوڑیں۔ اسلام کی وقعت غیر قوموں کے دلوں میں پیدا ہو اور اس کی شان بڑھے۔ اس دھن کے پورا کرنے کے لئے سید مرحوم مدۃ العمر محنت کرتا رہا۔ گالیاں کھاتا رہا۔ بدنامی سر پر لیتا رہا۔ کفر کے فتوے سنتا رہا۔ اور جب وہ زمانہ قریب آیا کہ اپنی محنت کا ثمرہ اُٹھائے۔ لوگوں میں وہ شوق جو وہ پیدا کرنا چاہتا تھا پیدا ہونے لگا۔ اُس کی نیکنامی شروع ہوئی۔ اُس کی تکفیر کے فتوے بند ہوئے۔ اقوام غیر بھی مسلمانوں کو قوموں میں شمار کرنے لگیں تو مشیّتِ ایزدی میں یہی آیا۔ کہ اُس کا وقت ختم کر دیا گیا۔ کیا وہ دو سہ روزہ آشنائی جو سرسید مرحوم کو قومی ترقی کے آثار سے ہوئی۔ اُس محنت کا جو "شناختن" میں صرف ہوتی تھی معاوضہ ہو سکتی ہے۔ گو اس کو اس تسلی نے کہ کام شروع ہو گیا ہے خواہ تکمیل اس نے نہ دیکھی شاید اس مصرعے کو "نیرزد" پڑھنے سے روک لیا ہو۔

تحصیلِ علوم و فنون میں یہی حال نظر آتا ہے کہ تحصیل کا عرصہ اُس عرصے سے جس میں اس تحصیل سے فائدہ اُٹھایا جائے عموماً کم ہوتا ہے۔

مثلاً کسی علم کی تکمیل کے لئے تو کم از کم ایک عمر چاہئے۔ فرض کیجے کہ کوئی شخص عمر بھر صرف کرکے بڑھاپے کے قریب اُس سے کماحقہ آشنائی حاصل کرتا ہے پس وہ دن جن میں وہ اُس سے فائدہ اُٹھاتا ہے شناختن کے زمانے کا پورا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ فرض کرو کہ ایک طبیب پچاس سال کے تجربے سے نبض کو پہچاننے میں تھرماٹر کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔ مگر جلد وہ تجربہ اُس کے ساتھ ہی قبر میں جاتا ہے اور اس سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا۔ ایک علم کیمیا داں عمر بھر کی محنت شاقہ کے بعد ایک ڈسکوری کرتا ہے یا کوئی ماہرِ علم طبعیات کوئی نئی اور مفید ایجاد کرتا ہے۔ یا فلسفی کوئی تھیوری نکالتا ہے۔ کہ اتنے میں پیمانۂ عمر لبریز ہوجاتا ہے۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ تو عام دستور ہے جو سب پر کم و بیش اثر کرتا ہے کہ آشنائی میں محنت کرنی پڑے۔ اور شناختن کے لطف یا فائدہ اُٹھانے کے دن کم ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ اس خیال سے وہ محنت ہی نہ کریں۔ وہ تو مایوسی کی حالت میں انسان کے دل سے یہ نکل جاتا ہے۔ کہ کاش اس مصیبت میں نہ پڑتے تاکہ یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس اظہار ناراضگی سے طبیعت ایک گونہ تسلّی پاتی ہے۔ مگر ایسے بیتابانہ الفاظ یا فقرات کبھی مانع سعی نہیں ہوتے۔ کیونکہ دنیا میں اصلی راحت تو سعی میں ہے۔ گو انسان ہر وقت اس بات کو نہیں سمجھتا۔ اور شاعر نے جب ایسے ہی مختلف خیالات کے ہجوم سے جن کے نمونے اوپر لکھے گئے ہیں۔ یہ بیساختہ مصرع کہا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ خیال کہ حصولِ مدّعا کے بعد اس کا لطف چند روزہ ہوتا ہے۔ اور دنیا کی چیزیں بہر حال چند روزہ ہیں۔ ہر وقت پیش نظر رہے۔ اور اس خیال سے وہ ہر فرصت کو غنیمت سمجھے اور آشنائی کے حصول میں اتنا وقت ضایع نہ کردے جتنا بعد کے لاانتہا لطفوں کی امید ہونے کی صورت میں کوئی کرسکتا ہے۔

اور نیز یہ کہ جب اس کی کوششوں کا ماحصل اُس سے چھننے لگے تو وہ صبر کو

بالکل ہاتھ سے نہ دے بیٹھے۔ بلکہ اس خیال سے تسلی پائے کہ آشنائی تو اپنے نیچر ہی میں دو سہ روزہ تھی +

حُرّیت اور آزادی

گذشتہ گرما میں جب مہاراجہ بڑودہ انگلستان تشریف رکھتے تھے۔ ایک دن لندن کے ایک مجمع میں وہ بمع مہارانی صاحبہ کے آئے۔ میل جول کا جلسہ تھا اور لوگ بے تکلفی سے اپنے اپنے حلقوں میں باتیں کر رہے تھے۔ مہاراج کے مزاج میں چونکہ بے ساختہ پن انتہا درجے کا ہے اس لئے وہ بھی خلق سے ہر ایک سے باتیں کرنے لگے اور لیڈیاں رانی صاحبہ کی طرف جھکیں۔ اور چونکہ رانی صاحبہ اخلاق کے اعتبار سے اپنے نامور اور ممتاز شوہر سے کچھ کم نہیں۔ اور حُسنِ سیرت وصورت کے ساتھ جوہرِ شرافت رکھتی ہیں۔ اس لئے اُن کے گرد ایک معقول حلقہ سلامیوں کا ہوگیا۔ اس حلقے میں ایک ہندوستانی بزرگ تھے۔ عمر رسیدہ اور ریاستی لباس پہنے ہوئے۔ کسی بڑی ریاست کے اہلکار تھے۔ مہاراج ان کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ آپ کب سے یہاں ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ چند ہفتے سے۔ مہاراج نے کہا آپ نے بڑی ہمت کی۔ کہ اس عمر میں اتنے لنبے سفر کا عزم کیا۔ آپ جیسے تجربہ کار لوگوں کا اس ملک میں آنا اور یہاں کے حالات کو دیکھنا مفید ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ اسی شوق نے اتنی دور کھینچا۔ مہاراج نے سوال کیا۔ آپ کس صیغے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ آیا آپ یہاں کی تعلیم گاہیں دیکھ رہے ہیں۔ یا تجارت گاہیں۔ یا صنعتی کارخانے۔ اُنہوں نے کہا۔ اب میری عمر ان چیزوں کے مفصل طور پر دیکھنے کی نہیں ہے۔ میں سرسری طور پر بہت سی چیزیں دیکھ رہا ہوں اور جو چیز یہاں کی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہاں کی لبرٹی ہے۔ مہاراج یہ لفظ ایک بوڑھے ریاستی اہلکار کی زبان سے سنکر خوش ہوئے

اور مُسکرا کر اُنہیں اپنے ساتھ ایک کونے میں لے گئے اور دیر تک اُن سے باتیں کرتے رہے۔

اس ایک لفظ میں کیا جادو تھا اسے وہی سمجھ سکتے ہیں۔ جن کے دل میں اسکی قدر ہے۔ مگر ہم میں کتنے ہیں جو اس کی پوری قدر کرتے ہیں۔ یا کر سکتے ہیں۔ پوری قدر کے یہ معنی کہ اسے جان و مال سے عزیز سمجھیں۔ جیسے بزرگوں کے قصّے سنتے ہیں۔ کہ وہ مال و جان اولاد سب چیز پر آبرو کو مقدم رکھتے تھے۔ اور چاہے کیسی تکالیف کا سامنا ہو آبرو پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ اُس طرح اس مجموعی آبرو۔ اس قومی عزت۔ اس ملکی نمود پر جو لبرٹی سے وابستہ ہے مرمٹنے والے ہم میں کہاں ہیں۔ ہمارے ہاں اس انگریزی لفظ کا ترجمہ عموماً آزادی کیا جاتا ہو مگر انگریزی میں ایک اور لفظ بھی ہے جس کا ترجمہ اُردو میں "آزادی" ہی ہے یعنی "فری ڈم" گو یہ دونو انگریزی لفظ اصل میں مترادف ہیں۔ مگر مخرج کے فرق نے ان کے معانی میں ایک باریک سا فرق پیدا کر دیا ہے۔ لبرٹی لاطینی زبان سے لیا گیا ہے۔ اور فری ڈم سیکسن اصل سے ہے۔ معنی دونو کے وہی ہیں۔ اور اب بھی بعض اوقات ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں جو لطیف امتیاز ان کے معنوں میں پیدا ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ "فری ڈم" مطلق آزادی کے لئے چاہے وہ خیالات کی ہو۔ عادات کی ہو۔ اطوار کی ہو۔ ذاتی ہو۔ یا ایک جماعت کی ہو۔ استعمال ہوتا ہے۔ اور لبرٹی ملکی آزادی کے معنوں میں زیادہ مستعمل ہے ہمارے ہاں اکثر ان دونو الفاظ کے لئے ایک ہی ترجمہ ہونے سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی لبرٹی کے خاص مفہوم کے لئے ایک خاص لفظ قرار دیں اور میرے خیال میں اُس مفہوم کو عربی لفظ 'حُرّیت' سے بڑھ کر کوئی لفظ ادا نہیں کرتا اور چونکہ 'حرّیت' پہلے سے ہی ہماری ہاں مروّج بھی ہے۔ اس لئے اس کے زیادہ استعمال میں کوئی رُکاوٹ نہیں۔ مصر کے عربی اخبارات میں یہ لفظ بہت مستعمل ہے۔ مگر وہاں عموماً حمیت قومی یا

مُلکی معنوں میں آتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو مفہوم بہر حال وہی رہتا ہے۔ کیونکہ حمیّت قومی یا ملکی لبرٹی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی اتفاق سے ہو بھی جائے تو پنپنے نہیں پاتی۔ حمیّت قومی ایک پودا ہے جو حرّیت کی سرزمین میں اُگتا ہے۔ حرّیت کے پانی سے سرسبز ہوتا ہے اور حرّیت کی ہواؤ سے راس آتی ہو اور جگہ جم بھی جائے تو وہ کیاری سوکھ جاتی ہے۔ حمیت کے گیت گانا۔ حمیت حمیت پکارنا اور چیز ہے اور حمیت کا عملی ثبوت دینا اور چیز۔ اور یہ عملی ثبوت ہی وہ شے ہے جو اُس حصّہ دنیا میں جو حرّیت کی نعمت سے محروم ہو۔ ناممکن ہے۔

ہندوستان میں گو آزادی کا شوق عام ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک روزافزوں جماعت اس کی خواہاں ہے۔ تاہم یہ بھی ایک امرواقعہ ہے۔ جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آزادی کے مخالف بھی ہم میں بکثرت موجود ہیں۔ جو اس کے نام سے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ کچھ بہت عرصہ نہیں ہوا۔ کہ اخبارات اور رسائل میں بعض ثقہ اور سلامت رو حضرات آزادی کے شوق کے خلاف مضمون لکھ رہے تھے۔ اور آزادی کے دلدادہ اپنے رنگ کے اخبارات میں انہیں صلواتیں سنا رہے تھے۔ اور اب بھی یہ مباحثہ وقتاً فوقتاً تازہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس کی وجہ یہی ہے کہ دونو فریق اس لفظ کے مفہوم پر متفق ہو کر بحث شروع نہیں کرتے۔ اختلاف کرنے والوں کے ذہن میں آزادی "مادر پدر آزادی" کے قریب قریب معنی رکھتی ہے۔ اور چونکہ آزادی پسند طبائع بھی کبھی کبھی اپنی مشق گھر ہی سے شروع کرتی ہیں۔ اور باہر قیود کی زیادتی کی وجہ سے سکوت پر مجبور ہو کر سارا زور گھر کی چاردیواری کے اندر "آزادی" کی پکار پر ڈالتی ہیں اس لئے پرانے طریقوں اور رسوم کے دلدادہ گھبرا کر زمانے کو کوسنے لگتے ہیں۔ اور اس صدی کو بُرا کہتے ہیں جس نے یہ تاثیر نوجوانوں میں پیدا کر دی۔ اور نہایت درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھتے ہیں ؎

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر مے بینم — آسماں را ہمہ پُر فتنہ و شر مے بینم

دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر — پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر مے بینم

یہ زمانے کے گلے شکوے تو ہمیشہ سے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ان کا جھگڑا چکانا تو ہمارا مقصود نہیں۔ ہمیں تو بحث اس سے ہے کہ یہ غلط فہمی جو لفظ آزادی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اور آزادی کم از کم ایک صفت ایسی ہو جس کے متعلق متفقہ رائے یہ ہو۔ کہ حاصل کرنے کے لائق چیز ہے۔ اور پھر اس کی حصول کے لئے متفقہ کوشش ہو۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم نے ابھی حرّیت کے نام سے پکارا ہے۔ کوئی معقول آدمی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور قوموں کی تواریخ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قوموں اور ملکوں کے بننے اور بگڑنے کا دارومدار اس پر ہے۔

یوں تو یورپ کے اکثر حصے اس دولت سے مالا مال ہیں۔ مگر انگلستان اور فرانس کو اس پر خصوصیت سے ناز ہے۔ نئی دنیا میں ریاستہائے متحدہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اُن کی جمہوری حکومت سب سے نمایاں مثال لبرٹی کی ہے۔ اور ادہر ایشیا میں اب جاپان نے لبرٹی کا جھنڈا بلند کیا ہے۔ فرانس کی حرّیت نے جس زمانے میں زور پکڑا۔ اُس نے تو ملک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اُسی انقلاب میں وہاں قدیم شاہی کی بیخ و بنیاد اُکھڑ گئی اور اس کی جگہ موجودہ ری پبلک یعنی جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ جس کے نشان پر یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہیں "لبرٹی۔ اگالتی۔ فراترنتی" ان تینوں حروف کا ترجمہ ہے "حریت۔ مساوات۔ برادری" یعنی ہر فرانسیسی آزاد ہے۔ سب اہالی برابر ہیں۔ اور سب اہالی بھائی ہیں۔ یہ نشان جس پر فرانس اس وقت نازاں ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے عرب میں اسلام کے آتے ہی بلند ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ بعد میں اس کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہا۔ اور اب صرف ایک تاریخی واقعہ کا حکم رکھتا ہے۔ انگلستان کا یہ قول ہے کہ اُس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی غلامی کی بیڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ قول تو اُس زمانے میں رائج ہوا تھا۔ جب انگلستان نے غلامی اپنی حکومت میں قانوناً ممنوع کر دی تھی اور اس لئے کسی دوسرے ملک سے اگر کسی کا غلام بھاگ کر انگلستان میں پناہ لیتا تھا تو وہ آزاد

سمجھا جاتا تھا۔ اور واپس نہیں دیا جاتا تھا۔ گو اب غلامی اُن پُرانے معنوں میں قریب قریب فسانہ رہ گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ کانگو کی ریاست کے یورپین انتظام میں اہلِ ملک پر زمانۂ غلامی کے ظلم سے یورپ کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہیں لیکن انگلستان کے متعلق یہ قول ابتک صحیح ہے۔ کیونکہ غلامی کی دوسری صورتیں جو دنیا کے بعض حصّوں میں ابتک انسان کی جان کا وبال بنی ہوئی ہیں۔ اُن کے ستم رسیدے جو انگلستان میں آپناہ لیں۔ فوراً اُن حالات سے آزاد ہو جاتے ہیں یہاں کوئی انہیں یاد نہیں دلاتا۔ کہ وہ مغلوب ہیں۔ ہر شخص اپنے گھر میں بادشاہ ہے اور کوچہ و بازار میں میلے تماشے میں گلگشت باغ میں۔ ریل کی سواری میں۔ کھانے پینے کے کمروں میں اُس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو انگلستان کے کسی معزز باشندے کے ساتھ۔ اس سلوک سے وہ زنجیریں جن سے وہ جکڑا ہوا تھا۔ خود بخود ٹوٹنے لگتی ہیں اور کچھ عرصے اس آب و ہوا میں جینے کے بعد وہ اپنے دل و دماغ کو آزاد پاتا ہے۔ اور حُرّیت کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ مگر حُرّیت مہنگے داموں بکتی ہے۔ اس عارضی طور پر اس کا مزا چکھنے کو جب ہزاروں روپے چاہئیں۔ تو مستقل طور پر اس صحت بخش و مفرح آب و ہوا میں جینے کے لئے تو ہوپانی ایک کرنا ہوگا۔

حُرّیت جب مزاج میں پیدا ہو جائے۔ تو ایک عجیب رنگ لاتی ہے۔ نہ صرف اپنی قیود بھاری ہونے لگتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کے جکڑبند توڑنے کو جی چاہتا ہے انگلستان میں جو تحریکیں وقتاً فوقتاً کارخانوں میں مزدوروں کی نوکری کے گھنٹے کم کرانے کے لئے۔ گھروں میں نوکروں کو اتوار کو آدھی تعطیل ضرور دینے کے لئے مدرسوں کے لڑکے لڑکیوں کو کھلی ہوا میں رہنے کے مواقع پیدا کرنے کے واسطے ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اس شوق کی مثالیں ہیں۔ یہ ہے تو خفیف سی بات مگر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ لیڈیاں اور صاحبان جو کُتّے پالنے کے شوقین ہیں۔ اگر اپنے بڑے بڑے اور تند کتّوں کو جو عموماً بے زنجیر رکھنے مشکل ہیں ٹہلانے

باہر نکلیں۔ تو اُن کی زنجیر کھول دیتے ہیں۔ ایک کوڑا ہوتا ہے۔ جس سے ایک کنڈا سا لگا ہوتا ہے وہ ہاتھ میں احتیاطاً رکھ لیتی ہیں۔ کہ اگر کتا کچھ شرارت کرنے لگے تو پٹے سے اٹکا کر کوڑے کو زنجیر بنا لیں۔ مگر کتا بھی اپنی آزادی کی قدر کرتا ہے۔ اور اس اعتبار پر ناز کرتا ہوا کہ اُسے بازار میں مالک یا مالکہ کے ساتھ ساتھ بے زنجیر چلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ بہت احتیاط سے چلتا ہے۔ کہ کہیں کوڑا زنجیر نہ بن جائے۔ اہل امریکا میں یہ فوق اس حد کو پہنچا ہے کہ اُنہیں انگلستان بھی مقید معلوم ہوتا ہے۔ میں اڈنبرا میں تھا۔ کہ ایک دن اتوار کو ایک بڑی چوا سپہ گاڑی میں جس میں ادہر کے قابل سیر مقامات میں بیس بیس پچیس پچیس مسافروں کو لاد کر سیر کرنے لے جاتے ہیں۔ مجھے اتفاق سے تین چار امریکن لیڈیاں مل گئیں۔ جو محض سیاحت کے لئے برطانیہ کی سیر کر رہی تھیں۔ جیسا کہ ہزاروں امریکن کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کا وطن۔ اپنی تاریخ کا مرکز۔ انگریزی زبان کے بڑے بڑے مصنفوں کا گھر۔ انہیں برطانیہ سے خاص دلچسپی کیوں نہ ہو۔ برطانیہ کو دیکھنے یوں آتے ہیں جیسے کوئی حج یا تیرتھ کے لئے آئے۔ اُن لیڈیوں سے گفتگو ہوئی کہنے لگیں ہمارے ہاں تاریخی دلچسپی کے ایسے سامان نہیں ہیں۔ جیسے اس ملک والے رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہمارا ملک دیکھنے کے قابل ہے اور ہم اُس پر فخر کرتے ہیں۔ میں نے کہا "آپ کا فخر بجا ہے۔ یہاں والے اگر تاریخ کی بوسیدہ ہڈیوں پر اترا سکتے ہیں تو آپ کا ملک ایک تاریخ جاری ہے جو اس وقت تک بن رہی ہے۔ یہاں والوں کو ناز ہے کہ اُن کے بڑوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ آپ اب وہ باتیں کر رہے ہیں جن کو آیندہ نسلیں تعجب سے دیکھیں گی اور جن سے آیندہ تاریخ بنیگی امریکا نے تھوڑے سے زمانے میں جو کچھ کیا ہے وہ اسی کا حصّہ تھا" اپنے ملک کی تعریف کسے نہیں بھاتی۔ میرے اس خیال کے اظہار سے وہ بہت خوش ہوئیں اور باقی راستے میں جا بجا اپنے خیالات سے مستفید کرتی گئیں۔ ایک خوبصورت پرانا مکان راستے میں پڑا جو کسی امیر کا ملک تھا۔ اور اس کے گرد ایک آراستہ

باغ تھا۔ اور باغ کے گرد ایک چار دیواری تھی جس کی دیواریں خاصی بلند تھیں۔ کہنے لگیں "مکان بہت عمدہ باغ بہت اچھا۔ مگر دیواریں بہت خراب" میں نے کہا پرانے زمانے کی یادگاریں"۔ کہنے لگیں "ہمیں ان سے وحشت ہے۔ ہم کھلی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اب تو مکان کے گرد جنگلے تک کی رسم مٹتی جاتی ہے۔ آگے تھوڑی دور چل کر چند پھٹے کپڑوں والے لڑکے نظر آئے جو گاڑی کے ساتھ ساتھ پیسہ مانگنے کے لئے دوڑتے تھے۔ برطانیہ کا قانون کسی کو ایسا کرنے کی اجازت تو نہیں دیتا۔ لیکن بیرونجات میں کہیں نہ کہیں افلاس لوگوں کو مجبور کر ہی دیتا ہے اور مثالیں چونکہ کہیں کہیں ملتی ہیں۔ اس لئے قانون بھی تعرض کم کرتا ہے۔ اُن لڑکوں کو دیکھ کر ایک امریکن لیڈی بولی "یہاں قدم قدم پر اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ یہاں حکومت لوگوں کی اپنی نہیں۔ نہ صرف ان غریب لڑکوں میں بلکہ عام طور پر غریب لوگوں کے چلنے پھرنے بات چیت ہر چیز میں یہ نظر آتا ہے کہ یہ ملک شاہی طرزِ حکومت کے ماتحت ہے۔" میں یہ سُن کر متعجب ہوا اور میں نے اُن سے کہا کہ آپ کی نگاہ میں اس ملک کی لبرٹی نہیں جنچتی۔ اور ہم اگر ان کی حالت میں ہوں تو گویا پولیٹکل بہشت میں پہنچ جائیں۔ اُس نے کہا "اہو۔ تو کیا آپ ان سے بھی ابتر حالت میں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ انگریزی حکومت سب جگہ یکساں ہے۔ کم از کم اکثر یہی سنتے ہیں۔ کہ انگلستان نے ہندوستان کو تمام وہ فوائد اور حقوق جو خود اسے حاصل ہیں۔ دے رکھے ہیں" میں نے کہا کہ جب آپ سکاٹلنڈ کے باشندوں کی صورت سے اُن کی حالت کا اندازہ کر سکتی ہیں تو ع

میری صورت میری حالت کا پتا دیتی ہے

اس کا بھی اندازہ کر لیجے۔ مگر صحیح اندازہ جب ہو سکتا ہے۔ جب آپ مجھے ہندوستان میں دیکھیں۔

ان امریکا والوں کے خیالات سے تو ہمارے ہاں کیا انگلستان میں بھی کئی لوگ گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی آزادی ہمیں مطلق نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جتنی مطلوب اور ضروری ہے۔ اتنی نہ ملے تو کیونکر ملے۔ حریت کا خیال دلوں میں پیدا ہو تو کیونکر ہو

ہندوستان میں کئی دل سوختہ اس وقت ایسے ہیں۔ کہ وہ اپنے ملک سے قطعی مایوس ہیں۔ اُن میں ایک میرے دوست ہیں۔ جو ان دنوں واپس وطن گئے ہوئے ہیں۔ یہاں تھے تو اُن سے بحث رہتی تھی اور وہاں ہیں تو خطوں میں وہی بحث چلتی رہتی ہے۔ اتفاق سے وہ زن و فرزند و علائق سے ابتک خالی ہیں۔ اس لئے وہ اکثر خواب لیتے ہیں۔ کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کدھر جائیگا۔ یہ تو فرمائیے۔ کہیں آپ کی قدر بھی ہے۔ ذرا جنوبی افریقہ میں آسٹریلیا میں تشریف لے جاکر تو دیکھئے۔ حُرّیت کے تمغے کے بغیر کون پوچھتا ہے آپ کے بھائیوں کی جو تواضع ہو رہی ہے وہ سارے زمانے کو معلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ایران یا روم کو جا بسائیں گے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ آپ کی تحقیر وہاں بھی رفاقت کریگی۔ جب تک اپنے ملک کی عزّت نہ بنا لوگے۔ باہر کہیں عزت نہ ہوگی اُنہوں نے مجھے خط میں لکھا "ہندوستان جہنّم ہے" میں نے جواب عرض کیا کہ "اسے جنّت بنائیے" اور مجھ سے پوچھئے تو میں اسے باہمہ نقائص آب و ہوا اور باہمہ مصائب ارضی و سماوی جن کا کچھ عرصہ سے وہ نشانہ بنا ہوا ہے۔ جنّت سمجھتا ہوں۔ اب معلوم نہیں وہ اپنے ذاتی علائق کی محبّت ہے یا قدرتی الفتِ وطن۔ بہرحال ہندوستان جو کچھ ہے۔ ہمارا ہے۔ اور ہم اُس کے ہیں۔ جو عزّت ہم اُس سے جدا ہو کر حاصل کرنا چاہیں۔ جو آرام ہم اُس سے بھاگ کر ڈھونڈھیں۔ وہ اوّل تو ملیگا نہیں۔ اور اگر ملا اُس کا لطف نہیں آسکیگا۔ عزّت وہی جو وطن کی عزّت کے ساتھ ہو۔ اور وطن کی عزّت اہل وطن میں حُرّیت کے پیدا ہونے پر منحصر ہے۔ اور وہ جب ہی پیدا ہوگی کہ ہر ہمدردِ وطن اُسے اپنی عزّت اپنی آبرو۔ اپنے نفع سے بڑھ کر عزیز رکھے۔ اُس صورت میں ہندوستان "فری انگلینڈ" (آزاد انگلستان) کا ایک معزز حصّہ اور سلطنت برطانیہ کا ایک رکن رکین ہوگا۔ اور اس کے بغیر اسکے دامانِ دولت کے وابستگان میں باوجود بہترین ہونے کے کہترین ہے۔

وطن آخر وطن ہے

(ترجمہ از فرانسیسی)

(۱)

انڈرے ڈُوریر مقام فلیڈلفیا کی سمتھسن کمپنی کے مشہور تجارتی کارخانے کا معتبر ملازم اپنے ایک کمرے میں مضطربانہ پھر رہا ہے۔ اِدھر سے اُدھر جاتا ہے اور اُدھر سے اِدھر آتا ہے۔ کوئی پریشانی دامنگیر ہے۔ کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اور کبھی تند و تیز حرکات سے اُس بحث کا اظہار کرتا ہے۔ جو اُس کے دل میں اندر ہی اندر جاری ہے۔

اگر اُس کے دوستوں میں سے کوئی اُسے اس وقت دیکھے تو یقیناً حیران ہو کیونکہ فلیڈلفیا میں اس کے جاننے والے سب اُسے کامیاب آدمی سمجھتے ہیں اور باعثِ رشک خیال کرتے ہیں۔ جب سے اُس نے امریکا میں قدم رکھا۔ کامیابی نے اُس کا ساتھ دیا۔ اُسے ابھی دو برس سے زیادہ یہاں نہیں گذرے مگر ہر ایک کے دل میں اُس نے گھر کر لیا ہے۔ اور گو ابھی اُس کی عمر چھوٹی ہے تاہم اس کارخانے میں ذمہ داری کا کام اس کے سپرد ہے۔ اس بنا پر لوگ اُسے ذی فہم اور ہونہار نوجوان سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ایک دن مالدار ہوگا۔ چند ہفتوں سے اُسے ایک اور خوش قسمتی حاصل ہے سمتھسن صاحب کی بیوی نے اُسے اپنے شام کے بے تکلف جلسوں میں آنے کا کئی بار موقعہ دیا ہے۔ اور وہاں مس ارابلا سمتھسن اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے چاء کی پیالیاں اُسے دیتی ہے اور اپنے لطف آمیز تبسم اور مہربانی کی نگاہوں سے اس مزے کو اور دوبالا کرتی ہے۔ چنانچہ آج قرارداد کے مطابق ان دونوں ماں بیٹیوں کے ساتھ اُسے تماشگاہِ عام میں باجا سننے جانا ہے جہاں ہر قوم کے

موسیقی کا نمونہ دکھایا جانے کو ہے۔ اس عزّت پر اس کے بہت سے ہمسروں کو رشک ہے۔ وہ اس میں معنی پیدا کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ محبّت کہنے سے وہ شادی کی لاٹری میں بہت سا مال جیت لیجائیگا۔

بااین ہمہ اگر وہ متفکّر ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے آج ہی اپنے باپ کا ایک خط ملا ہے۔ جس کے مضمون نے یہ اضطراب اُس کے دل میں پیدا کیا ہے بوڑھا ڈُوریر ایک پنشن یافتہ فوجی کمان افسر ہے۔ جو اپنے زاد بُوم۔ فرانس کی خدمت کے بعد وہیں ایک گاؤں میں اپنے آخری دن کاٹ رہا ہے۔

انڈرے نے کچھ عرصہ ہوا اپنے باپ کو ایک تجویز لکھ کر بھیجی تھی۔ جس میں امریکا میں مستقل سکونت اختیار کر کے قانوناً وہیں کا باشندہ قرار دیا جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ اُس تجویز کے جواب میں ہے۔

بوڑھے سپہ سالار کے خط کا مضمون ذیل میں درج ہے:۔

میر پیارے انڈرے

جب مدرسے سے نکلتے ہی تم نے مجھے یہ کہا کہ تم سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ تو میں نے تمہاری خواہش کو تسلیم کیا۔ سپاہی ہونے کے لیئے اپنے فن کا شوق اور ایثار کی خصلت درکار ہے۔ تم اس صدی کے آخری حصّے کی پیدائش ہو۔ تمہارے خیالات اور ہیں۔ اور تم نے کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا چاہا۔ پس میں نے مناسب نہ سمجھا کہ میں اپنے خیالات کی موافقت پر تمہیں مجبور کروں۔

میں صفائی سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ جب سے تم فرانس سے گئے ہو تم نے اپنے فیصلے کی عمدگی کا اپنی نمایاں کامیابی سے عملی ثبوت دیا ہے۔ اور جو خط مجھے فلیڈلفیا سے آیا ہے اُس میں تمہاری تعریف ہی آئی ہے۔

مگر اب جو تم جلدی امیر ہونے کی خاطر۔ امیر کی بیٹی بیاہنے کی غرض سے ایک دوسری قوم میں شامل ہونا چاہتے ہو۔ اور اپنے وطن کو ترک کرنا چاہتے ہو جیسا

کوئی پُرانے کپڑے کو اُتار کر پھینک دیتا ہے۔ تو اُسے پیارے بیٹے۔ میں اپنے پدرانہ اختیارات ترازو کے دوسرے پلڑے میں ڈالنا چاہتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تمہارے لئے پھر یورپ میں آنا باعثِ تکلیف ہوگا۔ اوّل تو تمہیں تین سال فوج میں صرف کرنے پڑیں گے۔ جو ہر ایک کے لئے لابُد ہے۔ اگر وہ فرانسیسی رہنا چاہے۔ مگر فرض کا خیال مقدم ہے اور فرض یہی حکم دیتا ہے۔ کہ تم واپس آؤ۔

جانِ پدر! وطن اُس جگہ کو نہیں کہتے جہاں معاش میسّر ہو۔ بلکہ یہ اس سرزمین کا نام ہے جہاں والدین رہتے ہوں۔ جہاں آباؤ اجداد کی ہڈیاں مدفون ہوں۔ یا جہاں تمہارا عہد رہا ہو۔ اُسی کی خاطر تمہارا دادا دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔ اُسی کے واسطے مجھے تلوار کی فوج میں زخمی ہونے کی عزّت حاصل ہوئی۔ آؤ اور اس پیارے جھنڈے کے نیچے اپنی جگہ لو جس نے تمہارے بزرگوں کے خون کا رنگ دیکھا ہے۔

میں اپنے زمانے میں خاصی ترقی کرتا رہا ہوں۔ گو مجھے کوئی بڑی مہم سپرد نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصّہ اپنے ملک کو دیا ہے۔ اور آڑے وقت میں اس کے کام آیا ہوں۔ اور اس وقت میں جو کچھ ہوں فرانس کی طفیل ہے۔ جب تم گھر سے نکلے تھے۔ اور میں نے تمہیں گلے لگا کر تمہاری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اُس وقت میں نے عہد کیا تھا۔ کہ تم میرے بعد اپنے ملک کی خدمت کروگے اور تمہاری نسل ہم سے بڑھ کر خوش قسمت ہوگی

اُسے فرزند! میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اور اگر ضرورت ہو تو تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم فرانسیسی رہو۔ اور اپنا وطن نہ بدلو۔

کماندار۔ ڈوریر"

انڈرے نے اس خط کو پھر ایک دفعہ پڑھا اور میز کے قریب آکر کانپتے ہوئے ہاتھ سے جواب لکھنا شروع کیا جس کا یہ مضمون تھا:۔

میرے والد بزرگوار!

آپ نے لکھا ہے۔ کہ وطن اُس جگہ کو نہیں کہتے۔ جہاں معاش ہو۔ منظور! مگر کیا اس جگہ کو بھی نہیں کہتے۔ جہاں اُس کا محبوب ہو۔ میرا دل یہاں ہے۔ اور اور میرا کاروبار یہاں۔

مجھے فرانس جسے میں نے مدرسے کی کھڑکیوں سے ہی دیکھا ہے۔ اب اچھی طرح یاد بھی نہیں۔ اور نہ مجھے اُس کا چنداں خیال ہے۔ آپ کے لئے اُس نے کیا کیا ہے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اس کی خدمت میں وقف کردی۔ اور اسکے بدلے اپنا خون بہایا۔ اس کے عوض میں آپ کے کندھے پر ایک رنگدار فیتہ بڑھانے اور بڑھاپے میں محض گذارے کے موافق مدد دینے کے سوا اس نے کیا کیا ملک امریکا مجھے دولتمند اور با اثر بنا دیگا۔

ابّا جان! میں اس بارے میں آپ کی حکم عدولی پر مجبور ہوں۔ گو مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔ مگر میں اپنی جوانی کے تین بیش قیمت برس گولہ باری سیکھنے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اور جتنی جلدی ممکن ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آزاد مملکت جمہوری کے اہالی میں شامل ہو جاؤنگا۔

نوجوان انڈرے یہانتک لکھنے پایا تھا۔ کہ ٹایم پیس نے گھنٹی بجائی۔ اور اُسے معلوم ہوا۔ کہ سمتھسن صاحبہ اور مس سمتھسن سے ملنے کا وقت ہوگیا۔ اُس نے قلم رکھدیا اور خط ختم کئے بغیر وہ اُن کی ملاقات کے لئے گھر سے نکلا۔

(۲)

فرانسیسی نوجوان کا مع دو خواتین کے نمائشگاہ میں داخل ہونا باوجود مجمع کی کثرت کے لوگوں کی نظر سے بچا نہیں۔ کئی نگاہیں اُن پر پڑیں۔ وہ خود دراز قد چھریرے بدن کا۔ سیاہ مونچھیں بانکپن سے چڑھائے ہوئے۔ فرانسیسی نسل کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ اور اُس کے ساتھ والی مس ارابلا کی خوبصورت نیلگوں آنکھیں۔ نازک کمر۔ سنہرے بال اُن حسینوں کو یاد دلاتے تھے جن کے فسانے دنیا میں رہ گئے ہیں۔

جہاں باجا بجتا تھا اُس کے قریب کُرسیاں بالکل پُر تھیں۔ لیکن چونکہ ان تینوں کے لئے کُرسیاں پہلے سے مخصوص ہوگئی تھیں۔ اس لئے انہیں جگہ ڈھونڈھنے میں چنداں دقت نہ ہوئی۔ گو راستے میں کسیقدر گھمسان تھا۔ خاصکر ایک جگہ جہاں ایک گروہ سفید مگر اُبھرے ہوئے گالوں والے آدمیوں کا بیٹھا تھا۔ جو آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے۔ کہ جرمن لوگ ہیں۔

انڈرے اپنی خوش رُو جلیس کو گوشۂ چشم سے دیکھتا جاتا تھا اور اُس کے کان موسیقی سے بڑھ کر اُس کی آواز کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں ایک عام حرکت سامعین میں ہوئی جس نے اُس کے خیالات کو جو موہومہ تصاویر کے گلابی ولوں پر پرواز کر رہے تھے۔ زمین کی طرف دم بھر کے لئے واپس بُلا لیا۔ یعنی پیرس کی جمہوری سلطنت کے دستۂ فوج کا باجا شروع ہونے لگا۔

اچانک وہ کیا دیکھتا ہے۔ کہ وہ وردی جس کو وہ بچپن میں خوب جانتا تھا۔ اُس کے سامنے موجود ہے۔ اور وہ تین رنگ کا جھنڈا جو تمام دنیا کے گرد فرانس کی شہرت اور آزادی کا آوازہ بلند کرنے کے لئے پھر چکا ہے۔ اُس کے پیش نظر ہے۔ ان کے دیکھتے ہی وہ سب باتیں جنہیں وہ اپنے ذہن میں بھلا بیٹھا تھا سُرعت سے اُس کے دماغ میں پھر گئیں۔

سب لوگ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوگئے۔ ایک سکوت کا عالم تھا۔ صرف ایک آواز اس سکوت میں مُخل تھی اور وہ ایک جرمن کی تھی۔ جو اپنے رفیقوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے طعن آمیزی سے ہنس رہا تھا۔ انڈرے نے سمجھا کہ وہ فرانسیسوں کے قومی جھنڈے کی ہنسی اُڑا رہا ہے۔ اُس نے بے اختیار۔ بے سوچے سمجھے پکار کر کہا "ہش ہش" اور کہنے کے بعد خود اپنے آپ پر متحیر ہوا۔

باجے کے افسر نے اپنی چھڑی اُٹھائی۔ نقارے پر چوٹ پڑی۔ رنگولے بجنے لگے۔ اور مرسیٹی کا غیر فانی راگ کمرے میں گونج اُٹھا۔ سارا زمانہ اس لے کو پہچانتا ہے۔ فرانس کے مشہور انقلاب میں یہی آوازۂ جنگ تھی جس نے لوگوں کے دل ہلا دیئے

تھے۔ اور جب باجا ختم ہوا تو سننے والوں نے بے ساختہ داد دی۔ اور تالیوں پر تالیاں بجیں۔ مگر ایک طرف سے حقارت آمیز سیٹی سُنی گئی اور یہ اسی جرمن نے بجائی۔ جسے انڈرے خاموش رہنے کو کہہ چکا تھا۔ اس پر فرانسیسی نوجوان بے قابو ہو گیا۔ اُسے سب کچھ بھول گیا۔ نہ یہ خیال رہا کہ اُس کی آرزوئیں کیا کیا ہیں۔ نہ یہ کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ یا کہاں ہے۔ غرض سب خیالات جو ابھی اس کے دماغ میں سما رہے تھے کافور ہو گئے۔ اُسے یاد نہ رہا کہ باپ کے خط کا جواب ابھی ابھی وہ کیا لکھ رہا تھا۔ حُبِّ وطن کی کیا تحقیر کی تھی۔ اور اہلِ امریکا میں شامل ہونے کا اُس کا کتنا پکّا ارادہ تھا۔ یہ سب اس وقت نگاہ سے غائب تھا۔ صرف ایک چیز اُسے نظر آتی تھی اور وہ یہ کہ اُس جرمن نے فرانس کی بے عزتی کی ہے اور جیسے کوئی اپنی ماں کی بیعزتی کے انتقام کے لئے جھنجھلا کے اُٹھتا ہے۔ اس طرح وہ تندی کے ساتھ اُس گستاخ جرمن کی طرف بڑھا اور جا کر اُسے گلے سے پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ذرا حواس قائم ہوئے۔ تو اُس نے اپنی جیب سے اپنے نام کا ایک کارڈ نکالا اور اُسے اپنے حریف کو دینا چاہا۔ مگر جرمن نے اُسے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا۔ گلا گھونٹنے سے وہ پتھر کی طرح ہو گیا تھا اور اسے اب اس فرانسیسی سے ڈوائل[1] لڑنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بُت بنا ہوا اُس کے مُنہ کو تک رہا تھا۔ حقارت کے ساتھ حریف کی طرف کارڈ پھینک کر فرانسیسی اُدھر کو مڑا جہاں اُس نے دونوں خواتین کو چھوڑا تھا۔ تاکہ اُن سے معذرت چاہے۔ کہ اُسے جوش نے اس فعل پر مجبور کیا۔ مگر اُن کی جگہ خالی تھی۔ وہ اُس بکھیڑے کی اُلجھن کے خوف سے اور اُس کی اس حرکت سے ناراض ہو کر چل دی تھیں۔

(۳)

ان دو امریکن عورتوں نے جو سلوک اُس سے کیا۔ اُسے دیکھ کر انڈرے کو شہور

[1] لغوی معنے دو آدمیوں کی لڑائی۔ فرانس اور بعض دیگر ممالک یورپ کی قدیم رسم جس میں کئی جھگڑے باہمی رقابت کے اس طریق سے فیصلہ ہوتے تھے اور قانون اس رسم کو روا رکھتا تھا۔ موجودہ قانون بہت کچھ ترمیم میں ساعی ہیں۔

امیر البحر نیلسن کے متعلق ایک روایت یاد آئی۔ جب نیلسن نیپلز گیا ہوا تھا۔ تو اُس کے کسی بے تکلف دوست نے اُسے لکھ بھیجا تھا۔ مائی لارڈ۔ انگلستان واپس آجایئے اپنے ملک کی عورتوں کے تبسم کی کوئی چیز برابری نہیں کرسکتی" وہ اس بے پروائی سے بغیر کسی اظہار ہمدردی کے اُٹھ گئیں۔ اور جس چیز نے اُسے اسیقدر رنج پہنچایا تھا اُس کا اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اس سے انڈرے کو معلوم ہوا کہ فرانس اور امریکا صرف بلحاظ جغرافیہ ہی جدا نہیں۔ بلکہ دونوں کے خیالات اور عادات میں بیحد فرق ہے جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔

جیسے سورج کے اثر کے سامنے دُھند اور غبار کے بادل دم بھر میں پھٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ اور مطلع صاف ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس کے خیالات کے بادل آناً فاناً بکھر گئے اور فرانس کی تصویر اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ ہر عشق کی یہ عجب خاصیت ہے۔ کہ اسے کبھی کبھی انسان مردہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ مگر اس کی چنگاری راکھ کی نیچے چھپی پڑی ہوتی ہے اور اُسے بھڑکانے کے لئے ایک پھونک کافی ہوتی ہے۔

وہی نوجوان جو اپنے آپ کو صرف کامیابی کا شائق سمجھتا تھا۔ اور جس کی نظر میں تھوڑی دیر پہلے زر کے سوا کوئی معبود نہ تھا۔ اب اپنی اصلیت کو صفائی سے دیکھنے لگا اُس نے دیکھا کہ جس جھنڈے سے اب وہ اپنا کچھ واسطہ نہیں سمجھتا تھا۔ اُس کی خاطر ابھی ڈُوائل لڑنے پہ آمادہ تھا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کو تیار تھا۔ مرشی کے راگ کی آواز نے اُسے زمانۂ انقلاب فرانساوی کے سپاہیوں کا سا جوش دیدیا تھا اور خونِ حمیت اُس کی رگوں میں حرکت کرنے لگا تھا۔ کیا تو وہ باپ کے غریبانہ گانوں کو حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کے جوش کے جواز کا قائل نہ تھا اور کیا ابھی ایک جرمن کی ایک ادنیٰ سی حرکت سے کہ وہ سیٹی بجاکر فرانس کے باجے والوں کی تحقیر چاہتا تھا۔ اُس پر حملہ کر بیٹھا۔ کیونکہ یہ تحقیر اُسے اُس مبارک سرزمین کی تحقیر محسوس ہوئی۔

نمائش گاہ سے نکل کر وہ اپنے گھر آیا۔ آتے ہی میز پر وہ خط دیکھا۔ جسے وہ ناتمام چھوڑ گیا تھا۔ اُس کو پھاڑ ڈالا اور کہنے لگا:۔

پیارے باپ! فرانس کے شریف مگر منکسر خدمت گذار! تو حق پر ہے۔ میں اگلے جہاز میں خط کے جواب میں خود تیری خدمت میں پہنچتا ہوں۔ اپنا بازو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ اور اپنے **وطن** کے خادموں کے درمیان جگہ دیئے جانے کی درخواست کرتا ہوں۔

گلبازی یا گلباری

یوں تو ہر ملک کے میلے اور تماشے اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور کون سا آباد ملک ہے۔ جو اپنی دلچسپیوں سے خالی ہے۔ مگر چند ہفتے ہوئے مجھے بولون علاقہ فرانس میں ایک نہایت اُجلا میلا نظر آیا۔ جس میں اہلِ شہر نے کمال نفاستِ مذاق سے کام لیا تھا اور جسے دیکھنا شمالی فرانس کی زندگی کے ایک نادر پہلو کو دیکھنا تھا۔ اس کے فرانسیسی نام کا لفظی ترجمہ تو "پھولوں کی لڑائی" ہے۔ مگر چونکہ اس میں ایک پرانے ایشیائی کھیل کا اصول موجود ہے۔ اس لئے ہم اسے "گل بازی" کہ سکتے ہیں لیکن جس کثرت سے اس میں دو گھنٹے تک پھول برسائے۔ اگر اُس کثرت کو ملحوظ رکھیں تو اُسے گلباری کہنا زیادہ موزون ہوگا۔

بولوں شمالی فرانس کے اُن مقامات میں سے ہے۔ جہاں لوگ جولائی اور اگست کے مہینوں میں گرمی بسر کرنے جاتے ہیں۔ نہ صرف قرب و جوار کے فرانسیسی آتے ہیں بلکہ پیرس تک سے لوگ سمندر کے ساحل کی کشش سے کھنچے آتے ہیں۔ گو ساحل کی زندگی کا شوق فرانس میں اُس درجے پر نہیں ہے جس پر انگلستان میں بولوں چونکہ انگلستان کے ساحلِ جنوبی کے مقابل واقع ہے۔ اس لئے انگریز بھی اُس موسم میں کثیر تعداد میں بولوں کی رونق بڑھاتے ہیں۔ اور ہے بھی مزے کی بات۔ فوکسٹن سے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھو تو بولوں نظر آتا ہے۔ جہاز پر سوار ہو جاؤ تو رودبار عبور کر کے گھنٹے سوا گھنٹے میں بولوں آ سکتے ہو۔ ادھر ریلوے اور جہاز کی کمپنیاں خلقت کا رجوع دیکھکر کرایہ بھی کم کر دیتی ہیں۔ اور اس تخفیف سے ہر دل میں اُمنگ اُٹھتی ہے

کہ ذرا سی ہمّت اور تھوڑے سے خرچ سے ایک نئی سرزمین دیکھی جا سکتی ہے۔ کیوں نہ دیکھ لیں۔ بس ایک سیل سا اُمنڈ آتا ہے۔ جدھر جاؤ انگریزی اور فرانسیسی کی آواز ملی ہوئی کان میں پڑتی ہے۔ انگریز زباندانی میں ممتاز نہیں۔ اس لئے باوجود صدیوں کی ہمسائگی اور کثرت آمد و رفت کے اور باوجودیکہ اکثر مدارس انگلستان میں فرانسیسی سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بولنے سے عاری ہیں۔ اور اگر بولنے بھی لگیں۔ تو چند فقروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور اس میں بھی تلفظ کی غلطی عام سی بات ہے۔ مگر خیر فرانسیسی دُکاندار بھی اپنی زبان کے قتل عام کا بدلہ انگریزوں سے لئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ بھی دُکان پر لکھ رکھتے ہیں "یہاں انگریزی بولی جاتی ہے" تاکہ انگریزی بولنے والا گاہک آئے اور جب آتا ہے۔ تو عموماً جیسی اُس کی فرانسیسی ہوتی ہے ویسی ان کی انگریزی۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ کام تو چل جاتا ہے۔ مگر انسان خود فریقین میں نہ ہو تو دور سے اس تماشے کا دیکھنا لطف خاص رکھتا ہے۔ فرانسیسی آدمی جہاں الفاظ جواب دیتے ہیں حرکات سے کام لیتا ہے۔ اور اثنائے گفتگو میں اُس کے شانے بیحد ہلتے ہیں۔ اور انگریز جوں جوں سمجھنے یا سمجھانے میں قاصر رہتا ہے گھبراتا ہے۔ مگر ہم گلباری سے دُور رہے جاتے ہیں۔

گلباری میں سب شریک ہوتے ہیں۔ مسافر اور مقیم۔ انگلستان سے آئے ہوئے مہمان اور فرانس کے اہلِ وطن۔ بوڑھے اور جوان۔ عورتیں اور بچے۔ بانکے چھیلے اور سیدھے سادے۔ کون ہے جو احاطے کے اندر داخلے کے چند پیسے دے سکتا ہے اور نہیں جاتا۔ عین کنارِ آب پر ایک تماشا گاہ ہے۔ جس کے متعلق ایک باغیچہ ہے۔ وہی باغیچہ اس مرتبہ اس میلے کے لئے مقرر تھا۔ کئی دن پہلے سے تیاریاں تھیں۔ اس کی روشیں آراستہ کی گئی تھیں۔ اور روشوں کے دونوں طرف نشست کا سامان تھا۔ ایک طرف اونچے اونچے عارضی چبوترے۔ جن پر ممتاز لوگ جو مدعو تھے یا جنھوں نے زیادہ قیمتی ٹکٹ خریدے تھے بیٹھ سکیں۔ اور دوسری طرف

صرف بنچ اور کہیں کہیں کُرسیاں - جن پر اُن سے کم قیمت ٹکٹ لیکر لوگ بیٹھ سکیں صبح سے گلفروشوں کی دُکانیں غیر معمولی طور پر پھولوں سے پُر نظر آنے لگیں - اور دوپہر کے بعد اُس باغیچے کے قریب بھیڑ بھاڑ شروع ہو گئی - اور اس کی سڑک پر دو کانوں کی قطاریں ہندوستان کے میلوں کی طرح لگ گئیں - چار بجے اصل تماشا شروع ہوا - تمام نشستیں تماشائیوں سے پُر تھیں - اور اُن کے سوا ایک بڑی تعداد ایسے تماشائیوں کی تھی - جو صرف داخلہ کا ٹکٹ رکھتے تھے اور اُنہیں میلے کے ہر حصے میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی - مگر اُن کے لئے بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ تھا سب تماشائی پھولوں سے جھولیاں بھرے ہوئے تھے - "گو جھولی" بجائے کُرتے یا دوپٹے کی جھولی کے کاغذ کی جھولی تھی - اور بعض زیادہ دولتمند لوگ نہایت خوشنما اور قیمتی گلدستے لئے کھڑے تھے - کہ اتنے میں سواریٔ گل کی آمد آمد ہوئی - تحسینِ گل کا شور اُٹھا اور سب متوجہ ہو گئے -

سب سے آگے ایک گاڑی تھی - ہمہ تن گل - گھوڑا تو سر سے پانوں تک پھولوں سے سجا ہوا - پہیّے پھولوں سے اٹے ہوئے - پُشت ایک تختۂ گل اور وسط میں ایک خوبصورت ٹوکری پھولوں کی - غرض اندر پھول - باہر پھول - اُس میں ایک معزز فرانسیسی لیڈی ایک پھول سے بچے کو ساتھ لئے بیٹھی تھی - چہرے پر باریک پھولدار نقاب ٹوپی پر پھول اور تکیے پر پھولوں کی چادر - اس پر پھول برسنے شروع ہوئے - دونوں طرف سے بوچھاڑ ہوتی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے - ایک ہاتھ سے سب کا جواب دیتی جاتی تھی - اس گاڑی کے پیچھے ایک دو اسپہ گاڑی تھی - جس کی سجاوٹ اس سے کچھ کم نہ تھی - صرف رنگ آمیزی میں فرق تھا - ہر گاڑی کی سجاوٹ میں ہر کسی نے اپنے اپنے مرغوب رنگ دکھائے تھے اور اپنی پسند کے گل کھلائے تھے - اس میں چار لڑنے والیاں تھیں - اور گھوڑی کی باگ کوچبان سنبھالے ہوئے تھا - جسے صفِ گل میں بیٹھنے کا انعام برابر مل رہا تھا کئی دل لگی باز نشانہ اُڑاتے تھے اور وہ جواب نہیں دیسکتا تھا - سر جھکائے گاڑی ہانکتا

جاتا تھا۔ اس گاڑی کا چبوتروں کے سامنے آنا تھا۔ کہ چومکھیا لڑائی ہونے لگی۔ لوگ ہزاروں تھے تو کیا ہوا۔ یہ چار چنچل نار تھیں۔ ان سے کون بازی جیت سکتا تھا۔ جس طرف سے پھول آتا تھا۔ اُسی طرف جواب جاتا تھا۔ کوئی گلدستہ پھینکتا تھا تو ادھر سے بھی فی الفور اُسی پر بوچھاڑ ہوتی تھی۔ کسی کا وار خالی گیا۔ تو یار لوگ ہنس دیے۔ کسی نے تاک کر پھول مارا۔ تو واہ واہ ہوگئی۔ ان کے پیچھے ایک اور سواری تھی جس میں اس پُرانی رسم پر بیسویں صدی کا پیوند لگایا گیا تھا۔ یعنی موٹر کار۔ اسی طرح پھولوں سے لدی ہوئی۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں سوار تھے اور چلانے والے کے سوا سب ہاتھ چلا رہے تھے۔ ایک گاڑی آئی جس میں بہت سے بچّے تھے۔ ان کا آنا چھوٹے بڑے سب کے لئے اشارہ تھا کہ "برس پڑو"۔ خصوصاً ہم عمروں سے ان کی خوب رہتی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور گاڑی آئی۔ جس میں ایک زندہ دل بوڑھا اپنی بڑھیا کو لئے جلوس گلی میں شامل ہو لیا تھا۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس ان کی طرف بھی پھول پھینک دیتا تھا۔ اور یہ بھی بہت کشادہ دلی سے پھول برساتے جاتے تھے۔ مگر عام دلچسپی اس گاڑی سے بہت کم تھی۔ اور چشمِ عبرت کو یہ سبق ملتا تھا۔ کہ ایسے کھیل ایک خاص وقت تک ہی موزون ہیں۔ اور جیتے جی ہی وہ زمانہ آجاتا ہے جب زندگی کی بہت سی خوشیوں کو خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ اسی طرح اور سواریاں تھیں۔ جن میں ہر شخص نے اپنی توفیق اور شوق کے مطابق سجاوٹ کی تھی اور یہ قطار کی قطار باغ کے گول چکر میں چلتی تھی اور وسطِ صحن میں باجا بجتا تھا۔ چھ بجے تک یہ چکر جاری رہا آخر کب تک چلتا۔ ہر انسانی خوشی محدود ہے۔ اور کیسی ہی پُرلطف کیوں نہ ہو آدمی خود اُس سے تھک جاتا ہے۔

اس دو گھنٹے کے عرصے میں کئی پھولوں کی جھولیاں بار بار خالی ہوئیں اور بار بار بھری گئیں۔ پھول والے ٹوکرے بھرے بیٹھے تھے۔ میلے کے ختم ہونے سے پہلے سب بیچ کر فارغ ہو گئے۔ گاڑیوں میں بھی کئی دفعہ پھولوں کے نئے ذخیرے کی مانگ ہوئی۔ مگر کتنا ہی بڑا خزانہ ہو جب دونو ہاتھ سے لٹایا جاوے۔ تو کہاں تک ساتھ دے گا۔

آخر پھول ختم ہو چلے۔ گھڑیال نے بھی آواز دی کہ جشن کے لئے وقت کے اٹل قانون نے جتنے منٹ اور جتنے ثانئے فیاضی سے عطا کئے تھے۔ سب ہو لئے۔ ہاتھ جو برابر مصروفِ ورزش رہے تھے۔ پکار اُٹھے کہ اب استراحت درکار ہے۔ گھوڑی چکر لگاتے لگاتے تھک گئے۔ اور فطرتِ انسانی کا مجموعہ جو انبوہِ تماشائیاں میں نمودار تھا۔ اپنی تغیر پسندی کا ثبوت دینے لگا۔ تماشائی ایک ایک دو دو کر کے کھسکنے لگے۔ اور آخر پھولوں والی گاڑیاں جس ترتیب سے آئی تھیں اُسی ترتیب سے قطار باندھے ایک بیرونی چکر سے گھوم کر باہر سڑک پر جا نکلیں۔ مکانوں کے بالاخانوں پر اس واپسی کے دیکھنے کے لئے ہجوم ہو گیا۔ کہیں کہیں سے پھول بھی برسے۔ مگر تھوڑی دور جا کر یہ قطار منتشر ہو گئی اور ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ لیا۔

مَیں اس میلے کو دیکھ کر آیا۔ تو ایک ہجومِ خیال ساتھ لایا۔ گل باری کی پہلی جھلک دیکھی تو خیال آیا کہ کیا اچھا ہو اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں اسی طرح پھول برسا کریں میلے کے ختم ہونے کی کیفیت دیکھی تو اس خیال کی اصلاح کی کہ پھول برسنے کا لطف ہی جاتا رہے۔ اگر روز یہ سامان میسّر ہو۔ میلے کی بے تکلفی نے اپنے ملک کی ہولی یاد دلائی۔ عجب نہیں کہ ہندوستان کے اس تیوہار کے بانیوں نے ایسی ہی بے ضرر دل لگی اور چہل پہل کے لئے ہولی کی رسم جاری کی ہو گی۔ اور مصفّا آبِ گلرنگ ایک دوسرے پر چھڑکنا ابتدائی دستور ہو گا۔ مگر حضرتِ انسان کہیں ایک بات برقرار پکڑتے ہیں۔ ایک ستم ایجاد ہیں۔ وہ وہ ایجادیں اس رنگ میں کیں کہ ہولی کو ہولا بنا دیا۔ مزاج تغیر پسند تو قدرتاً واقع ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہوا۔ کہ دنیا کے مغربی حصّے میں گذشتہ چند صدیاں اس تغیّر کی نذر ہوئیں جسے ترقّی کہتے ہیں اور ہم اُس تغیّر کی طرف مائل رہے جس کا نام ترقیٔ معکوس ہے۔ مَیں نے انگریزوں کو فرانسیسیوں کے گروہ میں دیکھا۔ تو خیال کیا کہ برابر کے جوڑ ہیں۔ جبھی تو اندنوں میل ملاپ ہو رہا ہے۔ صدیوں کی لڑائی اور مخالفت کے بعد ایک کے دل میں دوسرے کی وقعت پیدا ہو گئی ہے۔ اور دونوں نے محسوس کیا ہے کہ ناحق لڑنے

جھگڑنے سے بہتر ہے کہ دونو ہمسایہ قومیں صلح سے رہیں اور باہمی موافقت سے دونو دنیا میں اپنا رعب بڑھائیں اور ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے کی بجائے ایسے جلسوں میں جمع ہو کر ایک دوسرے پر گل باری کریں۔ اس بھیڑ بھاڑ میں اپنی طرف خیال گیا۔ اس مجمع اغیار میں ایک میں اور ایک میرا رفیق دو ہندوستانی تھے سوچا کہ ہم کیا ہیں اور کہاں ہیں ع شل گل بازی نہ ادھر کے نہ اُدھر کے۔ ہم پر کیا موقوف جاپان کو چھوڑ کر ساری ایشیائی قومیں اقوام یورپ کے ہاتھ میں گل بازی بنی ہوئی ہیں۔ وہ جو سلوک چاہیں کریں۔ ہاں اگر انہی گلوں میں قوت اجتماع پیدا ہو جائے۔ تو شاید اِدھر اُدھر پھینکے جانے سے محفوظ ہو جائیں فرانس اور انگلستان کی مصالحت آج سے دس برس پہلے کون باور کر سکتا تھا کہ ممکن ہو گی۔ اس کو دیکھ کر سعدیؒ کا قول یاد آیا۔ کہ "ختن و ختا صلح کردند۔ اما زیدو عمر را ہنوز خصومت باقی است۔" فرانس اور انگلستان جیسے صدیوں کے دشمن مل جائیں اور ہم ہندوستانی ہندو مسلمانوں کے ملاپ کو ترسا کریں۔

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

کان کنی کے شہید

جان کنی | ماہ مارچ ۱۹۰۶ء کی دسویں۔ کان کنی کی تاریخ میں۔ مدتوں یادگار قائم رہیگی۔ شمالی فرانس میں کوئلے کی کانیں ہیں۔ جن پر ہزارہا لوگوں کی معاش کا مدار ہے۔ ہفتے کے دن دسویں تاریخ کو مقام کوریر میں ان کانوں کے مزدور حسب معمول گھروں سے نکلے۔ ہنستے ہنستے بیوی بچوں سے جدا ہوئے کہ شام کو پھر ملیں گے مگر تقدیر ہنسی کہ تم میں سے سینکڑوں کے لئے یہ ملاقات آخری ملاقات ہے۔ تمہارا کام ویسے بھی محنت کی سخت ترین صورت ہے۔ لیکن آج تمہاری کان کنی سچ مچ

کی جان کنی ہوگی - کان کی تنگ و تاریک غار میں تمہاری قبر بنے گی - اور آگ اور دھواں اور نیم سوختہ کوئلے کی زہریلی ہوا اُس قبر کا عذاب ہوگا۔

آفتِ ناگہانی ان مزدوروں کی تعداد اٹھارہ سو تھی۔ اور زن و مرد بچے سب قسم کے مزدور تھے۔ انہیں کانوں میں اُترے دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ صبح کے ساڑھے چھ بجے کے قریب اچانک ایک پُرزور دھماکا ہوا۔ جیسے بارود سے بھری ہوئی کان زور سے پھٹ پڑے۔ اس مُہیب آواز سے جو لوگ باہر شہر میں تھے اُن کے دل ہل گئے۔ اندر والوں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ معلوم نہیں۔ دھماکا کیسے ہوا اور کان کیسے پھٹی۔ کوئی کچھ وجہ بتاتا ہے کوئی کچھ۔ یقینی ہے تو اسقدر کہ کان نمبر ۲۔ ۳ و ۴ دفعتہً آگ کا بھبوکا بن گئیں اور اس دوزخ کے شعلے اس قدر بلند ہوئے کہ کچھ عرصے تک بدقسمت مزدوروں تک کسی مدد کا پہنچنا ناممکن ہوگیا۔ جن آنکھوں نے اُنہیں اندر جاتے دیکھا تھا۔ اُن کی نگاہ میں دنیا اندھیر ہوگئی۔ ہر شعلے پر گمان ہوتا تھا کہ کسی جواں ہمت مرد یا خوبصورت عورت کی جان چاٹ کر نکل رہا ہے۔ اور اور اس طرح شمع محنت کے سینکڑوں پروانے اپنے معشوق پر جانیں فدا کر رہے ہیں

پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پُرپیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

رونے والے کان کنی کے ان شہیدوں میں ایک ایک موجودہ زمانے کا فرہاد ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرہاد کی کوہ کنی دنیا میں افسانہ بن گئی ہے۔ اور ایشیا کی نظم و نثر اس کے تذکرے سے پُر ہے۔ اور ان غریبوں کے گنج شہیداں پر شاید سب کے نام بھی صحیح طور پر معلوم کر کے لکھنے مشکل ہوں۔ مگر اس بیکسی پر بھی ان کے حال پر رونے والوں کی کمی نہیں رہی۔ یوں تو یہ مصیبت ایسی تھی کہ دور دور سے لوگوں نے اظہارِ غم کیا۔ مگر ہجوم ماتم اس قبرِ آتشیں کے باہر اُس شنبہ کے دن ہوا۔ وہ بھی اپنی مثال آپ ہی تھا۔ جُوں جُوں اس واقعۂ جانکاہ کی خبر شہر میں پھیلی عورتیں اور بچے جوق جوق گلیوں سے نکلنے شروع ہوئے۔ ہر ایک تصویرِ حیرانی

تھا۔ اور نشانِ غم ہر چہرے پر مسلط تھے۔ ۳ بجے بعد دوپہر کے قریب ایک انبوہ پچیس ہزار آدمیوں کا مرنے والوں کا ماتم کرنے کے لئے جمع ہوگیا۔ کوئی اِکّا دُکّا خوش قسمت جو اس طوفانِ بلا سے سالم بچ نکلا اور کوئی لاش جو کسی کی ہمت سے باہر آگئی سب اُس کی طرف دوڑتے تھے اور اُس گھڑی کی نفسا نفسی عرصۂ محشر کا نمونہ تھی۔

دو ثلث جل دیئے ۶ بجے کے قریب اتنا معلوم ہوگیا کہ دو ثلث کے قریب یعنی گیارہ بارہ سو آدمیوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہئے۔ جو بچ رہے اُن میں بھی کوئی دو سو آدمی کی طرف سے اطمینان ہے۔ کیونکہ ۱۲۵ اتّفاق سے آگ لگنے سے پیشتر باہر آچکے تھے اور چالیسؔ دو زینوں کے قریب تھے اور جھٹ نکل آئے۔ باقی آدمیوں کے نکالنے کے لئے بڑے بڑے انجنیروں نے کمرِ ہمت باندھی اور جوانوں کی ایک ایک جماعت لیکر کانوں کی طرف بڑھے۔ کان کے اندر ہوا پہنچانے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں اور کل کے زور سے ہوا پہنچانے کی پوری کوشش کی گئی۔ مگر اندر کی غلیظ ہوا اور دھوئیں کی کثافت ایسی نہ تھی کہ اتنی ہوا سے مغلوب ہو جاتی۔ بچانے والی جماعت کو بار بار پسپا ہونا پڑتا تھا کیونکہ ذرا سی دور جاکر دم گھٹنے لگتا تھا۔ آخر کچھ لاشیں اور کچھ نیم مردہ مزدور نکالے گئے جو سسکتے نکلا اُن کے جینے کی آس نہ تھی۔ کیونکہ جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ اور کپڑا تو کسی کے جسم پر باقی نہ تھا۔

ماتمی شہر شام تک سارا شہر ماتم میں تھا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جسے ذاتی صدمہ نہ پہنچا ہو کیونکہ یہ بستی کان کنوں کی تھی۔ ہر دروازہ پر سیاہ ماتمی کپڑا نمودار تھا۔ اہلِ شہر ماتم میں سیاہ پوش تھے۔ دوکانیں سیہ پوش تھیں۔ رہی سہی کمی آسمان نے پوری کر دی کالی گھٹا اگر شریکِ ماتم ہوئی۔ اور ۱۱-۱۲ مارچ ترشحِ ابر اور سردی کی بدولت اور بھی مصیبت کے دن بن گئے۔ بچانے کی کوشش کرنے والے برابر جان جوکھوں میں ڈال کر اس حالت میں بھی مصروفِ کار رہے۔ مگر کچھ بہت کامیابی نہ ہوئی۔ کوئی

ایک سو سے زیادہ لاشیں ہاتھ نہ لگیں۔ برف کو بھی شاید انہیں دنوں کا انتظار تھا۔ اُس نے بھی زمین پر اپنی سفید چادر پھیلا دی۔ گویا قدرت نے ان بیکسوں کے لئے کفن بھیجا۔

گورِ غریباں

۱۳۔ مارچ کو دفن کا سامان شروع ہوا۔ دو تین جگہ گڑھے کھودے گئے جن میں بہت سی لاشیں یکجا دفن ہوئیں۔ کیونکہ کئی لاشیں تو پہچانی ہی نہیں جا سکیں اور جو پہچانی بھی گئیں۔ ان کو علیحدہ علیحدہ کفن دفن ایسی حالت میں کون کرتا۔ ایک صاحبدل جوان دردناک موقعوں میں سے ایک پر موجود تھا چشم دید حالات یوں بیان کرتا ہے۔ "میری کورٹ والے چھپّر کے تلے بائیس۲۲ لاشیں اپنے اپنے صندوقوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ سرکار جمہوری کی طرف سے وزیر صیغۂ داخلیہ باچشم پُر نم کھڑا تھا۔ اور گرجے کی طرف سے ایک آرچ بشپ پریزیڈنٹ اور وزرائے دولت کی طرف سے پھول اس موقعے کے لئے آئے رکھے تھے۔ ماتمیوں کی تعداد کوئی پانچ ہزار ہوگی خستہ حال عورتیں صندوقوں کے گرد پھر رہی تھیں۔ زار زار روتی اور عالمِ یاس میں ہاتھوں کو ملتی تھیں۔ اتنے میں کان کن جنازوں کی طرف بڑھے۔ اُنہیں آہستگی سے اُٹھایا اور مدفن کی طرف لے چلے جو کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ جب یہ درد انگیز قطار جنازوں کی روانہ ہوئی تو برف پڑ رہی تھی۔ ۲۲ جنازے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ چھ کان کن ہر جنازے کو اُٹھائے ہوئے تھے۔ اور کان کنوں کے چھوٹے چھوٹے چراغ اُن کے سروں پر ٹوپیوں سے اٹکائے ہوئے دھرے تھے۔ پولیس اور فوج کا ایک معقول دستہ دورویہ کھڑا تھا۔ کیونکہ ہر لحظہ یہ ڈر تھا کہ کہیں پریشان حال کان کن نقضِ امن پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ پادری نے جنازہ کی دعا پڑھی۔ اس کے بعد سوشلسٹ جماعت کے ایک قائم مقام نے بھڑکانے والی تقریر کی جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا۔ "سرمایہ والوں کو سزا ملنی چاہئے۔ وہ ہمارے قاتل ہیں۔" جب صندوق گڑھے میں اُتارے گئے۔ اُس وقت عورتوں کی حالت دیکھی نہیں

جا سکتی تھی"! یہی کیفیت دوسرے قبرستانوں میں گذری جہاں باقی جنازے دفن ہوئے۔

مُلک کی ہمدردی مرنے والے مر گئے اور رونے والوں کے لئے عمر بھر کا رُونا چھوڑ گئے۔ مگر اس داستانِ غم کی خوفناک تاریکی میں اہلِ ملک کی سچّی اور بیپایاں ہمدردی اور مالی امداد ایک شعاعِ نور ہے۔ جس سے ملک کی بیدار زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ زندہ قوموں کے یہ اطوار ہوتے ہیں۔ کوریر کا سوگ خوشباش دارالخلافہ تک محسوس ہوا۔ شہر پاریس کا چہل پہل مبدّل بہ غم ہوا۔ جمہوری حکومت کے ارکین فوراً جمع ہوئے اور اُنہوں نے ضابطہ وغیرہ کو بالائے طاق رکھ کر بیس ہزار پونڈ یعنے تین لاکھ روپیہ فوری امداد کے لئے بے تامل منظور کیا۔ جگہ جگہ طور پر جا بجا چندے کی فہرستیں کھل گئیں۔ بنک فرانس نے تیس ہزار روپیہ چندہ اپنا لکھ کر اپنے ہاں فہرست کھولی۔ راشچائیلڈ والوں نے ساٹھ ہزار روپیہ نقد فوراً روانہ کر دیا۔ کہ زیادہ حاجتمند قبائل کو اسیوقت تھوڑا اسہارا مل جائے سب بڑے بڑے اخباروں نے اپنے اپنے دفتر میں چندہ جاری کر دیا۔ ۱۴ مارچ تک اس عام چندہ کی تعداد چار لاکھ روپیہ سے اوپر پہنچ چکی تھی اور ابھی زور سے جاری تھا۔ جمہور کے پریزیڈنٹ کے نام ہر ملک سے ہمدردی کے تار پہنچے اور نہ صرف زبانی ہمدردی کے بلکہ انگلستان وغیرہ ہمسایہ ملکوں میں بھی چندہ شروع ہوگیا۔ مگر سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر ہمدردی فرانس کے ہمسایہ جرمنی کی طرف سے ہوئی۔ جہاں سے ایک جماعت انجنیروں اور کان کنوں کی امداد کے لئے پہنچی جس نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر بہت سی لاشیں اور نکال دیں۔ مصیبت کا وقت بھی عجب وقت ہے۔ اُس وقت ہر شائستہ قوم اور ہر مہذب شخص کا فرض ہے کہ دشمنی اور مخالفت کو نظر انداز کر کے انسانیت کا حق ادا کرے۔ اور جرمن جو فرانسیسیوں کے بڑے دشمن سمجھے جاتے ہیں اور جو اس وقت بھی مراقش میں اُن سے جھگڑ رہے ہیں۔ اس موقع پر پورے انسان ثابت ہوئے اور اُن کی اس عملی

ہمدردی کی ہر طرف سے داد مل رہی ہے۔

خوشحالوں کی غفلت خوشحال لوگ جو جاڑے میں اپنی انگیٹھی کے گرد بیٹھے کوئلے کی آگ تاپتے ہیں اور کہتے ہیں "کیسی طرب انگیز آگ ہے" کیا جانیں کہ کوئلا کس محنت سے زمین سے کھود کر نکالا گیا ہے۔ اور کتنے غریب محنتی لوگوں نے اپنا لہو پانی کیا ہے۔ اس لئے کہ ان تن آسانوں کو آرام ملے۔ امرا جو ریل کے درجۂ اول کے گدیلوں پر آسائش سے لیٹے ہوئے سفر کرتے ہیں۔ کب سوچتے ہیں کہ ریل جو انہیں ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑائے لئے جاتی ہے۔ کوئلے کے بل پر چل رہی ہے اور اگر انجن کے دوزخ کو کوئلے کا ایندھن نہ ملے۔ تو وہیں کھڑی ہو جائے۔ انہیں کیا خبر وہ مفلس جو محض نانِ شبینہ کے لئے جان پر کھیل کر ان کی اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ کس حال میں ہیں۔ کل کا بنا ہوا خوشنما کپڑا پہنتے وقت کون سوچتا ہے کہ کوئلے کے بغیر دخانی کلیں کیسے چلتیں اور ہم کوئلے کے میسر آنے کے لئے کس کے مرہونِ منت ہیں۔ اسی لئے تو اپنی مصیبت سے گھبرا کر بیچارے مظلوم کان کن سرمایہ داروں کے خلاف خیالات ظاہر کرنے لگے۔ اگر سرمایہ داروں کو ان غریبوں کی جانفشانی کی قدر ہو تو وہ ان کے ساتھ اب سے زیادہ مہربانی کا سلوک کریں۔ مزدوری اب سے بہتر دیں۔ ان کی حفاظت کی کوشش زیادہ کریں۔ اور جو جو احتیاطیں ایسے حوادث کے روکنے کے لئے ممکن ہوں۔ سب عمل میں لائیں۔ چاہے ان کے عمل میں لانے کے لئے صرفِ کثیر درکار ہو۔ کیونکہ لاکھوں روپے کا منافع جو سرمایہ دار لیتے ہیں۔ اس میں بہت کچھ ان محنتی جاں نثار مزدوروں کا حق ہے اور لازم ہے کہ حقدار کو حق پہنچاتے رہیں۔ ہندوستان میں بھی اب کوئلے کی کان کنی شروع ہو فرانس کے کان کنوں کی اس مصیبت عظمیٰ سے سب جگہ کانوں کے مالک سبق لے رہے ہیں۔ ہندوستان کے مالکانِ معادن کو بھی غافل نہ رہنا چاہئے۔ چراغ جو کان کے اندر جائیں سب ڈھنپے ہوئے ہونے چاہئیں۔ نکلنے کے رستے اور

ہوا کے ذریعے اب سے زیادہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انگریزی پارلیمنٹ کی نئی لیبر پارٹی یعنی مزدوری پیشہ جماعت کے قائم مقام فریق کے لیڈر مسٹر کے ہارڈی نے اس موقع پر اپنے پیام ہمدردی میں کیا خوب لکھا ہے:۔

"میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ کان کے ایسے حادثے کی کیا مصائب ہوتی ہیں۔ اس لئے میرا دل بے اختیار آپ کے غم میں شریک ہوتا ہے۔ ہم سب مزدوری پیشہ انگریز آپ سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ خدا وہ دن جلد لائے جب سائنس کی ترقی اور معادن کی ہمدردانہ انسانیت دونوں مل کر ایسے حوادث کا خاتمہ کردے (کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ مناسب روک تھام سے یہ رُک سکتے ہیں) اور ایسے افسوسناک واقعات قصّے کے طور پر ایک وحشیانہ زمانے کی یادگار سمجھے جانے لگیں"۔

قدرت سے لڑائی گو یہ واقعہ اس قسم کا ہے کہ اسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پس جن کو اس سے صدمہ پہنچا ہے اُن کا کیا حال۔ تاہم انسان کی مجبوریاں ایسی ہیں۔ کہ تلاشِ رزق اُس سے بُری طرح کنوئیں جھکواتی ہے۔ اس لئے اِدھر تو بیچارے کان کن جو اس وقت جوش میں کام چھوڑ بیٹھنے پر آمادہ ہیں۔ آخر کہنے سُنے سے۔ یا زیادہ اُجرت کے لالچ سے پھر ان تاریک گڑھوں میں اُتریں گے اُدھر دولتمند سرمایہ دار قدرت کے ساتھ جنگ جاری رکھنے پر تلے بیٹھے ہیں اور یہ ناکامی اُن کو اسی بات پر آمادہ کریگی۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ قدرت کے خزانوں پر ہاتھ صاف کرتے رہیں حقیقت یہ ہے کہ حرص انسان کی فطرت میں ہے اور اس کا نچلا بیٹھنا ممکن نہیں۔ شروع سے اس کی رفتار شوقِ ارتقا کی شہادت دے رہی ہے۔ پہلے یہ قدرت کا دستِ نگر تھا۔ درختوں کے پھل اس کی خوراک تھی درختوں کے پتّے اس کا لباس۔ قدرتی غاریں اس کا مسکن تھیں اور گوشۂ دشت اس کا مدفن۔ قناعت کا خوگر تھا۔ جو مانگتا تھا۔ قدرت اُسے ہنسکر دیتی تھی۔ گرمی سے گھبراتا تھا تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی تسلّی کے لئے بھیجے جاتے تھے اور

سردی سے ٹھٹھرنے لگتا تھا تو دھوپ اُسے گرمی پہنچاتی تھی۔ ذرا ہوش سنبھالا تو ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ زمین سے کہا کہ "بیکار پڑی رہتی ہو۔ ہمارے کام آؤ۔ ہم بیج بوئیں تم اس کی حفاظت کرو"۔ قدرت نے دیکھا کہ لڑکا ہونہار ہے اُس کا حوصلہ بڑہانے کے لئے مینہ کو حکم دیا۔ کہ اس کے کھیتوں کو پانی دے۔ سورج کی خدمت مقرر کی کہ انہیں پکائے۔ انسان نے ہنسی خوشی فصل سمیٹا تو اپنی کاریگری پر نازاں ہونے لگا۔ کچھ دن بعد اور پر پُرزے نکالے۔ کسی بہتی ندی کی آزادی میں خلل ڈالا۔ اس کا راستہ کاٹ کر اُس کا رُخ بدل دیا۔ لگی بیچاری کھیت کی آبیاری کرنے۔ لڑکا اور پھولا۔ کہ اب تو قدرت وقفِ خدمت ہو چلی۔ خیال آیا کہ نہر کا پانی زور سے بہہ رہا ہے۔ اس زور سے کچھ کام کیوں نہ لیا جائے۔ ایک پن چکی لگا دی۔ پانی لگا چکی پیسنے۔ بھلا اب اس ناز پروردہ لڑکے کا دماغ کیوں ٹھکانے رہتا۔ اپنے آپ کو قدرت کا حکمران سمجھنے لگا۔ اور نت نئی تجویز قدرت کی قوتوں کو زیر کرنے کی نکالنے لگا۔ قدرت بھی بُردباری سے سب گستاخیاں دیکھتی گئی۔ اور درگذر کرتی گئی۔ یہانتک کہ حضرتِ انسان نے قدرت کی سب سے پیاری پری برق کو شیشے میں اُتار لیا۔ پیام بری کا کام تو اُس سے لیتا ہی تھا۔ اب بے درد یہانتک گھمنڈ میں آیا ہے کہ اُس کے دستِ نازک سے گاڑیاں کھنچواتا ہے۔ اور قدرت کو کھُلم کھُلا پیامِ جنگ دیدیا ہے۔ مگر آفرین ہے قدرت کے حلم و وقار پر۔ کہ اب بھی انسان کی گستاخیاں دیکھتی اور چشم پوشی کرتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی جب اس کا ہاتھ بہت بڑہ بڑہ کر چلنے لگتا ہے تو تادیب کے طور پر چشم نمائی کر دیتی ہے۔ اور کوئی آفت ایسی بھیجتی ہے۔ جس کے آگے انسان کو عجز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ انسان قدرت کے دفینے کھودتا اور اُن سے مالامال ہوتا ہے۔ اور قدرت چُپ رہتی ہے۔ مگر آخر پردہ دری کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور اُس حد سے گذرو تو قدرت اپنی قوت دکھاتی ہے۔ اور سینکڑوں اور ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں۔ مگر ہے انسان دُھن کا پکّا۔ ہمت نہیں ہارتا۔ برابر بڑھے جاتا

کہ "بڑھے چلو"۔ چنانچہ فرانس میں اس شکست فاش کے بعد جو وہاں کوئلے کی کانوں میں قدرت کے ہاتھوں انسان کو ملی ہے۔ آخر یہی فیصلہ ہوا ہے۔ کہ جنگ ٹھنی رہے۔ مجروحین و مقتولین کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا جائے۔ بیواؤں اور یتیموں کو مدد دی جائے۔ اور سپاہی اس تہ زمینی جنگ کے لئے تیار ہوں۔ اس فیصلے کو چاہے دلیر کہو چاہے گستاخ۔ مگر بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے خالی از فائدہ نہیں۔ اور اس لئے اس عزم اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ بوجھ اپنی طاقت سے بڑھ کر اُٹھانا تو حضرتِ آدم کا پُرانا شیوہ ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ باوجود اپنی ضعیفی کے اہم ذمہ داریوں کو مردانہ نباہنا بھی حضرت ہی کا کام ہے۔

شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں
جو نکمے ہیں اُن کا کام نہیں

گھر سے نِکل کے دیکھو

"سفر وسیلۂ ظفر ہے"۔ یہ مقولہ اگلے زمانے میں بھی سچ تھا۔ اور آج بھی سچ ہے بلکہ پہلے کم تھا۔ اب زیادہ۔ پہلے افراد پر عائد ہوتا تھا۔ اب اقوام پر حاوی ہے۔ کسی ترقی کرتی ہوئی قوم کا نام لو۔ جو اس کے فوائد سے بے خبر ہو۔ دنیا کی موجودہ تجارت کا فروغ اسی اصول پر مبنی ہے۔ جرمنی آجکل صنعت و حرفت کی ترقی میں اوّل درجے پر شمار کیا جاتا ہے۔ کیا اُس صنعت و حرفت کا مدار محض اہلِ جرمنی کی قدردانی پر ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اہلِ مُلک بھی اپنے مال سے بڑھ کر کسی کے مال کو نہیں سمجھتے۔ دوسرے ملکوں کی بنی ہوئی چیزیں اگر جرمنی میں راہ پانے کی کوششیں کریں تو وہاں کی حکومت ان اشیاء پر بھاری محصول لگاتی ہے تاکہ ملکی اشیاء کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ مگر یہ وہاں کی صنعتی ترقی کا ایک جزو ہے اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ جزوِ قلیل۔ جزوِ اعظم بیرونی تجارت پر منحصر ہے۔ دنیا کا کونسا

گوشہ ہے جہاں جرمن ساخت کا مال نہیں پہنچتا۔ چین میں اس کی کھپت ہے۔ روم میں اس کی قدر ہے۔ افریقہ کی منڈیاں وہ گھیرے ہوئے ہے اور ہندوستان کے بازاروں میں وہ انگریزی ساخت کی چیزوں سے بڑھ کر بکتا ہے۔ یہاں تک کہ خود انگلستان باوصف بڑا تجارتی ملک ہونے کے جرمن ساخت کی اشیا کی دستبرد سے بچ نہیں سکتا۔ اور لندن کے بازاروں میں لاکھوں کا مال جرمنی سے آیا ہوا بکتا ہے۔ امریکہ بھی اس ترقی میں کسی سے کم نہیں اور انگلستان بھی اوّل درجے کے تجارتی ممالک میں ہے۔ اس کے سوا یورپ کے قریب قریب سب مُلک اس تجارتی لوٹ میں جو دنیا میں مچ رہی ہے کم و بیش حصّہ دار ہیں۔ مشرقی اقوام میں سے جاپان نے حال ہی میں اس گُر کو سیکھا ہے۔ اور جاپانی چیزیں بھی جا بجا پھیلتی جاتی ہیں۔ اب ہندوستان کی باری ہے۔ ہاتھ کے کام میں اب بھی ہمارا وطن کسی سے کم نہیں۔ اور ابھی کل کی بات ہے کہ یورپ کی دکانوں میں ہندوستان کی دستکاری مہنگے داموں بکتی تھی۔ اب مشین کا زمانہ آگیا ہے اور صنعتی اور تجارتی لڑائی میں اس قوم کا جو کل کا مقابلہ ہاتھ سے کرنا چاہے وہی حال ہوگا جو میدان جنگ میں توپ کا مقابلہ تیر و تفنگ اور بندوق کا سامنا تیغ و سنان کے ساتھ کرنے سے ہوتا ہے۔ وقت آپہنچا ہے کہ ہند جاگے اور اسکے ساتھ اہل ہند کی قسمت۔ اور ہندوستان والے دُنیا کی معزز صنعتی اور تجارتی اقوام کی مجلس میں برابر کی کرسی لیں۔ اس کا آغاز تو پہلے گھر کی خبر لینے سے ہی ہوگا کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے کارخانوں سے خریدیں۔ مگر اس کا معراج یہ ہے کہ ہندوستان کا مال زمانہ سابق کی طرح اطراف دنیا میں پھیلنے لگے۔ بیشک یہ منزل دور ہے۔ اور دشواریاں بھی رکھتی ہے۔ لیکن اس کا پیش نظر رہنا بہرحال ضرور ہے۔ مسافر کی رفتار پر اس علم کا اثر ہوتا ہے۔ اور کوشش کا معیار جتنا بلند رہے مفید ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی کی تدبیریں کیا ہیں۔ تدبیریں تو مختلف ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ ضروری۔ مگر ہندیوں کا بکثرت دنیا کے دوسرے ملکوں میں

پھیل جاتا۔ ان میں سے ایک تدبیر ہے جس کی اہمیت میرے دل پر روز بروز نقش ہوتی جاتی ہے۔ صنعتی تعلیم کے لئے سفر درکار ہے۔ تجارتی تعلقات بڑھانے کے لئے سفر درکار ہے۔ محنت مزدوری کے ذریعے ڈھونڈھنے کے لئے سفر درکار ہو مگر ان کے علاوہ بعض اور فوائد دوسرے ممالک میں چندے قیام پذیر رہنے سے وابستہ ہیں جن کا احساس وطن میں کم ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر وطن کے باہر ہی ہو بھی سکتا ہے۔ دوسری قوموں کے اوضاع واطوار دیکھنے سے خیالات میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جو نہایت قابل قدر ہے۔ اور جب کسی ملک میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو جو مدتوں باہر رہے ہیں اور جنہوں نے اپنے ہاں کی ہوا کے سوا اور مقامات کی بھی ہوا کھائی ہے۔ تو نامعلوم طور پر ایک قسم کا تغیر ملک کے حالات اور خیالات میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ جیسے میدہ پر خمیر کا اثر ہوتا ہے اور بہت سی ترقیاں اور بہت سی اصلاحیں جو پہلے ناممکن نظر آتی تھیں ممکن معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور کئی تعصبات جو پہلے سدّ راہ ہوتے تھے۔ راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ ہاں اس نتیجے کے مترتب ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ جو لوگ سفر سے مستفید ہوں۔ وہ اس کے فوائد کے اخذ کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ اور ان میں سے بیشتر ایسا سفر کریں جس کے اخراجات وہ سفر ہی سے نکالیں۔ نہ یہ کہ سب کے سب ملک کا روپیہ باہر صرف کر آئیں۔ ابتک جو کچھ لوگ سفر یورپ کو نکلے ہیں وہ عموماً یا تو طالب علمی کے لئے نکلے ہیں یا محض سیاحت کے لئے۔ اور ان لوگوں کی تعداد جو تجارت کی غرض سے یورپ آئے ہیں ابھی بہت کم ہے۔ تاہم اس سلسلے کا آغاز ہی دل خوش کن ہے۔ اور ایسے اصحاب کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن میری مراد سفر سے سفر یورپ ہی نہیں۔ بلاشبہ اس وقت یورپ رونق کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور صاحبانِ توفیق کے لئے اس کا دیکھنا خالی از لطف وفائدہ نہیں۔ مگر میرا مدّعا سفر سے عام سفر ہے۔ چین کا ہو یا جاپان کا۔ رُوم کا ہو یا ایران کا۔ تہذیب کے دعویدار یورپ کا ہو یا تہذیب کے شکار افریقہ کا۔ سب سے

سبق مل سکتا ہے۔ سب سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی محنت اور لیاقت کے جوہر لے کے نکلے اور ہمت کی رفاقت نہ چھوڑے۔ کلکتہ اور بمبئی اور ہندوستان کے بعض اور بڑے شہروں میں ایک معقول تعداد چینیوں کی ملتی ہے۔ جو مختلف صنعتی اور تجارتی طریقوں سے روپیہ کما رہے ہیں۔ اور بوٹ بنانے میں خصوصیت سے اُستاد ہیں۔ کیا ان کے مقابل میں چین کے کسی مقام میں ایسی یا اس کے قریب تعداد ہندی دستکاروں کی موجود ہے؟ نہیں۔ انگریز تاجروں کو لو۔ اور ان کے کارخانوں کو دیکھو۔ جو روپیہ گورنمنٹ کے خزانے میں ہمارے ہاں سے جاتا ہے اُس کی بابت تو فریادیں ہوتی ہیں۔ کہ ہم لُوٹے جا رہے ہیں۔ کیا یہ بھی گورنمنٹ کا قصور ہے کہ سب بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں۔ بہت بڑے کارخانے۔ قریباً سب بستیاں جو چا، نیل۔ یا قہوہ کی پیداوار کے لئے قائم ہیں۔ انگریز تاجروں کے ہاتھ میں ہیں؟ کیا اگر خود اہل ملک مشترکہ سرمایہ کی بڑی کمپنیاں رکھتے ہوں اور ان کاموں میں حصہ لیں اور انگریز تاجروں کے نفع میں خود بھی شریک ہوں تو کوئی اُنہیں روکتا ہے؟ چاہیئے تو یہ کہ ہر انگریز کے جواب میں جو ہندوستان میں تجارت کر کے روپیہ کماتا ہے۔ ایک ہندی تاجر انگلستان میں روپیہ کما رہا ہو۔ ہر فرانسیسی تاجر کے جواب میں ہندی کی کوٹھی فرانس میں ہو۔ ایران تجارتی اقوام کے لئے زرخیز منڈی ہے۔ جب دور دور سے قومیں آ کر وہاں سے روپیہ کما سکتی ہیں تو ہندوستان والے جو پاس رہتے ہیں کیوں مستفید نہ ہوں۔ خلیج فارس کے سواحل پر چند جگہ ہندوستانیوں کی دُکانیں ہیں۔ کیوں اس سے زیادہ نہ ہوں۔ ملک کے اندر کے شہروں میں کیوں ہندی تاجر گھس نہ جائیں؟ رُوم ہم سے بہت دور بھی نہیں اور ہمارے ابنائے وطن میں خصوصاً مسلمانوں کا تعلق بھی اُس سے گاڑھا ہے۔ روم میں ہر قوم کے تاجر ہیں۔ نہیں موجود تو ہندی ہی نہیں۔ افریقہ کے بعض حصوں میں ہندوستانی جانے لگے تھے اور کام بھی اُن کا خاصہ بن چلا تھا۔ مثلاً جنوبی افریقہ میں۔ اور وہاں آب و ہوا

بھی اچھی تھی۔ مگر وہاں فرنگی اقوام کو ان چند آدمیوں کی کامیابی بھی کانٹے کی طرح کھٹکی اور انہوں نے اُن کے راستے میں بیحد دقتیں ڈال دیں اور اُن کا جانا قریب قریب بند کر دیا۔ اچھا یہ دروازہ بند ہے تو بند ہی سہی۔ اور کئی دروازے ابھی افریقہ میں کھلے ہیں۔ وہاں گھس جاؤ۔ اور جو دروازہ بند ہو اس کو بھی کھٹکھٹاتے رہو کبھی تو کھلیگا ہی۔ امریکہ جنوبی کے بعض حصّوں میں کچھ ہندی اچھی حالت میں ہیں وہاں ان کے خلاف تعصب بھی کم ہے۔ وہاں کچھ اور بھی کھپ سکتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اس وقت جمیع اقوام عالم کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی ہے۔ جرمن سے روس سے۔ فرانس سے۔ انگلستان سے لوگ وہاں جاتے ہیں اور وہیں کے باشندے قرار پا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں اگر بہت سے ہندوستانی وہاں جا کر بسنا چاہیں تو وہ کیا رویہ اختیار کریں۔ لیکن تا حال اُن کا سلوک ہندوستانی سیاحوں واعظوں اور طلبہ سے بہت عمدہ ہے۔ آزادی کی سرزمین ہے۔ زرخیزی میں دنیا کے کسی حصے سے کم نہیں۔ محنت مزدوری کے لئے اچھی ہے۔ بشرطیکہ کوئی ہنر کسی کے پاس ہو۔ وہاں قسمت آزمائی کرنے والے نکلنے چاہئیں۔ کینیڈا تو سلطنت برطانیہ کا ہی حصہ ہے اور اس میں ہزاروں ایکڑ قابلِ زراعت زمین کے کاشتکار کے ہاتھ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں کی گورنمنٹ آئے دن انگلستان اور دیگر ممالک یورپ میں ایجنٹ بھیجتی ہے۔ کہ لوگوں کو ترغیب دیکر لاؤ۔ زمین مفت ملیگی وہ آ کر قابض ہو جائیں اور آباد کریں۔ آئے دن سینکڑوں جاتے ہیں۔ مگر اُدھر سے ہل من مزید کی آواز ابھی جاری ہے۔ کچھ کم ہمت ور پڑھے لکھے ہندوستانی اگر جائیں تو عجب نہیں کہ اُنہیں وُہی رعایات مل جائیں جو اور آبادکاروں کو مل رہی ہیں۔ اور اگر یہ تجربہ کامیاب ثابت ہو تو پھر اور زیادہ لوگ جانے لگیں۔ غرض اُمنگ اور جستجو شرط ہے۔ پھر اس میں کچھ کلام نہیں۔ کہ "پائے گدا لنگ نیست۔ مُلکِ خدا تنگ نیست"۔

اس تحریک پر اعتراض دو ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خود ہمارا ملک بہت وسیع ہے۔

اُس میں ابھی بہت سی زمین قابلِ زراعت موجود ہے۔ اور بہت سے پیشے قابلِ تحصیل۔ سرمایہ جو باہر نکلنے کے لئے چاہئے۔ اُس کی بھی ملک میں بیحد ضرورت ہے۔ پھر باہر جانا کیا معنے۔ دوسرا یہ کہ آگے ہی ملک میں کام کرنے والے کم ملتے ہیں۔ اور اگر اس طرح باہمت آدمیوں کا ایک معتدبہ حصّہ مُلک سے باہر چلا چلا جائے تو ملک اور بھی غریب ہو جائے۔ اعتراض دونوں بجا اور جاندار ہیں۔ جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے اندر جو ترقی ممکن ہے وہ بھی کیجے اور ضرور کیجے۔ لیکن اگر قوموں میں نام پیدا کرنا ہے تو قوموں سے بھی رشتہ پیدا کرنے کی بنیاد ابھی سے ڈالدو۔ ہندوستان میں تمہاری سب کوششیں اُن حدود سے گھری ہوئی ہیں جو محکومی کے لوازم ہیں۔ باہر نکلکر نئے ملک میں جو لوگ آزادی کی آب و ہوا میں زندگی بسر کریں گے۔ اور اپنی قوتوں کا دوسری قوموں کی قوتوں سے موازنہ کریں گے۔ اُنہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہندی کسی سے کم رہیں۔ اُن کی رائے دوسروں کی رائے پر اثر ڈالیگی۔ اُن کی مثال دوسروں کو اُبھارے گی۔ اُن کی حیثیت کا عکس دوسروں کی حیثیت پر پڑیگا۔ اگر وہ باہر اپنی قابلیت کا سکّہ جما دیں گے اور اپنے چلن کی خوبی کا اعتراف کرالیں گے تو ملک میں جو اُن کے بھائی ہوں گے اُنہیں بھی اس نیکنامی کا حصہ ملیگا۔ اس نظر سے یہ تدبیر امتحان کے قابل ہے اور یہ ایثار کر گذرنے کے لائق۔ رہا دوسرا اعتراض کہ کام کے آدمیوں سے ملک کو خالی نہ کرنا چاہئے۔ اس کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص جو باہر نکلنے کا تہیہ ملک کی خاطر کرے وہ اس ارادے کے ساتھ ہی یہ عہد کر کے جائے کہ کامیابی کے بعد وہ ممالکِ غیر کو وطن ہی نہ بنا لیگا اور اپنی عمر کا آخری حصہ اور اپنی محنت کی کمائی ملک کی بھلائی میں صرف کریگا۔ اور جو کسی اتفاق سے اپنے نئے وطن کا پابند ہو جائے۔ وہ اپنے وطنِ مادری سے کبھی رشتہ نہ توڑے اور دُور بیٹھکر بھی ہند کے لئے باعثِ تقویت رہے اور حتی المقدور ملک کی بہتری کے لئے کوشش کرتا رہے۔ جو کام فرزندانِ انگلستان دنیا کے دور دراز حصّوں

میں جا لینے پر بھی انگلستان کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ وُہی کام ہر ہندی ہندوستان کے لئے کرتا رہے۔ اس شرط کو خیالی اور موہوم نہ سمجھنا چاہیئے۔ جب قومیں بننے لگتی ہیں اور اُن کے دن بھلے آتے ہیں تو اُن کے عزم وارادے میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اُن کے افراد گھر سے جو ارادہ کر کے نکلتے ہیں۔ اُس سے کبھی نہیں ٹلتے۔ پس اگر حبّ وطن کا ہندیوں پر یہ اثر ہو کہ وہ اپنا گھر گھسنا پن چھوڑ کر۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے۔ نئے مقامات میں رزق ڈھونڈھنے کی مشکلات کا سامنا کرنے اور زیادہ کامیاب اقوام کے ہاتھوں طرح طرح کی ذلّتیں سہنے نکلیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ وہ وطن سے نکلکر وطن کو یاد رکھیں اور اپنی فتح اور کامیابی کی گھڑیوں میں بھی اس کے حق سے غافل نہ ہوں۔ اگر ڈھب کے آدمی نکلنے لگیں تو تجارت۔ زراعت۔ صنعت۔ اشاعتِ مذہب کئی اسباب تحریک کے لئے موجود ہیں۔ موجودہ حالت کے مصداق مجھے دو چار مصرعے سوجھے ہیں لکھے دیتا ہوں۔ شاعر ہوتا تو اس لمبی تحریر کے بجائے ایک مختصر اور پُر زور نظم لکھ دیتا جسے لوگ گاتے پھرتے۔ اب ان مصرعوں پر اکتفا کرتا ہوں اور اپنے سخنور احباب سے عرض کرتا ہوں ع اگر "شاعری" یک اشارت بس است۔

بخت آزمانے نکلو - جنگل بسانے نکلو
کڑیاں اُٹھانے نکلو - جانیں لڑانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو۔ ہندوستان والو!
دولت کمانے نکلو - حکمت اُڑانے نکلو
مذہب سکھانے نکلو - ہر ہر بہانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو۔ ہندوستان والو!

غرض نکلو تو سہی۔ مگر ایک شرط ملحوظ رہے۔ ایسی طرح گھر سے نکلو کہ نہ گھر کے رہو نہ گھاٹ کے۔ بلکہ سامان کے ساتھ۔ جس سے اپنی عزت بڑھے اور ملک کی شان ایسا نہ ہو کہ جو بالکل بے زر ہیں۔ وہ بغیر مآل کار سوچے وطن کو چھوڑ دیں۔ تجارت

والے سرمایہ کا بندوبست کر کے نکلیں۔ تعلیم کے شائق پہلے گھر سے خوب پڑھکر نکلیں۔ زراعت کے لئے جائیں تو خود اُس فن سے واقف ہوں اور واقفکار آدمیوں کو ساتھ لے جائیں۔ صنعت والے اس قابل ہوں کہ چار باتیں کسی سے سیکھیں تو چار اُس کو سکھا بھی سکیں۔ جس ملک میں جائیں اُس کی زبان پہلے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اُس کے اوضاع و اطوار سے واقفیت بہم پہنچالیں۔ وہاں دن بسر کریں تو اس طرح کہ معلوم ہو کہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ابنائے وطن کی عزّت کا ہر وقت پاس ہے۔ اگر بڑھیں اور ان احتیاطوں کے ساتھ بڑھیں تو کوئی دن میں وہ کامیابیاں جواب اَوروں کے حصّے میں ہیں ہمارے احاطۂ دسترس میں ہوں۔ اور یہ جو ناکامیوں کی شکایت اب ہے۔ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ لندن میں ہزارہا یہودی روس سے آتے ہیں اور دنوں میں کاروباری بن جاتے ہیں۔ چند سال کے بعد انگریزوں کے سے حقوق حاصل کرتے ہیں اور اُن کی اولاد ہر اعتبار سے انگریز کا حکم رکھتی ہے۔ فرانسیسی جرمنی ارمنی۔ یونانی۔ اطالیہ کے باشندے۔ ہسپانیہ کے باشندے۔ آسٹریا کے رہنے والے۔ روس کے ساکن غرض ہر ملک کے قائم مقام انگلستان کے بڑے شہروں میں روزی کما رہے ہیں۔ اور محروم ہیں تو ہم جن کا اتنا حق انگلستان پر ہے اور جن سے انگلستان کو بیشمار نفع پہنچتا رہتا ہے۔ یہی حال کم و بیش سلطنت برطانیہ کے دیگر حصص اور امریکہ وغیرہ میں ہے۔ اور جُوں جُوں اس کیفیت کو ہم بچشم خود دیکھتے ہیں۔ دل کُڑھتا ہے اور یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے ہموطن بھی نکل پڑیں اور اس خوانِ نعما میں شریک ہوں ؎

سخن درست بگویم نمے توانم دید
کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

شیکسپیئر کا وطن

سٹریٹ فورڈ کنارِ ایوان

انگلستان کی سرزمین کا چپہ چپہ ویسے تو تاریخی یادگاروں سے مالامال ہے۔ مگر علم دوست سیّاحوں کے لئے شاید کوئی قطعہ زمین انگلستان بھر میں وہ دلچسپی نہیں رکھتا جو اُس پُرانے قصبے میں موجود ہے جسے شیکسپیئر۔ لازوال شیکسپیئر کے مولد اور مدفن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ انگلستان کی چھوٹی چھوٹی ندیوں میں ننھی سی مگر پیاری ندی ہمیشہ اس امتیاز پر ناز کریگی۔ کہ ایک ایسے جادو نگار شاعر نے اس کے کنارے جنم لیا۔ جس کی خوبیٔ تحریر نے ایک عالم کو گرویدہ کرلیا۔ خود مشہور ہوا تو اپنے قصبے کے حقوق کو نہ بھولا۔ اُسے مشہور کر گیا۔ اور جس ندی کے پانی سے وہ شاداب ہے۔ اُس کے احسان کا بھی حق ادا کر گیا۔ اب دنیا اُسے ناظمِ ایوان کے نام سے یاد کرتی ہے۔

دریا اُسی دھیمی رفتار سے بہہ رہا ہے جس سے ۲۶ ۔ اپریل ۱۵۶۴ء کو بہ رہا تھا۔ جب جان شیکسپیئر کے ہاں ولیم شیکسپیئر کے پیدا ہونے کی خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ اس کی چال میں آج بھی وہی معشوقانہ انداز نکلتا ہے جو اُس دن تھا۔ شہر کے رہنے والے آج بھی دریا پر جاکر اُسی شوق سے اپنی کشتیاں کھیتے ہیں۔ جیسے ولیم کے بچپن میں کھیتے تھے۔ کئی پرانی وضع کے گھر اب تک کھڑے زائر کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اُس کے گردوپیش کی دنیا سولہویں صدی کی دنیا ہے۔ مگر حقیقت اُسے یاد دلاتی ہے کہ تین سے زیادہ صدیاں گذر چکی ہیں۔ زمانہ سینکڑوں کروٹیں بدل چکا ہے۔ ولیم شیکسپیئر طفل سے جوان۔ جوان سے پیر ہوکر مرچکا ہے۔ مرنے سے پہلے اپنے ہم عصروں میں عزت و امتیاز پیدا کر کے مرنے کے

بعد کچھ دنوں کُنجِ گمنامی میں رہ چکا ہے۔ مگر جن کے لئے روزِ ازل سے شُہرت اور قبولیت ودیعت ہو چکی ہو۔ اُنہیں گمنامی میں کون ڈال سکتا ہے۔ آخر وہ شہرتِ بقائے دوام اُسے نصیب ہوئی۔ جس کا نظیر ملنا مشکل ہے۔

جب تک ملک اپنے سرمایۂ ناز سے غافل رہا۔ اُس وقت کو جانے دو لیکن جب سے مُلک بیدار ہوا اور اس کی شہرت کے نصیب جاگے۔ اُس دن سے اُس کے مولد کی بھی قسمت یاور ہوئی۔ ویسے کوئی اس چھوٹے سے قصبے کو دیکھنے کیوں جاتا۔ اب آئے دن وہاں ہجومِ زائرین رہتا ہے۔ امریکہ سے ہزاروں لوگ ہر سال انگلستان آتے ہیں اور انگریزوں سے زیادہ شوق کے ساتھ سٹریٹ فورڈ جاتے ہیں۔ وہاں خاص اُن کے قیام کے لئے اب ایک بڑا مکان تعمیر ہونے کو ہے۔ شیکسپیئر کی یادگار میں ایک خوشنما تھیٹر، کتب خانہ اور تصویر خانہ تیار کرنے کے فنڈ میں اُنہوں نے دل کھول کر شرکت کی ہے۔ بازاروں میں بیسیوں دُکانیں صرف مقامی تصاویر اور نشانیاں بیچنے پر چل رہی ہیں۔ لکڑی پر اُس کے گھر کی تصویریں۔ چینی پر اُس کے گھر کی تصویریں۔ پتھر پر اُس کے گھر کی تصویریں۔ اس قسم کا مال یہاں بہت بکتا ہے۔ ہوٹلوں والے گھروں والے گاڑیوں والے سب شیکسپیئر کے زائروں کی کثرت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور اس عجیب و غریب شخص کا نام مرنے کے بعد اپنے اہلِ وطن کو بے حساب نفع پہنچا رہا ہے۔ جب یہ چھوٹا سا لڑکا سٹریٹ فورڈ کی گلی کوچوں میں کھیلتا پھرتا ہوگا کسے خبر ہوگی۔ کہ اس قصبے کے لئے یہ لڑکا لازوال خزانہ ثابت ہوگا۔ جس کی بدولت ہزاروں آدمی پشت ہائے پشت تک روزی کمائیں گے۔ اور دُور دُور سے لوگ آ کر سٹریٹ فورڈ کی گلیوں میں قدم قدم پر اُس کا نقشِ پا ڈھونڈھتے پھریں گے اور جہاں کوئی ایسی جگہ نظر آئیگی جس کی نسبت قابلِ اعتبار روایت ہو کہ شیکسپیئر وہاں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ اُسے گھنٹوں کھڑے دیکھا کریں گے۔

سب یادگاروں سے زیادہ دلچسپ وہ پُرانا گھر ہے۔ جس میں یہ خوش قسمت شاعر

پیدا ہوا۔ غنیمت ہے کہ یہ مکان دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ انگلستان پر جو شان و شوکت آج کل برس رہی ہے اور جو محل ہر طرف سر بفلک دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی خوگردہ آنکھ کو چاہے یہ مکان کتنا ہی حقیر معلوم ہو۔ مگر علاوہ شیکسپیر سے متعلق ہونیکے اس میں یہ بڑی خوبی ہے کہ اس کے تنگ و تاریک کمروں سے سولھویں صدی عیسوی کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مکان کی تعمیر بیشتر لکڑی سے ہوئی ہے۔ یہ طرز تعمیر دیکھکر کشمیر یاد آگیا۔ لکڑی کا ایک لمبا شہتیر لیکر اس کے اوپر چند چھوٹی کڑیاں پاٹ کر دیں اور بیچ کے حصّے کو اینٹ اور چونے سے چُن ڈالا پھر کچھ اوپر چلکر ایک اور شہتیر متوازی لگایا اور اُس میں کڑیاں ٹھونک کر عمارت اُٹھالی۔ اور اس طرح دیواریں تیار کر لیں۔ اندر بالکل لکڑی کا کام ہے چھتیں بہت نیچی اور دروازے بہت ہی چھوٹے جن میں جُھک کر داخل ہونا پڑے۔ زینے لاہور کے بعض پُرانے مکانوں کی چھوٹی اور تنگ سیڑھیاں یاد دلاتے تھے۔ جس کمرے میں شیکسپیر پیدا ہوا۔ اُس کی ایک کھڑکی بازار کی طرف کو کھلتی ہے۔ دوسرے کمرے میں روشنی کے لئے صرف چھت میں روشندان ہے۔

اُس گھر کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے:۔ شیکسپیر کے بعد یہ مکان اُسکی وصیت سے اُس کی بہن کو ملا۔ بہن مر گئی تو شیکسپیر کی بڑی بیٹی سُوسن اُس پر قابض ہوئی۔ اس لڑکی کی شادی ایک طبیب ڈاکٹر ہال سے ہوئی تھی ۱۶۴۹ء سوسن کا انتقال ہو گیا تو اُس کی لڑکی لیڈی برنارڈ وارث بنی۔ مگر ۱۶۷۰ء میں اسے بھی پیام اجل آگیا۔ اس کے بعد شیکسپیر کے بہنوئی کی اولاد میں سے ایک شخص ٹامس نامی قابض ہوا۔ کیونکہ لیڈی برنارڈ بے اولاد تھی۔ ٹامس ۱۶۹۴ء میں چل بسا اور بے اولاد مرا۔ اس لئے اُس کا بھائی جارج جو درزی کا کام کرتا تھا گھر کا مالک بنا اور اُس نے ۱۷۲۷ء میں یہ مکان اسّی پونڈ (بارہ سو روپیہ) کو گرو کر دیا۔ جارج مرا تو مکان اپنی بیوی کے قبضے میں چھوڑ گیا۔ وہ ۱۷۵۳ء میں راہی عدم ہوئی تو مکان اپنے شوہر کے بھتیجے کو جو شوہر کا ہم نام تھا۔ سونپ گئی۔ اس شخص کا

انتقال ہوا تو سنہ ۱۷۰۱ء میں اُس کا بیٹا جان وارث بنا اور جان کے بیٹے ٹامس نے کچھ عرصہ بعد قصاب کی دُکان مکان کے نصف حصّے میں کھولی۔ وہ مر گیا تو اُس کا بھائی دُکان چلاتا رہا اور جب اُس کے چلنے کی نوبت سنہ ۱۸۰۰ء میں آئی۔ تو اُسکی بیوہ اور تین بچّے نہایت ناداری کی حالت میں رہ گئے اور یہ غریب بیوہ سنہ ۱۸۰۶ء میں مکان بیچکر اور زرِ رہن ادا کر کے اس قصبے کو چھوڑ کر کہیں اَور جا رہی۔ یہ لوگ جنہیں شیکسپیئر سے رشتہ داری کا تعلق تھا۔ قدرتی طور پر دل سے اس تعلّق کی قدر کرتے تھے اور اسی لئے جب کبھی کوئی شخص شیکسپیئر کی ولادت کی جگہ دیکھنے کو آجاتا تھا۔ اُسے دکھا دیتے تھے۔ مگر جس شخص نے آخری وارث سے مکان خریدا وہ اس فرض کے ادا کرنے سے گھبراتا تھا۔ لوگوں کو تکلیف ہونے لگی۔ اور اس اثنا میں شیکسپیئر کی قدردانی ازسرِ نو عام ہو چلی تھی اور زائرین کی تعداد روزافزوں تھی۔ اس حالت کو دیکھکر تحریک شروع ہوئی کہ اُسے رفاہِ عام کے لئے خرید لیا جائے اور سنہ ۱۸۴۷ء میں تین ہزار پونڈ ۴۵ ہزار روپیہ کو خرید لیا گیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں یہ کوشش کی گئی کہ جہانتک ممکن ہو اس کی اصلی صورت بحال کی جائے۔ اور اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں یہ مکان قوم کی مِلک ہو گیا۔

شیکسپیئر کے مولد کو دیکھنے کے بعد اُس مدفن کی طرف آیئے۔ خوش مزاج شاعر نے اپنی قبر کے لئے کیسا اچھا ٹھکانا ڈھونڈھا ہے۔ عین دریا کے کنارے ایک پُرانا گرجا ہے۔ جس کی مشرقی حد آبِ دریا ہے۔ گرجے کی دیوار سے ملا ہوا ایک چبوترہ ہے جس پر بیٹھکر آدمی گھنٹوں دریا کا لطف اُٹھائے۔ اور اُن دنوں کے فسانے پوچھا کرے جب شیکسپیئر اُس کے کنارے کھیلتا تھا۔ امریکہ کے مشہور سخنور لونگ فیلو کو غالباً یہیں پھرتے پھرتے وہ دلنشین الفاظ سوجھے ہونگے جن سے شیکسپیئر کی شان میں اس کا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ اس گرجے کے ایک گوشے میں قربانگاہ کے قریب شیکسپیئر سو رہا ہے۔ پاس کی دیوار میں اُس کا بُت رکھا ہے۔ جو گویا اس بیش بہا مُوئی مٹّی کی پاسبانی کر رہا ہے۔ اس بُت میں جو

خط و خال شیکسپیئر کے دکھائے گئے ہیں اُن سے اس کی ذہانت اور طباعی کے متعلق دل پر کچھ بہت اچھا نقش نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ ظاہری صورت میں یہ اصل سے بہت کچھ مطابق ہو لیکن چونکہ فن تصویر کے اُس جوہر اعلیٰ سے جس کے ذریعہ سے تصویر کا چہرہ۔ صاحبِ تصویر کے دل کا آئینہ بنتا ہے۔ یہ بت معرّا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے صحیح اندازہ لگانے میں بہت کم مدد مل سکتی ہے۔

گرجے کے ایک دوسرے حصّے میں ایک شیشے کے صندوقچے میں ایک پُرانا رجسٹر رکھا ہے جس میں شیکسپیئر کے بپتسما دیئے جانے کی تاریخ اور اُسکی تاریخ وفات کے پرانے اندراجات احتیاط سے محفوظ ہیں۔ ۲۶ اپریل ۱۵۶۴ء تاریخ بپتسما اور ۲۵ اپریل ۱۶۱۶ء تاریخ وفات درج ہے۔

پرانا گلڈ ہال[1]۔ اس کے بالاخانے پر مبتدیوں کا مدرسہ اور اُس کے ملحق گرجا گھر یہ بھی سٹریٹ فورڈ میں قابلِ دید ہیں۔ کیونکہ روایت ہے کہ سب سے پہلا تھیئٹر کی قسم کا تماشا جو شیکسپیئر نے دیکھا۔ وہ اسی گلڈ ہال میں تھا۔ اُس وقت اس قصبے میں کوئی تماشا گاہ نہ تھی۔ اور نہ کوئی مستقل تماشے کی کمپنی۔ تماشا کرنے والے شہر بہ شہر دورہ کرتے رہتے تھے۔ جیسا ان دنوں ہندوستان کے شہروں میں دستور ہے۔ دنیا کا بڑا ڈراما نگار ابھی بچہ ہی تھا کہ ایک کمپنی تماشا کرنے والی آنکلی۔ اُنہوں نے ہال میں تماشا کرنے کی اجازت لی اور ایک عارضی چبوترہ بنا کر اُس پر کھیل دکھایا۔ شیکسپیئر دیکھنے گیا۔ خدا جانے اس ہونہار بچّے کے دل میں اُس وقت کن خیالات کا ہجوم ہوگا اور کیا عجب ہے کہ اُسی دن سے اس ننھے سے دل میں آرزو پیدا ہو گئی ہو۔ کہ جو لطف اس کھیل کے اہتمام کرنیوالوں کو ہوتا ہوگا وہ بھی اُس میں شریک ہو۔

ہال کے اوپر کا مدرسہ اس لئے قابلِ زیارت ہے۔ کہ شیکسپیئر نے وہاں

---

[1] یعنی وہ کمرہ جس میں شہر کی پنچائت بیٹھتی تھی۔

کچھ دنوں جو رُاستاد کا مزا چکھا ہے۔ وہاں ایک پیتل کی تختی اس مقام کا نشان بتاتی ہے جہاں شیکسپیئر اپنی جماعت میں بیٹھا کرتا تھا۔ گرجا جو اس ہال سے متعلق ہے۔ نہ صرف اس قدیم زمانے کی نشانی ہونے کے اعتبار سے دیکھنے کی چیز ہے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ مدرسے کے لڑکے اس میں عبادت کے لئے بھیجے جاتے تھے اور یہ رسم ابتک جاری ہے۔ اب بھی اس مدرسے میں لڑکے پڑھتے ہیں اور وہ اس گرجے میں عبادت کے لیے آتے ہیں۔ پس اس کے اندر داخل ہونے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہیں شیکسپیئر نے اپنے بچپن میں کئی دفعہ اپنے معبود کی بارگاہ میں سرِ نیاز جھکایا ہوگا۔

سٹریٹ فورڈ کا مختصر سے مختصر بیان مکمل نہیں ہوسکتا۔ جب تک اُس میں اُس غریبانہ جھونپڑے کا ذکر نہ ہو۔ جہاں شیکسپیئر نے پہلے اپنی ہاتھالے سے ملاقات کی اور جہاں اُن دونوں کی نسبت کی قرارداد ہوئی۔ خاوند کی بدولت اس غریب اور گمنام عورت کا شکستہ سا گھر جو شہر کے کوئی میل بھر کے فاصلے پر ہے۔ نامورانِ دنیا کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور حقیقت میں نہایت ہی دلچسپ چیز ہے۔ اس کی سادگی۔ اور اس کا بے ساختہ پن ایسی صفات ہیں جو اُسے بڑی بڑی عالیشان یادگاروں سے ایسا ہی ممتاز کرتی ہیں جیسے اُس کی مکین۔ اینی باوجود اپنی غربت کے شیکسپیئر کی نظروں میں بڑی ذی جاہ عورتوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔

گو سٹریٹ فورڈ کی اصلی دلچسپی ان پُرانی چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ تاہم ایک نئی یادگار جو تھوڑا عرصہ ہوا شیکسپیئر کے نام پر قایم کی گئی ہے۔ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایک خوبصورت تعمیر ہے جو دریا کے کنارے بنائی گئی ہے۔ اس میں ایک عالیشان تھیئٹر ہے جہاں شیکسپیئر کے کھیل دکھائے جاتے ہیں۔ اور جہاں بعض اوقات انگلستان کے چیدہ ایکٹر جاکر وہاں کے کارکنوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ایک گیلری ہے جہاں شیکسپیئر کے متعلق

عُمدہ عُمدہ تصاویر کی نمائش ہے۔ اور نیچے کے درجے میں ایک کتب خانہ ہے جس میں شیکسپیئر کے نسخے جو آج تک طبع ہوئے ہیں بیشتر موجود ہیں اور جو شرحیں اور حواشی شیکسپیئر کی تصانیف پر لکھے گئے ہیں وہ بھی جمع کئے گئے ہیں۔ یہ یادگار نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ اور ثابت کرتی ہے کہ اس ملک کے لوگ اپنے محسنوں کے احسانات کی کسقدر جوش اور سرگرمی سے قدر کرتے ہیں +

نباتاتی غذا

چند سال ہوئے مجھے یہ سُنکر تعجب ہوا تھا۔ کہ میرے ایک ہندو دوست جو تین چار سال انگلستان رہ کر وطن کو واپس آئے تھے۔ اپنے زمانۂ قیام انگلستان میں برابر وجی ٹیرین رہے۔ یعنی نباتاتی غذا کھاتے رہے۔ میرے متعجب ہونے کے دو سبب تھے۔ اوّل تو یہ کہ انگلستان کی سرد آب و ہوا میں ان کا گذارہ گوشت کھائے بغیر کیونکر ہوا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ نباتاتی غذا کے پکوانے کا بندوبست کیونکر کرسکے اور سفر میں کیا انتظام ممکن تھا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ انگلستان میں وجی ٹیرین رہنا ہر طرح ممکن ہے اور ہر جگہ نباتات کھانے والے کے لئے سہولتیں مہیّا ہیں۔ اگر وہ ان کی تلاش کرے۔ چنانچہ اس وقت کئی ہندو طالب علم یہاں پورے وجی ٹیرین موجود ہیں۔

انگلستان کے متعلق ہمارے مُلک میں بہت سی غلط اطلاعیں ہیں۔ اُن میں یہ بھی ہے۔ کہ گوشت اور جگہ خواہ ضروری غذا نہ ہو۔ مگر انگریزی آب و ہوا میں اس کے بغیر صحت درست نہیں رہ سکتی۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ نہ صرف اس غذا کے ساتھ صحت درست رہ سکتی ہے۔ بلکہ پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے میں نے امتحاناً چھ مہینوں کے لئے اس غذا کو اختیار کیا تھا۔ اور اس عرصہ میں گوشت میں نے محض اتفاقیہ طور پر کسی کے ہاں مہمان ہونے کے موقعہ پر کھایا۔

اس امتحان میں یہ غذا بہت موافق آئی۔ اور کسی طرح کی تکلیف کا باعث نہیں ہوئی۔ میرا یا میرے کسی اور ہندوستانی دوست کا تجربہ اس بارہ میں کوئی عام کلیہ قایم کرنے کے لئے کافی نہیں۔ لیکن ہزارہا انگریزوں کا تجربہ جو اس آب وہوا میں پیدا ہوئے اور جن کی ابتدائی پرورش لحمی غذا پر ہوئی۔ اگر اس خیال کی تصدیق کرے تو اس نتیجہ سے انکار بن نہیں پڑتا۔ کہ نباتاتی غذا یہاں کے لئے بھی ویسی ہی موزوں ہے۔ جیسی کسی اور جگہ کے لئے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ یورپ اور امریکا ایک کثیر تعداد نباتاتی غذا کے شایقین کی پیدا ہو گئی ہے۔ جو لحمی غذا سے پرہیز قریب اسی تشدد کے ساتھ کرتے ہیں۔ جو ہم اپنے ہاں ہندو کے پرانے طبقہ میں دیکھتے ہیں۔ پچاس ساٹھ سال ہوئے یہ تحریک مغربی دنیا میں شروع ہوئی تھی۔ پہلے لوگ اس پر ہنستے تھے۔ اور نباتاتیوں کو باؤلا سمجھتے تھے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ جلد طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو کر پشیمان ہوں گے اور گوشت کھانے کی طرف عود کریں گے۔ لیکن جب انہیں نئی غذا راس آگئی اور ان کا چرچا اخبارات اور رسائل کے ذریعے سے پھیلنے لگا تو توجہ اس تحریک کی طرف کھنچی۔ سب سے پہلے جو لوگ نباتات خور بنے وہ زیادہ تر نباتات کی طرف اس لئے مائل ہوئے۔ کہ اس غذا کے ذریعے سے ماہوار اخراجات میں بہت کفایت ممکن تھی خوشحال امیر نباتاتیوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ کہ کنجوس ہیں۔ آخر کچھ امرا اور ذی وجاہت اشخاص بھی اس تحریک میں شریک ہونے لگے۔ اور اس دن سے فیصلہ ہو گیا کہ کوئی اصلی خوبی اس غذا میں ہو گی۔ جو لوگوں کو اس کی طرف مائل کرتی ہے۔ اب وجی ٹیرین مسافر خانے جا بجا قایم ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں کئی کئی ہوٹل خاص انہی لوگوں کے لئے جاری ہو گئے ہیں۔ جو خالص نباتاتی غذا کھاتے ہیں۔ اس وقت ہزارہا

اشخاص زن و مرد ویجی ٹیرین ہیں۔ اور یہ تعداد روز افزوں ہے۔ یہی حال جرمنی کا ہے۔ مجھے لنڈن میں بہت سے جرمن ملے ہیں۔ جو گوشت سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ اور انگریزوں کے اکثر ویجی ٹیرین خاندانوں سے میں واقف ہوں۔ مگر ٹھیک اندازہ اس غذا سے بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی کا لگانا ہو تو چاہیئے کہ دوپہر کے کھانے کے وقت لندن کے کسی ویجی ٹیرین رسٹوران میں جا نکلیں۔ تیرہ چودہ نباتاتی رسٹوران لندن میں ہیں جن میں بڑے بڑے یہ ہیں:۔

(۱) سینٹ جارج کافے۔ ۳۷ سینٹ مارٹین لین۔ ڈبلیو۔ سی۔

(۲) فوڈ رفارم (یعنی اصلاح غذا) ۴ فرنیول سٹریٹ۔ ہوبرن۔ ڈبلیو سی۔

(۳) مینشن ہاؤس۔ ۳۴۔ ۳۵ پولٹری۔ ای۔ سی۔

(۴) ہائی ہوبرن۔ ۲۷۸ ہوبرن۔ ڈبلیو۔ سی۔

(۵) الفا۔ ۲۳ اکسفورڈ سٹریٹ۔ ڈبلیو۔

ان سب مقامات میں دوپہر کو جگہ ملنی دشوار ہوتی ہے۔ اور ہر کرسی پُر کی ہوئی ہوتی ہے۔ سینکڑوں آدمی ایک وقت محض نباتاتی کھانا کھا رہے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ اُٹھ جاتے ہیں تو سینکڑوں اور اُن کی جگہ لینے کو موجود ہوتے ہیں۔

یہ انتظام لندن تک محدود نہیں۔ بیرونجات میں بھی اب ایسی جگہیں ہوتی جاتی ہیں اس لئے سفر میں بھی ویجی ٹیرین مسافر کو تکلیف نہیں۔ مندرجہ ذیل مقامات میں اب اس کھانے کے لئے رسٹوران کھل گئے ہیں:۔

لورپول۔ لیڈز۔ بورن متھ۔ مانچسٹر۔ شفیلڈ۔ ناٹنگھم۔ بولٹن۔ ہیلی فکس برمنگھم۔ اس طرح سکاٹلینڈ میں بھی ہیں اور آئرلینڈ میں بھی۔ بعض شہروں میں اکثر ہیں۔ مانچسٹر نباتاتیوں کا بڑا مرکز ہے اور وہاں چھ ایسے رسٹوراں ہیں۔ ان کے علاوہ ہر شہر میں متعدد مکان ایسے ہیں۔ جہاں آدمی مستقل سکونت

رکھ سکتا ہے اور غذا ویجی ٹیرین ملتی ہے۔ ان مکانوں کی فہرست ویجی ٹیرین سوسائٹی کے دفتر سے مل سکتی ہے۔ جہاں ہر قسم کی کتابیں اس مضمون پر موجود ہیں اور یہ سوسائٹی اب ہر بڑے شہر میں اپنی شاخ رکھتی ہے۔

کتابوں میں اس طریق کے اختیار کرنے کی تائید میں طرح طرح کے دلائل سے کام لیا گیا ہے۔ کوئی تو طبّی دلائل پر زور دیتا ہے۔ اور عام اشیاء خوردنی کا طبّی تجربہ کر کے لکھتا ہے۔ کہ کونسی غذا زیادہ مقوّی ہے۔ اور کیا کیا جزو کس چیز میں زیادہ ہے۔ کوئی رحمدلی کی دلائل سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ جانوروں کو مار کر اپنا پیٹ پالنا انسانیت کے خلاف ہے۔ اس آخری دلیل کے ماننے والے یورپ میں ہیں تو سہی مگر نسبتاً کم ہیں۔ اسی واسطے یہاں اکثر ویجی ٹیرین انڈوں سے پرہیز نہیں کرتے۔ انہیں جو دلیل قائل کر رہی ہے وہ یہی ہے کہ جب ازروئے طب نباتاتی غذا سے وہی جسمانی قوت ممکن ہے جو لحمی غذا سے حاصل ہوتی ہے۔ تو کیوں نباتاتی غذا کو ترجیح نہ دی جائے۔ جو فطرتِ انسانی کے زیادہ مطابق معلوم ہوتی ہے۔ اور جس کا صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

کئی اخبار اور رسالے یہاں ایسے نکلتے ہیں جن میں صرف ویجی ٹیرین امور کے متعلق اطلاع درج رہتی ہے۔ کہ کہاں کہاں جلسے ہوئے۔ کونسی نئی کتاب چھپی۔ غذا میں کیا نئی اصلاح ہوئی۔ کھانے پکانے کی کوئی عمدہ سی ترکیب نئی معلوم ہو تو وہ بھی درج کر دیتے ہیں اور نئے ممبروں کے ناموں کی فہرستیں بھی اُن میں چھپتی رہتی ہیں۔ بہت عرصہ نہیں ہوا کہ ایک اخبار نے چند عالی رتبہ اشخاص کے نام اور تصویریں چھاپی تھیں جو ویجی ٹیرین کھانا کھاتے ہیں اُن میں لارڈ چارلس بیرسفورڈ مشہور امیر البحر کا نام بھی تھا۔ مسٹر برنارڈ شا جو موجودہ ڈراما نویسوں میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس تحریک کا بڑا حامی اور اُس کی خوبیوں کا معترف ہے۔ نامور لیڈیوں میں کونٹس آف اسکس اور لیڈی سومرسٹ قابلِ ذکر ہیں۔ جو عرصہ سے نباتات اور فواکہ کے سوا کچھ نہیں کھاتیں۔

حال میں "مکتی فوج" کے ممتاز بانی جنرل بوتھ نے بھی نباتاتی غذا کے حق میں شہادت دی ہے۔ یہ تو عام طور پر معلوم ہے کہ جنرل بوتھ بہت بوڑھے ہیں۔ اور کام بھی اُن کے ذمہ بہت ہیں۔ مگر اُن کی صحت ابتک بہت اچھی ہے اور باوجود بڑھاپے کے دنیا بھر میں اپنی فوج کو اُبھارنے اور مذہب عیسوی کا جوش پھیلانے کے لئے چکر لگاتے اور پُر زور تقریریں کرتے رہتے ہیں اُن سے کسی اخبار والے نے جاکر پوچھا تھا۔ کہ اُن کی غذا کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں نے سات سال سے مرغ و ماہی۔ و گوشت ترک کر رکھے ہیں۔ مگر مجھے اس ترک سے کسی قسم کا ضعف لاحق نہیں ہوا۔ بلکہ میری صحت بہت عمدہ رہی اور میرا دماغ بہت صاف رہا ہے۔

اب جو اس طرح کئی نامور اور بااثر آدمی ویجی ٹیرین ہوتے جاتے ہیں اور اس تحریک کو تقویت پہنچتی جاتی ہے تو بعض سرگرم ویجی ٹیرین بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے لگے ہیں۔ ایک کتاب میں تو مصنّف نے یہانتک لکھدیا ہے۔ کہ گوشت کھانا ایک وحشیانہ فعل ہے جو یقیناً اصلی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ختم ہو جائیگا اور وہ دن آنے والا ہے جب ساری دنیا ویجی ٹیرین ہوگی۔ میرے خیال میں یہ رائے مبالغہ آمیز ہے۔ اور مجھے یہ نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ گوشت کھانے والے بھی قوی دلائل اپنے حق میں رکھتے ہیں۔ جن میں مختلف مذاہب میں گوشت کھانے کی اجازت کچھ کم زبردست نہیں۔ لیکن جو حالت اس تحریک کی اس وقت یورپ میں ہے اور جس رفتار سے یہ رو بہ ترقی ہے۔ اُس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عجب نہیں چالیس پچاس سال میں مغربی دنیا کا ایک معقول حصہ اس تحریک کی خوبی کا قائل اور گوشت سے پرہیز کے مسئلہ پر عامل ہو جائے اور اگر ایسا ہوا تو مغرب کی تاریخ میں یہ بھی ایک انقلاب عظیم ہوگا۔ جو ہندو دھرم کے لئے جس کے بزرگوں نے مدت سے گوشت سے پرہیز کی تلقین کی ہے۔ باعثِ ناز ہوگا۔

میرا مطلب اس تحریر سے گوشت کھانے کی مخالفت یا "ماس" اور گھاس کی ناگوار بحث کو تازہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ مندرجہ ذیل ضروری واقعات کا اظہار مقصود ہے:۔

(اول) یہ کہ یورپ میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً گوشت کھانے کے بغیر بہ آسانی کام چل سکتا ہے۔ اور اس لئے جو اصحاب اس ڈر کے مارے سفر سے گریز کرتے ہوں کہ اُنہیں اپنے عقائد یا عادت کے خلاف گوشت کھانے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ وہ اس روک کو سدراہ نہ ہونے دیں

(دویم) یہ کہ نباتاتی غذا اکثر ہوٹلوں میں ملتی ہے۔ مکان ایسے مل سکتے ہیں جہاں یہی غذا مستعمل ہو۔ اور مدارس وغیرہ کے کھانوں میں بھی اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔ چنانچہ بیرسٹری کے لئے جو لوگ یہاں پڑھتے ہیں اور جنہیں ہر سال چوبیس کھانوں پر ہال میں حاضر ہونا لازم ہے۔ وہ اگر چاہیں تو انہیں ہال کے اندر ویجی ٹیرین کھانا مل جاتا ہے۔

(سوم) یہ کہ ہمارے ملک میں جو گوشت کھانے والے حضرات نباتات کھانے والوں کو "گھاس خور" وغیرہ تحقیر کے کلمات سے پکارتے ہیں وہ اس تحقیر سے پرہیز کریں۔ اور ہر شخص کی ذاتی آزادی کا لحاظ رکھیں۔ اور اس بات کو تسلیم کریں کہ نباتاتی غذا اپنی جگہ کسی اور غذا سے کم قابل قدر نہیں کیونکہ ہندوستان کی گرم آب وہوا کے لئے تو یہ انگلستان سے بھی زیادہ موزوں ہے۔

میر انیسؔ[۱]

مغربی نقّادوں میں عموماً رسم ہے کہ کسی شخص کے کلام کا موازنہ کرنے سے پہلے اُن کی سوانح عمری پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے تذکرہ نویس بالعموم شعراء کے حالاتِ زندگی سے بالکل قطع نظر کرتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کا تذکرہ پڑھنے کے بعد اُس کی شخصیت کی نسبت سوائے نام اور ولدیت اور چند متفرق واقعات کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا اگر مختصر نویسی منظور ہو تو خالی از فائدہ بھی نہیں۔ کیونکہ دنیا کو مشاہیر کے نام کی نسبت اُن کے کام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اور اسی اصول کو مدِّنظر رکھ کر اِس مختصر نوٹ میں ہم زیادہ تر میر انیس کے کلام سے واسطہ رکھیں گے۔

اُن کی ذات و خاندان کی بابت صرف اسقدر کہہ دینا کافی ہے کہ اُن کا اسم گرامی میر ببر علی تھا۔ اور میر حسن جن کی مثنوی سحر البیان اپنی سلاستِ زبان کی وجہ سے آج تک مقبولِ ہر خاص و عام ہے۔ اُن کے جدِّ امجد تھے۔ اس طرح پر میر انیس کو شاعری گویا ورثے میں ملی تھی۔ اور اُن کا خاندان شاید اردو ادب کی تاریخ میں اس حیثیت سے بالکل یکتا ہے کہ اس کے حصے میں پانچ پشت تک شاعری کی دولت رہی ہے۔ جیساکہ ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا میر انیس کا خاندان شاہجہان آباد کی خاکِ پاک سے نسبت رکھتا تھا۔ لیکن نامساعدتِ زمانہ نے میر حسن کو مجبور کیا کہ لکھنؤ میں بود و باش اختیار کریں۔ میر انیس کی

---

[۱] ہم مولوی سیّد محمد حسن صاحب بلگرامی (گورنمنٹ اوڈیٹر اوف ریلوے و معدنیات حیدرآباد دکن) کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے میر انیس مرحوم کی تصویر جو اس ماہ کے مخزن کے لئے باعثِ زینت ہے۔ شائع کرنے کے لئے نہ صرف ہمیں اجازت دی۔ بلکہ بلاک بھی عنایت فرمایا۔

پیدائش و پرورش اُسی مردم خیز شہر میں ہوئی اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ لکھنؤ نے میر انیس کو مرثیہ گو بنا دیا۔

مرثیہ گوئی کا رواج تو ایرانیوں کی تقلید کی وجہ سے اُردو شاعری کی ابتدائی حالت ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سوداؔ کے کلیات میں بھی چند مراثی پائے جاتے ہیں جو چنداں اعلیٰ پائے کے نہیں۔ اور اس شاعر کے کلام کا شاید سب سے کم قابلِ قدر حصہ ہیں۔ لیکن انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے تک مرثیہ گوئی شاعری کی نہایت ضعیف صنف تصوّر کی جاتی تھی۔ اور مرثیہ گو کو بالعموم دیگر شعراء طنزاً بگڑے شاعر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ انیسؔ و دبیرؔ کی خداداد ذہانت نے مرثیہ گوئی کو اس معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ جس پر کہ آج ہم اُسے پاتے ہیں اور مرثیے کی زمین کو اسقدر رفعت دی کہ ہمسر آسماں بنا دیا۔

ہمارا خیال ہے کہ خود مرثیہ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ کسی صاحبِ کمال کے ہاتھوں میں فروغ پا جائے۔ شاعری کے لئے اثر کا ہونا ضرور ہے اور ہماری شاعری کے جملہ اصناف میں کوئی صنف اسقدر موثر نہیں جیسا کہ مرثیہ۔ کیونکہ اثر کے لئے صداقت لازمی ہے۔ اور مرثیہ ہی ایک ایسی شے ہے کہ جس میں شاعر جو کچھ قلم سے لکھتا ہے اُسے دل سے اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے پھر ممکن نہیں کہ اثر پیدا نہ ہو۔ علاوہ بریں مرثیے کو اُردو شاعری کی دیگر شاخوں پر ایک اور بھی فوقیت حاصل ہے وہ یہ کہ اس کا مقصد نہایت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کا منشا ان جذبات کو اُبھارنا ہے جو انسان کی ارفع یعنی روحانی خصلت سے تعلق رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے غزل گوئی جس پر ہمارے اکثر شعراء کی توجہ مبذول رہی ہے۔ اور جس پر اوائلِ عمر میں خود انیس نے کافی قدرت حاصل کر لی تھی۔ بالخصوص طبع انسانی کی نسبتاً ادنیٰ خواہشات و جذبات کو اُکساتی ہے۔

مندرجۂ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ انیسؔ کا پایۂ شاعری کسقدر بلند ہونا چاہیئے۔ مزید برآں ان کی زبان کی صفائی۔ خیالات کی نفاست و نزاکت

ان کو اور بھی کامیاب بناتی ہے۔ لکھنؤ کی صحبتوں نے انیس کو بلاغت سکھائی لیکن ناسخ کی طرح بلاغت کے ساتھ فصاحت کو ہاتھ سے نہیں دیا جو دہلی کے ساتھ دور کی نسبت ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل تھی۔ لکھنؤ میں رہ کر عمر بھر دہلی کا روزمرّہ استعمال کرتے رہے[1] اور جب کبھی کسی غیر مانوس ترکیب و محاورے کو استعمال کرتے تھے تو فوراً بلا تامل کہہ دیتے تھے کہ اہلِ لکھنؤ اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر احقر کے شہر اور گھرانے میں اسی طرح بولتے ہیں۔ امر واقعی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ لکھنؤ کی زبان جو تکلفات و تصنع سے پُر ہے کبھی دہلی کی سادہ[2] شیریں زبان کے برابر موثر نہیں ہو سکتی۔

انیس کی شاعری میں علاوہ صداقت و اثر کے شاعری کے دیگر لوازمات تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ تشبیہ و استعارے کے وہ بادشاہ ہیں۔ اور کبھی تشبیہ کے معاملے میں اپنے طبقے کے دیگر شعرا کی تقلید میں صحتِ مذاق کا خون نہیں کرتے۔ بلکہ غیر معمولی نازک خیالی و حسنِ بیان کا ثبوت دیتے ہیں کسی خوبصورت نوجوان کے رُخ پر سبزۂ آغاز ہوتے دیکھکر اس سے بہتر کیا تشبیہ سوجھ سکتی ہے کہ ع

دیکھو نئی بہار۔ کہ سبزہ ہے پھول پر

یا اس سے بہتر کیا مطالعۂ فطرت کا ثبوت ہوگا۔ کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتّوں کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی جائے۔ ع

پتّے برنگِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

---

[1] ملاحظہ ہو آبحیات مصنفہ شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد ۱۲

[2] شمس العلما مولوی سیّد علی صاحب بلگرامی جیسے اہل الرائے نے باوجود دہلی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے کے اس شہر کی زبان کو صفائی و شیرینی کے لحاظ سے لکھنؤ کی زبان سے بہتر قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو دیباچۂ تمدّنِ عرب ۱۲

غرضکہ اس قسم کی نازکخیالی کی مثالیں انیسؔ کے کلام میں سے سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں دی جاسکتی ہیں۔ نازک خیالی اُن کا خاص جوہر تھا۔ ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ زور وشکوہ الفاظ میں اُن کے ہمعصر مرزا دبیر بازی لے گئے ہیں مگر کہاں بلبل کا نغمہ اور کہاں شیر کی گرج۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ لیکن شاعری کے لئے تو کچھ اوّل الذکر بھی زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔

انیس کی غزل گوئی کی طرف ہم پیشتر اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اسقدر اور کہہ دینا کافی ہے کہ انیسؔ کی جو غزلیات ہم تک پہنچی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ لیکن ہم انیس کو بہت اعلیٰ پایہ کا غزل گو ماننے پر تیار نہیں۔ اُس وقت لکھنؤ غزل گوئی کا مرض عام تھا۔ اور ہر ایک موزوں طبیعت ورنگین مزاج نوجوان اس میدان میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔ مشاعروں کی قدردانی وداد اس شوق کو بڑھا دیتی تھی۔ اور بڑھی ہوئی مشق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ہر ایک شاعر ومتشاعر کے کلام میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ انیس کی غزلیات بھی خوبی سے خالی نہیں۔ لیکن بحیثیتِ غزل گوئی کے وہ دوسرے اساتذہ کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ غزل گوئی کی طرف توجہ کرتے تو دیگر شعراء سے اس میدان میں بھی گوئے سبقت لیجاتے۔ بدقسمتی سے اب اس خیال کی تصدیق ہونی محال ہے۔ تاہم ہم اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہر ایک شخص ایک خاص کام کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔ انیس کا کام فطرتاً مرثیہ کو فروغ دینا تھا اور اس کام کو اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا +

خانہ بدوش جلسپی

اِنگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں کچھ خانہ بدوش قومیں اب تک پائی جاتی ہیں جنھیں جلسپیؔ کہتے ہیں۔ گو تمدن کی ترقی اور قانون کی سخت گیری سے روز بروز

ان کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ اور ان میں جو ذرا خوشحال ہیں وہ اپنی آوارگی کی زندگی چھوڑ کر زیادہ پرامن پیشوں میں گھستے جاتے اور رفتہ رفتہ فرنگستان کی زبردست آبادی کا جزو بنتے جاتے ہیں اور جو خستہ حال ہیں وہ زمانہ کے ہاتھوں تنگ آ کر نیست و نابود ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم اُن کے حالات نہ صرف تاریخی اور علمی اعتبار سے دلچسپی سے پُر ہیں۔ بلکہ اہلِ ہند کیلئے خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ کیونکہ جدید تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اقوام زمانۂ قدیم میں ہندوستان سے آئی تھیں۔ اور اس وقت تک خانہ بدوش لوگ ہندوستان کے اکثر حصوں میں موجود ہیں۔ وہ ان گورے رنگ والے۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے خانہ بدوش جپسیوں کے چچیرے بھائی ہیں۔

جیساکہ لفظ جپسی سے ظاہر ہے۔ ایک زمانہ تک اہلِ فرنگ کا خیال تھا۔ کہ یہ لوگ "ایجپٹ" یعنی مصر کے رہنے والے ہیں۔ اس خیال کی دو وجہیں تھیں اوّل تو یہ کہ مدت تک مصری اہلِ یورپ کے لئے مشرق کا حکم رکھتا تھا۔ مصر سے پرے کی مشرقی اقوام سے ادھر کے لوگ عموماً واقف نہ تھے۔ اور بہت دور جاتے تھے تو مصر تک جاتے تھے۔ اس لئے ان مشرقی خط و خال کے آدمیوں کو اُنہوں نے ایجپشی سے تعبیر کیا اور یہ لفظ بعد جپسی" بن گیا دوئم یہ کہ غالباً یہ لوگ ایشیا سے یورپ میں مصر کے راستے ہی داخل ہوئے اور جیساکہ اُس زمانے میں ضروری تھا۔ ہند سے نکل کر بمنازل یہاں پہنچے۔ پہلی بڑی منزل ایران میں ہوئی۔ وہاں سے کچھ فارسی الفاظ سیکھے۔ ایران سے روم میں آئے اور روم سے مصر میں۔ مصر سے یورپ کون بڑی بات تھی جب گھر سے نکل پڑے تو دور و نزدیک کا کیا پوچھنا خصوصاً اُس حالت میں جب خانہ بدوشی کی عادت ہو۔ بچپن سے سفر اور آوارگی گھٹی میں پڑے اور پاؤں میں چکر ہو۔ یہ غریب ہندی نژاد مصر سے نکلکر یورپ بھر میں پھیل گئے۔ اٹلی۔ فرانس جرمنی۔ آسٹریا۔ کون سا ملک ہے جہاں اُن کا نشان نہ ملتا ہو۔ ہسپانیہ میں تو کچھ

دنوں ان کا بہت چرچا رہا۔ اور انگلستان بھی ان کے حملۂ بے شور و غل سے نہ بچا یورپ کے پرانے قصوں میں تو کوئی قصہ مشکل سے جپسی کے بغیر مکمل ہوتا ہے۔ سکاٹ کے کئی فسانوں میں جپسی فال نکالتے۔ نجوم کا احوال بتاتے۔ ہاتھ دیکھ کر ماضی و مستقبل کا حال کہتے نظر آتے ہیں۔ یہ پیشہ یورپ میں اب تک باقی ہے۔ گو پیشہ وروں کو بہت احتیاط سے چلنا پڑتا ہے۔ ورنہ قانون کے پھندے میں پھنس جائیں۔ ان دنوں جپسی لوگ انگلستان میں اس کثرت سے نظر نہیں آتے جس سے آج سے نصف صدی پہلے تک انہیں دیکھنا ممکن تھا۔ اور بڑے بڑے شہروں میں عموماً الگ رہتے ہیں۔ پھر بھی دیہات میں نکل جاؤ تو کئی جگہ ان کے ڈیرے خیمے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا اصولِ زندگی اس بیسویں صدی میں بالکل وہی ہے جو ہزار برس پہلے تھا۔ اور جو ان کے بھائی بندوں کا ہے جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ قافلہ قافلہ ملکر نکلتے ہیں سختی برداشت کرنے میں زن و مرد یکساں ہیں۔ مرد عورتوں کی طرح چابکدست اور عورتیں مردوں کی طرح دلیر ہیں۔ کھانا پینا غریبانہ اور سیدھا سادہ۔ زندگی بے تصنع اور بے تکلف۔ ہندوستان میں گھاس پھوس کے جھونپڑے بنا لیتے ہیں۔ یہاں کپڑے کے تنبو لئے پھرتے ہیں۔ وہاں نہایت بھدا سا چھکڑا یا گدھے اسباب لادنے کے لئے رکھتے ہیں۔ یہاں دو تین بند گاڑیاں ہوتی ہیں۔ جو ایک کمرہ کی طرح بنی ہوتی ہیں۔ اس کے اندر عورتیں بچوں کو لیکر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور اسباب سمیٹ لیتی ہیں۔ مرد گاڑی ہانکتے یا گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کچھ مریل سے ٹٹو بار برداری کے لئے ہوتے ہیں اور آئے دن یہ کارواں ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ جس گاؤں میں جاتے ہیں۔ وہاں کسی نہ کسی قسم کا سفری تماشہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ بچوں کے لئے ہنڈولے گاڑ دیتے ہیں۔ ٹٹو اور گدھے کرایہ پر دیتے ہیں۔ اور جہاں پہنچیں ایک میلہ جمع کر لیتے ہیں۔ ان کی صورت دیکھو تو ان میں اور ادنیٰ درجہ کے انگریزوں میں بہت کم فرق ہے۔ زبانِ انگریزی

گنواری لہجہ میں اچھی بولتے ہیں۔ اور سوائے سیاہ بالوں یا سیاہ آنکھ کے جو کبھی کبھی مشرقی اصل کا پتہ دے جاتی ہے۔ رنگ ڈھنگ سب چیز میں فرنگی ہیں اور اس نظر سے ہر ہندی کے لئے انہیں دیکھنا بہت کچھ نصیحت اور عبرت کا سامان ہے۔ ہندوستان میں ان کی برادری سیاہ رنگ ہونے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ اور شرفائے ہند عموماً صاف رنگ کے ہیں۔ یہ رنگ ان کا ہر وقت باہر دھوپ میں رہنے کی وجہ سے ہے اور اس عادت کا اثر ان کے چہروں پر یہاں بھی موجود ہے۔ مگر اتنا ہی جتنا کسی اور انگریز پر ہو جو عموماً دھوپ وغیرہ میں چلتا پھرتا ہو۔ لیکن آب و ہوا کی خوبی دیکھئے۔ اس سرد ملک میں چند صدیوں کی بود و باش نے انہیں بھی وہ چیز عطا کر دی ہے جس کو اہلِ فرنگ اپنا سرمایۂ ناز سمجھتے ہیں یعنی سفید رنگ۔ اگر وہ ذرا غور کریں تو ان کو معلوم ہو جائے۔ کہ نازش کمالات پر ہونی چاہئے اور وہ آجکل اہلِ فرنگ کا حق ہے۔ لیکن رنگ پر اترانا اور صرف اس کی وجہ سے اپنے آپ کو گندم گوں یا سیاہ رنگ لوگوں سے اعلیٰ مخلوقات جاننا کتنی بڑی غلطی ہے۔

جپسی انگلستان میں انگریزی بولتے ہیں۔ فرانس میں فرانسیسی ہسپانیہ میں ہسپانیہ کی زبان۔ مگر اپنے حلقۂ خاص میں اپنی خاص بولی بولتے ہیں۔ اس بولی میں جہاں وہ رہے ہیں۔ سب زبانوں کے الفاظ مل گئے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اس کی اصلی شان مٹ نہیں گئی۔ اور جو شخص اُن کی بولی کو غور سے سُنے۔ یا اُن کے الفاظ کو لکھا ہوا دیکھے۔ وہ بلا تامل یہ کہدیگا۔ کہ ان کے ہندی اصل کے ہونے میں شبہ نہیں۔ کیونکہ روز مرہ کے استعمال کی چیزوں اور باہمی تعلقات کے لئے ان کے الفاظ نہ صرف عموماً ہندی ہیں بلکہ اُن الفاظ میں امتدادِ زمانہ بہت کم تغیر کر سکا ہے چنانچہ 'پانی' کو وہ 'پانی' کہتے ہیں۔ 'منہ' کو 'مُو'۔ 'چُومنے' کو 'چومیا'۔ 'چور' کے لئے 'چور' اور 'ماس' کے لئے 'ماس' اُن کے ہاں موجود ہے۔

اور الفاظ جن کو ہر ہندوستانی کم و بیش سمجھتا ہے۔ اور جپسی زبان میں مروّج

ہیں - یہ ہیں 'شیل' - بہ معنی سردی - 'تتو' بمعنی گرم - 'جیب' اور 'چپو' بمعنی زبان - یہ الفاظ مجھے ڈاکٹر گریسن صاحب (سی - آئی - ای) نے بتائے ہیں - جو ہندوستان کی متعدد زبانیں جانتے ہیں - اور گورنمنٹ کی طرف سے السنۂ ہند پر ایک مفصل رپورٹ لکھ رہے ہیں - اُن کی رائے اس تحقیق کے ساتھ متفق ہے کہ یہ جپسی ابتدا میں ہندوستان سے آئے ہونگے - اور اُنہوں نے ایک ملاقات میں کئی اشعار جپسی زبان کے سنائے جو اس خیال کی مزید تائید کرتے ہیں - اُن میں سے مندرجہ ذیل شعر مجھے یاد رہ گیا ہے :-

اندرے داوِیشں اوپرے دِارُکھ آر چڑی کلو اینِڈ چڑی کلی
اندرے دِاویشں تلے دِارُکھ پیارانو اینِڈ پیَرنی

اس کا ترجمہ یہ ہے :- جنگل کے اندر - درخت کے اوپر چڑا اور چڑیا (بیٹھے) ہیں
جنگل کے اندر - درخت کے تلے پیارا اور پیاری (بیٹھے) ہیں

گویا پورا شعر ہندی زبان میں ہے - سوائے اس کے کہ انگریزی لفظ 'دِا' The اور 'آر' بمعنی 'ہیں' اور 'اینڈ' بمعنی 'اور' ہندی الفاظ کو باہم ترکیب دینے کے لئے درمیان آگئے ہیں -

ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر ان لوگوں سے جا کر باتیں کیا کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی نئی بات سُن آتے ہیں - چنانچہ اُنہیں معلوم ہوا - کہ یہ لوگ 'دُور' کو 'دور' ہی کہتے ہیں - اور یہ لفظ فارسی سے لیا گیا ہوگا 'چُھری' کو 'چھری' کہتے ہیں - 'مجھے گوشت دے' کہنا ہو تو 'دے موے اس' بولتے ہیں - ان مثالوں کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے - کہ وطن کی مُہر کتنی زبردست ہے - جو صدیوں میں مٹائے نہ مٹی - جپسیوں سے پوچھو تو اُنہیں کچھ معلوم نہیں کہ انکی مٹی کہاں کی ہے - اُن کے باپ دادا یہیں تھے - بس اتنا جانتے ہیں - یہہ ہندی الفاظ روز بولتے ہیں - مگر انہیں کیا معلوم کہ یہ ہندی ہیں - وہ تو یہ جانتے ہیں کہ اُن کے بزرگوں نے دور اندیشی سے اُنہیں ایک خاص بولی سکھا دی جسے

سوائے اُن کے دوسرے لوگ نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ پردے کی باتیں یا کسی چوری کی سازشیں اس بولی میں کر لیا کریں اور پاس والوں کو خبر نہ ہو۔

طرفہ یہ ہے کہ اس بولی کے کئی الفاظ بے معلوم طور پر خود انگریزی زبان میں انہی جپسیوں کے ذریعے داخل ہو گئے ہیں۔ مگر اُن میں سے اکثر بازاری بول چال میں (جسے سلینگ کہتے ہیں) آتے ہیں۔ اور شرفا تعلیم یافتہ انہیں بہت کم بولتے ہیں۔ گو کبھی کبھی وہ بھی انہیں زوردار سمجھکر استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً 'چیز' جپسیوں میں بمعنی 'شے' مروّج ہے اور انگریزی میں اس کے معنے ہیں عمدہ یا اوّل درجے کی چیز''۔ انگریزی میں (dada) 'ڈَڈے ڈی' باپ کے لئے پیار کی اصطلاح ہے۔ اس کے متعلق ایک لغت میں لکھا ہے کہ اغلب ہے کہ یہ لفظ جپسی لفظ 'دادی' سے جو وہاں باپ کے لئے مستعمل ہے لیا گیا ہو۔ انگریزی میں (mound) 'مُونڈ' مانگنے کے لئے ہے۔ اس کی نسبت بھی قیاس ہے کہ یہ جپسی لفظ 'مونگ' سے جو مانگنے کے لئے ہے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں ٹینی (tiny) چھوٹے کو کہتے ہیں۔ اور جپسی میں ٹُوٹو۔ کچھ عرصہ ہوا۔ انگریزی میں بازاری الفاظ و محاورات کی ایک ڈکشنری[1] شائع ہوئی تھی۔ جواب کمیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے۔ اور اس میں ایسے الفاظ کی جو جپسی لوگوں کا عطیہ ہیں۔ ایک معقول فہرست مندرج ہے میں نے مندرجہ بالا چند الفاظ نمونتاً اُسی سے لئے ہیں۔ اُس میں ان لوگوں کے متعلق بعض عجیب باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ اُنہوں نے نشانات مقرر کئے ہوئے تھے۔ جنہیں صرف یہی سمجھتے تھے اور جو بعد میں ان سے گداگروں نے بھی لے لئے جس سے ہر جپسی یا ہر گدا اپنے رفیقوں کو اطلاع دیدیتا تھا۔ کہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ کدھر جانا مفید ہو گا اور کدھر مضر۔ کس شخص سے کچھ ملیگا اور کس

[1] کتاب کا نام اور پورا پتہ:- The Slang Dictionary— Publishers— Chatto & Windus, London.

نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان نشانات میں سے چند کا نقل کردینا خالی از لطف نہ ہوگا:۔

کبھی کام کے نہیں۔ بہت غریب ہیں اور تنگی۔ ×

یہاں ٹھہرو۔ اگر اُن کے مطلب کا مال تمہارے 
پاس ہوا تو خریدنے والی اسامی ہیں۔ مگر ہیں ہشیار۔

اسی طرف چلے جاؤ۔ دوسرے راستے سے بہتر اُدھر کچھ نہیں 

خاصہ گھر ہے۔ کم از کم سوکھا ٹکڑا تو مل جائیگا۔ مگر ◇
ذرا زیادہ باتیں نہ بنانا۔

یہاں بہت سائلوں کے آنے سے کام بگڑ گیا۔ ▽

کتے سے بچنا۔ کاٹتا ہے۔ مکان بھی مایوس کرنیوالا ہی۔ □

اگر یہاں گئے تو ایک مہینے کا جیلخانہ یقینی سمجھو۔ ⊙

ان نشانات کے لئے اصطلاحی نام ہیں اور دیگر امور کے لئے بھی اصطلاحات ہیں اگر کوئی ہند کی ایسی اقوام کی اصطلاحات کا ماہر دونو اصطلاحوں کا مقابلہ کرے تو عجب نہیں کئی الفاظ مشترک مل جائیں۔ کیونکہ متحد الاصل ہونے کے علاوہ فطرتِ انسانی ہر جگہ ایک سی ترکیبیں استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ اُسی ڈکشنری جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے ایک یہ ترکیب راز کی باتیں کرنے کی لکھی ہے۔ کہ حروف کی ترتیب بدل دیتے تھے۔ مثلاً ٹمن چاپ کو چٹن ماپ کہتے تھے۔ اور یہ رواج ایسے لوگوں میں ہندوستان میں بھی بعینہٖ موجود ہے۔ ایک اور رواج ہے۔ جو ہندوستان کے ایک رواج سے بہت مشابہ ہے۔ یعنی کوئی زائد حرف ہر لفظ میں ڈال کر اُس کی صورت مسخ کردی جاتی ہے۔ مثلاً "شیل دی گو" (یعنی کیا ہم جائیں گے) کو "شگیل وگی گگو" کہنا اس کے مقابلہ کے لئے پنجاب کے بعض آوارہ لوگوں کی وہ ترکیب قابلِ ملاحظہ ہے جس میں وہ "میں تینوں کہنا ہاں" کی جگہ "مفیں تفینوں کفہنا ہفاں" بولتے ہیں۔ انگریزی میں بھی یہ ترکیب کچھ حرفِ گ سے مخصوص نہیں۔ بلکہ بعض نے گ کی جگہ ف یا ل سے اس بولی کو

ترتیب دیا ہے۔ ڈی کوئنسی ۔جو انگریزی مصنّفین میں ایک مشہور شخص گذرا ہے ایک جگہ بیان کرتا ہے۔ کہ اس کے بچپن کے زمانے میں اس بولی کا خاصہ رواج تھا۔ اور ونچسٹر کالج کے طلبہ خاص طور پر اس کے مشتاق تھے۔ چنانچہ اس نے بھی اسے سیکھا اور اسقدر مشق بہم پہنچائی کہ پچاس سال بعد اُسے لارڈ وسٹ پورٹ کے ساتھ اس میں گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تو بھی نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ بولتا چلا گیا۔ اس زبان کا اصطلاحی نام زِف ہے۔

میرا مدعا ان چند واقعات کے اظہار سے نہ صرف کسیقدر نئی معلومات کا ناظرین مخزن تک پہنچانا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ تحقیق پسند طبائع یہ تھوڑا سا اشارہ پاکر جپسی خانہ بدوشوں کی اصل کے متعلق زیادہ مسالہ بہم پہنچانیکی کوشش کریں +

اِستنبول
اور
اُسکے دلچسپ مناظر

مدت سے آرزو تھی کہ استنبول دیکھوں۔ آخر پوری ہوئی۔ اب تین ہفتے سے یہیں ہوں اور استنبول کی گلیاں۔ نہ وہ ختم ہوتی ہیں۔ نہ میرا شوق۔ یورپ کے اکثر سیاحوں نے لکھا ہے کہ یہ شہر تو لاجواب ہے۔ مگر اس کی گلیاں خراب ہیں۔ گلیوں میں صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں۔ ان سے بدبو آتی ہے۔ ان میں قدم قدم پر کتّے لیٹے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن اگر انہیں اس شہر کی بے انتہا دلچسپیوں کی شناخت کے لئے آنکھ دی گئی ہوتی تو وہ ان عیوب سے قطع نظر کر کے اس کے محاسن کو دیکھتے۔ اور اب بھی کئی قدرشناس سیّاحوں نے بیحد داد دی ہے۔ یہ عیوب عارضی ہیں۔ بہ نسبت سابق بہت کم ہو گئے ہیں۔ اور امید ہے کہ دن بدن

صفائی میں ترقی اور سڑکوں اور راستوں کی درستی پر زیادہ توجہ ہوتی جائے گی دیکھنے کی جو چیز اس شہر میں ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بانیوں نے اس کے لئے ایسا موقعہ ڈھونڈھا ہے۔ جس نے اسے سارے جہان کا انتخاب بنا دیا۔ ایک طرف ایشیا اپنی قدامت کو سنبھالے کھڑا ہے اور دوسری طرف یورپ اپنی جدّت طرازی پر اترا رہا ہے اور درمیان میں استنبول ہے۔ گویا ایشیا کا یورپ سے ڈانڈہا ملا ہوا ہے۔ ایک طرف سے استنبول یورپ کی اقوام مختلفہ کا مرجع ہے اور دوسری طرف سے ایشیا کی قومیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ خصوصاً ایشیا کی مسلمان اقوام اس مقام کی قدرتی خوبیوں اور اس کے تجارتی فوائد کے سوا یہاں مذہبی کشش بھی ہے۔ مزید براں خود ملک کے اندر بھی مختلف مذاہب اور اقوام کی کمی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ

جمگھٹا ہے اس میں ترک و فرس و رُوم و زنگ کا
یعنی گلدستہ ہے اک گلہائے رنگارنگ کا

پُل کی سیر۔ آؤ تھوڑی دیر کے لئے اُس پل پر کھڑے ہو جائیں جو اس خلیج پر بنا ہوا ہے جسے اہلِ یورپ "شاخ زرّیں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دیکھنے کو تو یہ پل پُرانا اور خستہ سا ہے اور سُنتے ہیں کہ کسی جرمنی کمپنی کو ایک نیا اور شاندار پُل بنانے کے لئے ٹھیکہ دیا گیا ہے۔ مگر اس کی دقیانوسی ساخت سے درگذر کر کے اس انبوہ پر تو ذرا نظر ڈالو۔ جو پُل پر سے گذر رہا ہے۔ بوڑھے۔ جوان پُرانے۔ نئے۔ عورت۔ مرد۔ کالے۔ گورے۔ فرنگستانی اور ایشیائی کس طرح ملے جُلے گذر رہے ہیں۔ کوئی اکڑ کر نہیں چلتا کہ اس مقبول گذرگاہ سے ہو کر نکلنا صرف اُسی کے لئے روا ہے۔ مساوات کے اصول کا حق یہاں ادا کر دیا گیا ہے اور تصویر کی بوقلمونی درجۂ کمال کو پہنچا دی گئی ہے۔ اس سے دلاویز تر تصویر چشم تصوّر نے بھی نہ دیکھی ہو۔ سُرخ ترکی ٹوپیاں اور ان کے کالے پھندنے سب سے پہلے اپنی کثرت کی وجہ سے نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مگر کسی پُرانی وضع کے بزرگ

کی خوشنما قبا اور ٹوپی کے گرد سفید عمامے کے پیچ دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ اور آنکھ کو کہتے ہیں کہ دیکھ باوفا اس طرح نباہ کرتے ہیں۔ زمانہ بدل جائے تو بدل جائے مگر یہ اپنے اصول پر ثابت قدم رہیں۔ انہیں کے ساتھ وہ سبز عمامے والے حضرت کون گذر رہے ہیں، سبز عمامہ یہاں نشانِ سیادت ہے۔ سیّد سب سبز عمامہ پہنتے ہیں۔ اور یہ امتیاز اُن کے لئے مخصوص ہے۔ اور کوئی سبز عمامہ نہیں پہن سکتا۔ اچھا تو یہ حضرت خاندانِ نبوّی کی یادگار ہیں۔ ان کے برابر ایک ٹوپی پوش فرنگی گذر رہا ہے۔ لیکن کس سادگی سے۔ نہ وہ سمجھتا ہے کہ ہچو ما دگرے نیست۔ نہ ہمارے ان حضرت کو یہ خیال ہے کہ اس سے چُھو گئے تو دامنِ عبا پلید ہو جائیگا۔ سامنے سے ایک ارمنی پادری آ رہا ہے۔ سیاہ چوغہ۔ کُھلی آستینیں۔ سیاہ اونچی ٹوپی۔ بہت بڑی داڑھی۔ اور بال لمبے۔ جنہیں وہ چوٹی کی طرح لپیٹ کر پیچھے لٹکائے ہوئے ہے یہ نئی چیز دیکھنے میں آئی۔ یہی وہ عالی جناب ہیں جو اکثر چپکے چپکے بکھیڑے کھڑے کر دیا کرتے ہیں اس وقت تو بہت بھولے بھالے اور غریب سے نظر آتے ہیں اور نہایت امن پسندی سے جا رہے ہیں۔ مگر ہیں طرفہ معجون مرکّب۔ عادات میں مشرقی تعصب میں مغربی۔ آزادی کی اہلیت کم۔ مگر شوق زیادہ۔ لیکن ان کے دیکھنے میں کون زیادہ وقت صرف کرے۔ ان سے بڑھ کر ایک قابلِ توجہ نظارہ موجود ہے۔ وہ سیاہ ریشمی برقعے سے کیا چلے آ رہے ہیں۔ آہا یہ ترک مستورات ہیں۔ ترکوں کی اکثر رسمیں مغربی اور مشرقی تمدّن کی ترکیب سے پیدا ہوئی ہیں۔ ان ہی میں ان کا پردہ ہے۔ جو نہ ہندوستان کے مسلمان شرفا کے ہاں کے پردے کی طرح حد سے بڑھا ہوا ہے اور نہ یورپ کی بے پردہ قوموں کی طرح عورتوں اور مردوں کے بیباکانہ خلا ملا کی اجازت دیتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ ترکی عورتیں اپنے خاص برقعے پہن کر گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ بازار میں سودے خریدتی ہیں۔ ریل پر سوار ہوتی ہیں۔ جہاز پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہیں۔ مگر کیا ریل پر کیا جہاز میں اُن کے لئے مردوں سے علیحدہ جگہ بنی ہوئی ہے۔ برقعہ عموماً ریشمی ہوتا ہے اور وہ کام دیتا ہے۔ جو ایک

نہایت کھلی ساڑہی (جو انگریزی لباس کے اوپر اُس لباس کو ڈھانپنے کے لئے باندہ لی جائے) دے سکے۔ ایک سیاہ ریشم کا نقاب منہ پر پڑا رہتا ہے۔ گو بعض سن رسیدہ عورات یا بعض منچلی نوجوان عورتیں اُسے اُٹھا کر بھی چلتی ہیں مستورات کے اُس جھنڈ میں جو نظر آیا تھا۔ ایک حبشی عورت بھی ہے جو منہ سے نقاب اُلٹے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ یہ کوئی خادمہ ہے۔ جسے انہوں نے ساتھ لے لیا ہے۔ لیکن حبشی عورت اپنے ملک کی اکیلی قایم مقام نہیں جو اس پُل پر اسوقت چل رہی ہے۔ دو تین حبشی مرد بھی چلے جا رہے ہیں۔ وہی چپٹی ناک۔ وہی سفید نہایت سفید دانت۔ وہی موٹے موٹے ہونٹ۔ لباس پورا ترکی۔ یعنی عمدہ یورپین فیشن کا کوٹ پتلون اور اُس پر ترکی ٹوپی۔ صورت سے خوشحال معلوم ہوتے ہیں ایک کی جیب سے سونے کی زنجیر بھی آویزاں ہے۔ یہ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ کسی سے پوچھو تو سہی۔ جواب ملتا ہے کام یہ کیا کریں گے۔ یہ کسی بڑے حرم کے خواجہ سرا ہیں۔ چونکہ یہ قدیم رسم بڑے بڑے گھروں میں ابتک باقی ہے۔ یہ چند نمونے رہگزروں کے جو ہم نے انتخاب کئے۔ ان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سب سفید پوش اور خوشحال ہی پُل پر سے گذرتے ہیں۔ پھٹے کپڑوں والا غریب سائل بھی وہیں ہے۔ ایک طرف ایک نابینا حافظِ قرآن آیاتِ قرآنی باواز بلند پڑھ رہا ہے۔ کہ کوئی اُس کی حالت پر رحم کھائے اور اُسے کچھ دے جائے۔ کہیں مٹھائی والا مٹھائی بیچ رہا ہے۔ کہیں شربت والا شربت پینے کے لئے ہر ایک کو بلاتا ہے۔ ایک سقا بھی ہے جو محض ٹھنڈا پانی پلا کر دھیلا پیسہ لے لیتا ہے مگر یہ سقا ہمارے ہاں کے سقے کی طرح ایک بھاری چمڑے کی کھال کندھوں پر لادے ہوئے نہیں ہے بلکہ ایک شیشہ پانی کا ہاتھ میں لئے ہے جو ہمارے ہاں کے گلاب یا بید مشک یا کیوڑے کے شیشے کی طرح ٹوکرے میں رکھا ہوا ہے۔ اور اُس سے پانی نکال نکال کر گلاسوں میں لوگوں کو پلاتا ہے۔ غرض استنبول کے اس ایک مقام کی رنگا رنگی کے بیان سے بھی قلم عاجز ہے۔ بہتر ہے کہ اب

اس منظر کو چھوڑ کر کسی اور منظر کو لیں۔

والبور۔ پُل کے وسط کے قریب جہاں ہم کھڑے سیر دیکھ رہے ہیں۔ ایک کھڑکی کے گرد ہجوم ہے۔ لوگ کہیں جانے کے لئے ٹکٹ لے رہے ہیں۔ آیئے ہم بھی ٹکٹ لے لیں۔ ٹکٹ گھر کے پاس چند زینے نیچے اُتر کر ایک سیڑھی لگی ہے اُس سے تختۂ جہاز پر چڑھ جایئے۔ جہاز دُخانی ہے۔ اسے عربی اور ترکی میں واَبور کہتے ہیں (یہ لفظ اصل میں فرانسیسی سے لیا گیا ہے) یہ جہاز مخصوص کمپنی کا ہے جس کے جہاز استنبول کے قرب و جوار میں دن میں کئی دفعہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کا انتظام خاصہ ہے۔ اسی قسم کے جہازوں سے جو ہم نے اور جگہ دیکھے ہیں۔ کسی طرح بُرے نہیں۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں بجائے ایک خاص حصۂ جہاز میں گراں قیمت پر ملنے کے تختۂ جہاز پر ارزاں بکتی ہیں۔ مسافروں کی آسائش کے لئے متفرق چیزیں بیچنے والے کمپنی کی اجازت سے جہاز پر آ جاتے ہیں۔ اور لوگ بیٹھے کھاتے پیتے چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ جہاز سقوطری کی طرف جسے اسکودرا بھی کہتے ہیں۔ اور جو قسطنطنیہ کا ایشائی حصہ ہے۔ جا رہا ہے۔ چلے کو بیس منٹ ہوئے ہونگے کہ ہم ساحلِ ایشیا پر آ پہنچے کیا کہوں کن خیالات کا ہجوم اُس وقت دل پر ہوا۔ جس دن سے خاکِ پاک ایشیا کو چھوڑ کر یورپ آیا ہوں۔ اُس دن سے اس مبارک سرزمین کے ساتھ محبت اور بڑھ گئی ہے۔ خیال آیا کہ گو وطن سے ایشیا کا یہ گوشہ نہایت دور ہے۔ پھر بھی ایشیا ہے۔ جسے دو سال بعد دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اس سے مسرت ہوئی۔ ساتھ ہی خیال آیا۔ کہ ابھی پھر یورپ واپس جانا ہے۔ اور وطن پہنچنے میں ابھی عرصہ باقی ہے اس سے قلق ہوا۔ اتنے میں عقل نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ لنڈن بیٹھے وطن سے جتنی دور تھے دونوں کے حساب سے دیکھو تو ایشیا کے اس کنارے پر اُس سے زیادہ دُور ہو۔ اگر بغداد کی ریل بن چکی ہوتی۔ جب کسقدر قریب ہوتے آخر سب خیالات اور دلائل پر یہ خیال غالب آیا۔ کہ یہ ایشیا ہے۔ اگر اس میں کچھ

شک بھی ہوتا۔ تو چند قدم چلنے میں شک رفع ہو جاتا۔ گاڑیاں ایشیائی وضع کی مسافروں کو لینے کے لئے کھڑی ہیں۔ گاڑی والے مسافروں کو بُلانے میں اسیطرح ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ گاڑیوں کے اڈے سے آگے چلیں تو کئی دوکانیں میوہ اور سبزی بیچنے والوں کی ہیں۔ کہیں خربزوں کے ڈھیر زمین پر لگے ہوئے ہیں اور کہیں تربوزوں کے۔ غریب لوگ وہیں خرید کر پاس بیٹھے کھا رہے ہیں۔ نان بائی کی دوکان نان کباب گرما گرم کی دعوت ہو رہی ہے۔ سگ و درویش شہر کے یورپی حصّے میں بھی موجود تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ پہچانتے ہیں کہ یورپ میں ہیں۔ یہاں وہ آگاہ معلوم ہوتے ہیں کہ ایشیا ہے۔ اور وہ آزاد ہیں۔ اور کوئی آزاد ہو نہ ہو۔

تُرکی قبرستان۔ شہر کا چکّر ختم کر کے بیرون شہر نکل جائیں تو عجب عبرت خیز نظّارہ پیش نظر ہوتا ہے۔ اسکودرا کا قبرستان میلوں میں ہے اور سرو جو یہاں خفتگانِ خاک کی پاسبانی کرتے ہیں۔ سمندر سے ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ اس قبرستان کی تاریخ تو خدا ہی جانے۔ صدیوں سے آباد ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے جیسے شہر میں زندہ کوئی نہیں ہوگا۔ اور شہر کی آبادی دیکھکر (خدا اسے چشم زخم عالم سے بچائے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی مرتا نہیں ان قبروں کو ذرا غور سے دیکھنے سے پہلے ایک فاتحہ پڑھ کر ان دلیروں کی حق میں دعائے مغفرت کرلیں۔ جنھوں نے زمانۂ گذشتہ میں اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ایشیا کا سکّہ یورپ کے دل پر بٹھانے کی خاطر سرحدِ یورپ کو اپنا مدفن بنایا ہے۔ فاتحہ پڑھتے وقت حضورِ قلب حاصل کرنے کے لئے آنکھ خود بخود بند ہو گئی۔ بعد فاتحہ جو آنکھ کھلی تو یہاں کے قبرستان کا ایک نیا دستور نظر آیا ہر قبر پر ایک بڑا سا پتھر کا کتبہ استادہ ہے۔ جس پر عربی یا ترکی میں مرحوم کے اوصاف لکھے ہیں۔ اور اس کے لئے دعائے خیر لکھی ہے۔ اور اس پتھر کے سر پر یا عمامے کی صورت ہے۔ یا ترکی ٹوپی کی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس

تربت میں مرد مدفون ہے۔ عورتوں کی تربت کے لئے نشان جُدا ہے۔ جو عموماً ایک سنہری سا پھول ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی عورت بیاہ کے بغیر مر گئی ہو تو اُس کے کتبے کی زینت خاص کوشش سے کی جاتی ہے۔ گویا جس زینت سے وہ محروم گئی۔ اس کا کچھ حصّہ اس کے مدفن کو دیا جاتا ہے۔ مجھے یہ رسم نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ گو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے جائز ناجائز یا مناسب نامناسب ہونے کے متعلق بزرگانِ دین کی کیا رائے ہو۔

ترکی قہوہ خانہ۔ یادِ رفتگان گو ہمارا ایک فرض ہے۔ اور اسی لئے اس کو ادا کرنا لازم سمجھا۔ لیکن زندوں کو زندوں سے زیادہ کام ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اکثر احباب کہیں گے کہ مناظر کے ذکر میں پہلے ہی اسے قبرستان کہاں سے یاد آگیا۔ اچھا تو آئیے اپنی کوفت رفع کر لیجئے۔ جہاز کا وقت آگیا ہے۔ اُس میں سوار ہو لیجئے۔ سستا لیجئے۔ کچھ برف وغیرہ کا شوق ہو تو کھا لیجئے۔ ایک پاؤ گھنٹے میں آپ کو پھر پُل پر لے چلتا ہوں۔ اور اُس پر سے استنبول کی طرف جاتے ہوئے جو پہلا قہوہ خانہ آئیگا۔ وہاں آپ کو بٹھا دونگا۔ بیٹھے بیٹھے جہان کی سیر کرتے رہیگا استنبول میں یوں تو سیکڑوں رستوراں یورپی نمونے کے ہیں۔ مگر اُن کی کیفیت عام طور پر معلوم ہے۔ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ اور نہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ہاں ترکی قہوہ خانہ یہاں کا ایک اعجوبہ ہے۔ فرانس اور انگلستان وغیرہ میں جو رونق شراب خانوں کو ہے وہ یہاں قہوہ خانوں کو ہے۔ جس طرح وہاں غریب سے غریب مزدور بھی تھوڑی سی شراب پینے شراب خانے میں ضرور جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کی مزدوری پیشہ اور کام کاج والے لوگ اور بہت سے بیکار لوگ بھی قہوہ خانے کو رونق دیتے ہیں۔ تیسرے پہر قہوہ جی یعنے قہوہ بیچنے والا چھوٹے چھوٹے رسّیوں سے بنے ہوئے مونڈھے دوکان کے باہر فرش پر قطار در قطار رکھ دیتا ہے۔ یہانتک کہ راستہ قریب قریب رُک جاتا ہے۔ اور لوگ آ کر اُن پر بیٹھنے شروع ہوتے ہیں کوئی تو دن بھر کی محنت سے تھک کر آتے ہیں اور آرام کے مستحق ہوتے ہیں۔ کوئی

گھر کے آرام سے اُکتا کر باہر نکل آتے ہیں کہ رہگزر کے تماشے سے دل بہلائیں گے۔ وہیں حقہ پیتے ہیں۔ وہیں قہوہ کی کئی کئی پیالیاں پی جاتے ہیں۔ اور اکثر ہاتھ میں تسبیح لے آتے ہیں۔ اسے بھی ہلاتے رہتے ہیں۔ یہاں عجیب عجیب فیشن نظر آتے ہیں۔ ایک کا انداز دوسرے سے جُدا ہوتا ہے۔ مگر عادات میں اتحاد ہے۔ شطرنج کا شوق بہت عام ہے اور ہر قہوہ خانے میں کئی کئی شطرنج بچھے رہتے ہیں اور ہر وقت لوگ کھیلتے رہتے ہیں۔ آپ کو اگر قہوہ کا شوق نہیں تو شربت یا کوئی اور ایسی ہی چیز مانگ لیجئے۔ اور اس گروہ کا جو یہاں جمع ہو رہا ہے جزو بن جائیے۔ پھر دیکھئے اگر گھنٹوں بیٹھنے کے بعد بھی آپ کا جی اُکتا جائے تو کہئے طرح طرح کے لوگ سامنے سے گذر رہے ہیں۔ وہ آپ کو تماشا سمجھتے ہیں او گھورتے ہیں۔ آپ اُنہیں تماشا سمجھئے اور گھوریئے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد ؁

ہیرو کا مشہور مدرسہ

ضلع مڈلیسکس میں جو وسط انگلستان میں ہے۔ ایک چھوٹی سی مگر خوشنما پہاڑی پر ایک پُرانا مدرسہ ہے۔ جس کی شہرت دُور دُور ہے۔ اس مدرسہ کی بدولت یہ چھوٹا سا قصبہ بھی جسے ہیرو کہتے ہیں مشہور ہو گیا ہے۔ اور ہیرو کے مدرسے کا معلّم اوّل ہونا علم و فضل کے درجۂ بلند کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ چند سال ہوئے ہندوستان کے لاٹ پادریوں کے لاٹ یعنی کلکتہ کے لارڈ بشپ پادری ولڈن صاحب تھے اس عہدۂ جلیلہ پر مقرر ہونے سے پہلے پادری ولڈن صاحب ہیرو کے مدرسہ ہی کے افسر اعلیٰ تھے۔ انگلستان کے مشاہیر اور وزرا اور مدبّر عموماً اس ہیرو یا اس کے دوسرے حریف ایٹن کے مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کو عموماً اپنے اپنے مدرسہ سے ایسا اُنس ہوتا ہے۔ کہ باپ کے بعد بیٹا اسی مدرسہ میں پڑھنے جاتا ہے۔ اور بیٹے کے بعد پوتا شوق سے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کا منتظر رہتا ہے

۱۶- جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کو اپنے ہم وطنوں کی ایک جماعت کے ہمراہ مجھے اس مشہور تعلیم گاہ کو سرسری طور پر دیکھنے اور اس کے حالات سُننے کا اتفاق ہوا مسٹر کولڈسٹریم صاحب نے غالباً پادری ولڈن صاحب کے توسط سے اس سیر کا انتظام کیا تھا۔ ہمارے لئے یہ سیر نہایت پُرلطف اور مفید ثابت ہوئی۔ مدرسہ کے کتب خانہ کے محافظ مسٹر لاسیل صاحب جو فضیلت اور خوش خلقی کے جامع معلوم ہوتے تھے۔ مدرسہ کے دروازہ پر ہمیں ملنے کے لئے تشریف فرما تھے۔ اور سب سے پہلے ہمیں ایک بڑے کمرے میں لے گئے جسے اس مدرسہ میں "سپیچ روم" یعنی تقریر کا کمرہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک ہزار آدمی کی نشست کی جگہ تھی۔ گو اس کا رقبہ بادی النظر میں یہ امید نہ دلاتا تھا۔ لیکن انگلستان اور دیگر ممالک یورپ میں جو جا بجا تمام ایسے مقامات میں تھیٹر کے طریق پر سیڑھیاں سیڑھیاں بنا کر اور تعمیر کی صورت گول رکھ کر تھوڑی جگہ میں بہت سے آدمی بٹھانے کی ترکیب مروّج ہے۔ اس سے یہاں بھی کام لیا گیا تھا۔ یہاں ہمیں بٹھا کر لاسیل صاحب نے کہا کہ اس مدرسہ کو ہندوستان سے چند خاص تعلقات حاصل ہیں۔ اوّل تو حکام ہند میں ایک معقول تعداد سالہا سال تک اس مدرسہ میں جاتی رہی ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اور اس ضمن میں لارڈ لٹن سابق وائسرائے ہند کا نام خصوصیت سے لیا۔ سب سے زیادہ جوش کے ساتھ جو نام ہماری جماعت نے سُنا وہ سر ولیم جونز مرحوم کا نام تھا۔ جس نے علوم سنسکرت کی تحصیل میں کمال پیدا کیا اور علوم مشرقی کی قدردانی کی بنیاد اپنے ملک میں ڈالی۔ ولیم جونز نے اسی چاردیواری میں ابتدائی تربیت پائی تھی اور اس وسیع علم کا جس کے سبب سے وہ مشہور ہے بیج پہلے پہل اس کے دل میں یہیں بویا گیا تھا۔ اس تمہید کے بعد لاسیل صاحب نے مدرسہ کی ابتدائی کیفیت ہمیں سُنائی۔ کہ پہلے یہ مدرسہ ایک شخص لائن نامی کی وصیت سے بہت ہی چھوٹے پیمانے پر اور بہت ہی محدود غرض سے قایم کیا گیا تھا۔ اس کا ابتدائی منشا مذہبی تھا اور چونکہ لوگ اس زمانے

میں لوگ لاطینی زبان کو بہت مقدس مانتے تھے اس لئے اس کی وصیت صرف لاطینی پڑھائے جانے کے متعلق تھی۔ رفتہ رفتہ جب مدرسے کو وسعت ہوئی اسکے مقاصد بھی بڑھنے لگے اور طالب علم اور مضامین سیکھنے کی خواہش ظاہر کرنے لگے اس پر مدت تک بحث رہی۔ کہ کیونکر مدرسہ کے اصلی مدعا میں خلل اندازی کرنے کے بغیر اور کسی مضمون کی پڑھائی اس میں ممکن ہے۔ مگر آخر فیصلہ یہی ہوا کہ ریاضی تواریخ جغرافیہ پڑھائے جائیں۔ اور یہ مقاصد وسیع ہوتے ہوتے یہ نوبت پہنچگئی ہے۔ کہ اب سب مضمون قریب قریب یہاں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور علوم جدیدہ اور طبعیات وغیرہ علمی چیزوں کی تعلیم بھی جاری ہو گئی ہے۔ البتہ طالب علموں کو اختیار ہے۔ چاہے السنۂ قدیمہ کے علم ادب کا نصاب پسند کرلیں اور چاہے زیادہ علمی اور مفید نصاب طبعیات وغیرہ کا لے لیں۔ لاسیل صاحب نے یہ بھی بیان کیا۔ کہ عام طور پر گمان کیا جاتا ہے کہ ہیرو بہت دولتمند تعلیم گاہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے پاس سرمایہ بہت ہی برائے نام ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اور عمارات بڑھانے اور زمینیں خریدنے اور اور فوائد زیادہ کرنے کے لئے روپیہ چندہ کے ذریعے سے مدرسہ کے معاونوں اور ہوا خواہوں سے مانگنا پڑتا ہے اور مدرسہ بالکل مکمل نہیں سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ یہ "سپیچ روم" بھی خاص چندہ سے تیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ بڑے مجموں کے لئے اس کی اشد ضرورت تھی اور اب سال کے سال اس میں ایک بڑا جلسہ ہوتا ہے جس میں مُلک کے اکثر شرفا شوق سے آتے ہیں اور لڑکوں کو انعام ملتے دیکھتے ہیں۔ اور ان کی مفید تقریریں سُنتے ہیں۔ اسی واسطے اُس دن کو "سپیچ ڈے" یعنی "روزِ تقریر" کہتے ہیں۔ کرسیوں کی طرف دیکھکر لاسیل صاحب بولے۔ کہ ابھی اس کمرہ میں کرسیاں بھی تو ہمارے حسب منشا موجود نہیں ہیں۔ چاہئے یہ کہ سارے ہال میں عمدہ لکڑی کی یک رنگ کرسیاں ایک ہی وضع قطع کی موجود ہوں۔ اس سے جگہ بھی کم رُکتی ہے اور وہ خوشنما بھی زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس سامان کے لئے روپیہ کی فکر تھی۔ ایک

مہربان خاتون نے تجویز پیش کی۔ کہ مناسب ہے کہ مدرسہ کے پرانے طلبہ سے درخواست کی جائے کہ اُن میں سے ہر شخص جو چاہے اور توفیق رکھتا ہو۔ ایک کرسی کمرہ کی نذر کر دے۔ اور اُس کی پشت پر اپنا نام لکھوا دے۔ تاکہ مدرسہ میں اسکی یادگار بھی رہے اور مدرسہ پر بوجھ بھی نہ پڑے۔ یہ ترکیب بہت کامیاب ہوئی اور آٹھ سو سے زیادہ کرسیاں اس طرح پرانے طلبہ سے آچکی ہیں۔ ابھی پچھلی قطاروں میں چند بے جوڑ کرسیاں رکھی ہیں۔ مگر وہ بھی اب رفتہ رفتہ اُٹھتی جاتی ہیں۔ اس تقریر کے بعد لاسیل صاحب ہمیں پرانے مدرسہ کی طرف لے گئے۔ کمرہ سے نکلتے وقت ہم میں سے ہر ایک ایک خاص اثر اپنے دل پر لایا جو خیالات میرے دل میں اُس وقت تھے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ ہیرو جیسے بڑے اور نامی مدرسہ کی ابتدا معمولی ہی تھی۔ پس معمولی ابتدا کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئیے۔ کون جانتا ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کی سرزمین میں جو چھوٹے چھوٹے پودے لگائے جا رہے ہیں۔ اُن میں سے کتنے ہیرو اور ایٹن بن جائیں گے۔ اگر ہمیں زمانہ نے مہلت دی اور ہمارے قومی باغبان اُن پودوں کی خبر گیری سے غافل نہ ہو گئے۔

۲۔ ہیرو کو بھی آجتک روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور قوم گھبراتی نہیں اور روپیہ دیئے جاتی ہے۔ اور ہیرو میں بھی چندہ مانگنے کے لئے وہ سب تدابیر کرنی پڑتی ہیں جن سے ہمارے ہاں کے تعلیمی کارکنوں کو سابقہ پڑتا ہے اور جن سے وہ کبھی کبھی اُکتا جاتے ہیں۔ پس اُنہیں اُکتانا نہیں چاہئیے۔

۳۔ انگلستان میں بھی پہلے تعلیم گاہیں مکتب اور پاٹ شالا کی طرح تھیں۔ رفتہ رفتہ مکتب اور پاٹ شالا ترقی کرتے کرتے بڑے بڑے سکول اور کالج اور یونیورسٹیاں بن گئے ہیں۔ اور ان کو بھی مذہبی تعلیم کی جگہ یا اُس کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کے داخل کرنے میں وہی مشکلات پیش آئی ہیں۔ جن کا ہم کو اس وقت سامنا ہے۔

۴۔ کرسیاں جمع کرنے کا پچھلا خاصہ رہا۔ کبھی کسی ایسی ہی ضرورت کے لئے ہمارے قومی کالج اور مدرسے اور ان کے منتظمین بھی اس نسخہ کو برت کر دیکھیں۔

خیر، ہجوم خیالات کا ذکر تو پھر بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت سیر کی کیفیت کا بیان مقصود ہے۔ تقریر کے کمرہ سے نکل کر ہم پرانے مدرسے میں گئے۔ مدرسہ کا یہ حصّہ سُرخ اینٹوں کی ایک سادہ سی عمارت ہے۔ جس کے اندر لکڑی کی بنچیں رکھی ہیں۔ جو زمین سے کوئی دو بالشت اونچی ہونگی گھس گھس کر اُن میں نشیب و فراز پیدا ہو گئے ہیں۔ جو نہایت چھوٹے پیمانے پر ارد گرد کے قدرتی منظر کے نشیب و فراز سے مشابہ ہیں۔ ان چھوٹی بنچوں پر خدا جانے کتنی پشتوں سے طالب علم بیٹھتے رہے ہیں۔ دیواریں لکڑی کے تختوں سے منڈھی ہوئی ہیں۔ اور ان تختوں پر اکثر طلبہ اپنا اپنا نام کندہ کر گئے ہیں۔ اسی کمرہ میں ایک تختہ پر ولیم جونز نے بھی اپنی طفولیت میں اپنا نام لکھا ہے۔ نام قایم رکھنے کا یہ شوق بھی قدرت نے ہر سینہ میں عجیب چیز پیدا کی ہے۔ طرح طرح سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن مشہور عمارات کی دیواروں پر نام کریدنا اس کی عام ترین اور شاید سب سے ادنیٰ صورت ہے۔ بعض تو ایسے نام ایسی دیواروں پر کندہ ہیں۔ کہ دنیا اُن سے بے خبر ہے۔ اور دیواریں بھی کچھ نہیں بتاتیں کہ وہ لوگ کون تھے اور کیا ہوئے۔ لیکن کئی ایسے بھی ہیں۔ کہ وہ دیواروں سے اُڑ کر صفحۂ ہستی پر منقوش ہو گئے ہیں اور پکار کر کہہ رہے ہیں۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ولیم جونز کا نام بھی انہی ناموں میں ہے۔ بچپن میں جب اُستاد اور ہم سبق دونوں کی نظر بچا کر دیوار پر نام کرید رہا ہوگا۔ اُسے کیا خبر ہوگی۔ کہ تقدیر اُسکا نام علوم مشرقی کی لوح پائدار پر کندہ کر رہی ہے۔ اور اُس کا نام کو حیاتِ جاوید کا خلعت بخشا جا رہا ہے۔

پُرانے مدرسہ کی سیڑھیاں اس تعلیم گاہ میں ایک خاص رسم سے منسوب ہیں

ایک اُستاد دن میں دو دفعہ ان پر کھڑا ہو کر حاضری پکارتا ہے اور لڑکے اپنی اپنی حاضری دے کر کھسکتے جاتے ہیں۔ یہ سیڑھیاں اُتر کر ایک خاصہ وسیع صحن ہے جس میں پکا فرش ہے۔ مگر سڑک سے جو مدرسے کے پاس جا رہی ہے یہ صحن بھی مرتفع ہے۔ اور مدرسہ کی تعمیر کی دوسری طرف بہت نشیب میں ہے اس لئے اس صحن میں کھڑے ہو کر دور تک گرد و نواح کے سبزہ زار کا نہایت فرحت بخش نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس عمارت اور مدرسہ کے متعلق ایک اور چھوٹی سی عمارت کے درمیان ایک ٹکڑا زمین کا کوئی سات آٹھ گز لمبا اور پانچ گز چوڑا بیکار پڑا ہوا ہے۔ جس پر کوئی عمارت نہیں۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیوں بیکار پڑا ہے۔ تو جواب ملا کہ محض قدامت پرستی کی وجہ سے۔ ایک زمانے میں یہ لڑنے کی جگہ تھی۔ کہ مدرسہ میں اگر دو طالب علم کسی وجہ سے لڑیں تو اور کسی حصہ میں لڑنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر اس چھوٹے سے ٹکڑے پر کھڑے ہو کر لڑنا اور ایک دوسرے کو مکے مارنا مباح تھا۔ اب وہ رسم عرصہ سے موقوف ہو گئی۔ مگر اس کا نام "قطعۂ زد و کوب" ہی رہا اور اس لئے کوئی اس پر عمارت بنانیکی جرأت نہیں کرتا۔ ہندوستان میں یہ بات عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ انگریز قدامت پرستی۔ اور اپنی پرانی رسوم بلکہ توہمات تک کی پابندی میں کسی سے کم نہیں۔ یہاں اگر کوئی غور سے دیکھے تو چپے چپے پر ان کے پابند رسوم ہونیکا ثبوت ملتا ہے۔

پرانے مدرسے سے نکلکر کتب خانے کی طرف آئیے۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان سڑک حائل ہے۔ کتب خانہ کی عمارت نسبتاً نئی اور زیادہ خوشنما ہے اس کا موقع نہایت ہی عجیب واقع ہوا ہے اور اس کی کھڑکیوں سے وسط انگلستان کی قدرتی سبزی کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ کتب خانہ میں تمام نامور طلبہ اور اساتذہ کی بڑی تصویریں آویزاں ہیں۔ اور کوئی گیارہ ہزار کتابیں مختلف علوم کی موجود ہیں۔ اور دو اڑھائی سو کتابیں بالاوسط ہر سال نئی خرید کے بڑھائی جاتی ہیں بعض پرانے خطوط اور مشاہیر کی اور نشانیاں اسی کمرہ میں شیشہ کی الماریوں میں سجی

ہوئی ہیں اور ہر اعتبار سے یہ کمرہ ایسا ہے جس میں بیٹھکر پڑھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

کتب خانہ کے قریب ایک دوسری عمارت ہے جو اس مدرسہ کا عجائب خانہ ہے۔ یہاں یہ دستور ہے کہ ہر مدرسہ کے ساتھ سبق الاشیاء کے طور پر ایک عجائب خانہ رہتا ہے کہ جن چیزوں کا ذکر طالب علم پڑھیں اُن کو اپنی آنکھ سے دیکھ بھی لیں۔ تاکہ جو کچھ پڑھیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ مگر یہ عجائب خانہ اس مدرسہ کی شان کے لائق ہے۔ کیونکہ مدرسوں کے معمولی عجائب خانوں سے زیادہ وسیع پیمانے پر ہے۔ ایک حصّہ علوم طبیعاتِ جدیدہ کے لئے مخصوص ہے اور دوسرا کلاسِک یعنی علوم قدیمہ کے لئے ہے۔ اور دونو کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس کے قریب ایک گرجا ہے۔ جو یہاں ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ہونا لازم سمجھا جاتا ہے۔ اس گرجے میں طلبہ اور اساتذہ ہر اتوار کو عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس کی تعمیر بھی مذہبی خیال کے لوگوں کے چندہ سے ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ کیونکہ یہ بعینہ اسی خیال کا پرتو ہے جس سے بہت سے مخیّر ہمارے ملک میں تعلیم گاہ کی مدد پر اُس تعلیم گاہ کے احاطہ میں ایک عبادت گاہ بنانے کو ترجیح دیتے ہیں اور کارکن اُن کی امداد کو بھی خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی ضروری کام ہے اور ہر شخص حق رکھتا ہے کہ اس چیز میں مدد دے جو اس کے خیال میں زیادہ وقعت کے قابل ہو۔ ذرا سی تلاش سے یہاں اور وہاں کی بہت سی باتیں مشترکہ ملتی ہیں۔ اور کیوں نہ ہو فطرتِ انسانی تو آخر ہر جگہ ایک ہی ہے۔

ہیرو کے مدرسہ کے طلبہ کی موجودہ تعداد پانچ اور چھ سو کے درمیان ہے۔ اُن کے جھنڈ کے جھنڈ ہم نے جماعتوں سے نکلتے یا جماعتوں میں جاتے دیکھے۔ سب کی ایک وردی تھی۔ سیاہ صدری اور سیاہ کوٹ۔ کوٹ کی تراش بالکل وہی

تھی جو انگلستان میں عام طور پر شام کے لباس کے ساتھ پہنا جاتا ہے۔ یعنی جو آگے سے چھوٹا اور پیچھے کی طرف لمبا ہوتا ہے۔ آج کل غالباً موسم گرما کی وجہ سے سب خود رنگ فلالین کی پتلونیں پہنے تھے۔ اس لباس سے یہ جہاں ہوں پہچانے جاتے ہیں۔ اور یہ یکرنگی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

طلبہ کی بود و باش کے لئے ہیرو میں کوئی بڑا بورڈنگ نہیں ہے۔ اور نہ اُن کے قیام کی کوئی جگہ مدرسہ کی کسی تعمیر سے ملی ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی بجائے یہ انتظام ہے کہ قصبہ بھر میں جا بجا مکان مدرسہ والوں کی منظوری سے مقرر ہیں جن میں ہر ایک میں بیس پچیس طلبہ کی رہائش ہے اور ہر گھر میں اُن کی نگرانی کے لئے ایک ماسٹر مقرر ہے۔ افسوس کہ ان گھروں میں سے کسی کو دیکھنے کا ہمیں موقعہ نہ تھا۔ اور اس لئے اس طریق کے حسن و قبح پر کچھ رائے دینا مشکل ہے۔

جمناسٹک کی ورزش کے لئے ایک مکان قریب ہی موجود ہے۔ مگر گیند بَلے وغیرہ کے لئے نہایت وسیع زمین کسیقدر فاصلہ پر ہے۔ لڑکے کھیلتے بھی ہیں پڑھتے بھی ہیں۔ ایک دوسرے سے علمی ترقی میں مقابلہ بھی کرتے ہیں اور اسی طرح رفتہ رفتہ دنیاوی زندگی کی جدّ و جہد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ انگلستان کے ان بڑے مدارس کے طریق تعلیم پر بعض اعتراضات بھی کئے جا سکتے ہیں۔ مگر اُن کے لئے علیحدہ مضمون درکار ہے۔

نصائحِ رفاعیہ

مجھے استنبول کے سفر میں جو صحبتیں نصیب ہوئیں۔ اُن میں سب سے گہرا نقش دل پر اُس بزم مختصر نے چھوڑا۔ جو شیخ محمد ابوالہدیٰ سردار طریقت رفاعی کے ہاں دیکھی یہ بزرگ تیس سال سے مقربین بارگاہِ سلطانی میں ہیں اور دنیا کا زر و مال اُن کے لئے ہر وقت حاضر ہے۔ اس پر تواضع اور حسن خلق کا نمونہ ہیں۔ اور

دن رات سوائے یادِ حق اور تلقین شرع کے کوئی شغل نہیں رکھتے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے کئی مجلسیں بنیں اور کئی بگڑیں۔ کئی لوگ بڑھے اور کئی گرے۔ مگر انہیں کسی سے سروکار نہ رہا اور نہ ہے۔ رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیان سب سے الگ۔ ایک دن اُنھوں نے مجھے ایک چھوٹا سا رسالہ اُردو میں لکھا ہوا عنایت فرمایا۔ جس میں طریقہ مبارکہ رفاعیہ کے سب سے بڑے سرتاج حضرت سید احمد اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سو اقوال کسی نے عربی سے ترجمہ کئے ہیں میں نہیں چاہتا کہ اس نعمت سے اکیلا مستفید ہوں۔ اس لئے ارادہ رکھتا ہوں کہ اس رسالے کو شائع کردوں۔ پیشتر اس کے کہ وہ رسالہ علیحدہ چھپے اور لوگ اس کے فیوض سے بہرہ اندوز ہوں اُن نصائح میں سے بعض جو ہر ملت و مذہب کے اصحاب کے لئے یکساں دلچسپ ہیں یہاں نقل کردیتا ہوں تاکہ اہلِ نظر دیکھیں کہ حکمت کے کیسے دفتر ان مختصر فقروں میں بند کئے گئے ہیں:-

۱- ہمارا طریق ہے نہ مانگیں اور نہ پھیر دیں اور نہ جمع کر رکھیں۔

۲- دعوےٰ تکبّر کا نتیجہ ہے۔ دل اس کی برداشت نہیں کرسکتا۔ اور اُسے زبان کی طرف پھینک دیتا ہے۔ احمق زبان اسے کہہ بیٹھتی ہے۔

۳- تھوڑا ادب اچھا ہے اُس علم و عمل سے جس کے ساتھ ادب نہ ہو۔

۴- تیرا بھائی وہ ہے کہ تیرا نفس اُس پر بھروسا کرے اور تیرے دل کو اس سے آرام ہو اور تجھکو خدا سے باز نہ رکھے۔

۵- اللہ کے ساتھ رہ بصورت موافقت۔ خلق کے ساتھ بہ خیر خواہی لیکن نفس کے ساتھ برسر پرخاش۔

۶- اُمید کو تازہ کر زاہد ہے۔ نہ کہ کملی پہننا۔ اور موٹا کھانا۔

۷- جس نے صبر کی زرہ پہنی۔ شتاب کاری کے تیروں سے بچ گیا۔

۸- حق خاص و عام کے دلوں میں پوشیدہ ہے خواہ وہ حق پر ہوں خواہ باطل پر

۹- اعمال کے محرابوں کی مرمت خیال کے ہاتھوں سے نہیں ہوسکتی۔

۱۰۔ بندۂ زر نہ خدا کا بندہ ہو سکتا ہے نہ خلقِ خدا کا دوست۔
۱۱۔ مروّت کے معنے یہ ہیں کہ اپنے نفس پر اُس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ ڈالے۔
۱۲۔ جب علم کسی راہ میں منزل بناتا ہے تو جہل کو وہاں سے کوچ کرنا پڑتا ہے۔
۱۳۔ خوش خلقی فائدہ مند تجارت ہے۔ قناعت خزانہ ہے۔ دنیا کی محبت میں گرفتار نہ رہنا آبرو ہے۔ توکل پناہ ہے اور عقل کشتیٔ نجات۔
۱۴۔ عذاب کی تلخی گناہ کی شیرینی کو بھلا دیتی ہے۔
۱۵۔ دانشمند کا چراغ کبھی گل نہیں ہوتا۔ اور نہ اُس کی آبرو کی پردہ دری ہوتی ہے۔

ایک مغربی درویش

دو گھنٹے پروفیسر ومبری کی صحبت میں

شہر بوڈاپسٹ اس وقت زوروں پر ہے۔ اہلِ ہنگری اس کی رونق بڑھانے میں دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں۔ دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر دور تک اس پایۂ تخت کی آبادی چلی گئی ہے۔ اس کے عجائب گھر۔ اس کے مدرسے اس کی مجالس ملکی سب دیکھنے کے لائق ہیں۔ اور لوگوں کو دور دور سے کھینچتی ہیں۔ مگر اس کی مشہور یونیورسٹی میں چند باکمال ایسے جمع ہو گئے ہیں جن کا اس کی شہرت کے بڑھنے میں ایک معقول حصّہ ہے۔ ان میں السنہ مشرقی کے نامور پروفیسر ومبیری اہلِ کمال کی صفِ اوّل میں ہیں۔ مَیں جب پچھلے دنوں ایک دوست کی معیت میں سفر کر رہا تھا۔ تو ہمیں پروفیسر موصوف کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ مل گیا حسنِ اتفاق سے ایک انگریز مہربان نے ایک رسمی رقعہ تقریب ملاقات کے لئے دیدیا تھا۔ وہ ہم نے پروفیسر صاحب کے پاس بھیجدیا اُس سے ملنے میں آسانی ہوگئی۔ مگر ملاقات کے بعد جسقدر خلیق اُنہیں پایا۔ اس سے

معلوم ہوا۔ کہ کسی رقعے کے بغیر بھی اُن کا خلق عمیم ہمیں لطف صحبت سے محروم نہ رکھتا

پروفیسر ویمبیری انگلستان میں اور دیگر ممالک یورپ میں مشرقی معاملات کے متعلق عموماً اور اسلامی معاملات کے متعلق خصوصاً نہایت باخبر مانے جاتے ہیں اور گو کئی دفعہ ہمیں اُن سے رائے میں اختلاف ہوا ہے۔ تاہم اس امر کا اعتراف کرنا فرض ہے۔ کہ باعتبار مغربی نژاد ہونے کے اُن کے معلومات تعجب خیز ہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ برسوں اسلامی ممالک میں رہی ہیں اور عام یورپین لوگوں کی طرح نہیں کہ الگ تھلگ۔ بلکہ گھل مل کر ایک مسلمان طالب علم کے بھیس میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ استنبول میں پرورش پائی اس لئے ترکی سہولت سے بولتے ہیں۔ تاتاری مدارس میں برسوں رہے اور وہاں عربی فارسی اور دینیات اسلام کی تحصیل کی۔ چونکہ اس زمانے میں درویشی رنگ اختیار کیا تھا۔ اس لئے اب تک اپنے آپ کو درویش کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی طبیعت میں وہ رنگ سرائت بھی کر گیا ہے۔ گو اب اُن کی بود و باش پوری یورپین ہے اور صحبت بھی زیادہ اپنے مغربی بھائیوں سے ہے۔ تاہم پُرانا رنگ اتنا گاڑھا تھا کہ مٹ نہیں سکا۔ اب تک برابر جھلک دکھا جاتا ہے۔

ستمبر ۱۹۰۶ء کی ستائیسویں تاریخ اور جمعرات کا دن تھا کہ کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم نے پروفیسر ویمبیری کے دروازہ پر دستک دی۔ ہم انگریزی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مگر سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ لیکن ہماری ٹوپیوں سے کچھ متحیر نہ ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس گھر میں ایسے ملاقاتی پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ ہمارے کارڈ اور تقریب ملاقات کا رقعہ اندر لے گئی اس کے بعد بہت جلد ہمیں بلانے آئی اور اُن کے کتب خانے کے کمرہ میں پہنچا کر چلی گئی۔ کمرہ وسیع اور روشن تھا۔ ایک معقول قالین کا فرش چند کرسیاں ایک آرام کرسی اور دریچے کے پاس کونے میں ایک میز۔ بس کتابوں کی الماریوں اور تین چار تصویروں کے سوا یہی سامان اُس وسیع کمرہ کی زینت تھا۔

ایک مسن بزرگ میز کے قریب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھے اور تپاک سے ملے۔ ہاتھ ملایا۔ مزاج پُرسی کی اور میز سے ذرا فاصلے پر جہاں تین چار کرسیاں رکھی تھیں وہاں ہمیں بٹھایا۔ خود بھی لکھنا چھوڑ کر پاس آ بیٹھے۔ ہم نے دیکھا کہ کسیقدر لنگڑاتے ہیں۔ قد میانہ ہے یا اُس سے بھی کچھ کم۔ بدن متوسط ہے نہ فربہ نہ لاغر۔ بال سفید ہیں +

بیٹھتے ہی اُنہوں نے انگریزی میں پوچھا۔ کہ فارسی بولتے ہو۔ میں نے کہا "ہاں کسیقدر" بس پھر کیا تھا فارسی میں باتیں ہونے لگیں۔ فارسی نہایت عمدہ بولتے ہیں اور بڑی خوبی یہ ہے کہ تلفظ اور لہجہ میں وہ نقص نہیں جو اکثر یورپین علمائے علوم مشرقی میں پایا جاتا ہے۔

شاید مناسب ہو کہ میں اُس گفتگو کے بعض حصے قریب قریب اُن الفاظ میں لکھدوں۔ جو اُس وقت استعمال کئے گئے۔ کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی سادہ کتاب تھی جس پر میں گفتگو کے نوٹ لیتا جاتا تھا۔

پروفیسر ویمبیری۔ از دیدن شما خوشحال شدم۔ چندروزے شود کہ در روز نامہائے خواندم کہ در استنبول تشریف وارید و موردِ الطافِ شاہانہ شدہ اید۔

جواب۔ بلے قریب دو ماہ آنجا ماندیم۔ چہ خوب جائے است و خلق عثمانی چہ قدر خوب است۔ الحمد للہ کہ از التفات شاہانہ ہم ممنون شدیم +

پروفیسر۔ بندہ ہم عثمانی ہارا خیلے دوست دارم۔ سالہائے دراز در استنبول بودم۔ وقتیکہ درخدمت سلطان بودم۔ مرا رشید آفندی مے خواندند۔

جواب۔ بندہ ازیں حال آگاہ نبودم۔ بائد کہ چیزے دیگر از احوال خود بفرمائید کہ خیلے دلپذیر است +

پروفیسر۔ بیشتر از احوال خود در یک کتاب انگریزی نوشتہ ام کہ نامش "حکایت جد و جہد من" است۔ در لوندرہ چاپ شدہ است۔

اس پر اُٹھے اور ایک الماری سے وہ کتاب اُٹھا لائے۔ میں نے اُس کے

چند عنوان سرسری طور پر دیکھے اور ارادہ کیا کہ ضرور پڑھونگا۔ کیونکہ نہایت دلچسپ تھی۔ اس کتاب کے پاس ایک کتاب اور رکھی تھی اس کی تقطیع اور جلد وغیرہ ہمارے ہندوستان کی کتابوں کو یاد دلاتی تھی۔ میں نے پوچھا وہ کون سی کتاب ہے۔ بولے خوب یاد آئی یہ کتاب تمہارے لاہور کی چھپی ہوئی ہے۔ میری اُس کتاب کا اردو میں خلاصہ چھپا ہے۔ اسے منشی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار نے شایع کیا ہے اور سفرنامہ پروفیسر ویمبیری" اُس کا نام رکھا ہے۔ کیا تم اُنہیں جانتے ہو۔ میں نے کہا کہ جاننا کیا معنے وہ میرے بڑے دوست ہیں اور لاہور میں ہمارا وقت فرصت بیشتر اکٹھے صرف ہوتا تھا۔ اس سے بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔ اُنہیں بتا دینا کہ میں اُن کے ترجمے کو کسقدر عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں یہ پیغام ضرور اُن تک پہنچا دونگا۔ اور یقیناً وہ اس سے بہت خوش ہونگے +

اب چونکہ ہم کتابوں کے پاس کھڑے تھے۔ اُنہوں نے اپنی بعض اور تصانیف دکھانی شروع کیں۔ مگر اُن میں جس کتاب کا نام ہندوستان کے مذاق کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہے وہ "دی کمنگ سٹرگل فور انڈیا" ہے۔ یعنے وہ جدوجہد جو اہل ہند کو پیش آنے والی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے متعلق جو بات چیت ہوئی وہ قابلِ ذکر ہے +

میں۔ بہ ہند ہیچ نہ رفتہ اید۔ سیاحے مثل شمارا لازم نبود۔ کہ از سیاحت ہند غافل باشد۔

پروفیسر۔ خیلے آرزو داشتم کہ بروم۔ یک بار یکے از رُوسائے ہند۔ نواب عبد الطیف صاحب از کلکتہ مرا دعوت کردہ بود۔ و قریب بود کہ بروم لیکن موانع چند مرا ازاں عزم باز داشت۔ حالا پیر شدہ ام ممکن نیست۔

میں۔ چنداں پیر کہ نشدہ اید۔ و اگر پیر ہم باشید۔ چوں ہمت جواں دارید۔ بعد مسافت مضایقہ ندارد۔

پروفیسر۔ بلے راست است لیکن یک مانع دیگر است۔ و آں سیاسی است۔

مے دانید رابطۂ قدیم با قوم انگلیس دارم و کنگ اڈورڈ بالخصوص برحالِ درویش التفات بسیار دارد۔ مے بینید آں تصویر از دست و آں دیگر از ملکہ الکزندر است۔ کہ ہر دو بدست خط خود شاں مرا عنایت فرمودہ اند۔ حالا اگر بہ ہند روم۔ ازیں مے ترسم کہ اگر بعضے از احوال نا ملائم کہ میشوم بہ چشم خود بہ بینم۔ دویم برائے مردم ہند بہ سوزد۔ چیزے بہ نویسم کہ ازاں مردم انگلزا از من ناخوش شوند۔

میں۔ نزد ہمیں یک وجہ قوی است کہ زمین شما بہ ہند لازم مے گرداند۔ اگر مردمے ہمچو شما از اندیشہائے ایں چنیں عزم کارے بگزارد۔ کہ از فرائض انسانیت است۔ باز از دیگراں چہ توقع۔

پروفیسر۔ خوب اقطعیاً ناممکن نیست باشد۔ کہ روز برم۔ چند روز مے شود۔ کہ وزیر صیغہ معارف جاپان مرا دعوت کردہ است کہ سفر جاپان بردم کہ آں نجا روم۔ باید کہ ہند را ہم زیارت کنم۔

یہ کہکر میز کی طرف گئے اور ایک خط ڈھونڈھ لائے جو انگریزی میں لکھا ہوا تھا اور جس میں جاپانیوں کی طرف سے فاضل نویسندہ نے پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ کہ وقتاً فوقتاً اُن کے قلم سے جاپانیوں کے موافق مضمون نکلتے رہے۔ اور یہ لکھا تھا کہ فرمانروائے جاپان مکاڈو۔ امید ہے کہ جلد آپکو کوئی نشانِ عزت بھیجیں گے۔ اور اگر آپ یہاں آئیں گے تو ہم سب آپ کے نہایت ممنون ہونگے۔

اس میں ہندوستان کی موجودہ حالت اور وہاں کی سیاسی تحریکوں کا ذکر آگیا۔ اور پروفیسر صاحب نے کہا کہ مجھے اُن لوگوں سے جو آزادی کے طلبگار ہیں دلی ہمدردی ہے اور میں یقین واثق رکھتا ہوں کہ آخر کار ہندوستان میں ہندوستانیوں کو اپنا انتظام آپ کرنیکا حق مل جائیگا۔ مگر اس معاملہ کی کامیابی خود ہندوستانیوں

کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ عقلمندی سے چلیں گے اور قبل از وقت شورشوں سے جن کی خبریں اندنوں کبھی کبھی آتی ہیں۔ اپنا کام خراب نہ کریں گے تو انجام اچھا ہوگا۔ آپ میرا یہ پیغام اپنے اہلِ وطن کو پہنچا دیجئے۔ اور کہئے کہ اُن کے ایک غائبانہ ہمدردی کی یہ بے غرضانہ رائے ہے۔ اور اس پر عمل کرنا نہ کرنا اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ مجھے قریب قریب سب یورپی ممالک کے خیالات کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے۔ اور اُس تجربے کی رُو سے میں جانتا ہوں کہ اگر خامی اور ناتجربہ کاری کے ساتھ اہلِ ہند کی طرف سے کوئی عام شورش موجودہ طرزِ حکومت کے خلاف ابھی ہوئی تو یورپ بھر کی ہمدردی انگلستان سے ہوگی اور وہ سب کسی نہ کسی طرح انگلستان کی موافقت کرینگے لیکن اگر اہل ہندوستان متانت کے ساتھ برابر ترقی کرتے رہیں اور رفتہ رفتہ یورپ تک اُن کی قابلیت اُن کی معاملہ فہمی۔ اُن کی صناعی اور اُن کی ہُشیاری کی شہرت پہنچ جائے اور اُس وقت وہ اپنے حقوق کا دعویٰ کریں تو یورپ کی ہمدردی اُن کی طرف ہوگی۔ غرض اس سارے جھگڑے کی بنیاد محنت استقلال اور صبر پر ہونی چاہئے۔ نہ کہ جلد بازی اور بے صبری پر۔

میں نے اس پختہ کارانہ نصیحت کے لئے اُن کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ میں اسے اہل وطن تک پہنچا دونگا۔ اس کے بعد پھر کچھ کتابوں کی طرف ہم متوجہ ہوئے۔ ایک کتاب جو اُنہوں نے مجھے آغاز ملاقات ہی میں دکھائی تھی لیکن جس کی ورق گردانی باتوں میں نہیں ہو سکی تھی وہ کتاب بابر نامہ تھی۔ اسکی تصحیح میں بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کا اصل نسخہ سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ میں تھا۔ وہاں سے منگوا کر نقل لی گئی۔ ایک انگریزی لیڈی نے یہ ساری محنت کی۔ پروفیسر صاحب نے اس کا ذکر اس لئے کیا تھا۔ کہ یورپ کے بعض علم دوست لوگ مشرقی کتابوں کی اشاعت اور نگہداشت کے متعلق وہ خدمت کر رہے ہیں جو اصل میں اہل مشرق کا فرض ہے اور جس سے وہ غافل ہیں۔ اس کا جواب

سوائے اپنی غفلت کے اعتراف کے کیا ہو سکتا تھا۔
بابر نامہ کے سرورق پر ایک شعر لکھا تھا۔ جو مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے پروفیسر صاحب سے اس کی تعریف کی۔ وہ بھی پرلے سخن فہم ہیں۔ اُنہوں نے جوش سے داد دی۔ شعر یہ ہے:-

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزار ماست

ایک اور بڑی دلچسپ کتاب جو اُن کے ہاں دیکھی وہ امیر البحر سید علی رئیس کے سفرنامہ کا ترجمہ تھا۔ یہ ترکی امیر البحر ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان گئے تھے اور جب شاہ ہمایوں کا زینہ سے گر کر انتقال ہوا اُس وقت ہندوستان میں موجود تھے۔

ان باتوں میں جن کا خلاصہ اوپر لکھا گیا ہے ایک گھنٹہ کے قریب گذر گیا۔ میں نے اجازت مانگی اور رخصت ہونا چاہا۔ مگر پروفیسر صاحب نے نہایت اخلاق سے روک لیا۔ اور کہا:-

"اگر عجلت نباشد قدرے بہ نشینید۔ آدم ایں چنیں ہر روز نمے آید"
ہم پھر بیٹھ گئے۔ خادمہ قہوہ لائی۔ ہم نے قہوہ پیا۔ کہنے لگے کہ تمہیں ایک وقت ہمارے ساتھ کھانا کھانا چاہئیے۔ ہم نے اظہار ممنونیت کیا۔ مگر کہا کہ معذور ہیں۔ آج کے دن یہاں ہیں شام کو وائنا کی طرف روانہ ہوں گے۔ اس پر اُنہوں نے بہت افسوس کیا۔ کہنے لگے:-

"اگر تا فردا ہم ایں جا باشید۔ یک پلاؤ بدست خود برائے شما درست بکنم در ایام درویشی مشق پختن بہم رسانیدہ ام"
میں:- "مرحمت عالی زیاد۔ لیکن بندہ معذور ہستم۔ امروز راہِ وائنا گرفتن لازم است۔ سفر ما از قرار یکہ داشتیم طول گرفتہ۔ حالا در لونڈرہ کار داریم۔ باید کہ زود آنجا برسیم۔ ایں صحبت کہ بدست رسید ایں را غنیمت

خواہیم دانست - وایں روز در روزنامۂ ما یادگار خواہد ماند"

پروفیسر - لیکن آرزو دارم کہ شمارا باز بہ بینم - وقت مراجعت ہند کدام راہ مے روید - اگر ازیں راہ بیائید - باید مرا از اوّل اطلاع بدہید - کہ منتظر شما باشم"

میں - بچشم - اگر ازیں راہ باز گردم - دیدنِ جناب شما فریضہ است - واز اوّل خبر خواہم داد - خیلے مے خواہم کہ وقت بازگشت ایں ہم جاہا را دوبارہ بہ بینم - وبہ استنبول ہم یکبار دیگر بروم - لیکن گمان نہ دارم کہ ممکن بہ بشود - اغلب آنست - کہ والور بزودی راہِ وطن گیرم"

بعد اس گفتگو کے پھر متفرق باتیں شروع ہوئیں - ایک تصویر دیوار پر ہمارے سامنے لٹک رہی تھی - جس نے میری توجہ کو کئی بار اپنی طرف کھینچا تھا - کسی مسلمان عالم کی تصویر معلوم ہوتی تھی - ایک سجادہ پر ایک صاحب اپنی عبا پہنے بیٹھے تھے - پانی کا ایک گلی برتن پاس رکھا تھا - عمامہ کا شملہ آگے کو لٹک رہا تھا - میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کون صاحب ہیں - اور ان سے آپ کی کیونکر اور کب دوستی ہوئی کہ اُنہوں نے میری رازجوئی کو تاڑ لیا اور کہا:-

"ہمیں درویش است - وقتے کہ در تاتار بودم - دریں لباس بودم ایں از آں زماں یادگار است"

لارڈ کرزن کی کتاب فارس کے متعلق وہاں پڑی تھی اُسے جو میں نے اُٹھایا تو اس کے اندر لارڈ کرزن کا ایک خط رکھا تھا - جو اُنہوں نے اپنی کتاب پروفیسر صاحب کو نذر کرتے وقت لکھا تھا - اس کو دیکھکر بولے "یکے از شاگردان من حاکم ہند بودہ است" معلوم ہوا کہ لارڈ کرزن نے چند سبق ان سے لئے تھے - اور ڈاکٹر سٹائین جو ہمارے پنجاب میں رجسٹرار تھے وہ بھی پروفیسر صاحب سے تلمذ رکھتے تھے - اور لارڈ کرزن کے عہد میں اُن کو جو عہدہ وسط ایشیا میں تحقیقات وغیرہ کا سرکار کیطرف سے ملا تھا اس میں غالباً پروفیسر صاحب کی سفارش کو

بھی دخیل تھا۔

لارڈ کرزن اور وسط ایشیا کے تذکرہ سے افغانستان اور افغانستان سے امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے امیر مرحوم نے بھی ایک مرتبہ بلایا تھا۔ مگر جانا نہ ہو سکا۔ ان کی دانشمندی اور تدبر کی بیحد تعریف کرتے رہے اور ان کا ایک قول سُنایا جو خالی از لطف نہیں کہنے لگے کہ روس اور انگلستان کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک دفعہ امیر مرحوم نے کہا تھا۔ "درپشت انگریز چیزے نیست مگر آب درپشت روس زمین است"۔

حکومتِ روس سے پروفیسر صاحب کو دیرینہ مخالفت ہے۔ مگر مسلمانانِ روس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مسلمانان روس کے کئی اخبار اُن کی میز پر رکھے تھے۔ اور اُنہیں وہ اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ تمہارے روسی بھائی بہت معقول ترقی کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ حال میں چھبیس۲۶ اخبار نئے روسی مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوئے۔ جن میں بعض بہت قابلیت اور معقول درجہ کی آزادی سے لکھے جاتے ہیں۔ اُن وقت نام روزانہ اخبار جو اورن برگ سے نکلتا ہے سب سے بہتر ہے۔ قزان مجری ایک اور روسی اخبار اُنہوں نے مجھے دکھایا۔ جو قزآن سے شایع ہوتا ہے۔ روس کا ذکر کرتے کرتے اُنہوں نے بتایا۔ کہ سلطان المعظم سے وہ ربط اُنہیں نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ پروفیسر صاحب کو کہتے تھے کہ روس کے خلاف لکھنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ اُن کے مصالح ملکی کے خلاف تھا۔ اور یہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اس کے سوا عثمانیہ یونیورسٹی کے بارہ میں بھی اختلاف ہو گیا تھا۔ کیونکہ سلطان المعظم کی مرضی تھی کہ سردست تاریخ فلسفہ مغربی کی تعلیم اس میں نہ ہو اور اُنہوں نے عرض کیا کہ "بغیر از فلسفہ و تاریخ یونیورسٹی نمے شود"۔

آخر میں اکثر عیسائیوں کے مذہبی تعصب کا ذکر کرتے رہے۔ کہتے تھے کہ

بھلے آدمی اُنہیں انجیل اور دیگر مذہبی کتابیں اس نظر سے بھیجتے رہتے ہیں۔ کہ کہیں عیسوی مذہب کی طرف مائل ہو جاویں۔ اور اسلام کی تعریف جو وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ اس سے رُک جائیں کہنے لگے وہ نہیں جانتے میں کوئی مذہب نہیں رکھتا۔ میں بارہا اُنہیں بتا چکا ہوں کہ میں فیلسوف ہوں۔ اور جس مذہب میں جو خوبی دیکھتا ہوں اُس کے اظہار سے نہیں رُکتا۔ باقی خود قید ملت سے آزاد ہوں اور اتنی مدت آزادی کا مزا چکھنے کے بعد اب آخری عمر میں گرفتار نہیں ہونگا"۔ ایک آخری لطیفہ اُن کا نقل کئے بغیر میں اپنے مکالے کے اس مختصر خلاصے کو ختم نہیں کر سکتا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ مذہب عیسوی کے بعض پیرووں کے جوش کی یہ حالت ہے کہ ایک عیسائی بی بی نے خط لکھا کہ اگر تم بیاہے ہوئے نہیں ہو تو میں تم سے بیاہ کرنے اور اپنی ساری دولت تمہیں دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم عیسائی ہو جاؤ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس آخری دام میں بھی یہ آزادہ رَو مغربی درویش نہیں پھنسا +

میں نے لندن واپس آگر پروفیسر صاحب کو ایک خط لکھا۔ اور اُن سے اُنکی تصویر مانگ بھیجی۔ جواب نہایت عنایت آمیز ملا۔ اور تصویر بھی ساتھ آئی۔ میں اُنکو پاس تو اُسے اُن کی نشانی سمجھکر رکھوں گا ہی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اُس کی ایک نقل میرے دوستوں کو بھی پہنچ جائے۔ اس لئے اس مضمون کے ساتھ اُن کی تصویر بھی بھیجتا ہوں +

شُعَرائے مَزار

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے ایک شاگردِ رشید نے جنہیں اس تلمذ کی وجہ سے حضرت ذوق مرحوم سے ارادت خاص ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اپنے قیام دہلی کے زمانے میں ملک الشعراء دہلی کے مزار کی خستہ حالت دیکھ کر یہ ارادہ

کیا کہ اس کی مرمت کرا دی جائے۔ اور چند مہینے کے اندر ہی یہ ارادہ پورا بھی ہو گیا اس نیک کام سے انہوں نے نہ صرف اپنے حسنِ عقیدت کا ثبوت دیا۔ بلکہ قدردانان اُردو کی آیندہ نسل پر احسان کیا۔ اردو علم ادب میں بہ تقاضائے ضروریاتِ وقت کچھ جان تو آچلی ہے۔ لیکن وہ ترقی کہ جسے کہتے ہیں ابھی شروع نہیں ہوئی۔ خدا نے چاہا تو اُس کا بھی وقت آئیگا۔ اُس وقت لوگ ڈھونڈھینگے کہ وہ بزرگ کہاں ہیں جن کی اَن تھک محنتوں اور جانفشانیوں سے اس لٹریچر کی پہلے شہرت ہوئی۔ اور جنہوں نے اس ہندی نژاد بولی کو "رشکِ فارسی" بنا دیا۔ احسانمندی کا احساس تقاضا کریگا کہ اُن کی آرامگاہِ خا کی تلاش کر کے اُس پر شکریہ کے پھول چڑھائیں اور دردِ دل سے اُن کی یاد میں دو آنسو بہائیں۔ لیکن اگر اس وقت تک ہماری غفلت اور زمانے کی بیدردی سے اُن کے مزاروں کے نشان تک مٹ گئے تو سوائے حسرت کے اس تلاش کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ پس اس وقت جب ابھی اُن نامور گزشتگان کی نشانیاں باقی ہیں۔ انہیں بچانا اور ان کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس فرض کے ادا کرنے کی تحریک کے لئے حضرت ذوق کے مزار کی مرمت کہ یہ قابلِ تقلید مثال کافی ہے۔ اور اگر تائید مزید کی ضرورت ہو تو وہ پُر اثر الفاظ حاضر ہیں۔ جن میں ہمارے دوست نے پہلے اپنے ارادے اور پھر اس ارادے کی تکمیل سے ہمیں مطلع کیا۔ اُن کے دونوں خطوں کے وہ حصے جو اس تحریک کے متعلق ہیں ذیل میں درج ہیں:-

"ان دنوں خواجہ ستان شاہ کابلی کا تیسرا سالانہ عُرس تھا۔ قدم شریف میں خواجہ کا مدفن ہے۔ قوالی خوب سُننے میں آئی۔ ہمارے خاص مطلب کی بات جو وہاں جانے سے حاصل ہوئی یہ تھی کہ میں پوچھتا پوچھتا بالکل اتفاق سے حضرت ذوق علیہ الرحمۃ کے مزار مبارک پر پہنچ گیا۔ یقین نہ آتا۔ مگر ظفر کی بدولت لوحِ مزار پر قطعہ تاریخ موجود ہونے سے تسلی ہوئی۔ دیر تک ایک عالم میں وہاں بیٹھا رہا۔ حضرت اُستاد ہمراہ ہوتے تو کیفیت آجاتی۔ خواجہ باقی باللہ میں جا کر حالی کے بھائی خواجہ امداد حسین

حافظ غلام رسول ویران شاگردِ ذوق - امیر مرزا برادر نواب مرزا داغ اور دیگر لوگوں کی قبریں دیکھیں - اور مولوی حالی کا شعر پڑھا ۔

چپہ چپہ پہ ہیں یہاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

دوسرے روز شوق کشاں کشاں پھر مجھے وہیں لے گیا اور حضرت ذوق کی مزار مبارک کی مرمت کا تخمینہ کیا ۔ خداوند کریم جلد اس ارادے کو پورا کرے - ع

یہ کس بیکس کی تربت ہے جہاں حسرت برستی ہے

رسول نما میں حکیموں کے خاندان کا مدفن ہے - حکیم محمود خاں - عبد المجید خاں وغیرہ ہیں - کہیں مومن خاں بھی مدفون ہیں - مگر لوحِ مزار نہ ہونے کے باعث بغیر کسی معتبر شخص کے بتانے کے ٹھیک پتہ نہیں چلتا - کہ کون سی قبر ہے - اسوقت مومن کی ایک غزل کے دو تین شعر یاد آئے ہیں جو بغیر لکھے قلم آگے نہیں بڑھنا چاہتا -

حسرت سے کہا خضر نے دیکھ اُس کی گلی کو ۔ مرجائیے مدفن کو ملے گرچہ زمیں یہ
بیخود سا پڑا تھا کوئی اُس کوچہ میں اُس نے ۔ دروازہ میں آجھانک کے دیکھا جو کہیں یہ
اس رحم کے صدقے ادھیں گھبرا کے کہا ہاں ۔ جا کر کوئی دیکھو کہیں مومن تو نہیں یہ !!

غرضیکہ میرا دل ان دنوں اس قسم کے احساسات کے مزے لے رہا ہے - اگر کمی ہے تو صرف اس امر کی کہ کوئی ہمدرد رہبر نہیں ملتا - جسے پُرانے لوگوں کے حالات بتلانے میں بھی وہی مزا آئے جو ہمیں سننے میں آتا ہے ۔" (جہانگیر)

" میں آپ کو بڑی خوشی سے اطلاع دیتا ہوں کہ حضرت داو اُستاد کے مزار کی مرمت بخوبی کردی گئی ہے - اس بیس سال کو تو اطمینان ہوگیا پھر زندگی رہی تو دیکھا جائیگا ؛

خواجہ حسن نظامی نے آگرہ میں نظیر کی قبر کا بہت بُرا حال بتایا - اُردو کے شاعروں کی مٹتی ہوئی نشانیاں جہاں جہاں باقی ہیں - کیوں نہ ان کو قایم رکھنے کی کوشش کی جائے - ایک شخص کے کرنے کا کام ہوتا تو شاید اب تک بہت کچھ

ہو گیا ہوتا۔ کیوں نہ آپ انجمن ترقی اُردو میں۔ اس کے لئے تحریک کریں۔ اور اگر وہاں کے لوگ شنوائی نہ کرتے ہوں تو مخزن کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کر کے چندہ جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور اس ذریعے سے یہ کام کیا جائے۔ دہلی میں ذوق۔ غالب۔ خواجہ میر درد۔ حافظ ویران (خدا کا شکر ہے کہ امیر خسرو اب کسی کے محتاج نہیں) ہیں۔ آگرہ میں میاں نظیر اور اُن کے صاحبزادے اسیر ہیں لکھنؤ میں تلاش کرنے سے بہت سے مشہور شاعروں کی قبریں ملیں گی۔ کیونکہ لکھنؤ والوں کے علاوہ دہلی کے بہت سے شاعر مثلاً میر۔ سوز۔ جرأت۔ انشا۔ حسن وغیرہ بھی وہیں جا کر فوت ہوئے ہیں۔ ایک یا دو شاعر فیض آباد میں مدفون ہیں۔ غرضکہ ہماری کمیٹی کے متعلق یہ کام ہو کہ دوران سیر و سفر میں اس امر کے متعلق اپنی معلومات بڑھاتی رہیں۔ اور حسب موقع کمیٹی کو مطلع کر کے اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ میں نے اپنا یہ خیال حسن نظامی کو بھی سنایا تھا اور لالہ سری رام کو بھی۔ لالہ سری رام تو بولے کہ چندہ جتنا چاہو ہم سے لے لو۔ تیار ہیں۔ حسن نظامی نے کہا کہ میں نے داغ کو ایک مرتبہ اُن کے جیتے جی لکھا تھا اور حالی سے کہا تھا۔ اُنہوں نے بھی ہمدردی ظاہر کی۔ مگر بات یہ ہے کہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ یہ ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ پس اگر آپ کے دل کو یہ بات کچھ بھلی معلوم ہو تو اس کے متعلق ضروری کارروائی شروع کیجئے۔ کم از کم مخزن سبھا کے ممبر تو بڑی خوشی سے چندہ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ اور ہر جگہ کے لوکل ممبر وہاں کی قبروں کی مرمت کا کام کر دینا اپنے ذمے لینے میں بھی دریغ نہ کریں گے۔ بہرکیف ایک بات آپ کے کان میں ڈال دی ہے۔ آپ جانیں۔" (جہانگیر)

ان دونوں خطوں کے نقل کرنے کے بعد میں اس نیک تحریک کی تائید میں کوئی الفاظ بڑھانے ضروری نہیں سمجھتا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں دل سے اس تحریک کی کامیابی کے لئے کوشش کرنے کو حاضر ہوں اور اپنے سخنور اور سخن فہم احباب سے درخواست کرتا ہوں کہ اُن میں سے جس جس صاحب کو اس سے

اتفاق ہو اور جو علمی امداد کے لئے آمادہ ہوں۔ وہ اس بارے میں مجھے لکھیں۔ اگر چند اہلِ دل بھی اس کام کے لئے مستعد ہو گئے تو اس کا سرانجام ہونا کچھ مشکل نہیں۔ اگر کثرت رائے سے یہ قرار پا گیا۔ کہ مخزن کے متعلق ایک کمیٹی اس غرض سے ہو تو مخزن بڑی خوشی سے یہ خدمت اپنے ذمہ لے گا +

ایک شام مسٹر سٹیڈ کے ہاں

سنتے تھے کہ مسٹر سٹیڈ لاجواب آدمی ہے۔ دیکھا تو اور بھی لاجواب پایا۔ اکثر مشاہیر کی نسبت یہ واقعہ اُن کے غائبانہ مشتاقوں کو پیش آیا ہے۔ کہ جو توقعات اُن کے ذہن میں تھیں وقت ملاقات وہ پوری نہیں ہوئیں۔ لیکن مسٹر سٹیڈ ملاقات میں بھی ویسا بیدار۔ تیز اور جدّت پسند آدمی نظر آیا۔ جیسا ریویو آف ریویوز کے اوراق میں نظر آتا ہے۔ پچھلے سال حسن اتفاق سے مجھے اس باکمال سے ملنے کا موقع مل گیا اور اس کے بعد دو تین دفعہ زیادہ اچھی طرح ملاقات ہوئی بڑھاپے میں جوانی کا رنگ اس شخص میں موجود ہے اور اُس کی طبیعت کا چلبلا پن آدمی کو حیران کرتا ہے۔ وہ نادر اور دلنشیں فقرات جو اُس کے ریویو کی ہر دلعزیزی کا باعث ہوئے ہیں۔ وقت گفتگو اس کے منہ سے بیساختہ نکلتے جاتے ہیں۔ ہنسانے پر آتا ہے تو نہایت ظریفانہ لطیفے کہہ جاتا ہے اور اس سنجیدگی کے ساتھ کہ اُس کے چہرہ پر ہنسی کے آثار بالکل نہیں ہوتے۔ اور اسی لئے نہایت آسانی سے دم بھر میں ظریف اور دم بھر متین بنکر سامعین کو گھبراہٹ میں ڈال سکتا ہے اور خود اُن کی گھبراہٹ کا مزہ لیتا ہے۔ اُس کی باتیں سننے کے لئے آدمی کو ہمہ تن متوجہ رہنا پڑتا ہے کیونکہ وہ ذرا ذرا سے جملوں میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس کے لکھنے کی بڑی تعریف ہم یہ سمجھتے تھے کہ یوں لکھتا ہے جیسے ناظرین سے باتیں کر رہا ہو۔ اس کے بولنے میں یہ خوبی

دیکھی کہ یوں بولتا ہے۔ جیسے کتاب لکھ رہا ہو۔ ہر لفظ تُلا ہوا۔ ہر بات موزوں گویا کوئی زود نویس لکھتا جائے اور بغیر نظر ثانی کے رسالے یا کتاب کی صورت میں وہی عبارت چھپوا دے۔

جس شام کا ذکر میں آج کیا چاہتا ہوں وہ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء کی بیسویں تاریخ اور جمعہ کی شام تھی۔ اُس دن میں اور میرے چند احباب مسٹر اور مسز سٹیڈ کے ہاں مہمان تھے۔ مگر اس سے قبل کی دو ملاقاتوں کا تھوڑا سا حال لکھ دینا بھی ضروری ہے جن کی وجہ سے اس شام کی دوستانہ مجلس میسّر ہوئی۔ مسٹر سٹیڈ کو طبعی طور پر نئی چیزوں کا شوق ہے اور اُس کی عادت میں داخل ہے کہ جس نئی تحریک سے اُسے ہمدردی ہو اور جس میں اُسے کچھ جان نظر آئے اُسکی حمایت میں مردانہ وار کمر ہمّت باندھ لیتا ہے اور اس بات سے نہیں گھبراتا کہ لوگ اُس پر ہنسیں گے۔ یا کثرت رائے کس طرف ہو گی۔ اُن نئی تحریکوں میں جن کی حمایت مسٹر سٹیڈ نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ یورپ کی جدید اور ہونہار زبان اسپرانٹو ہے۔ جو فرانسیسی انگریزی۔ اطالین اور جرمن سب زبانوں کا ایک مرکب مجموعہ ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ ہر زبان کے سادہ الفاظ چُن لئے گئے ہیں اور اسمار افعال اور صفات کے لئے ایک خاص صورت مقرر کر کے ہر اسم کو خواہ کسی زبان کا ہے ایک صورت دی گئی ہے اسیطرح ہر فعل کو تاکہ آدمی دیکھتے ہی کہہ دے کہ یہ اسم ہے یا فعل۔ صرف و نحو کے قواعد آسان رکھے گئے ہیں۔ اور اس احتیاط کے ساتھ کہ سب قواعد کلیہ ہوں اور استثنا کسی قاعدے کی نہ ہو۔ اکثر تجارتی لوگوں میں اس نئی ایجاد کا رواج ہوتا جاتا ہے اور بہت اہل الرائے یہ خیال کرتے ہیں کہ بیس پچیس سال تک یہ زبان یورپ بھر میں پھیل جائیگی اور زبانوں کے اختلاف کی تکلیف کم ہو جائیگی۔ مسٹر سٹیڈ بھی انہی لوگوں میں ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں۔ گذشتہ سال کے آغاز میں لندن کی مجلس "اسپرانٹو" کے سالانہ جلسے کے موقع پر مسٹر سٹیڈ صدر نشین ہوئے۔ مجھے اُنہیں دیکھنے کا مدت

سے شوق تھا۔ وہاں دیکھا بھی اور تقریر بھی سُنی۔ تقریر ختم ہو چکی تو میرے ایک دوست نے جو اس نئی زبان کے بڑے سرگرم معاون ہیں۔ مجھ سے پوچھا کہ تم سے اور مسٹر سٹیڈ سے اگر ملاقات نہ ہو تو میں ملاقات کرادوں۔ میں پہلے ہی اس فکر میں تھا۔ کہ کسی سے یہ فرمائش کروں۔ میں نے خواہش ملاقات ظاہر کی۔ اور اُنہوں نے مجھے اُن سے ملایا۔ تکلف مسٹر سٹیڈ کے مزاج میں نام کو نہیں۔ فوراً اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے دیر سے جان پہچان ہوئی ہے۔ چند باتوں کے بعد کہنے لگے کہ یہاں کی ملاقات کافی نہیں۔ کسی دن میرے گھر پر آؤ۔ میں نے کہا جس دن آپ چاہیں کہنے لگے میں تمہیں تاریخ اور وقت گھر جاکر لکھ بھیجوں گا۔ میرے ہاں کھانے پر آنا۔ مسز سٹیڈ سے بھی ملنا۔ وہ تمہیں دیکھکر خوش ہونگی۔ کیونکہ اُنہیں ہندوستان کے معاملات سے بہت دلچسپی ہے۔ اس قرارداد کے مطابق اُنہوں نے مجھے خط لکھا اور میں اُن کے ہاں کھانے پر گیا۔ اُن کا جوان اور بیاہا ہوا لڑکا اور بہو بھی اُس دن کھانے پر مدعو تھے اور اُن کی صاحبزادی بھی موجود تھیں اور مسز سٹیڈ بھی۔ مسز سٹیڈ نہایت شریف مزاج اور مہمان نواز خاتون ہیں۔ گو ذہانت اور طباعی میں اُنہیں اپنے نامور شوہر سے کوئی نسبت نہیں۔ لیکن باوجود اس کے شوہر کے مزاج میں اُنہیں بیحد دخل ہے۔

مسٹر سٹیڈ نے مجھ سے کہا کہ تمہیں لنڈن میں رہتے ہوئے سال بھر سے زیادہ ہو گیا۔ اس سے پہلے مجھ سے کیوں نہیں ملے۔ میں نے کہا کہ میں بہت مشتاق تھا۔ لیکن چونکہ آپ نے اپنے دفتر میں ہفتہ وار ملاقات کا سلسلہ اب بند کر دیا ہے اور ویسے بھی آپ نہایت کم فرصت ہیں۔ اس لئے جرأت نہیں ہوئی۔ کہنے لگے ہاں مجھے بھی ہفتہ کی شام کی اُن مجالس کے جواب سے چند سال پہلے ہوا کرتی تھیں بند ہو جانے کا افسوس ہے۔ مگر میں کثرتِ کار سے مجبور ہوں اور اسی سبب سے لوگوں سے کم ملتا ہوں۔ اب بھی ملاقاتیوں کے ڈر

سے عموماً شہر سے باہر رہتا ہوں۔ دفتر میں چند گھنٹوں کے لئے آکر کام کاج دیکھ جاتا ہوں اور پھر باہر چلا جاتا ہوں۔ میں نے کہا شہر کے ملنے والوں اور دور سے آئے ہوئے مسافروں کے لئے یکساں بندش مناسب نہیں بہیرے کئی دوست آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اگر اتفاق سے اُس جلسے میں موجود نہ ہوتا تو کیا جانے ابھی اور کب تک محروم رہتا یا بے ملے واپس ہندوستان چلا جاتا۔ کہنے لگے مجھے ہندوستان کے اصحاب سے ملکر ہمیشہ بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور آپ اپنے دوستوں سے جو مجھ سے ملنا چاہیں کہدیں کہ میں باوجود قلّت وقت کے اُن سے ملنے کو حاضر ہوں۔ اگر وہ خط لکھکر وقت معیّن کرلیں اور تشریف لائیں۔ بلکہ بہتر ہو کہ کسی دن آپ اپنے چند احباب کو میرے ہاں جلسے پر مدعو کریں۔ تاکہ ہم سب ہندوستان کے معاملات پر کچھ تبادلۂ خیالات کرسکیں۔ میں نے کہا آپ اپنے وقت فرصت سے مجھے مطلع کیجئے گا اور میں چند احباب کو جمع کرلونگا۔ یہ باتیں کھانے پر ہوئیں۔ اس کے بعد وہ سب ایک جلسے میں جہاں ہنگری کے متعلق لکچر ہونے کو تھا گئے اور مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ راستے میں مسٹر سٹیڈ سے چند باتیں ہوئیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

راقم۔ آپ ہندوستان کے معاملات پر کبھی کبھی لکھتے تو ہیں اور جب لکھتے ہیں تو آزادانہ لکھتے ہیں۔ اس کے ہم ممنون ہیں۔ مگر یہ کافی نہیں اس سے بہت زیادہ لکھنا چاہئے یہ مسئلہ اہم ترین مسئلہ ہے اور آپنے اسکی طرف ویسی توجہ نہیں کی جس کی آپسے توقع ہے۔ اگر حالات بچشم خود دیکھنے کے لئے آپ ہندوستان جائیں تو بہت بڑا کام کریں۔

مسٹر سٹیڈ۔ ہندوستان کے معاملات بیشک اہم ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہاں بہت سی بیقاعدگیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر میرا کام اتنا بڑھا ہوا ہے کہ میں اور ذمہ واری اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ ہندوستان جانے کو میرا جی بہت چاہتا ہے۔ مگر فرصت کہاں سے لاؤں۔ وقت کہیں مول بکتا ہوتا تو میں تھوڑا سا خرید لیتا اور اس میں ہندوستان بھی ہو آتا۔

راقم ۔ مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ ہندوستان کے کام کو آپ ایسا کم ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کو زائد وقت میسّر ہو تو آپ وہاں جائیں ۔ میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے ملک کے سب کاموں میں اس سے بڑا کوئی کام نہیں اور انگلستان کا کوئی دوست اس کا سچا دوست نہیں ہو سکتا جو اس کام کو نظرانداز کرے ۔ آپ اگر معاملات ہند پر اپنا زبردست قلم استقلال کے ساتھ اٹھائیں تو صرف ہمیں پر احسان نہیں ہوگا بلکہ اپنے ملک پر بھی آپ احسان کریں گے ۔ آپ نے روس جانے کے لئے کہاں سے وقت نکالا تھا ۔ کیا آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ روس کی آزادی کی کوشش سے ہندوستان کی بہبودی کی کوشش مقدم ہے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ روس کے متعلق اپنا شغف چھوڑ دیں ۔ مگر یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کے متعلق بھی کم از کم اُسی درجے کا شغف درکار ہے ۔

مسٹر سٹیڈ ۔ اچھا میں اس معاملے کو سوچتا رہونگا ۔ آپ جس دن مع احباب کے میرے ہاں آئیں گے ۔ اُس دن ہندوستان پر ہی بحث ہوگی ۔ اتنے میں جلسے کا مقام آگیا اور آدھی رات کے قریب ہم سب وہاں سے فارغ ہوئے ۔ میں اُن سے رخصت ہو کر گھر آیا ۔ اس ملاقات اور گفتگو سے کچھ عرصہ بعد مجھ سے مسٹر سٹیڈ نے کہا کہ جمعہ کی شام کو دو تین دوستوں کو کھانے پر ساتھ لاؤ اور کھانے کے بعد چاء کے لئے جتنے دوست مناسب سمجھو بلا لو ۔ اگر مختلف خیالات کے لوگ ہوں تو اور بہتر ۔ تاکہ بحث میں سب قسم کی آرائے کا اظہار ہو سکے ۔ میں نے بھی اس اصول کو مدِّنظر رکھ کر اطلاعیں جاری کیں اور اُس شام کو کوئی پندرہ سولہ حضرات ہندو مسلمان کھانے کے بعد ان کے ہاں جمع ہو گئے ۔ اس شام کی صحبت نہایت پُرمطلب اور پرلطف تھی ۔ مسٹر سٹیڈ اُس دن مزے میں تھے ۔ ساڑھے آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک نشست رہی اور مسئلہ ہند پر دلچسپ بحث ہوئی ۔ حاضرین میں مسٹر عبداللہ یوسف علی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے اس طبقہ کا ایک عمدہ نمونہ

تھے جو سرکار انگریزی کی ملازمت میں ہے۔ شیخ محمد اقبال گویا کمبرج کے اعلےٰ طلبہ کے قائم مقام تھے۔ مسٹر ریڈی مدراس کے مشہور طالب علم کانگریس کی رائے کے بیان کے لئے موزون ترین شخص تھے۔ مسٹر ڈوبے کانگریس سے بھی ایک دو قدم آگے چلنے والی جماعت کے طرفدار پروفیسر پرمانند ہمارے لاہور کی آریہ سماج کے رُکن مسٹر عبد الطیف بمبئی کے تجار اور آزاد خیال اصحاب کے خیالات کے جامع اور دیگر حضرات۔ سب منتخب لوگ تھے۔ اس موقع کی گفتگو کی ایک یادداشت میرے پاس مہینوں سے موجود ہے۔ میں اُن دنوں مخزن کے لئے لکھنا چاہتا تھا۔ مگر نہ لکھ سکا۔ اب مسٹر سٹیڈ اور اُن کے رفیقوں کی سیاحت کی وجہ سے یہ مضمون تازہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اس یادداشت سے کام لیتا ہوں اور اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

مسٹر سٹیڈ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت ہندوستان میں ہوں اور آپ سب ایک چھوٹا سا ہندوستان ہیں یہ ہندوستان بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے ایک غیر قوم کے پنجے میں ہے۔ جو اس وقت زبردست ہے اور اختیار رکھتی ہے کہ اس کے ساتھ سلوک اچھا کرے یا بُرا۔ میں ڈبلیو ٹی سٹیڈ اُس قوم کا ایک فرد ہوں اور ایک عمر سے اخبار نویسی کرتا ہوں۔ اس وجہ سے میرا کچھ اثر اس قوم غالب پر ہے۔ آج میں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ مجھے بتائیں کہ اگر ڈبلیو ٹی سٹیڈ ہندوستان کی کوئی خدمت کرنا چاہے۔ تو ہندوستان کی کیا فرمائش ہوگی۔ اور ڈبلیو ٹی سٹیڈ کے لئے بہترین طریقہ اسے فائدہ پہنچانے کا کیا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص جو یہاں موجود ہے میرے اس سوال کا جواب دے۔ اس لئے میں اپنے آپ کو اس جلسہ کا صدر منتخب کرتا ہوں (قہقہہ) اور پوچھنا شروع کرتا ہوں۔

اتفاق سے سب سے پہلے اُن کے دائیں ہاتھ مسٹر یوسف علی بیٹھے تھے اُن سے مسٹر سٹیڈ نے کہا کہ "کہئے جناب آپ کیا فرماتے ہیں۔" ہم سب کو یہ

خیال نہ تھا کہ بحث یہ صورت اختیار کرے گی۔ اور مسٹر یوسف علی کو بہ وجہ تعلق ملازمت ایسی بحث میں لب کشا ہونا مشکل تھا۔ اس لئے اُنہوں نے مسٹر سٹیڈ کے ظریفانہ فقرہ کی آڑ لیکر اپنی باری کو ٹالنا چاہا۔

مسٹر یوسف علی۔ چونکہ صاحب صدر کے انتخاب میں ہماری رائے نہیں پوچھی گئی۔ اس لئے ہم اُن کے فیصلے کے پابند نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ بحث کمرے کے کسی اور گوشے سے شروع کی جائے۔

مسٹر سٹیڈ (وجہ انکار سمجھ کر) گو میں اس مجلس کا خود مختار پریزیڈنٹ ہوں، تاہم میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں سخت حاکم نہیں۔ نرمی سے بھی کام لے سکتا ہوں۔ اس لئے میں دوسرے صاحب سے جو مسٹر یوسف علی کے بعد بیٹھے ہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ تقریر شروع کریں۔"

اب میری باری آئی مگر میں چاہتا تھا۔ کہ مجھے اور تقریروں کے بعد بولنے کا موقعہ ملے۔ اس لئے میں نے کہا:۔ میں امتحان کیا چاہتا ہوں کہ پریزیڈنٹ صاحب کا دعویٰ نرمی کہانتک درست ہے اور میں بھی چاہتا ہوں کہ میری نوبت بعد کو آئے۔"

مسٹر سٹیڈ۔" اسی لئے تو آپ اس سخت سلوک کے سزاوار ہیں جو آپ سے حکام ہندوستان میں آپ سے کرتے ہیں۔ کیونکہ نرمی اگر کی جائے تو لوگ اس سے بیجا فائدہ اُٹھانے لگتے ہیں۔ (گھٹنوں کے بل بیٹھکر اور ہاتھ جوڑکر) میں بھولا میری خطا معاف کیجئے۔ میں نہ پریزیڈنٹ اور نہ نرم پریزیڈنٹ (قہقہہ) میں ایک سائل ہوں۔ اور آپ سے ایک سوال کر بیٹھا ہوں۔ اس کے جواب دینے میں آپ کا اپنا بھلا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ تیسرے صاحب اب مجھے مایوس نہ کریں گے۔ اور کم از کم اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے کہ ہندوستان کی حالت بہتر کیونکر ہو سکتی ہے۔ میں اس سے کچھ اندازہ لگاؤں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

اب تقریریں شروع ہوئیں۔ شیخ محمد اقبال۔ پروفیسر پرمانند۔ پنڈت چرنجیت رائے۔ ڈاکٹر انصاری۔ مسٹر عبد الطیف۔ مسٹر نند لال دوبے اور مسٹر ریڈی نے برجستہ تقریریں کیں۔ شیخ محمد اقبال کی تقریر میں مسئلہ ہندوستان کے اقتصادی پہلو پر اور ہندوستان کی اقتصادی ترقی کی ضرورت بیان کی گئی۔ پنڈت چرنجیت رائے کی تقریر میں ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کی بدسلوکی کی شکایت تھی۔ مسٹر عبد الطیف نے کہا کہ مسٹر سٹیڈ کو خود ہندوستان جاکر اپنی آنکھ سے سب حالات دیکھنے چاہئیں۔ اور پھر اگر جو رائے ہو اُس کو اپنے معمولی جوش کے ساتھ ظاہر کرنا چاہئے۔ مسٹر سٹیڈ نے کہا کہ "یہ فرض کرکے تقریر کیجئے کہ میں نہیں جا سکتا میں بوڑھا ہوں۔ میرے کئی کام یہاں محتاج توجہ ہیں۔" مسٹر لطیف نے کہا کہ پھر آپ ہندوستان کی حالت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ یہاں چند نوجوانوں کو جمع کرکے اُن سے حالات پوچھنا اور رائے لینا کافی نہیں۔

مسٹر سٹیڈ۔ آپ تو نوجوانوں میں نہیں ہیں۔ آپ سے جہاندیدہ اور کارآزمودہ بھی تو نوجوانوں کے اس مجمع میں موجود ہیں۔

مسٹر لطیف۔ اگر میں کارآزمودہ ہوں تو آپ میری رائے مان لیجئے اور عزم سفر کیجئے۔ اس سے بہتر کوئی مشورہ میں آپ کو نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد مسٹر ریڈی نے جو کیمبرج میں تقریریں شہرت خاص رکھتے ہیں۔ اور نہایت شستہ انگریزی بولتے ہیں۔ ایک دلچسپ تقریر کی۔ مسٹر سٹیڈ ہر تقریر سے کچھ نہ کچھ یادداشت لکھتے جاتے تھے اور بات بات پر کوئی نہ کوئی چھیڑ کئے جاتے تھے۔ سب تقریروں کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے اب آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ میں نے جو تقریریں سُنیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ زیادتیاں ہوتی ہیں۔ مجھے پہلے بھی اس امر کا یقین تھا اور اب بھی اس شام کی بحث نے اسے اور تقویت دی ہے۔ لیکن اس کا علاج آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ آپ فریاد نہیں کرتے اور کرتے ہیں تو کافی زور سے

نہیں کرتے۔ آپ کے لئے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ آپ ایک متفقہ رائے قایم کریں کہ آپ کو کیا درکار ہے اور پھر ایسے استقلال کے ساتھ مطالبہ کیجئے۔ کہ میرے ہموطن آپ کی خواہش کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ میرے جو ہموطن وہاں ہیں اُنہیں چین نہ لینے دیجئے تاوقتیکہ وہ آپ کے مطالبات آپ کو نہ دیدیں اور یہاں والوں کو بھی اُن کی میٹھی نیند سے جگائیے +

میں نے اپنی گفتگو میں کہا "ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے آج اپنی شام اس مباحثے کے لئے وقف کی۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ یہ نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ پہلے سوال کا جواب آپ نے اپنے آخری فقرے میں خود ہی دیدیا ہے۔ ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنے زورِ قلم سے ہمیں مدد دیں اور اپنے ہم وطنوں کو ہندوستان کے حالات کی تحقیق کی طرف متوجہ کریں۔ اگر آپ کے نزدیک یہ کام کرنے کے لائق ہے تو آپ کو نہ قلت وقت کی شکایت کرنی چاہئے نہ اور وسائل کی کمی کی وقت نکالنا چاہئے۔ وسائل پیدا کرنے چاہئیں۔ اور جو کام کرنے کا ہے اُسے کرگذرنا چاہئے۔ آپ نے کہا کہ ہم فریاد نہیں کرنا جانتے ہمیں جیسا کچھ ڈھنگ آتا ہے ہم تو اپنی کہانی سناتے ہی رہتے ہیں۔ آگے شنوائی نہ ہو تو کیا کیا جائے ہم بذریعہ اخبارات اور مجالس کے اپنی آواز حکام تک پہنچاتے ہیں اور یہ طریقہ ہم نے آپ ہی کے ملک کے دستور سے سیکھا ہے۔ لیکن چونکہ ہم نوآموز ہیں اور آپ اس فن کے ماہر ہیں۔ اس لئے آپ ہمیں موثر فریاد کا طریقہ بھی سکھائیے۔ یہ سب سے مقدم خدمت ہے جو آپ کرسکتے ہیں ؎

کس طرح[1] فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ

اے اسیرانِ قفس میں نوگرفتاروں میں ہوں

اس کے بعد انگلستان کے لوگوں کو متوجہ کرنا ہے۔ اس کام کے لئے بھی ہمیں آپ بہت مفید مدد دے سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لندن کے اخبارات جو

---

[1] اصل تقریر میں اس شعر کا انگریزی ترجمہ تھا۔

چھوٹی چھوٹی مقامی باتوں اور واہیات مقدمات طلاق کے لئے جگہ نکال سکتے ہیں ہندوستان کے متعلق مضامین کے لئے جگہ نہیں نکالتے۔ انہیں کوئی مضمون دیا بھی جائے تو عذر کر دیتے ہیں۔ اور جب اس باخبر طبقے کا یہ شیوہ ہے تو دوسروں کا تغافل ناگفتہ بہ ہے۔ آپ کا ریویو کثیر اشاعت رکھتا ہے۔ آپ ہی اس میں ہندوستان کو زیادہ حصّہ دیجئے۔ اور اپنے دوسرے دوستوں کو کہئے کہ وہ بھی آپ کی تقلید کریں۔ آپ نے کہا تھا کہ ہم کوئی ایک ایسا اخبار یا رسالہ بتائیں جسے آپ بالالتزام دیکھ لیں تو آپ کو ہندوستان کے روز بروز کے حالات معلوم ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ کوئی ایک ایسا اخبار نہیں جو سب آراء کا مجموعہ ہو۔ لیکن میں آپ کو آسانی سے ہندوستان کے اخبارات سے چند ایسے اخبار انتخاب کر کے دے سکتا ہوں جن کے مطالعہ سے پڑھنے والے کو ہر قسم کی آرائے سے جو اس وقت ہمارے ملک میں موجود ہیں واقفیت ہو جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ان سب کو خود پڑھیں۔ لیکن آپ یہ خدمت اپنے کسی مددگار کے سپرد کر سکتے ہیں۔ اور وہ احوال کا خلاصہ آپ کو دے سکتا ہے۔ اس کے سوا اگر آپ اپنے ریویو کے دفتر کے متعلق ایک کمرہ ایسا بنائیں جس میں ہندوستان کی سرکاری اور غیر سرکاری رپورٹیں۔ ہندوستان کے متعلق کتابیں اور اخبارات اور رسائل مہیا رہیں اور اس امر کا اعلان کر دیں کہ جس کسی کو ہندوستان کے حالات سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہے۔ وہ اس ذخیرے سے کام لے تو عجب نہیں کہ بہت سے لوگ اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ میں نے کئی اصحاب ایسے دیکھے ہیں جو معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ کیونکر کریں۔ انڈیا آفس کا کتب خانہ اول تو عام کتب خانہ نہیں۔ دوسرے اس میں زیادہ تر سرکاری مسالہ ہوتا ہے۔ اس کے سوا کانگریس کی کمیٹی کا ایک چھوٹا سا دفتر ہے جہاں اس قسم کا کچھ مواد موجود ہے۔ لیکن لوگ اس سے عام طور پر آگاہ نہیں۔ تعجب ہے کہ پایہ تخت انگلستان میں حکومت برطانیہ کے ایسے

بڑے ٹکڑے کے متعلق اطلاع کے وسائل کی اسقدر کمی ہے۔ آپ اگر اس کمی کو پورا کریں تو آپ کے رسالے کی ہر دلعزیزی اور کثرت اشاعت بہت لوگوں کو آپ کے دفتر کی طرف کھینچے گی۔ ان سب چیزوں کے علاوہ جو آپ لندن سے باہر جانے کے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمت کر کے ہندوستان کو خود ایک نظر دیکھ آئیں تو آپ اور بھی زیادہ مفید طور پر ہندوستان کی خدمت کر سکتے ہیں"

مسٹر سٹیڈ "میں خوش ہوں کہ آخر آپ نے ایک عملی نسخہ میرے لئے تجویز کیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ ان سب باتوں میں سے جو آپ نے کہی ہیں۔ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ جیسے حالات اور مواقع ہوں گے اُن کے مطابق عمل کرونگا لیکن یہ سب باتیں میرے ذہن میں رہیں گی۔ ریویو میں معاملات ہندوستان کو جگہ دینے کی بابت اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں ہمیشہ اس میں ہندوستان کے موافق لکھتا رہا ہوں۔ لیکن اس کا جو منصب تمام دنیا کے حالات کا خلاصہ درج کرنے کا ہے۔ اس میں خلل ڈالے بغیر میں اس میں ہندوستان کو بہت زیادہ جگہ نہیں دے سکتا۔ میں نے ایک زمانے میں چاہا تھا کہ ہندوستان کے لئے ایک خاص پرچہ نکالوں۔ جو وہیں شایع ہوا کرے۔ اور میں نے وہاں چند دوستوں کو لکھا بھی اور مسٹر کین مرحوم کو کہا کہ وہ دریافت کرتے آئیں کہ ایسے رسالے کی مانگ وہاں ہے یا نہیں۔ مگر اُنہوں نے نااُمید کر دیا۔ اب اگر حالات بدل گئے تو اب یہ کام ہو سکتا ہے۔ دوسرے اخبارات کی بابت جو شکایت آپ نے کی ہے ایک پہلو سے بجا ہے۔ لیکن یہاں اخبارات تجارتی کارخانے ہیں۔ وہ اپنے گاہکوں کی مرضی پہچانتے ہیں اور جو باتیں گاہکوں کو دلچسپ معلوم ہوں وہ لکھتے ہیں۔ آپ کو میں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ کے ملک سے کانگریس یا کوئی اور جماعت انگلستان میں اپنے مقاصد کی اشاعت کے لئے کچھ رقم سالانہ جمع کرے اور یہاں کلکتہ کے ایک دو اخبارات سے ہفتہ وار ایک دو کالم خرید لے۔ جیسے اشتہارات والے خرید لیتے ہیں۔ اور اُن میں مسلسل ہر ہفتے

اپنے مفید مطلب مضامین درج کرائے۔ آخر کب تک لوگ آنکھ اور کان بند کر رکھیں گے۔ اُن کو جاگنا پڑیگا اور وہ دیکھیں گے کہ اصلی حالت ہندوستان کی کیا ہے۔ اگر کبھی آپ لوگ اس قسم کا تہیہ کریں تو اس کا انتظام میں کرا سکتا ہوں۔ اس کے سوا میرے خیال میں آپ کے لئے یہ وقت آگیا ہے۔ کہ آپ کی طرف سے ایک وکیل انگلستان میں متعین ہو۔ جو پبلک سے تنخواہ پائے۔ اور سرکار کا ملازم نہ ہو۔ لیکن آدمی ذی وجاہت اور قابل ہو۔ یہاں رسائی پیدا کرے۔ صاحبانِ اخبار سے۔ اراکین پارلیمنٹ سے اور دوسرے بارسوخ لوگوں سے ملتا اور اُن کے خیالات ہندوستان کے متعلق درست کرتا رہے۔ جہاں کہیں ہندوستان کے متعلق کوئی غلط اطلاع شایع ہو۔ اُس کی باضابطہ تردید کر سکے۔ اور جو ہندوستانی یہاں آئیں اور مقیم ہوں اُن کی رہنمائی اور اعانت کرے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب بھی بعض ہندوستانی حضرات وقتاً فوقتاً بطورِ خود ایسی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ مگر ملک سے باقاعدہ ایک ایسے شخص کے منتخب اور مقرر ہونے کا اثر جدا ہے۔ آپ فوراً ایک جست میں بیجان سے جاندار قوم اور بے زبان سے زبان آور قوم کہلانے کا حق پیدا کر لیں گے۔“

سرسیّد کی برسی

یہ مہینہ سر سیّد مرحوم کی برسی کا ہے۔ جابجا جلسے ہوں گے جن میں مرحوم کے مدّاح جمع ہو کر اُن کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے فاتحہ پڑھیں گے۔ اُن کے کارناموں اور اُن کی قومی اور ملکی خدمات کا ذکر کریں گے۔ اور موجودہ نسل کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی تاکید کریں گے۔ یہ رسم ایک مبارک رسم ہے اور جسقدر عام ہو مفید ہے۔ اس سے قوم میں زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم حق شناس ہیں اور احسان فراموش نہیں۔ مگر یہ سمجھنا

چاہیئے کہ صرف مرحوم کی تعریف کر کے یا اس سالانہ جلسے میں شریک ہو کر ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ سرسید کے اوصاف میں یہ بہت بڑا وصف تھا کہ وہ تعریف کے جویاں تھے نہ مذمت سے ترساں۔ لوگوں نے انہیں بُرا بھلا کہا اور وہ مسکرا کر چپ ہو رہے یا "بدم گفتی و خورسندم" پڑھ دیا۔ لوگوں نے انکی تعریف کی اور انہوں نے شرما کر سر جھکا لیا۔ مجھے یاد ہے جب ایک دفعہ ایک بزرگ نے میری موجودگی میں چند اشعار اُن کے روبرو پڑھے۔ جن میں اُن کی مدح کی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ اُن پر ایک رقت کا عالم تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں دل کا راز کہہ رہی تھیں۔ وہ الفاظ مدح سنتے تھے اور کہتے تھے کہ کاش میں ان کا مستحق ثابت ہوں۔ ہر نئی مذمت اُن کے جوش اور ہمت میں ترقی کا باعث تھی اور ہر نئی تعریف اُن کو تبنا تی تھی کہ اُن پر جو اعتماد قوم اور ملک کے چیدہ اشخاص کو ہے اُس کا بوجھ کتنا بھاری اور اُس کی ذمہ داری کیسی سخت ہے۔ مرحوم کی صداقت اُن کی ترقی اور اُن کی کامیابی کا راز تھا اور یہی وہ جوہر ہے جس کے پیدا کرنے کی کوشش اُن کے مداحوں پر واجب ہے۔ اور جو اِن مجالس کا جو ہر سال منعقد ہوتی ہیں مقصد اعلیٰ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مرحوم جب زندگی میں مدح و ذم سے مستغنی رہے تو اب پس مرگ یہ چیزیں اُن کے کس کام کی ہیں۔ ہاں ایک چیز ہے جس سے اُن کی روح بیشک خوش ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ جن جن خدمات قومی کے لئے اُنہوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اُن کے دوست۔ شاگرد اور پیرو اُن کاموں کی تکمیل میں دل و جان سے کوشاں ہوں۔ جن متعدد کاموں کو اُس پیر مرد جواں ہمت نے تن تنہا سنبھالا ہوا تھا۔ اُنہیں اُن کے جانشین متفقہ کوششوں سے سرانجام دیں۔ اُن کی تعلیمی خدمات سب سے اہم تھیں اور اب بھی بیشتر توجہ اُن کی طرف رہنی چاہیئے۔ یہ مقام شکر ہے کہ اُن کا تعلیمی کام اُن کے بعد روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ کالج کی رونق، شہرت اور عزت دن بدن زیادہ ہو رہی ہے اور اُن کی بنا کردہ تعلیمی مجلس (کانفرنس) شمالی

ہندوستان کی حدود سے نکل کر شرق و غرب و جنوب تک اپنا اثر پھیلا چکی ہے۔
مگر ان دو بڑے کاموں کے سوا اور بھی کئی کام تھے۔ جو مرحوم نے اپنے ذمے
لے رکھے تھے۔ مثلاً وہ اصلاح رسوم و تمدن میں ہمیشہ کوشاں تھے۔ اب علیگڈھ
کے ایک ممتاز تعلیم یافتہ نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ مگر اُن کا مذہبی کام
اُن کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اُنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر نہایت آزادانہ
لکھی اور اس پر اُن کی بیحد مخالفت ہوئی۔ اکثر اصحاب کا یہ خیال ہے کہ اگر اُنھوں نے
تفسیر میں مسلمانوں کے معتقدات عامہ کے خلاف خیالات نہ ظاہر کئے ہوتے
تو علی گڈھ کالج کو مسلمان بہت زیادہ مدد دیتے اور وہ تمام غلط فہمیاں جو اُنکی زندگی
میں کالج کے متعلق تھیں پیدا نہ ہوتیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی تفسیر نے
بہت لوگوں کو اُن سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اور ابتک بعض اطراف میں سخت تعصب
اُن کے نام کے ساتھ باقی ہے۔ لیکن سید احمد خاں بغیر اُس تفسیر کے ایک نامکمل
سید احمد خاں ہوتا۔ ہم اُس تفسیر کو درست سمجھیں یا غلط۔ اس کے جزو سے اختلاف
کریں یا کل سے لیکن اس کے متعلق دو واقعات سے انکار نہیں بن پڑتا۔
ایک تو یہ کہ انگریزی علوم کے نئے نئے رواج سے جو اثر نوجوان طبائع پر
پڑتا تھا۔ اُس کی وجہ سے وہ اپنے دین کے بالکل منحرف ہوتی تھیں اور اُسے
خلاف عقل و فطرت سمجھتی تھیں۔ سید مرحوم نے اسلام کو موافق عقل و فطرت ثابت
کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں بعض جگہ وہ کامیاب ہوئے اور
بعض جگہ صاف نظر آرہا ہے کہ کھینچ تان کر معانی کو اپنے مطالب کے موافق ڈھالا
ہے اور معانی مستند نظر نہیں آتے۔ مگر اُن کی اس کوشش نے اُس سیل
لامذہبی کو جو وہ ابتدا میں تعلیم یافتہ گروہ کو غرقاب کرتا نظر آتا تھا۔ روک دیا۔ اور
وہ لوگ دائرہ اسلام میں رہ گئے۔ دوسرا بڑا اثر جو اُن کی تفسیر کا ہے وہ یہ ہے کہ
ہندوستان میں مذہب کے متعلق فرداً فرداً غور و فکر کرنے کی عادت اور قرآن مجید
کے مطالعہ کا شوق قریب قریب مفقود ہو چلا تھا۔ لوگ اُن شرائط ایمان پر قناعت

کرتے تھے۔ جو اُن کو بچپن میں طوطے کی طرح سکھائی جاتی تھیں۔ اس تفسیر نے بعض دلوں میں جو خود غور و خوض کی اہلیت رکھتے تھے اس شوق کو تازہ کیا۔ اور یہ ایک بڑی خدمت ہے کیونکہ اس بیداری کے زمانے میں جب تمام دنیا کے مذاہب میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے۔ اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو کسی نہ کسی وقت دوسرے مذہب کے علما سے مقابلہ آپڑتا ہے لابد ہے کہ خود اس کے دل میں اپنے مذہب کی بنیاد تحقیق پر مبنی ہو ورنہ وہ ہر وقت اس خطرہ میں رہیگا کہ دوسرے مذہب کا کوئی ہوشیار حریف اس کے عقیدے کی کچی بنیاد کو ہلا دے۔

سر سیّد مرحوم کا سیاسی کام بھی اُن کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جہاں وہ قوم کے لئے قدرت نے اُنہیں دل دیا تھا۔ وہیں امورِ دنیا کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سُلجھانے کے لئے اُنہیں دماغ بھی ایسا عطا ہوا تھا۔ جو حسن تدبیر کے لئے قدرتی طور پر موزوں تھا۔ سیاسیات میں اُن کی طبیعت خوب لگتی تھی اور باوجود مغربی علوم اور السنہ کی ناواقفیت کے وہ مغربی اصول سیاسی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ہاں اُن کے سمجھنے اور عام نو تعلیم یافتہ اصحاب کے سمجھنے میں یہ فرق تھا کہ نئی تعلیم کے لوگ مغرب کے سیاسی قواعد کو بالتمام والکمال ہندوستان میں مروّج دیکھنا چاہتے تھے اور سر سیّد کا معاملہ فہم اور تجربہ کار دماغ انہیں مناسب تغیرات کے ساتھ ہندوستان میں رواج دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سرد آب و ہوا کا درخت گرم آب و ہوا اور خشک سرزمین میں جمے اور پھلے پھولے۔ یہ کہتا تھا کہ نہیں اُس درخت کا پیوند کسی دیسی درخت سے جو اُسی جنس کا ہو لگاؤ۔ اور دیکھو کہ کیسا پھل لاتا ہے۔ اسی پر اس خیال کے لوگوں سے سر سیّد کا پہلے اختلاف ہوا۔ اور پھر جدائی۔ مسلمان تو لکیر کے فقیر ہیں ہی۔ اُن کے ہاں یہ اختلاف اور جدائی ایک آیت حدیث بن گئی جس میں نہ تغیر ہو سکے نہ تبدّل۔ سر سیّد نے اس جدائی کے زمانے میں حکمران گروہ کی رفاقت کی کیونکہ اُس وقت قوم کے لئے چند فوائد اس

تدبیر میں منحصر تھے۔ لیکن اکثر مسلمانوں نے اُس کے بعد یہ شیوہ کر لیا۔ کہ جا و بیجا حکّام کی مدح سرائی کرنی چاہئے۔ سر سید کا مزاج آزادی اور اطاعت کا ایک مرکّب مجموعہ تھا۔ جس میں دونوں چیزیں مناسب مقدار سے موجود تھیں اور اپنے اپنے وقت پر دونو ظاہر ہوتی تھیں۔ جہاں صاف گوئی کی ضرورت ہوتی تھی وہاں وہ حکّام کو بے دھڑک کھری سُناتے تھے اور جہاں اطاعت واجب اور مناسب ہوتی تھی۔ وہاں خود سر تسلیم خم کرتے تھے اور دوسروں کو مشورہ دیتے تھے کہ یہ بات ماننے کی ہے۔ اُن کے بعد اُن کے سیاسی پیرووں نے اُن کا ایک اصول تو مضبوطی کے ساتھ لے لیا اور دوسرے سے عموماً غافل ہو گئے اب بھی اُن کے پیرووں کی جماعت میں چند آدمی ایسے ہیں۔ جو آزادی کی تعریف سمجھتے ہیں اور کبھی کبھی صاف گوئی سے کام لینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ہمّت۔ وہ آزادہ روی اور ادائے فرض میں خوفِ ضرر سے وہ بے پروائی کہاں سے لائیں۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی معاملات ایسے پیچیدہ ہو رہے ہیں کہ پہلے کبھی نہ ہوئے تھے اور دن بدن زیادہ نازک ہوتے جاتے ہیں۔ آج اگر سید مرحوم ہوتے تو میرا عقیدہ ہے کہ وہ ضرور کسی نئی پالیسی کی بنیاد رکھتے جو اس پالیسی سے بالکل جدا ہوتی جو انہوں نے آج سے بیس بائیس برس پہلے مسلمانوں کے لئے تجویز کی تھی۔ اُس وقت مسلمانوں کی حالت اور تھی اب اور ہے۔ اُس وقت ہمارے ہم وطنوں کے خیالات کچھ تھے اب کچھ ہیں اُس زمانے میں حکّام کا رویہ اور تھا۔ اب اور ہے۔ ضرورت ہے تو سید مرحوم کے دل و دماغ کے ایک شخص کی جو ان سب تغیرات کو مدّ نظر رکھکر اپنی قوم کے لئے ایک نیا دستور العمل قایم کرے تاکہ مسلمانوں کی ترقی بھی جاری رہے اور اُن پر بیجا خوشامد اور حد سے بڑھی ہوئی اطاعت کا الزام بھی نہ رہے۔ حکّام سے بھی اُن کی رسم بنی رہے اور ہمسایوں سے بھی نہ بگڑے۔ یہ کام ان سب شرایط کے ساتھ پورا ہونا بظاہر بہت ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مگر بڑے آدمیوں کی ایسے ہی موقعوں کے لئے تو ضرورت ہوتی ہے کہ ناممکنات کو ممکن کر دکھائیں۔ مسلمانوں میں سر سید کے سیاسی

کام کا اصلی جانشین وہی شخص ہو سکتا ہے جو تقلید کی بند سے آزاد ہو کر ہر وقت کے حالات کے مناسب سیاسی رائے قایم کر سکے۔ نہ برک[1] اور شریڈن۔ اور کابڈن کی تقریروں کو رٹ کر ہندوستانیوں کے کان ان تقریروں سے بھرے اور ہر جگہ یہ ثابت کرتا پھرے کہ حدیث و قرآن کے رو سے حکومت انگلستان کی اطاعت مسلمانوں کا فرض مذہبی ہے۔ ان حد سے بڑھے ہوئے راستوں کے بین بین کوئی مسلکِ امن ایجاد کرے۔ جسے تعلیم یافتہ معقول پسند اور آزاد منش اشخاص عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور جس پر چلنے میں ہر شخص کا ضمیر مطمئن ہو۔ ایک طرف مسلمانوں کے منہ پر سیاسیات کے متعلق جو مہر سکوت آجتک لگی رہی ہو اس کا طلسم توڑے اور دوسری طرف انہیں اُس دریدہ دہنی اور ہزیان سے بچائے جس میں سیاسی اصلاح کے بعض مدعی مبتلا ہیں۔

ایک اور نہایت ضروری کام ہے جو سر سید مدت العمر بہت خوبی سے انجام دیتے رہے اور جس کے جاری رکھنے کے لئے اب اُس پایہ کا کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ ہمارا مطلب اردو علم ادب کی خدمت سے ہے اُردو نثر پر اُن کا بڑا احسان ہے۔ اُن سے پہلے مرزا غالب کے رقعات کے سوا کوئی مثال ایسی سلیس اور پُر لطف اُردو نثر کی موجود نہیں۔ جو مغربی زبانوں کی ترقی یافتہ نثر سے لگا کھا سکے۔ سید احمد خان جیسے اور کئی چیزوں کے بانی اور موجد تھے اسی طرح نثر کی اس طرزِ جدید کے بھی پیشرو تھے۔ اُنہوں نے نہ صرف خود عمدہ نثر کے نمونوں سے ہمارے علم ادب کو رونق دی۔ بلکہ اپنے حلقۂ احباب میں اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے اس شوق کو پھیلایا اور ایک معقول گروہ مضمون نویسوں کا پیدا کر دیا جن کی قابلیت سے ملک پہلے آگاہ نہ تھا۔ اور جو بعد کو ہماری علمی دنیا کے روشن ستارے بنے۔ گو قافلہ سالار ابتک باقی ہے اور ان اصحاب کی قلمی خدمات سے ہم آجتک مستفید ہو رہے ہیں۔ گذشتہ سال میں مخزن میں

[1] مشہور مدبرین و مقررین انگلستان۔

کئی نامور مصنفین اُردو کی تصویریں شایع ہو چکی ہیں۔ مگر سرسید مرحوم کی تصویر آجتک شایع نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے اُسے دانستہ اس مارچ کے مہینے کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ کیونکہ ان دنوں میں اس کا شایع ہونا زیادہ موزوں ہے۔ جب ہر طرف اُن کی چند در چند خدمات کا اعتراف ہو رہا ہوگا۔ تاکہ لوگ علیگڈہ کالج کے بانی۔ کانفرنس کے دبیر۔ اور مصلح قوم کو یاد کرتے ہوئے یہ نہ بھول جائیں کہ سرسید ان سب اوصاف کے سوا اعلیٰ درجے کے ادیب بھی تھے اور اُردو نثر ہمیشہ اُنکی تحریرات پر ناز کرے گی۔

ارشد کی یاد میں

چند روز ہوئے ایک دوست کا خط آیا۔ کہ کلامِ ارشد چھپنا چاہئے۔ میں نے اُن کو لکھا کہ مرزا مرحوم نے لائق فرزند یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ ضرور اس فرض کو ادا کریں گے اور اگر اتفاق سے میرے وطن واپس پہنچنے تک کلامِ ارشد کے چھپنے کا انتظام نہ ہو چکا تو میں بھی اس کی اشاعت کی سعی کرونگا۔ کیونکہ میں اُسے نہ صرف اُس خلوص کے لحاظ سے ضروری سمجھتا ہوں جو مجھے مرزا مرحوم سے تھا۔ بلکہ میرے نزدیک ہمارا یہ قومی اور ملکی فرض ہے۔ کیونکہ شہزادہ مرزا عبدالغنی ارشد مدت العمر ملک و قوم کی خدمت زبان و قلم سے کرتے رہے اور اُن کے کلام کے کئی حصے اُردو علم ادب میں مستقل شہرت اور قدر کے مستحق ہیں۔ دہلی کے جن نامور حضرات کی بدولت پنجاب میں اُردو نے قبولیت عام کا درجہ پایا۔ اُن کی معزز فہرست میں مرزا ارشد کا نام توقیر خاص رکھتا ہے۔ شعرائے دہلی کے دورِ آخر میں مرزا ارشد کی ذات بس مغتنم تھی۔ اُن کے گذر جانے سے پنجاب میں پرانی شاعری کے بعض اصناف کا خاتمہ ہو گیا۔ اُن کو ترددات زمانہ نے کبھی جی بھر کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہنے کی مہلت نہ دی۔ اس پر بھی جو کچھ وہ نظم و نثر میں لکھ گئے ہیں

جمع کیا جائے تو کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ اور اگر انتخاب سے کام لیا جائے تو بھی دو معقول جلدیں درکار ہوں گی۔ نثر میں ناول ہیں اور مختصر مضامین۔ نظم میں غزلیں ہیں۔ مرثیے ہیں۔ قومی مسدس ہیں۔ علمی اور اخلاقی مسلسل نظمیں ہیں۔ رباعیاں ہیں۔ لطائف و ظرائف ہیں۔ مرزا ارشد کا ان تھک قلم علم ادب کے وسیع میدان میں ہر طرف دوڑتا تھا اور زبان اُردو کا یہ بادشاہ ایک صنف کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری میں اس بیتابی سے طبع آزمائی کرتا تھا کہ گویا جہانِ سخن پر قبضہ کیا چاہتا ہے ؎

ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ ہمچناں دربند اقلیمے دگر

اور تھا بھی حق بجانب۔ گورگانی خون رگوں میں دوڑتا تھا۔ مگر بادشاہی کی جگہ ملک سخن ہی رہ گیا تھا۔ زبانِ اُردو کنیز خانہ زاد تھی جس گھر میں اردو نے جنم لیا۔ جس گھرانے میں اُس کی پرورش ہوئی۔ اُس گھر اور گھرانے کا یہ چشم و چراغ تھا جب انقلاب زمانہ سے وہ گھر اُجڑ گیا۔ اور دہلی لُٹ گئی تو یہی ایک دولت تھی جو اس کے پاس باقی رہ گئی۔ اُسے لیکر نکلا اور پنجاب کی خوش قسمتی سے پنجاب کی سرزمین اُسے پسند آگئی۔ وہاں بیٹھکر اِس دولت کو اس طرح صرف کیا کہ سینکڑوں مالا مال ہو گئے پنجاب کے جس ضلع کو مرزا ارشد سے خاص طور پر فیض پہنچا وہ فیروزپور ہے۔ اور وہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسا ہوگا جسے مرزا مرحوم سے تلمذ نہ ہو۔ گو لاہور میں مرزا ارشد کا قیام بہت کم ہوا۔ لیکن فیروزپور سے لاہور بہت دُور نہیں اکثر تشریف لاتے تھے۔ طبیعت دوست پرور تھی۔ جو کوئی بھی بُلاتا چلے آتے مشاعرہ ہے تو اُس میں موجود۔ مجلس عزا ہے تو وہاں مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ انجمنوں کے سالانہ جلسے ہیں تو اُن کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ اتنی جگہ سے اُنہیں بلاوے آتے تھے۔ کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سب جگہ پہنچنے کے لئے وقت کہاں سے لاتے ہیں اور سب کے لئے نظم کس وقت لکھتے ہیں طبیعت میں آمد بلا کی تھی۔ مضامین گویا صف بستہ حاضر رہتے تھے۔ قوافی پر عبور کامل تھا۔ بات کرتے کرتے

مصرع اور شعر موزوں ہوتے جاتے تھے۔ کبھی ریل میں آتے آتے سفر میں جلسے کے لئے نظم لکھی جارہی ہے۔ کبھی سب نظم چلے آئے ہیں اور جلسے سے پہلی شب کو شمعِ نیم شب جل رہی ہے۔ کبھی جلسے ہی میں اپنی نوبت آنیسے پہلے ایک گھنٹہ بھر کے لئے الگ جا بیٹھے ہیں اور ایک نظم لکھ لائے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر نظم جو اس عجلت اور روا روی میں لکھی جاتی تھی۔ اُس رتبے کی نہیں ہوتی تھی جو اُن کی قابلیت اور شہرت کے شایاں تھا۔ مگر پھر بھی اس میں بہت سے اشعار کام کے نکل آتے تھے جو سُننے والوں کو پھڑکا دیتے تھے اور باقی اشعار بھی روزمرّہ اور زبان کی خوبی اور اُن کے پڑھنے کے انداز کی بدولت اُس وقت مقبول ہو جاتے تھے۔ واہ واہ کا صلہ اُنہیں ہر جگہ بکثرت مل جاتا تھا اور اس سے زیادہ وہ کسی سے طالب نہ تھے۔ ہاں والیانِ ریاست سے بعض دفعہ اُنہیں خلعت اور انعام ملا مگر وہ بھی زیادہ نہیں۔ اور اس میں بھی ان کی عادت یہ تھی کہ کسی نے دو دفعہ یاد کیا تو ایک دفعہ جا کھڑے ہوئے۔

اُن کی طبیعت کی آمد کا ایک دفعہ مجھے ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہوا اور عجب اتفاق ہے کہ وہ میری اُن کی پہلی ملاقات کا دن تھا۔ اُس کے بعد جب کبھی مجھے ملتے تو اس ملاقات سے واقعات کو یاد دلاتے۔ ان پر خود ہنستے اور دوستوں کو ہنساتے تھے۔ اور وہ قصّہ تھا بھی یاد رکھنے کے قابل۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر دس سال گذر گئے۔ مجھے اُس وقت کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئے دو اڑھائی سال ہوئے تھے۔ اور میں اُس وقت تک نسبتاً گوشہ گزین تھا۔ اخبار آبزرور سے بہ حیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر میرا تعلق تھا۔ اور اس وجہ سے بعض لوگ میرا نام سُن چکے تھے لیکن میری صورت کم پہچانتے تھے۔ میں اُن دنوں ترکی ٹوپی جواب ہندوستان میں مسلمانوں کا شعار ہو چلی ہے نہیں پہنتا تھا اور اس لئے میری وضع اور پوشش میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے یہ پہچانا جائے کہ میں مسلمان ہوں۔ کئی لوگ مجھے ہندو خیال کرتے تھے۔ ہاے عجب زمانہ تھا۔

مجھے دیر وحرم سے کچھ تعلق تھا تو یکساں تھا
گماں ہندو کا کرتا تھا کوئی مجھ پر مسلماں کا

مرزا ارشد بھی اسی دھوکے میں تھے گو مجھے یہ حال معلوم نہ تھا۔ ایک رات وہ لاہور میں ایک مشاعرے میں تشریف رکھتے تھے۔ میرے ہمراہ مرزا صاحب کے شاگردوں میں سے میرے ایک ہندو دوست تھے۔ ہم پہنچے تو مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ مینے اپنے دوست سے کہا چلو مرزا صاحب سے باتیں کریں انہوں نے کہا چلو۔ میں اس سے پہلے کئی دفعہ ایسے ہی موقعوں پر بغیر باقاعدہ تقریب ملاقات کے اُن سے باتیں کر چکا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتے ہیں۔ ہم دونوں اُن کے پاس جا بیٹھے وہ معمولی اخلاق سے پیش آئے۔ پہلے کچھ شعر و سخن کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میرے دوست نے انسے کہا "کل ہمارے ہاں کھانا کھائیے" انہوں نے شکریہ ادا کیا اور یہ کہکر عذر کیا۔ کہ "آجکل رمضان کا مہینہ ہے۔ ہم مسلمانوں کو دن میں کھانا کھانے کی ممانعت ہے۔ اور شام کو میں فیروزپور واپس جاتا ہوں" اس اثنا میں روزوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مجھ سے بھی وہ کچھ اسیطرح مخاطب ہوئے جیسے مسلمان نہیں۔ اور اس لئے مجھے مسلمانوں کا دستور ٹھیک معلوم نہیں۔ مجھے اس سے کسیقدر تعجب ہوا۔ لیکن میں چپ ہو رہا اس خیال سے کہ خطاب اصل میں میرے ہندو رفیق سے ہے۔ خیر اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ مرزا موصوف نے ایک پرزور غزل پڑھی۔ اس کے بعد اور لوگوں کی غزلیں پڑھی گئیں اور مشاعرہ برخاست ہوا۔ دوسری صبح کو کوئی دس بجے کے قریب میں بازار میں جا رہا تھا۔ کہ مرزا صاحب مل گئے۔ میں نے سلام کے لئے ہاتھ اُٹھایا۔ اُنہوں نے کہا "بندگی! آپ خوب وقت پر ملے۔ میں ہزاروں دفعہ لاہور آیا ہوں۔ مگر یہاں کی گلیاں سمجھ میں نہ آئیں۔ مجھے داروغہ عبدالغفور خاں صاحب کے ہاں جانا ہے۔ راستہ بتائیے" میں نے کہا "چلئے میں بھی ادھر کو جا رہا ہوں۔ آپ کو وہاں پہنچا جاؤنگا" وہاں پہنچے تو مرزا صاحب

کہنے لگے " اگر آپ کو عجلت نہ ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جائیے۔ آپ سے باتیں کر کے جی خوش ہوتا ہے۔" میں اُن کے ساتھ مکان کے اندر گیا۔ وہاں میرے ایک دو ملاقاتی موجود تھے۔ اُنہوں نے مجھے "السّلام علیکم" کہا تو مرزا صاحب چونکے۔ کہنے لگے۔ "ایں! ارے میاں کیا تم مسلمان ہو؟" اس پر ایک دوست نے بڑھ کر میرا نام و نشان اُنہیں بتایا۔ یہ بیچارے اور بھی متحیر ہوئے۔ معذرت کرنے لگے۔ "بھئی مجھے خدارا معاف کر دو۔ کل رات بھی تمہیں ہندو سمجھ کر میں رُوزوں کے متعلق تم سے یوں گفتگو کرتا تھا۔ جیسے تمہیں کچھ خبر نہیں کہ اُن کے قواعد کیا ہیں۔ اور تم نہ صرف مسلمان نکلے بلکہ مسلمانوں کی جماعت کے ممتاز لوگوں میں سے۔ میں تمہارے پریس میں تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے جانے کو تھا۔ کہ تم نے میری کتاب "فہنشاہ نامہ" پر عمدہ ریویو لکھا ہے۔ اور میں نے یہ شکریہ ادا کیا۔ کہ تمہیں ایک معمولی طالب علم سمجھ کر ساتھ گھسیٹے لایا۔" میں نے کہا "آپ کے ساتھ آنا میرے لئے عین راحت ہوا۔ اور آپ سے ملنا میرے لئے موجب عزت ہے۔ آپ کیا فرما رہے ہیں۔" بولے۔ میں بار بار اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوں۔ کہ میں نے اس سے پہلے کسی سے کیوں دریافت نہیں کیا۔ کہ آپ کون ہیں۔ ورنہ یہ ندامت نہ اُٹھانی پڑتی۔ معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو ہر مشاعرہ اور ہر مجلس میں موجود دیکھ کر یہ سمجھتا تھا۔ کہ آپ لاہور کے بیکار نوجوانوں میں سے ہیں جو ہر جگہ دل بہلانے کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور اسی لئے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ کہ کسی سے پوچھوں۔" میں نے کہا "حضرت اب اس معذرت کو رہنے دیجئے۔ آپ سے ہم نثر میں باتیں کرنے نہیں بیٹھے۔ اپنا کلام کچھ سنائیے۔ مدت سے آرزو تھی کہ نیاز حاصل ہو۔ آج موقعہ ہوا۔" اُنہوں نے کہا "تازہ غزل" جو میرے پاس تھی وہ تو میں نے رات پڑھ دی۔ اب کوئی چیز سُنانے کے لائق موجود نہیں۔ فکرِ سخن کی فرصت کہاں ملتی ہے۔ معلّمی کی زندگی شاعری کے لئے سخت ناموزوں ہے۔" ایک صاحب جنہوں نے مجھ سے اُن سے ملاقات کرائی تھی۔ بولے۔ "اگر آپ کو مرزا صاحب کا کلام سُننا

ہے تو یہ نسخہ مجھ سے پوچھئے۔ کوئی مصرع طرح دیدیجیے اور ابھی بیٹھے بیٹھے کلام سُنتے جائیے"۔ مجھے اس وقت امیر مینائی کی ایک پسندیدہ غزل یاد آئی جو مجھو اندنوں خصوصیت سے پسند تھی۔ اور میں نے یہ مطلع پڑھا:

تڑپا ہیں جو آنکھوں کو پسند آگئیں آنکھیں — دل لوٹ گیا چوٹ غضب کھاگئیں آنکھیں

مرزا صاحب نے کہا "خوب مطلع ہے" میں نے دوسرا شعر پڑھا:۔

آفت کی سفیدی ہے قیامت کی سیاہی — نیرنگ دو عالم مجھے دکھلاگئیں آنکھیں

فرمایا "بہت خوب"۔ میں نے تیسرا شعر پڑھا:۔

اس ناز سے دیکھا کہ بہم کٹ گئے عشاق — ایک ایک کو ایک ایک سے لڑوا گئیں آنکھیں

شعر سنتے ہی پھڑک گئے۔ اور کہنے لگے لیجئے ہم بھی چند شعر اس زمین میں کہہ دیتے ہیں اور فی البدیہ کوئی گیارہ شعر کی ایک غزل منٹوں میں کہدی۔ مجھے اُس کے دو تین شعر یاد رہ گئے ہیں:۔

اے شوخ یہ دُکھنے جو تری آگئیں آنکھیں — کیا دل کے دُکھانے کا مزا پاگئیں آنکھیں
یہ کہہ گئیں چھٹنے کی نہیں رسمِ محبت — سمجھے نہیں تم خود بھی جو فرما گئیں آنکھیں
کیوں باغ میں نرگس کے تلوے مرگئے ارشد — معلوم نہیں کس کی پسند آگئیں آنکھیں

اب کیا تھا۔ ہمیں گُر معلوم ہوگیا۔ ایک آدھ شعر کسی غزل کا پڑھ دیا اور اُسی زمین میں ایک غزل سن لی۔ جلال لکھنوی کا دیوان سامنے رکھا تھا۔ ان کا ایک مصرع سامنے آگیا ع ترکِ اولیٰ ہوگا یا روزہ قضا ہو جائیگا۔

مصرع اوّل کا مضمون تھا کہ ماہ صیام میں ساقی نے دعوتِ مے کردی ہے۔ اب یہ مشکل آپڑی ہے کہ یا روزہ قضا ہو یا ترکِ دعوت ہو۔ میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ اس پر بھی ایک غزل رہے۔ چنانچہ اُسیوقت ایک بہت لمبی غزل ہوئی افسوس کہ میرے حافظہ میں اب اُس کے بھی چند ہی شعر محفوظ ہیں:۔

نازنیں تو بڑھتے بڑھتے کیا سے کیا ہو جائیگا — ہے ابھی تو بُت کسی دن کو خدا ہو جائیگا
میکدے کو چھوڑ کعبے کون جائے واعظا! — وہ بھی اک فرضِ ضروری ہے ادا ہو جائیگا

تم بنے سنورے ہوا اور میں سخت اس نشّی مزاج
خوف ہے آئینہ صورت آشنا ہو جائیگا
میں تو کہہ دوں صاف اسکے حُسن کی کیا شاں ہو
پر خداوندِ دو عالم تو خفا ہو جائیگا

اُس دن سے مرزا ارشد میں اور مجھ میں پیمانِ محبت بندھ گیا۔ اس کے بعد میں اُنہیں کئی دفعہ فیروز پور میں ملا۔ وہ مجھے لاہور میں ملے۔ اُن کے آتے ہی میں اور کام چھوڑ کر شعر و سخن کی گفتگو شروع کر دیتا تھا اور اُن کے کلام سے محظوظ ہوتا تھا۔ دو آخری ملاقاتیں بھی مزے کی ملاقاتیں تھیں۔ مگر افسوس یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ملاقاتیں آخری ہونگی۔ جاڑے کے دن تھے۔ میں صبح کے وقت گھر میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کی طرف سے گانے کی آواز آئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی خوش آواز شخص کچھ الاپتا ہوا اُس کمرے کی طرف آرہا ہے جہاں میں بیٹھا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ مرزا صاحب ایک بڑی سی کتاب بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں اور یہ شعر سوز و گداز سے پڑھ رہے ہیں ؎

قبر میں کوئی خبر لینے نہ آیا بعدِ مرگ
زندگی تک تو بہت تھے چاہنے والے مرے

اُن کو کبھی گاتے نہ سُنا تھا۔ اس لئے متعجب ہوا۔ مجھے بعض لوگوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ فیروز پور میں کبھی کبھی اپنے گھر میں احبابِ خاص کی بزمِ مختصر میں وہ اشعار گا کر پڑھتے ہیں۔ اور چونکہ فنِ موسیقی سے باخبر ہیں اور آواز اچھی پائی ہے۔ اس لئے سُننے والوں پر بہت اثر ہوتا ہے۔ لیکن مجھے ادب ہمیشہ مانع رہا تھا کہ میں اُن سے درخواست کروں کہ کوئی چیز لَے سے پڑھیں۔ مجالس میں ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور میں اسی کا عادی تھا۔ اُس دن جو میں نے اُن کی طبیعت کو راگ کی طرف مائل پایا میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہی شعر یا اسی غزل کے اور شعر یاد ہوں تو اسی اسی آہنگ سے سنائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے مطلع پڑھا ؎

ہنس کے فرمانے لگے سُن سُن کو وہ نالے مرے
آپ کب سے ہوگئے ہیں چاہنے والے مرے

اور مقطع تھا:۔

ضبطِ اُلفت کی قسم کھاتا ہوں لیکن کیا کروں
جان کھا جاتے ہیں ارشد پوچھنے والے مرے

یہ غزل میں نے اُسیوقت لکھ لی تھی۔ صرف چند شعر اور تھے جو مخزن میں چھاپ دیئے تھے۔ مگر جو لطف ان شعروں کا مجھے مرزا مرحوم کی زبان سے اُن کے دلفریب آہنگ میں سُنکر آیا تھا اُسے میں دوسروں تک کیونکر پہنچاتا۔ میں نے جی میں کہا کہ اچھا ہوا اس سوال کا تکلف درمیان سے اُٹھ گیا۔ اب جب ملونگا مرزا صاحب سے فرمایش کرونگا کہ کچھ سنائیے۔ مگر حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد“۔ کاتبِ تقدیر اسی وقت لکھ رہا تھا۔ کہ جو سُن لیا ہے اُس کو غنیمت سمجھ اور اسی کو یاد اور تاثیر دل میں رکھ۔ پھر یہ بات تیرے حصّے میں نہیں ہے۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے کہا ”آج تمہارے ہاں ایک کام لیکر آیا ہوں“۔ میں نے کہا فرمایئے۔ کہنے لگے ”فرمانا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ہو بڑے خوش قسمت۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں سال بھر سے ارادہ کر رہا ہوں کہ ایک رسالہ جاری کروں۔ اور اس عرصے میں اُس کی تیاری میں مصروف رہا ہوں۔ میرے پاس اس وقت سال بھر کے لئے نظم و نثر کا مسالہ موجود ہے۔ اور سب میرا اپنا لکھا ہوا۔ رسالہ جاری ہوتا اور اَور لوگوں کے مضامین آتے تو یہ مسالہ کئی سال کو کفایت کرتا۔ اور ظاہر ہے کہ میرا رسالہ تمہارے رسالے کے لئے ایک زبردست غنیم ثابت ہوتا۔ مگر بعض اسباب سے میرا ارادہ ملتوی ہو گیا ہے اور میں یہ سب مسالہ تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ ان میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جو وقتاً فوقتاً مخزن میں چھاپ سکو گے اور کچھ ایسی ہیں کہ انہیں علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہونا چاہئے۔ ایک صاحب نے اس کتاب کے لئے ایک رقم پیش کی ہے۔ مگر میں اسے اپنی محنت کا کافی معاوضہ نہیں سمجھتا۔ اس لئے میں نے منظور نہیں کی۔ تمہیں مفت دیتا ہوں۔ کیونکہ تم اس جنس کے قدردان ہو۔ اور مالدار نہ ہونے میں میرے بھائی ہو

صرف یہ شرط ہے کہ کتاب نہایت نفیس چھپے۔ کوئی سو کاپیاں مجھے دیدینا۔ دوستوں میں بانٹونگا۔ اور باقی تم جانو تمہارا کام"۔ میں نے نہایت شکریہ کے ساتھ اس شرط کو منظور کیا اور اُنہوں نے وہ بڑی سی کتاب جو بغل میں تھی۔ میرے حوالے کردی۔ میں دیر تک اُسے دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ پھر اسے ایک بیش قیمت خزانہ سمجھکر میں نے الماری میں بند کر دیا اور قفل لگادیا۔ دوسرے دن مرزا صاحب پھر تشریف لائے۔ کہنے لگے" نواب صاحب بہادر مالیر کوٹلہ کے ہاں سے پیام آیا ہے۔ کہ آئیے اور کچھ اپنا کلام ساتھ لائیے۔ میرے پاس یہاں کچھ اور موجود نہیں۔ وہ کتاب دو تین دن کے لئے مجھے دو میں اسی میں سے انہیں کچھ سنادونگا۔ اور پھر تمہاری امانت تمہیں دیدونگا"۔ میں نے کہا ایسا نہ ہو کہ آپ کی بے پروائی میں یہ کہیں گم ہو جائے اور میں اس سے محروم رہ جاؤں۔ کہنے لگے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بحفاظت تمام تمہیں واپس لادونگا۔ میں نے کتاب الماری سے نکال کر اُنہیں دیدی۔ افسوس! مجھے نہ اس کتاب کو دیکھنا نصیب ہوا نہ مرزا صاحب کو۔ وہاں سے آتے ہی وہ ایک عارضہ دماغ میں مبتلا ہو گئے۔ جس کے آثار ان کے پہلے دن کی یاس آمیز گفتگو کے بعض حصّوں سے پائے جاتے تھے۔ اس کے بعد میں جلد اس لمبے سفر کے لئے گھر سے چل پڑا اور میری غیر حاضری میں مرزا صاحب رحلت فرما گئے ع۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مجھے معلوم نہیں اس کتاب کی کیا قسمت ہوئی۔ کسی نے مجھے لکھا ہے کہ اُنہوں نے دریا میں پھینک دی تھی۔ خدا کرے ایسا نہ ہوا ہو اور ان کے ورثا کے پاس یہ خزانہ باقی ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو یقیناً ہمارے علم ادب کی بدقسمتی ہے کئی دفعہ اُس کے بہترین مصنّفین کا سرمایۂ عمر اس طرح دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکا ہے اور اس کی وجہ زیادہ تر ہمارے ملک میں عام طور پر ہنر کی قدر نہ ہونا ہے۔ بیچارے مصنّفین خونِ جگر کھا کھا کر علمی کام کرتے ہیں اور پھر اتنا بھی یقین نہیں ہوتا کہ کتاب

چھپ جائیگی یا اگر چھپ گئی تو بلا نقصان بِک جائیگی۔ اور جب تک یہ حالات بدل نہ جائیں۔ علمِ ادب میں وہ جان نہیں آسکتی جو زندہ۔ مالدار اور قدر دان قوموں کے ادبیات میں ہے اور جن کی ترقی دیکھ کر ہم حیران رہتے ہیں۔

ارشد مرحوم نہایت خوش خلق اور خوشخو تھے۔ لیکن جب کسی سے ناراض ہو جاتے تھے تو ان کا غصہ بھی ایسا تھا کہ الاماں۔ دوسرے شعرا کو رقیب سمجھنے میں متقدمین کا نمونہ تھے اور کسی اور کی تعریف اُن کے سامنے کرنا اُنہیں اکثر برہم کر دیتا تھا۔ اُن کا کلام عموماً شگفتہ عام فہم اور سادہ تھا۔ اور اُس میں کوئی عیب تھا تو وہ پُر گوئی کا نتیجہ تھا۔ کلام کو مانجھنے اور بار بار اُس پر غور کرنے کی عادت اُن میں کم تھی۔ سیماب کی سی بیقراری اُن کی طبیعت میں تھی اور اسی لئے جو کچھ لکھتے تھے ایک حالتِ اضطراری میں لکھتے تھے۔ مگر طبعِ رسا اور شاعرانہ دل لیکر پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے باوجود متاعِ سخن کی سرد بازاری کے تمام عمر اسی مال کی تجارت میں گذاری۔ یہ میں کہہ چکا ہوں کہ اُنہوں نے سب اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب میں وہ یکساں پھولے پھلے ہیں۔ میرے خیال میں اُن کی تربیت اور طبیعت دونوں غزل کے لئے موزوں تر تھیں۔ اور غزل جب کہتے تھے اچھی کہتے تھے۔ ضروریاتِ زمانہ اور مسدسِ حالی کی مقبولیت نے اُنہیں قومی مسدس کی طرف مائل کر دیا۔ اور چند قومی مرثیے نہایت عمدہ یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن یہ میدان حالی پہلے ہی مار چکے تھے اور اس میں کسی اور کی زور آزمائی اُن کے بعد اُن کی شہرت کی برابری نہیں کر سکی۔

شہیدانِ کربلا کے دردناک حالات پر بھی مرزا ارشد نے مرثیے لکھے ہیں۔ لاہور کی مجالس میں اکثر پڑھتے تھے۔ مگر اس صیغے میں وہ اپنے دوست میر ناظر حسین خاں ناظم کے مراثی پر سبقت نہ لے جا سکے۔ کیونکہ میر صاحب کو اس فن میں لکھنؤ کے مشہور باکمالوں سے تلمذ ہے۔ وہ مرثیہ میں غیر معمولی مہارت اور مذہبِ امامیہ رکھتے ہیں۔ اور مرثیہ اُن کا حصہ ہے۔ جدید مضامین پر مولانا آزاد کے

رنگ میں بھی کچھ نظمیں مرزا ارشد نے لکھی ہیں۔ مگر وہاں بھی ایجاد کا سہرا مولانا آزاد کے سر پر ہے۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی مرزا صاحب کا کام کسی دوسرے ہم عصر کے کام سے کم قابلِ قدر نہیں ہے۔ اور میں اُنہیں غزل کے اعتبار سے زمانۂ حال کے شعرا کی صفِ اوّل میں اور دیگر اصنافِ سخن میں صفِ دوم میں جگہ پانے کا مستحق سمجھتا ہوں اور یہ آرزو رکھتا ہوں کہ اُن کے صاحبزادے۔ اُن کے شاگرد اور اُن کے دوست اُن کے کلام کو مرتب کرنے اور اس حصّے کو جو ابتک نہیں چھپا چھاپنے کا فرض جلد ادا کریں۔ تاکہ مرحوم کی روح کو خوشی ہو۔ اور لوگ اُن کی قدر کماحقہ پہچانیں ؂

جنوب فرانس میں سرما

اور

ایک فرانسیسی یونیورسٹی میں دو مہینے

اب کے سخت جاڑے کے دو مہینے خوش قسمتی سے مجھے لندن سے باہر کاٹنے نصیب ہوگئے۔ میں فرانسیسی زبان میں کسیقدر مشق بہم پہنچانے کی غرض سے فرانس کے شمال میں کسی شہر میں کچھ دن ٹھہرنے کا عزم رکھتا تھا۔ ایک واقفکار دوست نے مشورہ دیا۔ کہ جب انگلستان سے نکلتے ہو تو پھر شمال فرانس میں کیوں ٹھہرو۔ جنوب میں جاکر رہو کہ تبدیل آب وہوا کا بھی لطف آئے۔ یہاں جاڑوں میں بعض دفعہ سورج دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں۔ وہاں قریب قریب ہر روز آفتاب چمکیگا۔ سردی معتدل ہوگی اور ہوا خوشگوار۔ محض تفریح منظور ہو تو نیس میں قیام کرو۔ فرانس کے اُس حصّے کو "ساحلِ نیلگوں" کہتے ہیں۔ بحیرہ روم کا نیلگوں سمندر تمہارے سامنے لہریں مار رہا ہوگا۔ آفتاب کی کرنیں اُس کے لطف کو دوبالا کریں گی۔ جاڑے میں بہار کا مزا آئیگا۔ لیکن اگر کچھ پڑھنے لکھنے کا شغل بھی جاری رکھنا ہو۔ تو مونٹ پیلیے[۱] جاؤ۔ جنوبی فرانس کی مشہور ترین یونیورسٹی

[۱] انگریزی میں مونٹ پیلیر

وہاں ہے۔ تمہیں علماء سے ملنے کا موقعہ ہوگا اور ہر طرف علمی چرچا ہوگا۔ اگر چاہو تو ایک
دوست کے نام تمہیں چٹھی بھی دیدیتا ہوں۔ وہ تمہیں ہر طرح مدد دینگے۔ میں نے اس
مشورہ کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ اور آخر نومبر میں مونؔ پیلے آگیا۔ پرانا تاریخی
مقام ہے اور یہاں کی یونیورسٹی بھی نہایت قدیم ہے۔ اس کے قریب ایک اور
تاریخی مقام ہے جسے نیم کہتے ہیں۔ اس کے کھنڈر رومیوں کے زمانے کی یادگار
ہیں۔ مارسیلز کا بندر یہاں سے کچھ بہت دور نہیں لیکن خود مونؔ پیلے کے قریب
کوئی آدھ گھنٹے کی راہ پر سمندر واقع ہے اور لوگ تعطیل کے دن وہاں تک سیر
کو جاتے ہیں۔ شہر پہاڑی آبادیوں کی طرح کئی نشیب و فراز رکھتا ہے اور کسی بلند
مقام پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو گرد پہاڑیوں کا حلقہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف کوہستان
سیوؔرن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دوسری طرف اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں
آب و ہوا کے لحاظ سے یہ جگہ خوب ہے۔ اب و ہوا خشک اور صحت بخش ہے
جاڑوں میں یہاں کا موسم عموماً خوشگوار رہتا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے
پہلے یہاں ایک شہر آباد تھا جسے گلولوں کہتے تھے۔ جب وہ شہر اُجڑ گیا۔ تو اسی
مقام کے قریب رومیوں کی بستیاں بنیں جن کے کھنڈر اب تک ملتے ہیں۔ اب
آٹھویں صدی سے یہ شہر اپنے موجودہ نام سے موسوم اور آباد ہے۔ بارہویں صدی
میں یہاں پہلے پہل یونیورسٹی کی بنیاد پڑی اور اُس زمانے سے آج تک یہ مقام
یورپ کے بڑے علمی مرکزوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی ابتدائی منظوری پاپائے
روما کی طرف سے ہوئی تھی اور قرون وسطیٰ میں یہاں بڑا بھاری مجمع علماء کا رہتا تھا
اندلس سے عربوں اور یہودی علماء کے ذریعے ارسطو کی حکمت و فلسفہ اور اطالیہ
سے مذہبی علوم و قوانین یہاں پہنچتے تھے اور باعث فیض عام ہوتے تھے۔ کچھ
عرصہ بعد فن طب کی طرف یہاں خصوصیت سے رغبت شروع ہوئی اور جوں جوں
طب جدید ترقی کرتی گئی۔ اس یونیورسٹی میں بھی اس کے اسباب و آلات مہیا
کئے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ اس وقت طب جدید کی تعلیم کا مکمل سامان یہاں

سلہ انگریزی کا یاسا:-

موجود ہے اور پیرس کے بعد طب کے لئے کوئی دار العلوم فرانس بھر میں اس سے زیادہ مقبول نہیں۔ مگر اس یونیورسٹی نے اپنی کوشش فن طب تک محدود نہیں رکھی وقتاً فوقتاً اور صیغوں کی تعلیم کے لئے انتظام کرتی رہی ہے۔ اور اب طب کے سوا سائنس اور آرٹ کے صیغے بھی یہاں مہیا ہیں۔ جن میں نامور پروفیسر تعلیم دیتے ہیں۔ ملک کے ہر گوشے کے طلبہ کے علاوہ ممالک غیر کے طالب علم بھی دُور دُور سے یہاں آتے ہیں۔ معلوم نہیں یہاں کی آب وہوا اُنہیں کھینچتی ہے یا یونیورسٹی کی شہرت۔ یا اس کی شرائط کی آسانیاں۔ لیکن یہاں کے طلبہ میں روسی۔ جرمن۔ انگریز اور ہسپانیہ والے سب موجود ہیں۔ بلکہ میں نے کچھ طالب علم امریکہ اور کنیڈا کے۔ کچھ سویڈن ناروے کے اور کچھ سرویا بلگیریا کے بھی دیکھے۔ اتفاق سے ایک ہندوستانی طالب علم بھی یہاں موجود ہیں۔ مشرقی بنگال کے رہنے والے ہیں اور مسٹر داس نام ہے۔ یہ یہاں زراعت اور صنعت ابریشم کی تحصیل کے لئے آئے ہیں اور بنگال کی اُس کمیٹی نے جو طلبہ کو مختلف بلاد دنیا میں صنعتی تعلیم کے لئے وظیفے دیکر بھیجنے کو قایم ہوئی ہو۔ انہیں مون پیلیے میں بھیجا ہے۔ یہ بات اُس کمیٹی کی واقفیت عامہ کی وسعت اور عالی حوصلگی پر دلالت کرتی ہے۔ اور مسٹر داس بھی تعریف کے مستحق ہیں کہ باوجودیکہ وہ یہاں آنے سے پہلے فرانسیسی نہیں جانتے تھے۔ اُنہوں نے چھ مہینے میں اسقدر سیکھ لی ہے۔ کہ وہ جماعت کے ساتھ سبق پڑھ سکتے ہیں۔

مون پیلیے چونکہ علمی مرکز ہے۔ اس لئے یہاں کے شرفا میں ذی حلم اور علم دوست لوگ بکثرت ہیں۔ وہ اپنی یونیورسٹی پر ناز کرتے ہیں اور یونیورسٹی اُن پر ناز کرتی ہے۔ وہ ہر طرح سے اس کی شہرت بڑھاتے اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور اس لئے اُنہوں نے خاص اہتمام کیا ہے۔ کہ ممالک غیر کے جو طلبہ یہاں آئیں اُنہیں بہ سبب اجنبی ہونے کے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک کمیٹی اس غرض سے قایم کی ہے کہ وہ اجنبی طلبہ کی خبر گیری کرے۔ اُنہیں مکان ڈھونڈھنے

میں مدد دے۔ اُنہیں تعلیم کے متعلق مشورہ دے اور اُن کے لئے اچھی صحبتوں میں شریک ہونے کے موقعے بہم پہنچائے۔ اور اگر کوئی اجنبی طالب علم بیمار ہو جائے تو اُس کے علاج میں مدد دے۔ یہ جماعت نہایت کوشش سے کام کر رہی ہے اور اس کے سکرٹری موسیو ولیری ہیں۔ اسی مجلس کے زیر نگرانی اجنبی طلبہ کو زبان فرانسیسی کا سبق مفت پڑھایا جاتا ہے۔ چند سال ہوئے موسیو تاپے نامی ایک صاحب نے ایک ہزار فرانک سالانہ یونیورسٹی کو اس غرض سے دیا تھا کہ اجنبی طلبہ کو زبان کا سبق مفت پڑھانے کا انتظام اس رقم سے کیا جائے۔ اُن کے بعد اُن کی بیوہ نے اس عطیے کو جاری رکھا۔ اور ہفتے میں دو سبق فرانسیسی زبان کے یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ایک مبتدیوں کے لئے اور ایک اُن طلبہ کے لئے جو پہلے کچھ فرانسیسی پڑھ چکے ہوں۔ اس سبق میں شریک ہونے کے لئے یونیورسٹی کے دفتر میں جا کر صرف نام درج کرا دینا ہوتا ہے۔ مجھے جو خط لندن سے ملا تھا وہ موسیو ولیری کے نام تھا۔ اُنہوں نے مجھے سب سے پہلا مشورہ یہ دیا کہ اس سبق میں شریک ہو جاؤ۔ یہ سبق میرے لئے نہ صرف بلحاظ زباندانی مفید تھا۔ بلکہ نئی معلومات اور مشاہدات کا ذریعہ ثابت ہوا۔ اوّل تو اس جماعت میں ہر ملک ہر عمر اور ہر قوم کے طلبہ اکٹھے پڑھتے ہیں۔ دوسرے عورتیں اور مرد ہم سبق ہیں۔ کیونکہ یونیورسٹی میں بہت سی لڑکیاں بھی طالب علموں میں ہیں اور اُن میں جو دوسرے ملکوں سے آئی ہوئی ہیں وہ اپنی فرانسیسی کی تکمیل کے لئے اس جماعت میں آتی ہیں۔ چند مثالیں ایسی نظر آئیں کہ میاں بی بی ہم سبق ہیں۔ سویڈن کے رہنے والے ایک نوجوان کو میں نے یہاں دیکھا جو اپنی بی بی سمیت یہاں پڑھنے آیا ہے اور اور اس جماعت میں دونوں ہم سبق ہوتے ہیں۔ ایک اور صاحب کنیڈا کے اسیطرح میاں بیوی دونو ہم جماعت تھے۔ عورتوں میں ایک کیمبرج کی تعلیم یافتہ انگریزی عورت تھی جو کیمبرج سے تحصیل ختم کر کے صرف فرانسیسی کی ترقی کے لئے یہاں بھیجی گئی تھی۔ اس کو یہاں لڑکیوں کے سکول میں جگہ مل گئی ہے۔ وہاں انگریزی پڑھنو

والی جماعت کو ہفتے میں دو دفعہ انگریزی بولنے کی مشق کراتی ہے اور خود فرانسیسی کی تکمیل کرتی ہے۔ اور اس کے عوض میں رہائش کا خرچ اور مکان اُسے مدرسے کی طرف سے ملتا ہے۔ دو جرمن معلّم اسی جماعت میں نظر آئے جن میں ایک کی عمر ساٹھ کے قریب ہوگی وہ دونوں جرمنی کے صیغہ تعلیم کے ملازم ہیں اور باوجودیکہ علما فرانسیسی سے اچھی طرح واقف ہونے اور بولنے کی خاصی مہارت کے بغرض تکمیل فرانس آئے ہوئے ہیں۔ بوڑھے پروفیسر صاحب کا نام ڈاکٹر کنوٹ ہے۔ اُن سے میری ملاقات ایک دن موسیو ولیری کے ذریعے ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ اُنہیں چھ ماہ کی رخصت اس شرط پر دی گئی تھی کہ وہ اُسے فرانس میں صرف کریں اور علاوہ زبان کی تکمیل کے مقصد کے فرانس کے طریقۂ تعلیم کو دیکھ کر ایک رپورٹ پیش کریں۔ کہ کن کن باتوں میں وہ جرمن طریق سے مختلف ہے۔ میں نے اس بوڑھے پروفیسر کو ہمت میں جوانوں سے بڑھ کر دیکھا۔ کوئی جلسہ یا لیکچر ایسا نہ تھا۔ جہاں وہ نہ پہنچتا ہو۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی ان چیزوں کا شائق ہوں تو کئی دفعہ وہ مجھے ایسے جلسوں کی اطلاع دے جاتے تھے جن کی مجھے ویسے خبر نہ ہوتی اور کبھی کبھی ساتھ لے جاتے تھے۔ علم کا شوق ان لوگوں کا حصہ ہے اور عمر بھر اس سے سیر نہیں ہوتے۔ جبھی تو ہماری تعلیم اور ان کی تعلیم کے نتائج میں اتنا فرق ہے۔ ایک مجلس یہاں ہے جسے مجلس تعلیم عوام کہتے ہیں۔ اس کا پتہ مجھے ڈاکٹر کنوٹ کی معرفت ہی معلوم ہوا۔ ورنہ اس سے بے خبر رہتا۔ نہایت عمدہ کام ہے۔ ہفتے میں دو دفعہ شام کو اس مجلس کے اراکین ایک تجارتی مدرسے کے ہال میں کتاب پڑھ کر سناتے یا لیکچر دیتے ہیں اور متوسط درجے سے لیکر ادنیٰ درجے تک کے لوگ سننے آتے ہیں۔ تجارت پیشہ مرد و زن۔ اور بچے جو قبل از وقت تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہوں وہ یہاں اپنی کمی پوری کرتے ہیں۔ مجلس کے اراکین میں یونیورسٹی اور مدارس کے پروفیسر اور معلّم ہیں اور دیگر تعلیم یافتہ ہمدردانِ ملک جو مفت اپنے اُن غریب بھائیوں کی خدمت کرتے ہیں جنہیں یا تو کتابیں پڑھنے کا وقت نہیں مل سکتا۔ یا خریدنے کی توفیق نہیں۔ یہاں ہر طرح

کی اچھی اچھی کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ اُن کا مطلب سمجھایا جاتا ہے اور مفید مضامین پر لکچر ہوتے ہیں۔ اور پڑھنے کے لئے بعض اوقات دلچسپی بڑھانے کی غرض سے ایسی چیزیں انتخاب کی جاتی ہیں جن میں کئی پڑھنے والے باری باری پڑھ سکیں اور سُننے والوں کو زیادہ لطف آئے۔ ایک دن جب میں وہاں گیا تو مولیر کا ایک مشہور ڈراما پڑھا جا رہا تھا اور سامعین کی کثرت تھی جس سے لوگوں کا علمی مذاق معلوم ہوتا تھا۔

یہاں کی صحبتیں بھی محض تفریح کی صحبتیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ اُن میں سے تفریح کے ساتھ ساتھ علمی گفتگو بھی رہتی ہے۔ موسیو بو نے جو لاطینی اور یونانی کے فضلا میں مانے جاتے ہیں اور یونیورسٹی میں لاطینی کے پروفیسر ہیں۔ ہر ہفتے کی شام کو یونیورسٹی کے پروفیسروں اور اُن کی بیویوں کو اپنے ہاں مدعو کرتے ہیں۔ اور طلبہ میں سے چند آدمی ہر دفعہ اُن کی ملاقات کے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ مجھے بھی اُن کے ہاں کی صحبت میں شریک ہونیکا موقعہ ہوا اور میں نے اسے نہایت دلچسپ پایا۔ مدام بو نے اُن کی بیوی ایک روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہیں اور اجنبی طلبہ کی ترقی کے لئے ہر طرح کوشاں رہتی ہیں۔ میں نے اُنہیں ہندوستان کے حالات سے باخبر دیکھا۔ مجھ سے اور مسٹر داس سے انہی کے ہاں ملاقات ہوئی۔ مسٹر داس نے کہا کہ وہ انہیں اکثر مجالس میں بلاتی ہیں۔ مدام بو نے ہر اتوار کو ایک پارٹی جمع کرتی ہیں جس میں طلبہ اور پروفیسر دونو شریک ہوتے ہیں اور سب ملکر شہر سے باہر سیر کو جاتے ہیں۔ اس طرح طلبہ کو پروفیسروں سے بے تکلف ملنے اور اجنبی طلبہ کو فرانسیسی بولنے کی مشق کرنیکا موقعہ خوب ملتا رہتا ہے۔ موسیو بو نے کی صاحبزادی انگریزی خوب جانتی ہیں اور ہر جمعرات کو اُن کے ہاں چند اور انگریزی خواں نوجوان لڑکیاں بھی آتی ہیں اور سب ملکر شکسپیر پڑھتی ہیں۔ غرض ہر روز اُن کے گھر کوئی نہ کوئی علمی چرچا رہتا ہے جس میں علاوہ گھر کے لوگوں کے اُن کے دوست بھی شریک ہوتے ہیں۔

اس یونیورسٹی کی جو بات مجھے سب سے پسندیدہ نظر آئی ۔ وہ یہاں کی تعلیم کی ارزانی ہے ۔ انگلستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں رہنے اور یونیورسٹی کی تعلیم کے ہتنے ہیں مصارفِ گراں کی زیر باری ۔ مگر یورپ کے اکثر حصّوں میں اور خاصکر جرمنی اور فرانس میں یونیورسٹی فیضان علمی کا ایک سرچشمہ ہے ۔ جس سے جو چاہے آکر سیراب ہو لے اور حق یہ ہے کہ یونیورسٹی کی اصل تعریف یہی ہے ۔ یہاں یونیورسٹی میں پڑھنے کی فیس کچھ نہیں ۔ صرف نام درج کرانے کے لئے بیس فرانک[1] سالانہ دینے ہوتے ہیں ۔ اور بس ان باقاعدہ طلبہ کے علاوہ بعض اور لوگوں کو جنہیں شوقِ علم یہاں کھینچ لائے ۔ مگر جو زیادہ دیر نہ ٹھہر سکتے ہوں یا کسی خاص امتحان کی تیاری کے لئے نہ آئیں ۔ خاص خاص جماعتوں کے سبق میں بطور سامعین شریک ہونے کی اجازت مل جاتی ہے اور اس کے عوض میں اُنہیں کچھ دینا نہیں پڑتا ۔ رہائش کا خرچ یہاں سَو فرانک ماہوار سے ڈیڑھ سَو فرانک تک ہر طالب کی حیثیت کے موافق ہے ۔ اور زائد اخراجات بمقابلہ دیگر مقامات کے بہت کم ہیں ۔

تعلیم کے مختلف شعبوں کے لئے ہر شعبے کے مناسب سامان یہاں رفتہ رفتہ جمع ہو گیا ہے ۔ علم نباتات کے طلبہ کے لئے باغ ۔ علم حیوانات کے طلبہ کے لئے بھس سے بھرے ہوئے جانوروں کا عجائب گھر ۔ تاریخ قدیم کے طلبہ کے عجائب خانۂ العتیق ۔ فنون لطیفہ کے لئے تصویروں اور بتوں کی ایک نفیس گیلری ۔ عام شائقین کے لئے نہایت معقول کتب خانہ ۔ اور یونیورسٹی کو دار العلوم کے علاوہ مکاتب صنعت وحرفت و تجارت اہل شہر کی ہمت شہر کے حکام میونسپل کی روشن دماغی پر دلالت کرتے ہیں ۔

تصاویر کی گیلری اور فنونِ لطیفہ کے مکتب اور کتب خانہ عام ان تینوں چیزوں کا تاریخی حال خصوصیت سے قابلِ بیان ہے ۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

[1] ہندوستانی سکے کے حساب سے فرانک دس آنے کا ہوتا ہے ۔

بعض اوقات ایک فردِ واحد کی ذاتی فیاضی کتنے مفاد کا باعث ہوتی ہے۔ اور کس طرح دوسروں کو مفید کاموں کی ترغیب دیتی ہے۔ خوشا نصیب اُن قوموں کے جن میں بہت سے افراد ایسے پیدا ہوں۔ یہ گیلری بنام عجائب خانہ فیبر موسوم ہے اور فنون لطیفہ کے مدرسے میں جو گیلری سے ملحق ہے۔ اس عجائب خانے کے بانی کا قدِ آدم بُت بطور یادگار احسان کے استادہ ہے۔ اور کتب خانے کی عمارت مدرسے سے ملی ہوئی ہے۔ فیبر گذشتہ صدی کے مشہور اُستادانِ فن تصویر میں گذرا ہے۔ موں پیلیے کا باشندہ تھا۔ شوقِ فن اسے اطالیہ لے گیا جہاں روما اور نیپلز میں اس نے بہت نام پیدا کیا۔ وہاں ایک امیر خاتون اس کی اس درجہ مدّاح ہوئی کہ وہ مرتے وقت اپنا کتب خانہ اور تصاویر کا مجموعہ اسے دے گئی۔ اس نے خود بھی جو کچھ کمایا مشہور تصویروں کے خریدنے اور کتابوں کے جمع کرنے میں صرف کیا۔ اور اس طرح نہایت بیش قیمت تصاویر اور کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ اس کے پاس موجود ہو گیا۔ بڑھاپے میں فیبر نے ارادہ کیا کہ زندگی کے آخری دن وطن میں بسر ہوں۔ اس نے موں پیلیئے کی کمیٹی کو ایک خط لکھا۔ کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنا کتب خانہ اور مجموعۂ تصاویر رفاہِ عام کے لئے موں پیلیئے کی نذر کروں۔ اگر کمیٹی ان کے لئے عمدہ موقعہ پر ایک تعمیر بنانے کا خرچ گوارا کرے۔ اس کے متعلق ایک مدرسہ فنونِ لطیفہ کا جاری کرے۔ اور میری زندگی میں اس سارے کارخانے کی نگرانی میرے متعلق رکھے۔ کمیٹی نے نہایت شکر گذاری سے اس ہدیہ کو شرائط مجوزہ پر قبول کیا۔ اس عطیئے کی تصاویر اور بتوں کی قیمت چار لاکھ فرانک اندازہ کی گئی۔ اور کتابیں اس کے علاوہ تھیں ۱۸۳۷ء تک فیبر زندہ رہا اور فنون لطیفہ کے مدرسے کی ترقی میں ساعی رہا۔ جب اس کا انتقال ہو گیا تو بذریعہ وصیت اور بہت سامان جو پہلے ہدیہ کے بعد اس کے پاس بچ رہا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کو دے گیا۔ اُس وقت سے لیکر آجتک وقتاً فوقتاً اور معطی اس عجائب خانہ اور اس کتب خانے کو عطیات

مال و جنس دونوں صورتوں میں ان عطیوں میں دیتے رہے۔ ان عطیوں میں ہوسپیو والدو کا ذخیرہ ساڑھے تین لاکھ فرانک کی قیمت کا تھا۔ اس وقت یہ گیلری پیرس کے عجائب خانہ لوور کی بڑی گیلری کو چھوڑ کر فرانس کے باقی مجموعہ ہائے تصاویر میں ایک امتیاز رکھتی ہے اور کتب خانہ عام میں جس کی بنیاد اس گیلری کے ساتھ ہی رکھی گئی تھی اور جس کے ذخیرہ کتب میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ایک لاکھ تیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ یونیورسٹی کا ایک عالیشان کتب خانہ جو طلبا کے لئے مخصوص ہے وہ اس عام کتب خانے کے علاوہ ہے۔

اس مقام کی اخلاقی حالت پر بھی یونیورسٹی نے اپنا اثر ڈالا ہے۔ مجھے اس سے پہلے جب سال گذشتہ میں دو مرتبہ فرانس میں آنیکا اتفاق ہوا تھا۔ تو جو کچھ میں نے دیکھا تھا اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ فرانس عیاشی میں دوسرے ممالک یورپ سے بڑھکر مبتلا ہے۔ اور اس کے باشندوں کی عیش پسندی اس قوم کو گھُن کی طرح کھا رہی ہے۔ مگر وہ مشاہدہ پیرس کی سرسری سیر اور بولوں کی رہائش کا نتیجہ تھا۔ مگر یہاں رہ کر معلوم ہوا کہ سارے ملک کی حالت یکساں نہیں۔ ملک کے بہت سے حصے ایسے ہیں۔ جہاں لوگ زندگی کے اہم فرائض کے بوجھ کو اسی متانت اور وقار کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ جو یورپ کے بہترین حصوں کا خاصہ ہے اور جہاں عام اخلاقی حالت بالکل اطمینان بخش ہے۔

تین سال کے بعد

میری غریب الوطنی کا زمانہ ختم ہوا۔ میں نے تین سال بلاد غرب کی ہوا کھائی دنیا کے اُس حصے کو دیکھا جو آج کل علم و دولت کی کان اور تہذیب و تمدن کی جان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں بہت سی باتیں ایسی دیکھیں جن سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت انسان خواہ تہذیب ظاہری کے کتنے مدارج طے کیوں نہ کر لیں بشر انسان ہیں

اہل غرب میں وہی کمزوریاں موجود ہیں جو اہل شرق میں ہیں۔ فطرت انسانی وہی رنگ یورپ میں دکھاتی ہے۔ جو ایشیا کا خاصّہ سمجھا جاتا ہے۔ ایشیا اور یورپ کی اس ہم رنگی کے باوجود بہت سی چیزیں ایسی نظر آئیں جن میں یورپ اس وقت ایشیا سے آگے ہے۔ ان سب کی تفصیل کا جاننا ہمارے ابنائے وطن کے لئے مفید اور ضروری ہے۔ اور جو کچھ اطلاع میں نے بہم پہنچائی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ناظرین مخزن کی خدمت میں پیش ہوتی رہیگی۔ میں کچھ نہ کچھ تو اثنائے سفر میں لکھتا رہا ہوں۔ لیکن اب حضر میں جب اطمینان سے بیٹھنا نصیب ہوگا۔ تو معلومات مرتب اور مکمل صورت میں نذر احباب ہونگے۔ ایک حصّہ سفر ناموں کی صورت میں (جن میں حالات استانبول زیر طبع ہیں) اور ایک حصّہ اوراق مخزن کے ذریعے۔ اب ان معلومات سے فائدہ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا اہل ملک کے اختیار رہے اور مخزن کے حلقۂ اثر اور زمرۂ ناظرین کو بڑھانا مخزنیوں کا کام ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کرینگے وہ اپنا فرض ادا کریں۔

ارادہ ہے کہ آیندہ پرچے سے یہ سلسلہ مضامین شروع ہو اور اس کے بعد جسقدر جلد ہو سکے" واقعات عالم پر ایک نظر یا کسی اور عنوان سے ایک مفید اور دلچسپ ماہوار سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس مرتبہ تو صرف اپنے دوستوں اور کرمفرماؤں سے دو دو باتیں کر لینے کا موقعہ ہے۔ میں جس دن سے بمبئی پہنچا ہوں اُس دن سے آجتک احباب کی عنایت ہائے بیحد نے میرے دن اور دن کے ہر لمحے کو مصروف بنا رکھا ہے۔ اس لئے جون کا پرچہ دیر سے نکلتا ہے۔ اور جولائی کا بھی شاید کسیقدر دیر سے نکلیگا۔ ۷ جون کو مجھے ساحل ہند نظر آیا۔ اس وقت کے جذبات الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتے۔ ہر چیز کی قدر اُس سے دور ہو کر یا اُسے کھو کر معلوم ہوتی ہے۔ وطن کی جو قدر غربت میں ہوئی۔ وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور اب جس خلوص سے وطن نے مجھے اپنے دامنِ شفقت میں لیا ہے۔ اس محبت نے اور مجھے گرویدہ کر لیا۔ اب اگر پھر کبھی گھر سے نکلنے کی نوبت

آشفتگی تو دلی کو آفت کا سامنا ہوگا۔ بزرگان قوم و ملک کی طرف سے جو احسانات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اُن کے بوجھ سے دبا جاتا ہوں۔ بمبئی میں جہاز سے اُترتے ہی ہمارے مخدوم قوم جناب نواب محسن الملک بہادر کی ملاقات۔ اور پھولوں کا پہلا ہار اُن مبارک ہاتھوں سے پہننا ایک ایسی عزت ہے کہ جس کے لئے تین سال کی بے وطنی اور ریاضت کوئی بڑی قیمت نہیں۔ اور انجمن ضیاءالاسلام کے اراکین بکثرت تشریف فرما تھے۔ دو دن میں وہاں ٹھیرایا گیا۔ انجمن ضیاءالاسلام کے جلسے دوسرے دن اور اسلام کلب کے 'ایٹ ہوم' اور 'ڈنر' سے فارغ ہو کر میں ۱۰ر جون کو بمبئی سے چلا۔ ایک دن گوالیار میں ٹھیرا۔ وہاں کے معززین کی مہمانداری اور خلوص دیر تک نہ بھولیں گے۔ گوالیار سے میں دہلی آیا۔ دہلی جتنا بڑا امر کز ہے۔ اُسی تناسب سے یہاں کے احباب کا مجمع تھا۔ انجمن بہبود اسلام دہلی نے دہلی کی ساخت کا سنہری ہار جس پر انجمن کا نام لکھا تھا۔ مجھے ہدیتہً دیا۔ میں اس تحفہ کو نہایت عزیز رکھونگا۔ خواجہ سید حسن نظامی کی معیت میں نہ صرف درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی زیارت کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ بلکہ اُنکی بدولت قابل قدر تبرکات اس درگاہ سے ملے جو میرے لئے باعث فخر و سعادت ہیں دہلی کے بعد انبالہ میں قیام ہوا۔ انبالہ سے جو مدد مخزن کو ملتی رہی ہے۔ اُس سے ناظرین مخزن آگاہ ہیں۔ اور اس کو دیکھتے ہوئے جس سرگرمی سے اہل انبالہ نے لبسرکردگی اعجاز وینر نگ میری عزت افزائی کا سامان کیا تھا وہ ہرگز تعجب انگیز نہیں۔ انبالہ سے چلا تو کچھ دوست لودیانہ کے اسٹیشن پر ملے۔ اور کچھ بعد کے مقامات پر۔ جالندھر کا مجمع بلحاظ خوبی اور جوش کے دوآبہ پنجاب کے زندہ دلوں کے شایاں تھا۔ مگر ع حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد۔ گاڑی وہاں صرف چند منٹ ٹھری۔ اور مجھے اسی روز لاہور پہنچنا تھا۔ اہل جالندھر سے مفصل ملاقات کا وعدہ کر کے آگے چلنا پڑا۔ امرتسر میں انجمن اسلامیہ کے زیر سایہ سرگردگان شہر نے اپنی مشہور مہمان نوازی کی داد دی۔ گر وہاں بھی چار پانچ گھنٹے سے زیادہ قیام ممکن نہ ہوا۔ ۱۶ر جون کی شام کو آخر گاڑی

لاہور کے قریب پہنچی۔ میانمیر سٹیشن پر آنریبل میاں محمد شاہ دین صاحب نے دیدارِ ہمایوں سے شاد فرمایا۔ اور لاہور نے اپنے ناچیز خادم کے ہاتھوں ہاتھ لینے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ پرانے پرانے لوگ کہتے تھے۔ کہ ایسا مجمع کم دیکھنے اور سننے میں آیا ہے۔ سیکڑوں احباب سے مل سکا اور سیکڑوں سے نہ مل سکا سیکڑوں ایسے رہ گئے جنھیں دور سے بھی اس وقت میں نہ دیکھ سکا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ بھی تشریف فرما تھے۔ اُس دن سے آجتک زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے اس تمام محبت اس تمام اعزاز کے لئے میں یارانِ وطن کا دل سے ممنون ہوں مگر اس کے ساتھ میں ہرگز ایسا نہ بخبر نہیں کہ یہ سمجھ بیٹھوں کہ یہ سب کچھ میری ذات کے لئے یا میں اس کا مستحق ہوں۔ بلکہ میں جانتا ہوں کہ یہ ملک کی بیداری کا ثبوت ہے ملک میں اب کام کی قدر پیدا ہو چلی ہے اور جو کوئی تھوڑی بہت خدمت ملک یا قوم کی کرے۔ اس کی حوصلہ افزائی کا خیال اب اہلِ ملک کو ہو گیا ہے۔ اور یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ اس حوصلہ افزائی کا ثبوت ہے۔ اور اس لحاظ سے قابلِ قدر و لایقِ تشکر ہے۔ مجھ سے جو کام آجتک بن پڑا ہے۔ اس میں مخزن کی خدمت کا ایک معتد بہ حصہ ہے اور اس اعتبار سے جو قدردانی مجھے نصیب ہو میں اہلِ مخزن کو اس کے لئے مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں۔ کیونکہ بغیر اُن کی ہمدردی اور امداد کے خود مخزن کو وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ جو آجتک ہو چکی ہے۔ اور جس کی آیندہ اُمید ہے۔

مخزن اس وقت حالت نمو میں ہے۔ گذشتہ تین سال میں اس نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ میرے بعد جس محنت اور جانفشانی سے میرے معاون شیخ محمد اکرام صاحب نے اس رسالے کی حالت کو قایم رکھا ہے۔ اس کی اشاعت کو بڑھایا۔ اور اس کے مددگاروں کے حلقہ کو وسیع کیا ہے۔ اس کی داد دینی بھی اس وقت میرا فرض ہے۔ میں گیا تو یہ ایک نیا لگا ہوا پودا تھا۔ اور آیا ہوں تو اسے ایک درخت پاتا ہوں جس کے برگ و بار لانے کی جلد توقع ہو سکتی ہے۔ میں نے چند در چند مصلحتوں سے اسے آجتک محض علمی رسالہ رکھا ہے اور سیاست کو اس میں دخل نہیں دیا

ہر چند کہ سیاسیات کا شوق ملک میں عام ہے۔ اور رسالوں کو مقبول بنانے میں ان سے کام لیا جاتا ہے۔ میں ملک کی سیاسی تعلیم کو مفید جانتا ہوں اور اس کے لئے کچھ کرنا بھی چاہتا ہوں لیکن میں اس علمی رسالے کو سیاسی بنانے کا قائل نہیں۔ اگر ضرورت دیکھونگا تو ایک جدا سیاسی رسالہ خواہ ماہانہ ہو خواہ یہی جاری کرونگا۔ مگر مخزن برابر اپنا خالص علمی رنگ نباہیگا۔ تاکہ ہر پولیٹکل خیال کے اصحاب اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے یکساں شوق سے پڑھیں اور اس زبان اور اُس علم ادب کی ترقی میں جو ہندؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے سب شریک ہوں*

کلیّہ کیمبرج

یونیورسٹی کا ترجمہ عموماً دارالعلوم کیا جاتا ہے۔ مگر مصر میں لفظ کُلیّہ سے اس وقت یہ معنے لئے جاتے ہیں۔ مجھے یہ لفظ اختیار کرنے کے قابل معلوم ہوتا ہے کیونکہ اوّل تو لفظ یونیورسٹی کا لفظی ترجمہ ہے اور دوسرے مفرد ہونے کے سبب زیادہ سہل اور جلد مقبول ہونے والا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی دنیا کے مشہور ترین علمی مرکزوں میں ہے اور انگلستان میں صرف ایک ہی کُلیّہ اس کے ہم پلہ ہے یعنی اکسفورڈ۔ ان دو بڑے تعلیمی مقامات میں دیرینہ رقابت چلی آتی ہے۔ دونو ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں اور دونوں کے اساتذہ ایک دوسرے کی قابلیت کے معترف ہیں۔ لیکن ساتھ ہی دونو اپنی اپنی جگہ اپنے آپ کو افضل سمجھتے ہیں ہمیں اُن کی اس تکرار سے سروکار نہیں۔ ہمارے نزدیک دونو قابل شکریہ ہیں کہ صدیوں سے علم کے دریا وہاں بہ رہے ہیں۔ جن سے لاکھوں تشنہ کام سیراب ہو چکے ہیں۔ کوئی خوبی کسی میں زیادہ ہے اور کوئی کسی میں۔ گذشتہ تین سال میں کئی دفعہ میرا جی چاہا کہ میں کیمبرج کے کچھ حالات لکھوں۔ لیکن دو وجہ سے میں نے اس ارادہ کو ملتوی رکھا۔ ایک تو یہ کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کُلیّہ اکسفورڈ دیکھے بغیر

کیمبرج پر قلم اُٹھاؤں اور اتفاق ایسا ہوا کہ کیمبرج میں کئی دفعہ جانا ہوا۔ مگر اکسفورڈ کی نوبت انگلستان سے روانہ ہونے کے قریب آئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ ایسی بڑی تعلیم گاہ کی نسبت کوئی رائے زنی عجلت میں نہ کروں۔ اس لئے اس مضمون کو آجتک روک رکھا۔

کیمبرج کیا تھا دریائے کیم کے کنارے ایک چھوٹا سا قصبہ۔ مگر آج دنیا کے مشہور اور قابلِ دید مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرونِ وسطیٰ میں بعض دیندار عیسائیوں نے مذہبی تعلیم کے لئے یہاں مدرسے کھولے اور اس تاریکی کے زمانے میں یہاں علم کا چراغ روشن کیا۔ اُن کے جوشِ مذہبی اور ایثار کی بدولت وہ مدرسے ترقی کرتے گئے اور رفتہ رفتہ محض تعلیم مذہبی کی پابندی سے نکل کر علوم مختلفہ کی تعلیم کا ذریعہ بن گئے۔ مذہبی رنگ کا اثر اب تک زور سے قایم ہے۔ کئی کالجوں کے صدر نشین ابتک بڑے بڑے پادری ہیں طلبہ میں سے اکثر ابتک مذہبی تعلیم پانے سندِ فضیلت حاصل کرنے اور اس کے بعد گرجے کی خدمت میں لئے جانے کی غرض سے کیمبرج آتے ہیں۔ بہت سے طالب علم ایسے بھی ہیں کہ علوم جدیدہ کم اور الٰہیات زیادہ پڑھتے ہیں۔ اور الٰہیات کی تکمیل کے لئے لاطینی اور پرانی یونانی کی تحصیل میں اسی طرح عمریں صرف کرتے ہیں جیسے ہمارے ملک کے مولوی عربی اور پنڈت سنسکرت کے حاصل کرنے میں۔

کیمبرج اور اکسفورڈ میں یونیورسٹی مراد ہے چند کالجوں کے مجموعے سے جن میں سے ہر ایک اپنا علیحدہ سرمایہ اور علیحدہ آمدنی رکھتا ہے اور اندرونی انتظام میں خودمختار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اکثر حیثیتوں میں دوسرے کالجوں کا شریکِ حال ہے۔ ہر مضمون کے لئے یونیورسٹی کے مقرر کئے ہوئے اُستاد ہیں۔ اور جو سبق وہ پڑھاتے ہیں۔ اُن میں ہر کالج کا طالب علم جو وہ مضمون پڑھتا ہو شریک ہوتا ہے۔ مگر اس کے سوا ہر کالج کے اپنے اتالیق علیحدہ ہیں جو خاص اپنے ہاں کے طلبہ کو پڑھائی میں مدد اور مشورہ دیتے ہیں اور اُن طلبہ کے چال چلن کے نگراں ہوتے

ہیں - کیمبرج اور اکسفورڈ کی بڑی خصوصیت وہاں کا قاعدہ رہایش ہے جس کے سبب ہر طالب علم مجبور ہے - کہ یا اپنے کالج کے لورڈنگ ہوس میں سکونت رکھے یا شہر کے اُن چیدہ مکانوں میں جنہیں افسران یونیورسٹی نے تحقیقات کے بعد قابلِ اطمینان قرار دیا ہو اور جہاں ان قواعد کی پابندی ہوتی ہے جو بورڈنگ میں رہنے والے لڑکوں کے لئے مقرر ہیں - چاشت اور دوپہر کا کھانا سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں کھاتے ہیں - مگر شام کے کھانے کے لئے اُنہیں اپنے اپنے کالج کے ہال میں حاضر ہونا پڑتا ہے اور اپنے ہم مکتبوں کے ساتھ مل کر کھانا ہوتا ہے ہال میں جانے کے لئے کلیہ کی وردی پہنکر جانا ضروری ہے - یعنے ہر طالب علم "کیپ" اور "گون" پہنے ہونا چاہئے - کیپ یونیورسٹی کی اصطلاح میں ایک چوگوشہ سیاہ ٹوپی ہے جس سے ایک سیاہ ریشمی پھندنا لٹکتا رہتا ہے - شام کے بعد اگر کوئی طالب علم "کیپ" اور "گون" کے بغیر دیکھ لیا جائے تو اُس پر جرمانہ ہوتا ہے یا سخت بازپُرس ہوتی ہے - اُن کی نگرانی کے لئے مفتش مقرر ہیں - جنہیں وہاں کی اصطلاح میں پراکٹر کہتے ہیں اور طالب علم کے لئے بعض اوقات اُن سے دوچار ہونا ایک سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے - مدعا اس سے یہ ہے کہ اگر یونیورسٹی کا کوئی طالب علم شہر میں نکل کر کسی طرح کی بیقاعدگی کرتا ہو تو جھٹ معلوم ہو جائے اور یہ دھوکا نہ ہو کہ طالب علم ہے یا کوئی عام شہر والا -

یہاں کے طلبہ کے طریق زیست کی یہ خصوصیت کہ مختلف کالجوں میں جداگانہ زندگی بھی ہے اور اس کے ساتھ مشترکہ زندگی بھی نبھتی ہے - کھیل کود اور ورزش کے معاملے میں خوب نظر آتی ہے - ورزش جسمانی کیمبرج میں تعلیم کا جزو ضروری ہے اور قریب قریب ہر شخص کوئی نہ کوئی ورزش کرتا ہے - یوں تو گیند بلا - فٹ بال ٹینس سب کھیل یہاں کھیلے جاتے ہیں - مگر کشتی چلانا سب سے مقبول ہے - کالج عموماً ندی کے کنارے بنے ہیں - اُن کے عقب سے سیڑھیاں پانی میں اُترتی ہیں - اُن سیڑھیوں کے قریب ہلکی کشتیاں کھڑی رہتی ہیں - بعض طالب علم اپنی

کشتیاں رکھتے ہیں۔ بعض کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ تنہائی پسند آہستہ آہستہ اپنی کشتی آپ چلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لطف صحبت کے شیدائی دو دو تین تین ملکر ایک کشتی میں بیٹھ جاتے ہیں، اور باری باری کھیتے جاتے ہیں اور ہنستے بولتے جاتے ہیں۔ ہر کالج میں آٹھ چیدہ کشتی چلانے والوں کی ایک جماعت ہوتی ہے۔ جو کالجوں کے باہمی سالانہ مقابلے کے لئے مشق کرتے رہتے ہیں۔ ابتدائے ماہ جون میں کشتیوں کی دوڑ ہوتی ہے اس وقت کالجوں کی باہمی رقابت کا تماشا دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ہر کالج کے طلبہ اپنے ہاں کی کشتی کیساتھ ساتھ ندی کے کنارے دوڑتے اور دیوانہ وار شور مچاتے ہیں۔ اپنے بہادروں کی ہمت بڑہانے کے لئے کبھی اپنے کالج کا نام لیکر نعرے لگاتے ہیں کبھی کشتی چلانے والوں میں سے ایک ایک کا نام لیکر تحسین و آفرین کہتے ہیں۔ ندی کے دونوں کناروں پر زن و مرد تماشائی جمع ہوتے ہیں۔ جو دور دور سے دوڑ کو دیکھنے آتے ہیں اس موقعہ پر اکثر طلبہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بیرونجات سے مدعو کرتے ہیں۔ اور چند دن کیمبرج میں نہایت چہل پہل رہتی ہے۔

یونیورسٹی کی مشترکہ زندگی کا سب سے بڑا مرکز وہاں کا "یونین" ہے۔ سب کالجوں کے طلبہ اس میں شریک ہیں۔ لڑکوں کی یہ سوسائٹی بڑی ہردلعزیز ہے۔ ایک طالب علم کے لئے کیمبرج میں یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ یونین کا پریزیڈنٹ منتخب ہوجائے۔ پریزیڈنٹ تو ایک طرف نائب پریزیڈنٹ ہونا یا سکرٹری ہونا بھی بڑا امتیاز ہے۔ یونین میں مختلف مضامین پر ہفتہ وار نہایت پرجوش اور لطیف مباحثے ہوتے ہیں۔ بحث کے طریق میں پارلیمنٹ کے مباحثوں کی تقلید کی جاتی ہے۔ گویا لڑکوں کے لئے فن تقریر کا ایک اعلیٰ درجہ کا مدرسہ ہے اور بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ کیمبرج کے ممتاز مقرر پارلیمنٹ کے نامی فصحا کی جماعت میں جا پہنچے ہیں۔ مضامین کے انتخاب میں یہاں طلبہ کو کافی آزادی حاصل ہے اور وہ بڑے بڑے سیاسی مسائل پر بھی عمدگی سے بحث کرسکتے ہیں۔ مناظرہ

کے فریقین بڑے زور سے تیار ہو کر آتے ہیں۔ اور مسئلہ زیر بحث کے متعلق پوری اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ میں نے یونین کا مباحثہ سنا ہے۔ پارلیمنٹ کی تقریروں سے اس کا رنگ ملتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ ع یہ صورت ہے لڑکپن کی وہ نقشہ ہے جوانی کا۔ یونین میں جو رائیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ اُن پر پختگی کی مُہر نہیں ہوتی کہیں کہیں خامی نظر آجاتی ہے۔ مگر انہیں لوگوں میں سے چند آدمی جب پارلیمنٹ میں پہنچکر ذمہ داری کے عہدوں پر سرفراز ہوتے ہیں تو اس درجے کی متانت پیدا کرتے ہیں کہ اُن کا ایک ایک لفظ جنچا تُلا نکلتا ہے اور ہر رائے غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

کیمبرج میں اس وقت ہندوستانی طلبہ کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اور وہ بھی یونین کی مجالس میں شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ بعض بعض نے اُس کی مناظرِوں میں نام بھی پیدا کیا ہے۔ پچھلے دنوں میں مسٹر ریڈی نام ایک صاحب مدراس کے گریجوایٹ تھے۔ جو یونین کے سکرٹری بھی رہے اور نائب پریزیڈنٹ بھی نوجوان ہندوستانیوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس خوبی اور فصاحت سے انگریزی میں تقریر کر سکیں جیسے مسٹر ریڈی کرتے ہیں۔ کیمبرج میں تعلیم کی عجیب کیفیت ہے۔ یہ جگہ محنتی اور پڑھنے والے طالب علموں کے لئے ایسی ہی موزوں ہے جیسی آرام طلب اور نہ پڑھنے والے طلبہ کے لئے۔ انگلستان میں کسی شریف اور خوشحال آدمی کے لڑکے کے لئے کیمبرج یا اکسفورڈ میں تعلیم کے لئے بھیجا جانا ضروری ہے۔ مگر خوشحال لوگوں کی اولاد کی عادتیں عموماً زیادہ مسرفانہ اور اُن کی بود و باش زیادہ راحت پسند ہوتی ہے اور انگلستان کچھ اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ لڑکے وہاں کچھ شوق علم سے نہیں جاتے بلکہ محض رسم کی پابندی سے۔ کہتے ہیں اگر وہاں نہ گئے تو ہم چشموں میں ذلیل سمجھے جائیں گے مدرسہ سے نکلے اور وہاں جا داخل ہوئے۔ جوانی کے دن امیری کی وجہ سے مزاج میں لاپروائی۔ اپنے ایسے فارغ البال نوجوانوں کی صحبت سمند ناز کے لئے تازیانہ

بنتی ہے۔ بجائے اس شوق کے تحصیل علم میں ایک دوسرے سے بڑھیں یہ مقابلہ کرتے ہیں کہ کون زیادہ خرچ کرتا ہے۔ کپڑے کون اچھے پہنتا ہے۔ ہمراہیوں کو کون زیادہ کھلاتا پلاتا ہے۔ اور اس طرح نہ صرف اپنا وقت بیکار کھوتے ہیں بلکہ بہت سے متوسط درجے کے طالب علموں کو اپنے ساتھ لے ڈوبتے ہیں۔ مگر چونکہ عرصہ دراز سے ایسے طلبہ کیمبرج اور اکسفورڈ میں موجود چلے آتے ہیں اور جب تک قوم انگریزی کا تموّل قایم ہے۔ موجود رہیں گے۔ اس لئے بہت سے سست طلبہ کا گذارہ ان یونیورسٹیوں میں بلا تکلّف ہو جاتا ہے۔ مگر یہ جماعت بھی کیمبرج میں بالکل بیکار نہیں وہاں کی سوشل زندگی کا دار و مدار بہت کچھ ان پر ہے۔ اور چونکہ کیمبرج کی سوشل زندگی ایک بڑی کشش ہے جو دور دور سے طلبہ کو کھینچتی ہے اس لئے یہ لوگ بھی اپنے کلیہ کی آبادی کا باعث ہیں۔ ایک خوبی بھی ان کی قابلِ داد ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے اکثر کالج سے نکلنے کے بعد متین اور معقول آدمی بن جاتے ہیں اور طالب علمی کے زمانے کی بے اعتدالیاں ان کی طبیعت پر بہت کم مستقل اثر چھوڑتی ہیں۔ بخلاف ان کے ہمارے ہموطنوں میں سے اگر کوئی انکی دیکھا دیکھی اس رنگ میں اُتر آئے۔ تو اس کے لئے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

کیمبرج میں جہاں ایک طرف یہ رنگین اور مسرف جماعت ہے۔ وہیں دوسری طرف ایک معقول تعداد ایسے طلبہ کی ہے جو فی الحقیقت نشۂ علم میں سرمست ہیں یونیورسٹی کے کتب خانے اور لکچروں کے کمرے اُن کی دنیا ہیں۔ دوستوں سے ملتے ہیں مگر بقدر ضرورت۔ کھاتے پیتے ہیں مگر بخیال صحت۔ ورزش کریں گے تو صرف اتنی کہ جس سے صحت درست رہے۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے انہیں ایک ہی دھیان ہے اور وہ یہ کہ علم کی دولت کے ذخیرے جمع کر لیں۔ ہر فن کے مستند اُستاد یہاں کے ادیب ہیں۔ یہ شائقین علم اُن سے ملاقات پیدا کرتے ہیں اور اُن کی صحبت سے مستفید ہوتے ہیں اور جو کوئی اس صحبت سے فیض پانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کے لئے یہ اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اور اصل منشا تعلیم

ایسی صحبتوں سے پورا ہوتا ہے۔

کیمبرج اور اکسفورڈ کے اساتذہ بھی عموماً عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر اپنے اپنے فن میں سند اور حجت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ اس پر اُن کا عجز اُن کا انکسار اُن کی سادگی دیکھنے کے لایق ہوتی ہے۔ طلبہ میں صرف انہی کو وہ مُنہ لگاتے ہیں جنہیں قابلِ تربیت پاتے ہیں۔ مگر اُن کے ساتھ اُن کا سلوک بزرگانہ ہوتا ہے۔ وہ خود تمام عمر طلب علم میں بسر کرتے ہیں اور اس لئے ایسے طالب علم کی جو سچ مچ طالب علم ہو۔ اُن کے دل میں خاص وقعت ہوتی ہے اور اسی حیثیت سے وہ لایق طالب علموں سے ملتے ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفیسر عام طور پر وہی لوگ ہیں جو اپنے زمانے میں ممتاز طالب علم تھے۔ یونیورسٹی کی محبت اور تعلیم و تعلم کا شوق اسقدر غالب ہوا کہ اور سب خیالات چھوڑ کر وہیں کے ہو رہے۔ اب شاگردوں میں جسے زیادہ قابل دیکھتے ہیں۔ اُسے وہیں گھیر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممتاز طالب علم پہلے اپنے ہی کالج میں فیلو ہوجاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ بڑھ جاتا ہے۔ فیلو ہونے کے زمانے میں اُسے گزارہ کے لایق مشاہرہ ملتا رہتا ہے اور اس کا کام علمی تلاش اور جستجو ہوتا ہے۔ کئی فنوں میں مشہور درسی کتابیں تلاش اور جستجو کے اسی منضبط طریق کا نتیجہ ہیں +

کالجوں کے جس مجموعہ سے کیمبرج یونیورسٹی بنی ہے وہ تعداد میں اٹھارہ ہیں اور اگر اُن میں دو کالج جو عورتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص ہیں شامل کر لئے جائیں تو بیس کالج ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اکیسویں عمارت ہے جسے "فٹز ولیم ہال" کہتے ہیں۔ اس میں ایسے طلبہ رہتے ہیں جو یونیورسٹی میں تو داخل ہیں لیکن کسی خاص کالج سے تعلق نہیں رکھتے۔ کیمبرج میں یونیورسٹی کی فیس جدا ہے اور کالج کی فیس جدا اس لئے کم استطاعت طلبہ جو دونوں جگہ کی بھاری فیس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔ وہ صرف یونیورسٹی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور کالج کے اتالیقوں کی مدد کے بغیر امتحانات کی تیاری کرتے ہیں۔ ڈگری پانے کے لئے کسی کالج میں داخل ہونا

ضروری نہیں۔ یونیورسٹی کے دفتر میں نام درج ہونا کافی ہے۔ مگر کالج میں داخل ہونا حُسنِ تربیت کے اعتبار سے مفید سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کالج میں داخل ہو کر طالب علم کو وہاں کے معلمین اور متعلمین دونوں سے ملنے اور مستفید ہونے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اور فٹز ولیم ہال کی رہایش سے طالب علم یونیورسٹی کی دُنیا میں رہ کر اُس دنیا سے الگ رہتا ہے۔ کالجوں والے ایک دوسرے سے ارتباط بڑھاتے ہیں۔ اور ان "نان کال[۱]" طلبہ کو اپنی برادری سے علیحدہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کیمبرج اور اکسفورڈ کی زندگی کی بڑی خوبی جو اور مقامات میں کمیاب ہے۔ یہی طالب علموں کی مراد رہی ہے۔ جس سے بسا اوقات بڑے مفید نتائج نکلتے ہیں۔

گو کیمبرج میں سب کالج۔ کیا چھوٹے کیا بڑے۔ اپنی اپنی جگہ مقتدر ہیں۔ اور کوئی کسی خوبی پر ناز کرتا ہے۔ اور کوئی کسی خوبی پر۔ تاہم بعض کالج خصوصیت سے نامور ہو گئے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اُن میں داخل ہونے کے آرزومند رہتے ہیں۔ اور انہیں موقع نہیں ملتا۔ کیونکہ اُن بڑے کالجوں میں یہ دستور ہو گیا ہے کہ ایک تعداد مقررہ سے زیادہ طلبہ داخل نہ کئے جائیں۔ اس قاعدے کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ طلبہ کی غیر معمولی کثرت سے تعلیم ناقص نہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ نالائق طلبہ کی بھرتی جہاں تک ممکن ہو کم رہے۔ ان ممتاز کالجوں میں سب سے اوّل نمبر پر عموماً "ٹرنٹی کالج" شمار ہوتا ہے یہ کالج ہنری ہشتم شاہ انگلستان نے ۱۵۴۶ء میں قایم کیا تھا۔ اور اس سے پہلے کی بنی ہوئی چند عمارتیں اسی میں ملا دی گئی تھیں۔ مثلاً "کنگز ہال" جو اڈورڈ سوم کی یادگار تھا اور ۱۳۳۶ء میں بنا تھا۔ اور میکائیل ہوس جو ۱۳۲۳ء سے قائم تھا۔ اور شاہ اڈورڈ دوم کے ایک وزیر کی فیاضی کا نتیجہ تھا۔

ان کالجوں کے تاریخی حالات میرے خیال میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشہور یونیورسٹیاں ایک دن میں پیدا نہیں ہو گئیں

[۱] یعنی وہ لوگ جن کا کوئی کالج نہیں۔ اسی اصطلاح میں لفظ "کال" "کالج" کا مخفف ہے ۱۲

بلکہ صدیوں کی متواتر کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے ہم وطنوں میں جو لوگ انہیں سرسری طور پر دیکھ کر اپنے کالجوں کا مقابلہ اُن سے کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت پر بعض اوقات مایوسی چھا جاتی ہے۔ ؎

"کہ جائیکہ دریاست من گیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم"

لیکن ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ بلکہ اس سے ہمیں یہ سبق لینا چاہئے کہ ملک کی تعلیم کیلئے ذرا سی دیر اور تھوڑی سی کوشش کر کے بہت بڑے نتیجوں کی دفعتہً توقع کرنی غلطی ہے۔ بجائے اس کے مستقل اور پُر زور کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ اس اُمید پر کہ آج جو بنیاد ہم ڈالیں گے۔ آئندہ نسلیں اُس سے پورے طور پر فائدہ اُٹھائینگی۔ وہاں ایک ایک نواب اور ایک ایک امیر ایسے ایسے چشمے فیض کے جاری کر گیا ہے۔ کہ لوگ نسلاً بعد نسل اُن سے کام لے رہے ہیں اور یہی مثال ہے جس کی پیروی ہمارے امراء کو کرنی چاہئے۔ غور کا مقام ہے کہ ان یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے کالجوں کی بنیاد تو بادشاہوں اور امرا اور دیگر خوشحال افرادِ قوم نے ڈالی لیکن نیکنامی ساری قوم کی ہو رہی ہے۔ بلکہ ان تعلیم گاہوں کی وجہ سے انگلستان کے علم و کمال کا بھرم دنیا بھر میں بنا ہوا ہے۔

ٹرنٹی کالج کے بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی وہ عمارت نظر آتی ہے جو ڈاکٹر وہویل کی فیاضی سے بنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ۱۸۴۱ء سے ۱۸۶۶ء تک ٹرنٹی کالج کے "ماسٹر" رہے اور وہ اس عمارت کا ایک حصہ ۱۸۵۹ء میں اپنے سامنے بنوا گئے اور دوسرا حصہ اُن کی وصیت کی رو سے اُن کے انتقال کے بعد بنوایا گیا۔ یہ عمارت طلبہ کے رہنے کے لئے ہے اور جو کرایہ آتا ہے اُس سے قانون بین الاقوام کے طلبہ کی ایک جماعت کے وظائف اور اُن کے اُستاد کی تنخواہ نکلتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف دوہری خدمت اپنے کالج کی کر گئے۔ پہلے اپنے علم اور تجربہ کے پختہ ترین ثمر پندرہ سال تک کالج کی نذر کرتے رہے اور

؎ ماسٹر کیمبرج میں کالج کے پرنسپل یعنی افسر اعلیٰ کو کہتے ہیں ۱۲

مرنے پر اپنا اندوختۂ عمر یا شاید اپنے بزرگوں کا اندوختہ بھی کالج کو دے گئے۔ انگلستان میں اس قسم کے لوگوں کے پیدا ہونے کی کئی وجوہات ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ انگلستان میں اہل علم کی قدر و منزلت ہے۔ اور ایسے باکمالوں کے سامنے اہل دولت و مرتبت کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ مثلاً ٹرنٹی کے ماسٹر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی کے روبرو ٹوپی نہ اُتارے۔ گویا ہر کہ و مہ پر اس کا ادب واجب ہے۔ اس لئے کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ امرا کے لڑکے جنہیں علم کا شوق زیادہ ہو۔ خوشی سے کالجوں کی پروفیسری منظور کر لیتے ہیں۔ تنخواہ اگر کم بھی ہو تو پروا نہیں کرتے۔ گھر میں کھانے کو کافی موجود ہے۔ مگر اعزاز اور قدردانی پر مرتے ہیں۔ اور اس کے سوا ان کا ضمیر اس خیال سے تسکین پاتا ہے۔ کہ دولتِ علم سے دوسروں کو مالا مال کر رہے ہیں اور زندگی کا کوئی مقصد رکھتے ہیں۔ دام و دد کی طرح کھانے پینے اور سو رہنے پر اکتفا نہیں کرتے۔

کالج کے بڑے دروازے کے شمال کی طرف گرجا ہے جو کیمبرج اور اکسفورڈ میں قریب قریب ہر کالج کا ایک جزو ضروری ہے۔ گرجے کو جاتے ہوئے تین کمرے دیکھنے کے لائق ہیں۔ دروازہ کے قریب ہی ایک بالا خانہ میں وہ کمرہ ہے جس میں سر آئزک نیوٹن مشہور مہندس سنہ ۱۶۷۹ء سے ۱۶۹۷ء تک مقیم رہا۔ اس کے نیچے تھیکرے نامور ناول نگار کا کمرہ ہے۔ اور اس کے مقابل گرجے کے پاس کا کمرہ وہ ہے جس میں مکالے رہتا تھا۔

قریب قریب ہر کالج کسی نہ کسی ایسی یادگار پر نازاں ہے اور نوجوان طلبہ کی ہمت بندھانے اور انہیں شوق دلانے کا اس سے زیادہ موثر ذریعہ مشکل سے مل سکتا ہے۔ کہ انہیں معلوم ہو کہ ایسے نامور لوگوں نے وہیں تعلیم پائی تھی جہاں اب وہ تعلیم پا رہے ہیں۔ اور ایسے مشہور زمانہ اصحاب کی آنکھیں بھی اسی عمارت کے در و دیوار سے آشنا رہ چکی ہیں۔ جس میں وہ رہتے ہیں۔ ان باتوں سے انہیں ان بڑے لوگوں کے ساتھ ایک قسم کی یگانگت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ

محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس تعلیم گاہ کو جس میں وہ تربیت پا رہے ہیں ایک مادرِ مہربان فرض کیا جائے تو یہ بزرگ گویا اُن کے بڑے بھائی ہیں۔ جب سینکڑوں سینوں میں شوق ترقی جاگزین ہو تو آخر کہیں نہ کہیں تو اپنا اثر دکھائیگا۔ اور انھی مقامات سے گردش دوراں پھر کوئی نیوٹن۔ پھر کوئی تھیکرے۔ پھر کوئی مکالے پیدا کریگی۔

اب ہم گرجے کے قریب ہیں۔ ذرا اسے بھی اندر سے ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ ۱۵۶۴ء میں تعمیر ہوا۔ مگر اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں اس کی مرمت ہوئی اور بہت سی چیزیں جو شکستہ ہو رہی تھیں نئی بنائی گئیں۔ اُنیسویں صدی میں بہت سا چندہ اس گرجے کی سجاوٹ کے لئے کیا گیا۔ اس رقم سے چھت اور دیواروں کی تزئین ہوئی اور دریچوں میں باتصویر رنگین شیشے لگائے گئے دیواروں پر جو تصویریں ہیں۔ اُن میں سے مندرجہ ذیل کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا:-

۱۔ حضرت آدمؑ۔ بہشت کا میوہ۔ نو کاشت شدہ زمین۔ اور بہشت کی چار ندیاں۔

۲۔ حضرت نوحؑ۔ زیتون کا درخت۔ قوس قزح۔ ایک فاختہ مع ایک شاخ زیتون کے۔ ایک مردہ کوا نیچے پانی میں پڑا ہے۔ اور ایک مور اور ایک مورنی شجر زیتون کے نیچے کھڑے ہیں۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ۔ شاہ بلوط کا درخت۔ اس کے نیچے ایک مینڈھا۔ جس کے سینگ جھاڑی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

۴۔ حضرت یوشعؑ۔ انار کا درخت۔ انجیر اور انگور۔

یہ اور دیگر تصاویر اسی قسم کی اُن قصّوں اور روائتوں کی تفسیر ہیں جن کی طرف انجیل کے عہدِ عتیق میں جابجا اشارات ہیں۔ یورپ بھر کے گرجے اور عجائب خانے ان تصاویر سے بھرے ہوئے ہیں۔

رنگین دریچے تعداد میں پندرہ ہیں اور ہر ایک میں مختلف صورتیں بنی ہوئی ہیں ہر دریچہ بہ حیثیت مجموعی ایک خاص مضمون کی توضیح ہے۔ مثلاً ایک میں حضرت

عیسیٰؑ کے سب حواری ہیں۔ دوسرے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ابتدائی عیسائی کس وضع کے لوگ تھے۔ تیسرے میں مغربی عیسائیت کا نمونہ ہے۔ چوتھے میں لاطینی عیسائیت کا نقشہ ہے۔ کہیں یہ دکھایا ہے کہ موجودہ اصلاح شدہ کلیسا سے قبل انگلستان کی کلیسائی زندگی کس حالت میں تھی اور قومی زندگی کس حالت میں اور بعد اصلاح کیا بن گئی۔ کہیں کالج اور یونیورسٹی کے بانیوں اور محسنوں کی تصاویر ہیں۔

گرجے سے نکل کر باب اڈورڈ ملتا ہے۔ جو ۱۶۰۰ء میں تیار ہوا تھا۔ اس سے ایک کھلے صحن میں پہنچتے ہیں جو سبز گھاس سے مزین ہے۔ یہ جگہ دلکش ہے اور اس میں کھڑے ہو کر دیکھیں تو سنٹ جان کالج اور دریا کا منظر نہایت خوشنما ہے۔ اس سے آگے ایک صحن ہے جس میں ایک خوبصورت فوارہ لگا ہوا ہے۔ جو ۱۶۰۲ء سے موجود ہے۔ آگے کالج کا بڑا ہال ہے یہ بھی ۱۶۰۴ء اور ۱۶۰۸ء کے درمیان بنا ہے۔ لنڈن کے مڈل ٹمپل کے ہال کا نمونہ ہے اور بلحاظ رقبہ اور تزئین کے اسی کا مثنیٰ ہے۔ اس ہال میں بہت سی قد آدم تصویریں ہیں جو بڑے بڑے اُستادوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ اُن میں ایک تصویر ملک الشعرا لارڈ ٹنی سن کی ہے۔ جو واٹس نے ۱۸۹۰ء میں بنائی۔ یہ ملک الشعرا کی وفات سے صرف دو سال پہلے بنی ہے۔ اور اس خصوصیت سے قابل قدر ہے۔

ہال کے مقابل مطبخ کی عمارت ہے اور قریب ہی ایک اور صحن ہے جسے "نے ول کورٹ" کہتے ہیں۔ "نے ول" فن تعمیر کے اُستادوں میں شمار ہوتا ہے اور ٹرنٹی کی بہت سی عمارات اسی کی صناعی کی یادگار ہیں۔ مگر یہ صحن اُس کی نام سے یوں موسوم ہوا کہ اسے اُس نے اپنے صرف سے تیار کرایا تھا۔ گویا اپنے فن کے ذریعے کالج کی خدمت پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے جیب خاص سے بھی معقول مدد دی۔ اسی صحن کے گرد کمروں میں لارڈ بائی رن کے کمرے تھے۔

ٹرنٹی کے بڑے کتب خانہ کی عمارت اس صحن سے دائیں ہاتھ پر رہ جاتی ہے اس کا نقشہ سرکرسٹوفررین کی صناعی کی یادگار ہے اور وینس میں جو سینٹ مارک کی لائبریری تھی۔ اُس کی طرز پر یہ عمارت بنی ہے بین ۱۶۷۶ء اور ۱۶۹۵ء کے درمیان پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اب کیمبرج کی خوب ترین عمارات میں شمار ہوتی ہے۔ یہ لائبریری طول میں دوسو فٹ عرض میں ۴۲ فٹ اور اس کی چھت ۳۷ فٹ بلند ہے۔ اس میں کتابیں اس عمدگی سے سجائی گئی ہیں اور روشنی کے آنے کا انتظام ایسی طرح کیا گیا ہے کہ وہاں بیٹھکر پڑھنے والے کا خواہ مخواہ دل لگے۔ لائبریری میں بہت سے بت سنگ مرمر کے رکھے ہیں جن میں لارڈ بائی رن کا ایک مشہور بت قابلِ مذکرہ ہے۔ اس مشہور شاعر کے مداحوں نے چندہ کر کے سنہ ۱۸۳۱ء میں یہ بت تیار کرایا۔ بدیں امید کہ اسے لنڈن میں سنٹ پال کے گرجے میں یا وسٹ منسٹر ایبے میں جہاں اکثر مشاہیر کے بت رکھے ہیں۔ جگہ مل جائیگی۔ لیکن پادری صاحبان نے دونوں جگہ اس بت کے رکھے جانے کی اجازت نہ دی سنہ ۱۸۴۲ء تک یہ بت چونگی خانہ میں پڑا رہا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر وہیول ٹرنٹی کی مسند کے صدر نشین تھے اُنہیں خبر ملی کہ ایک باکمال کے بت کے ساتھ یہ ناانصافی تعصب کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہم اسے اپنے کالج میں خوشی سے جگہ دیں گے۔ اور اس طرح یہ بت لائبریری میں رکھا گیا۔

کتب خانہ کے نوادر میں مندرجہ ذیل قلمی نسخے بہت قیمتی ہیں۔ ایک شیشہ کی الماری میں ایک کتاب رکھی ہے۔ جس میں ملٹن کے مسودات ہیں۔ اور اس میں اس کی مشہور کتاب "پیرے ڈائس لوسٹ" یعنی "فردوس ز دست رفتہ" کا پہلا خاکہ ہے۔ جب وہ اسے ناٹک کی صورت میں لکھنا چاہتا تھا۔ ایک اور الماری میں تھیکرے کے معروف ناول "ایسمنڈ" نامی کا مسودہ ہے اس سے بھی زیادہ بیش بہا مسودہ ٹنی سن کی "اِن میموریم" یعنی "یادگار دوست" کا ہے۔ ٹنی سن جب کیمبرج میں طالب علم تھا تو اس کا سب سے عزیز دوست ہیلم بھی وہیں پڑھتا تھا۔ تقدیر سے

ہیلم جوانی میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو داغِ مفارقت دے گیا۔ ٹنی سن کے دل پر اس مرگ کا ایسا صدمہ ہوا کہ اُس نے اسی صدمہ کے اثر سے اپنی بہترین نظم لکھی۔ ہیلم گذرنے کو تو اس جہانِ فانی سے گذر گیا۔ مگر اپنے دوست کو شہرتِ جاودانی کی سند دے گیا اور ساتھ ہی خود بھی مشہور ہو گیا۔ جبتک انگریزی زبان اور اس کی نظم زندہ ہے۔ ٹنی سن کی "ان موریم" زندہ رہیگی اور اس کے ساتھ ٹنی سن اور ہیلم کے نام۔ ٹنی سن بھی اس کالج کا طالب علم تھا۔ مگر کالج کے کمروں میں نہیں رہتا تھا۔ ہیلم کالج میں رہتا تھا اور اُس کے کمرے "نےول کورٹ" کے مقابل عین درمیان کے زینے پر تھے۔

ٹرنٹی کی عمارتوں میں اب ایک اور چیز قابل بیان رہ گئی ہے۔ اُسے بشپس ہوسٹل کہتے ہیں۔ یعنی لاٹ پادری صاحب کا بنایا ہوا مکان۔ مقام لیچفیلڈ کے بشپ کی فیاضی کی یادگار ہے۔ ایک سو طلبہ اس میں رہتے ہیں۔ اور اس کا کرایہ کتب خانہ کی امداد میں صرف ہوتا ہے۔ اسی طرح کیمبرج میں اکثر عمارتیں اور اکثر مکان دوسرے مفید مقاصد کے جامع ہیں اور اس قسم کی معقول خیرات سے قومی تعلیم کی کل انگلستان میں نہایت عمدگی کے ساتھ چل رہی ہے ؛

ہماری "اسپرانٹو"

یورپ میں آجکل ایک نئی زبان کا بہت چرچا ہے۔ جسے "اسپرانٹو" کہتے ہیں۔ شاید دنیا میں یہ پہلی مصنوعی زبان ہے۔ جو کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ گو زبانوں کی جڑ کو دیکھیں تو سب زبانیں کم و بیش مصنوعی ہیں۔ ان کی ابتدائی حالت میں چند انسانوں نے ضرور یہ قرار دیا ہو گا کہ زبان ولب کی فلاں حرکات سے فلاں معنے لئے جائیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کونسی زبان کس زمانے میں اس حالت ابتدائی میں تھی۔ بلکہ عام طور پر ہر قوم کی زبان اس قوم کی زندگی کے ساتھ وابستہ معلوم

ہوتی ہے۔ جب سے اُس قوم کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اسی وقت سے اُسکی زبان اُس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ حالات کے تغیر کے ساتھ تغیر پاتی ہوئی بتدریج بڑہتی جاتی ہے اور اہل بصیرت کے لئے اس قوم کی زندہ تاریخ ہوتی ہے۔ مگر ایسا کم سننے میں آیا ہے کہ کوئی ایک شخص ایک زبان ایجاد کرے یا چند آدمی مل کر ایک زبان گھڑلیں۔ اور اس کے قواعد منضبط کریں اور اس کے بعد اس کی اشاعت کی کوشش کریں۔ اور یہ بنائی ہوئی زبان مقبول ہو جائے۔ اختلاف السنہ سے جو مشکلات سیر و سیاحت اور تجارت کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ اُن سے بچنے کے لئے ایک مشترکہ زبان ایجاد کرنے کی کوشش کئی مرتبہ یورپ میں ہو چکی ہے۔ مگر ناکام رہی۔ یہ آخری کوشش جو "اسپرانٹو" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک روسی عالم کی محنت کا نتیجہ ہے۔ علامہ موصوف نے روسی اور فرانسیسی۔ انگریزی جرمن اور اطالین زبانوں کی آمیزش سے یہ زبان پیدا کی ہے۔ اور اس کے صرف و نحو کو بالکل باقاعدہ اور آسان بنادیا ہے۔ کوئی استثنائی قواعد اس میں داخل نہیں کئے جن سے طالب زبان کو دقت ہو۔ اور اس کا "اسپرانٹو" نام رکھا ہے۔ یہ اطالین زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں "امید" چونکہ اس کے بانی اور اس کے معاون کے نزدیک اس سے یہ اُمید بندہتی ہے کہ یورپ کی مشترکہ زبان ہونے میں کامیاب ہوگی۔ اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ایک رعایت اس نام میں اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس زبان میں یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ سب اسما حرف واو پر ختم ہوں اور اس لئے اس نام سے زبان کی ماہیت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

جب یہ زبان پہلے پہل ایجاد ہوئی تو اکثر لوگ اس کی ہنسی اُڑاتے تھے۔ اور کہتے تھے کبھی اس طرح بھی زبانیں بنتی ہیں اور پھیلی ہیں۔ قدرتی طور پر بنتی اور قدرتی اسباب سے بڑہتی ہیں۔ مگر آفرین ہے اس کے بانی اور اس کے ہمراہیوں کی ہمت اور تدبیر پر۔ اُنہوں نے ناممکن کو ممکن بنادیا ہے۔ اور اب یورپ،

کے ہر بڑے شہر میں "اسپرانٹو" والوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہوگئی ہے۔ اور برلن۔ پیرس اور لندن کی بڑی بڑی دکانوں پر لکھا ہوتا ہے کہ یہاں "اسپرانٹو" بولی جاتی ہے۔ اس کے بانیوں کا یہ منشا نہیں کہ یہ موجودہ زبانوں کی جگہ چھین لے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قوم اپنے گھر میں اپنی زبان اور اپنے علم ادب کو ہی ترجیح دے گی۔ اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر اس مشترکہ زبان کو اختیار کرلے گی۔ بے سود ہے۔ مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ مشترکہ زبان اُن سب مختلف زبانوں والی قوموں میں ایک مفید واسطہ بن جائے۔ اور خصوصاً تجارتی کاروبار میں سہولت کا باعث ہو۔ تاکہ "اسپرانٹو" جاننے والا یورپ کے ہر حصے میں اپنا کام نکال لے۔ علم لسان کے چند علما کے علاوہ پہلے جس طبقے نے اس زبان کی طرف توجہ کی وہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ کیونکہ انہیں اس کے اختیار کرنے اور اس کی اشاعت کرنے میں صریح فائدہ نظر آیا۔ اس کے بعد اُن کی مثال کے اثر اور اُن کی شبانہ روز کی سعی کی بدولت اور لوگ بھی ماننے لگے۔ کہ اس زبان کو پھیلانا چاہئے۔ اب اُن لوگوں کو یہاں تک کامیابی ہوگئی ہے کہ لندن اور پیرس کے اکثر مدارس میں یہ زبان داخلِ درس ہوگئی ہے۔ اور اُن لڑکوں کو جو تجارتی کاروبار میں پڑنا چاہتے ہیں۔ تاکید ہے کہ وہ یہ زبان ضرور سیکھیں علاوہ ازیں اس کے حامی ہر برس ایک عظیم الشان کانفرنس یورپ کے کسی نہ کسی مشہور مقام میں کرتے ہیں اور وہاں ہر ملک کے رہنے والے جمع ہوتے ہیں۔ اُس جلسے کی کارروائی سب اپنی زبان میں ہوتی ہے۔ اور اراکین ایک دوسرے سے "اسپرانٹو" میں باتیں کرتے ہیں۔ میں جب شمالی فرانس میں بولون میں مقیم تھا تو مجھے اُن کا سالانہ مجمع دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس برس کیمبرج میں "اسپرانٹو" والوں کا جلسۂ سالانہ ہوا ہے اور کیمبرج جیسے علمی مرکز کی طرف سے اس جلسے کی اجازت اور تائید گویا اس زبان کے لئے انگلستان کی طرف سے فرمانِ منظوری اور اس کی کامیابی کے لئے ایک نیک فال ہے۔ اب اگر اس کے حامی اسی سرگرمی سے کام کرتے رہے جو آج تک

اُن کا شعار رہی ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے اور اسے آخر یورپ کی زبانِ عمومی بنا کے چھوڑیں گے۔

"اسپرانٹو" والوں نے کئی وسائل اس زبان کے مقبول بنانے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ جا بجا "اسپرانٹو" کی انجمنیں قایم کی ہیں۔ اُن انجمنوں کے جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ اور اُس میں اسپرانٹو کی مشق ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ مختلف اللسان لوگ آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ سارے یورپ کی زبانوں کی مشہور اور مقبول ترین کتابوں کا اس زبان میں ترجمہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ لطیف سے لطیف خیالات بھی اس میں ادا ہو سکتے ہیں۔ ہر دلعزیز گیتوں کا ترجمہ بھی اسپرانٹو میں کیا گیا ہے۔ اور موسیقی کے بعض اُستادانِ فن اپنی دلکش آواز سے ان گیتوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ کئی رسالے "اسپرانٹو" میں نکلنے لگے ہیں۔ اور "اسپرانٹو" کے ہواخواہ بعض اخبارات میں اپنے تجارتی اشتہارات اس زبان میں چھپواتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی نگاہیں اس کے الفاظ سے آشنا ہو جائیں۔ اور بیگانگی دور ہو جائے۔ اسپرانٹو کے معاونوں کی سرگرمی کا یہ حال ہے کہ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ جہاں کسی نئے شخص سے ملاقات ہوئی۔ پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔ آپ "اسپرانٹو" جانتے ہیں۔ اگر اُس نے اسپرانٹو کا نام سُنا ہے تو اُس کے متعلق باتیں شروع ہو جاتی ہیں اور اگر نہیں سُنا تو مختصر سا حال اس کے آغاز اور اس کی ترقی کا سنا کر اُسے اُس کی طرف توجہ کرنے کا شوق دلاتے ہیں۔ "اسپرانٹو" پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے ہیں وہ اُن لوگوں کے پاس اکثر موجود رہتے ہیں۔ اور نئے شائقین میں بانٹے جاتے ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اُن کوششوں کا جو یورپ کی مختلف اللسان قوموں میں رابطۂ اتحاد اور سہولتِ تجارت پیدا کرنے کے لئے ہو رہی ہیں۔ اور باوجودیکہ ایک نئی زبان کا عدم سے وجود میں لانا ایک کٹھن کام ہے۔ "اسپرانٹو" کے حامی کمرِ ہمت باندھے ہوئے مصروفِ سعی ہیں۔ اور کامیابی کے امیدوار یہانتک کہ اُنھوں نے

اس نئی زبان کا نام ہی "زبان اُمیدؔ" رکھا ہے۔ اس خاک پاک ہند میں بھی جو ہمارا وطن ہے ایک زبانِ امید موجود ہے۔ جو یورپ کی "اسپرانٹو" سے بہت سی باتوں میں ملتی اور بعض اعتبارات سے فضیلت رکھتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اس سے غافل ہیں اور امکانات سے بیخبر ہیں جو اُس کی ترقی میں پنہاں ہیں۔

ہماری "اسپرانٹو" وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اُردو۔ کوئی ہندی۔ اور کوئی ہندوستانی زبان کہتا ہے۔ ہم نام کے پابند نہیں۔ ہمیں کام سے کام ہے جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو۔ اُس نام سے اُسے یاد کرے۔ مگر اس کوشش میں رہے کہ چار دانگ عالم میں ہندوستان کی اس "خداداد اسپرانٹو" کا چرچا ہو جائے۔ اُردو کو میں "خداداد اسپرانٹو" اس لئے کہتا ہوں۔ کہ اپنی یورپین بہن کی طرح یہ ایک تازہ انسانی ایجاد نہیں ہے۔ بلکہ صدیوں میں اُن قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ جن سے دنیا بھر کی زبانیں پیدا ہوئیں اور بڑھی ہیں۔ اور یہی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ جو "ہماری اسپرانٹو" کو یورپ کی اسپرانٹو پر حاصل ہے۔ اسی لئے اُردو کے پھیلانے کا کام بہ نسبت اسپرانٹو کے زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ اسپرانٹو بولنے والوں کا وجود ہی نہ تھا۔ اور ہندوستانی بولنے والے ہمارے ملک میں صدیوں سے چلے آتے ہیں۔ یورپ میں "اسپرانٹو" کا فقط اس کی ذاتی کامیابی کی توقع کے سبب "اُمید" نام رکھا گیا ہے۔ مگر ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی کامیابی ملک کی کامیابی ہے اور ملک کی بہتری اور اہلِ ملک کے اتحاد کی اُمید کا صرف یہی ایک پہلو ہے۔ کہ کم از کم سب ہم زبان تو ہوں اختلافات مذہبی تو کسی کے مٹائے مٹنے والے نہیں۔ مگر ایک ملک میں ایک حکومت کے زیر سایہ رہتے ہوئے اور نقل و حرکت کے ذرائع کی کثرت کے باوجود ملکی زبان کا ایک نہ ہو سکنا اور اس کی اشاعت میں کوتاہیاں نہایت قابل افسوس ہیں۔

کئی زبانوں کا مجموعہ مرکّب ہونے میں اُردو کو اسپرانٹو کے ساتھ پوری مشابہت ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ابھی اور الفاظ کی آمیزش کی گنجایش اس میں موجود ہو

ہندوستان کی مختلف زبانوں کی موجودہ بولیاں جو اپنی اپنی جگہ قایم رہنے کے قابل اور قایم رہنے والی ہیں۔ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔اور خصوصاً ہندوستانی کے الفاظ اُن میں بہت شامل ہیں۔جو انگریزی الفاظ اب ہندوستان کی زبانوں میں ملکر جزوِ زبان بن گئے ہیں۔اُن سے یہ مشترکہ حصّہ ان سب زبانوں کا اور بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ایسی صورت میں اُردو کا عام رواج دیا جانا سب کی آسانی کا باعث ہے اور بغیر بہت غیر معمولی تردّد کے ممکن ہے۔اگر لوگ اس طرف مائل ہوں۔یورپ جس کے لئے ایک زبان پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔دس بارہ مختلف دُوَل کا مجموعہ ہے۔جہاں ہر حکومت میں زبان جُدا۔طرزِ حکومت جُدا اور قانون جدا ہے۔ایک حکومت کے باشندوں کی اغراض اکثر اوقات دوسری حکومت کے باشندوں کی اغراض کے خلاف ہیں۔اور ایک سلطنت اور دوسری سلطنت میں رقابت موجود ہے۔مگر اُن لوگوں کی وسعتِ خیال اور روشن دماغی دیکھئے۔کہ ایسے بڑے اختلافات کو بھی مٹانے یا اُن کے دبانے کے لئے ایک نیا رشتۂ یگانگت پیدا کرنے کی فکر میں ہیں اور ہماری کوتاہ اندیشی کو دیکھئے۔کہ ایک ملک ایک حکومت اور مشترکہ ضروریات اور اغراض کے باوجود فکرِ ہم زبانی سے غافل ہیں۔حالانکہ ہمارے راستے میں وہ مشکلات بھی نہیں جو اُن کے راستے میں ہیں۔کیسا عمدہ موقعہ ہے جو ہم کھو رہے ہیں۔ع

اَے دل بہ کوئے دوست گذارے نہ کردۂ	فرصت زدست دادہ وکارے نہ کردۂ
میداں فراخ دیدہ و گوئے نہ بُردۂ	شاہیں بہ دست و عزم شکارے نہ کردۂ

میرے خیال میں اب وہ وقت نہیں رہا۔کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں کہ ہماری زبان میں اگر قوّت نمو ہے تو خود بڑھے گی۔اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں ترقی کی طاقت موجود ہے اور وہ ہماری کوشش کے بغیر بیدلی کی کوشش سے بھی کچھ نہ کچھ بڑھ رہی ہے۔اُس کا ذخیرۂ ادب بھی روز افزوں ہے

اس کے بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ اور ملک کے دور دراز گوشوں میں بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی آواز پہنچنے لگی ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے کافی نہیں ہے۔ اس ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو سکتی ہے۔ اگر ہم اس کی خاطر کچھ تکلیف گوارا کرنے لگیں۔

ہمیں اپنے سب بڑے بڑے شہروں میں اپنی زبان اُمید کی انجمنیں قائم کرنی چاہئیں جن میں اس کے شائقین۔ اس کے دلدادہ۔ اس کے ہواخواہ بلاقید ملت و مذہب جمع ہوں اور اپنی اپنی محنت کے نتائج سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اس کے علمی اور ادبی ذخیروں کو بڑھائیں۔ ہمعصروں سے داد پائیں۔ اور آئندہ نسلوں کو ممنون منت کریں۔ وقتاً فوقتاً کوئی کانفرنس یا بڑا جلسہ بھی ہونا چاہیئے جس میں ملک کے ہر گوشہ سے اس زبان کے مصنف۔ مولف۔ مترجم اخبار نویس سب جمع ہوں۔ یہ پہلا کام ہوگا جس میں نامور اہل قلم بلالحاظ مذہب ایک مشترک مقصد کے لئے جمع ہونگے۔

اُن صوبجات ہند میں جہاں اردو مادری زبان نہیں۔ ایک اور طریق عمل بہت مفید ہو سکتا ہے۔ میں نے انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسی زبان کے طالب علم فرانسیسی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے۔ اور فرانس میں انگریزی پڑھنے والے انگریزی کے لئے یہ تدبیر استعمال کرتے ہیں کہ کئی آدمی یکجا جمع ہو کر مشہور کتابوں کے انتخاب پڑھتے ہیں۔ اور لوگ سننے آتے ہیں۔ اس سے تلفظ بہ سہولت کرنے کی عادت ہوتی ہے اور روزمرہ درست ہو جاتا ہے۔ فرانس میں تو میں نے فرانسیسی لوگوں کو اپنی زبان کی مشق کے لئے اسی طریق سے فائدہ اُٹھاتے دیکھا ہے۔

جن صوبجات ہند میں اردو کا رواج نسبتاً کم ہے۔ مثلاً بنگال۔ مدراس اور بمبئی وہاں اس قسم کی اردو انجمنوں کی ضرورت ہے۔ ایسی ہی مجالس "اسپرانٹو" کے حامیوں نے یورپ میں قایم کی ہیں۔ ان انجمنوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو بے تکلف اُردو بول سکتے ہیں اور وہ اپنے گرد جمع کریں ایسے لوگوں کو جو اُردو کے فوائد

تمدنی۔ تجارتی اور سیاسی کو مدنظر رکھ کر اسے سیکھنا چاہتے ہیں۔ جلسے کی کارروائی اُردو میں ہو۔ ضابطہ کی کارروائی کے علاوہ میل ملاپ اور بات چیت کے موقعے پیدا کئے جائیں۔ تاکہ سب اراکین کو تکلّم کی مشق ہو۔ اور جلسہ کی دلچسپی بڑھانے کے لئے اُردو نظم و نثر کی مقبول کتابوں کے انتخابات وہاں پڑھے جائیں اور اردو کے مشہور گیت بھی کبھی کبھی گائے جائیں۔ پڑھنا بھی ایک خاص فن ہے ہمارے ملک میں بھی مروّج رہا ہے اور اب ایک دوسرے رنگ میں یورپ میں مروّج ہے۔ اچھا پڑھنے والا عمدہ کلام میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے اور وہی انتخاب جو کتاب میں چھپا ہوا صرف چند اہل نظر کو گرویدہ کرتا ہوشیار پڑھنے والے کی زبان اور فن کی تاثیر سے خاص و عام کو قائل کر لیتا ہے۔ ایسے مشّاق پڑھنے والے آجکل ہمارے ہاں بہت کم ہیں۔ ان کی تعداد کو بڑھانا اور اُن کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ایک مفید ذریعہ ترقی زبان کا ہے۔ اور اگر ہم اُن سب ذرائع سے جو اس ہر دلعزیز زبان کی اشاعت کے ہمارے پاس موجود ہیں۔ کام لیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری "اسپرانٹو" ایک نصف صدی میں ہندوستان بھر کی زبانِ عمومی نہ بن جائے اگر "اسپرانٹو" کے چند مددگار چند سال میں کئی سو سے کئی ہزار اور کئی ہزار سے کئی لاکھ بن سکتے ہیں۔ تو کیا ہماری "اسپرانٹو" کے کئی کروڑ بولنے والے اور کئی کروڑ آدمی اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ ہمت کریں تو منزل بہت دور نہیں۔ اور ہمت ہار بیٹھیں تو اس سے دشوار تر منزل کوئی ہو نہیں سکتی ؞

نت نئے نظارے

یورپ کے بعض قابل دید مقامات جو میں نے گذشتہ سال دیکھے اُن کے نظارے چشمِ تصور میں اب تک جاگزین ہیں۔ حالات سفر کا وہ حصہ جو استانبول کے متعلق تھا علیحدہ کتاب کی صورت میں "مقام خلافت" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ استانبول میں چونکہ بہت دن قیام رہا وہاں کے حالات کا علیحدہ چھپنا ضروری تھا۔ باقی مقامات

کے مشاہدات باقساط درج مخزن کئے جائیں گے۔ آج قسط اول ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس میں یورپ کے مشہور خوش منظر مقام لوسرن کے سفر کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ کئی ہفتے ایسے گذرے کہ روز کسی نئے مقام کی سیر ہوتی تھی اور نئے نظارے۔ اسی لئے اس سلسلے کا نام "نت نئے نظارے" رکھنا پڑا (عبد القادر)

کیسا ہی دلچسپ مقام کیوں نہ ہو آدمی ایک جگہ رہتے رہتے اُکتا جاتا ہے۔ لندن اس وقت مرجع انام ہے۔ لیکن چہار شنبہ ۱۸ر جولائی ۱۹۰۶ء کے دن کوئی ہمارے جی سے پوچھتا۔ کہ لندن سے جانے کی کس زور سے آرزو تھی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ دو بجنے کو تھے کہ ہم[1] ریل پر پہنچے۔ چند دوست ہمیں وداع کرنے آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم قابلِ رشک ہیں کہ سوٹزرلینڈ کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم بیتاب تھے کہ گاڑی چلے۔ دو بجکر بیس منٹ گذرے اور گاڑی چلی۔ لندن سے فوکسٹن تک دو گھنٹے کا رستہ تھا۔ بارہا دیکھا ہوا تھا۔ اس کے ہرے ہرے مرغزاروں سے انگلستان میں رہتے رہتے نگاہ کافی آشنا ہو چکی تھی۔ مگر اس دن میں خدا جانے کیا جادو کی تاثیر تھی کہ وہ رستہ بھی غیر معمولی طور پر دلچسپ معلوم ہوتا تھا اور وہ اونچے نیچے کھیت جن میں بھیڑوں کے گلے چرتے پھرتے تھے نہایت دلفریب نظر آتے تھے۔ وہ تو کیا بدل گئے ہونگے۔ ہماری نگاہ بدلی ہوئی تھی۔ یا آنے والے مناظر انگلستان کی ناہموار مگر سرسبز زمین پر اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔

فوکسٹن پہنچکر ہم جہاز میں بیٹھے حسنِ اتفاق سے دریا میں تموج کم تھا ہنستے کھیلتے کھاتے پیتے گھنٹہ بھر میں ہم نے بولون ساحلِ فرانس کو جالیا مسٹر کی جگہ موسیو! موسیو! کا شور ہے۔ فرانسیسی حمال اسباب اُٹھانے کو دوڑے آتے ہیں۔ بات بات میں سر سے لیکر پاؤں تک حرکت کرتے ہیں۔ کچھ پوچھو تو دونو شانے ہلا کر اس طرح "ژونہ سے پا"[2] کہتے ہیں۔ کہ نیچے کا ہونٹ علامتِ انکار کے طور پر خود بخود آگے بڑھ جاتا ہے۔ بھویں اوپر کو کھنچ جاتی ہیں۔ اور پیشانی پر دو تین شکن پڑ جاتے ہیں۔ ہم اُنکی بات

[1] اس سفر میں میرے دوست شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی میرے ہمراہ تھے اسی لئے جا بجا لفظ "ہم" استعمال ہوگا۔
[2] میں نہیں جانتا (فرانسیسی)

سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ اپنے مطلب کی خوب سمجھتے ہیں۔ اسباب اُٹھا کر یہ جا وہ جا۔ بہت عنایت کی تو اشارے سے بلاتے جاتے ہیں کہ ادھر آؤ ادھر آؤ۔ کوئی جانے ریل پر سوار کرانے لئے جا رہے ہیں۔ مگر نہیں۔ دوانہ[۱] کا قضیہ پہلے درپیش ہے فرانس میں تمباکو پر بہت محصول ہے اور زیادہ تر اسی کی پرسش ہوتی ہے کہ کہیں اسباب میں تمباکو تو نہیں۔ بعض دفعہ اسباب کھول کر دیکھتے ہیں بعض دفعہ صرف پوچھتے ہیں۔ کوئی چیز چنگی کے قابل تو نہیں؟ اور اعتبار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ریل تیار ملتی ہے اور حمال اسباب لا کر گاڑی میں رکھ دیتے ہیں۔

ہم جہاز سے اُترنے کو تھے کہ ایک انگریز ہم سے مخاطب ہوا۔ اور پوچھنے لگا کیا آپ مالٹا کے رہنے والے ہیں؟" ہم نے کہا "نہیں ہم ہندوستانی ہیں" وہ ہنسا اور کہنے لگا "عجیب بات ہے۔ اسی جہاز میں دو اور شخص ہیں بالکل آپ کے ہم رنگ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ ہندوستان سے آتے ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں ہم مالٹا کے باشندے ہیں۔ اب میں نے سمجھا کہ آپ بھی اُن کے ساتھ ہوں گے اور آپ سے پوچھا تو آپ ہندوستانی نکلے۔ میں نے آج دو دفعہ غلطی کھائی۔ مگر میرا کیا قصور ہے۔ آپ کے رنگ اسقدر ملتے ہیں۔" ہم پوچھنے ہی کو تھے کہ وہ مالٹا کے آدمی کہاں ہیں۔ کہ وہ سامنے آ گئے۔ اُس انگریز سے اور اُن سے باتیں ہو چکی تھیں اُس نے ہمیں اُن سے ملا دیا۔ جب ہم سب دوآن سے فارغ ہو کر ریل میں سوار ہوئے تو اتفاق سے ہم اور ہمارے ہمرنگ مالٹی ایک ہی کمرے میں تھے۔ ہم نے اُن سے پوچھا "آپ کہاں جاتے ہیں؟" انہوں نے کہا۔ لوسرن! پھر کیا تھا۔ ہم اچھل پڑے کہ راستے بھر کے لئے رہبر خدا نے بھیج دیئے۔ مشیر نے برمحل یہ شعر پڑھا ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ہم چلتے وقت اس خیال سے کسقدر متردد تھے کہ سوئٹزرلینڈ میں زبان نہ جاننے سے

---

[۱] چونگی خانہ (فرانسیسی)

ہمیں دقّت ہو گی۔ لیکن ان مالٹی حضرات کے مل جانے سے وہ تردد رفع ہو گیا۔ یہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے اور لوسرن کی سیر پہلے بھی کر چکے تھے۔

ہمارے دو ہم سفروں میں ایک نوجوان تھا ایک بوڑھا۔ نوجوان چرٹ اور سگرٹ کی تجارت کرتا تھا۔ اور بوڑھا مالٹا کے ایک مدرسے کا معلّم تھا۔ دونو متوسط حالت کے آدمی تھے مگر محض شوقِ سیر سے نکلے تھے۔ شمالی افریقہ کی سیر کرتے ہوئے ہسپانیہ پہنچے وہاں سے انگلستان آئے۔ چند روز لندن میں رہ کر اب سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے راستے گھر جا رہے تھے۔ ہم نے اُن کی ہمت کی تعریف کی۔ اُنھوں نے کہا یورپ میں سیر و سیاحت معمولی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے ہم لوگ سال بھر محنت سے اپنا کام کرتے ہیں۔ مہینہ دو مہینے ہر برس آرام اور تفریح کے لئے بھی چاہیئے۔ اس سے آدمی تندرست رہتا ہے اور باقی مہینوں میں کام اچھی طرح کر سکتا۔ آرام کے دنوں میں گھر پڑے رہنے کی نسبت تبدیل آب و ہوا اور طرح طرح کے نظارے دیکھنا زیادہ مفید ہے خصوصاً سیر سے انسان کو خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور گھر گھسنے پن کی جو تنگ خیالی ہوتی ہے رفع ہو جاتی ہے۔ اِدھر اُدھر کی چند اور باتیں کرنے کے بعد وہ آپس میں اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے اور ہم اپنی زبان میں۔ ایک دفعہ میں نے جو ذرا کان لگایا۔ تو ان کی گفتگو میں کئی الفاظ عربی معلوم ہوئے۔ میں نے پوچھا آپ عربی بول رہے ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا۔ نہیں۔ یہ مالٹی ہے۔ عربی اور اطالین کی ترکیب سے بنی ہے اور اس میں بکثرت عربی الفاظ ابتک موجود ہیں۔ ایک عرصہ تک عربوں کا جزیرۂ مالٹا میں عمل دخل رہا ہے اور مالٹی زبان کی ترکیب اُس زمانے کا ایک پائدار نقش ہے۔

بولون سے جب گاڑی چلی ہے تو چھ بجے تھے آمین پہنچے۔ تو رات ہو ئی تھی۔ سٹیشن کے قریب آتے ہی دریچے سے سر نکال کر ہم نے بہت چاہا کہ شہر کے نقشے کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ مگر سوائے اس کے کہ چراغوں کی روشنی یہ بتائے کہ خاصا بڑا شہر ہے۔ کچھ زیادہ پتہ نہ چلا۔ ہاں تھوڑی دیر سٹیشن کی سیر کی، اور پھر گاڑی میں آ بیٹھے

ہمراہیوں نے سونے کی تیاری شروع کی۔ مگر مجھے نیند کیونکر آتی سوئٹزرلینڈ کو دیکھنے اور ایشیا کے سوئٹزرلینڈ (کشمیر) سے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میں ہمہ تن انتظار تھا اور کہتا تھا کہ کب صبح ہوگی۔ مشکل یہ کہ رات کو باغ و راغ کا نظارہ بھی ممکن نہ تھا۔ اور تو کچھ نہ ہو سکا "سٹیشن شماری" جاری رہی۔ اگلے وقتوں کے لوگ انتظار میں اختر شماری کیا کرتے تھے۔ اب وہ ترکیب پرانی ہو گئی۔ ریل کے سفر میں رات کے وقت سٹیشن گننا نئے زمانے کی ایجاد ہے۔ سچ ہے ہر زمانے کی ضرورتیں جدا ہیں اور ایجاد ضرورت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ یا جیسا انگریزی والے کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ چنانچہ ریل کے سفر میں بیتاب طبیعتوں کے واسطے انتظار کی مشکل گھڑیاں آسان کرنے کے لئے "سٹیشن شماری" ایجاد ہوئی۔ اگر کسی نے تجربہ کیا ہو تو میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ نسخہ آزمانے کے قابل ہے۔ اختر شماری سے کم دلچسپ نہیں اور طبیعت اس سے تھکتی کم ہے نئی سواریوں کی بیقراری کہ گاڑی میں جگہ ملے۔ اترنے والوں کی بیتابی کہ جلد اتریں۔ ریل کے اہلکاروں کا ادھر ادھر یوں ٹہلنا جیسے اس چھوٹے سے قطعۂ زمین کے خود مختار بادشاہ ہیں سٹیشن پر روشنی کا زور سٹیشن کے باہر دور اندھیرے میں سرخ و سبز لالٹینوں کی رنگا رنگی اگر کوئی کہے کہ یہ تماشہ دلچسپ نہیں تو اس کا نام صاحبانِ مذاقِ سلیم کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیئے۔ میں ہر سٹیشن کو اٹھ کر دیکھتا تھا۔ اور اس کا نام پڑھ کر پنسل سے اپنی یادداشت کی کتاب میں ٹانک لیتا تھا۔ پہلے دو سٹیشن ذرا جلد جلد آئے پھر دیر دیر سے آئے۔۔۔ بلے۔ لاوان۔ ریم۔ شالون۔ شومان۔ درسو۔ بلفور تک کی تو رسید دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد چشم انتظار کو بھی خواب نے آلیا۔ رات آخر رات ہے قدرت کا زبردست نظام اپنے احکام کی تعمیل کرائے بغیر کسے چھوڑتا ہے۔ صبح کے قریب ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگ گئی۔ اور انتظار کا خاتمہ ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو مول ہاوزن سٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی۔ یہاں سے گویا سوئٹزرلینڈ کا علاقہ اور جرمن زبان کا دور شروع ہوا۔ اشتہارات جرمن ہیں۔ مکانوں کے نام جرمن ہیں۔ کرخت جرمن بولنے والے

لوگ آکر شریک راہ ہونے لگے۔

مگر یہاں اُن کی کسے فکر تھی۔ صبح صادق کا سہانا سماں سوٹزرلینڈ کا خوبصورت ملک ریل کے دونو طرف سبزہ ہی سبزہ اور سبزہ پر شبنم کے موتی بہار دے رہے تھے۔ میں کوٹ پہنکر بیٹھ گیا اور علاقہ کی سیر کرنے لگا۔ اتنے میں سورج نے سر نکالا درختوں کے پتوں کا ماہ جولائی کا گاڑھا سبز رنگ آغاز بہار کے ہلکے دھانی رنگ کی جھلک دکھانے لگا۔ مقام بال پر گاڑی رُکی تو وہاں کی آبادی کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور سب سے زیادہ خوشی یہ تھی کہ گھڑی دو گھڑی میں لوسرن پہنچینگے صبح کے سات بجے گاڑی ایک عالیشان سٹیشن پر تھی۔ ایک پُرفضا جھیل اسکے کنارے درختوں کی قطار۔ اور درختوں کے پیچھے بلند اور شاندار عمارتیں یہی لوسرن تھا دیکھتے ہی رات کی کلفت بھول گئی۔

لُوسرن سٹیشن نہایت عمدہ موقعہ پر واقع ہے۔ نکلتے ہی سامنے جھیل کا وسیع تختۂ آب ہے۔ دائیں ہاتھ عجائب خانہ کی عمارت اور بائیں ہاتھ کو بڑے بڑے ہوٹل۔ یہاں کسی نے نہیں پوچھا کہ اسباب میں کیا ہے۔ یہاں کے لوگ مسافروں کو ہر طرح خوش کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی رُوزی مسافروں کی کثرت آمد و رفت سے ہے۔ ہم اپنے مالٹی دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں گئے جہاں وہ پہلے ٹھہر چکے تھے۔ اُنہوں نے ہمیں کہا کہ ذرا استالیس دوپہر کو جہاز پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کو چلیں گے۔ ہم نے کہا بہت خوب۔ لیکن سستانے کا وقت ہمارے پاس کہاں تھا۔ ہمیں دوسری صبح کے لئے کسی نئے نظارے کی فکر تھی اور لوسرن میں جو کچھ دیکھنا تھا۔ اُس کے لئے یہی دن تھا۔ بس ہوٹل میں اسباب رکھتے ہی مُنہ ہاتھ دھو کر ہم باہر نکلے کہ بارہ بجے تک نزدیک نزدیک کی چیزیں سب دیکھ آئیں۔

سوٹزرلینڈ کا ہر حصہ ویسے تو حسن قدرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مگر لوسرن اور اُس کے قرب و جوار کو یہاں کی سینری کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ حکومت کا صدر مقام

اگر برن ہے۔ تو مناظر قدرت کا مرکز لوسرن ہے۔ کوہ الپس برف سے ڈھپی ہوئی چوٹیوں کے دیدار اور اُس کے شفاف چشموں کی زیارت کے لئے اس سے عمدہ موقع مشکل ہے۔ کوہستان کے ہر قابل دید حصے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں مناظر قدرت کے شیدائی دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں۔ اور محبوبۂ بہار کو بصد رعنائی جلوہ گر پاتے ہیں۔ موسم گرما بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ مزے کی جگہ کیا ہوگی۔ جنہیں دولت اور فراغت دونو میسّر ہیں وہ تو یہاں اگر مہینوں جانے کا نام نہیں لیتے۔ اس کو مرکز قرار دیکر گردونواح کی سیر کر آتے ہیں اور پھر یہیں آجاتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال بہار کے آغاز اور گرما کے اختتام کے درمیان یعنی اپریل کے شروع سے ستمبر کے اخیر تک کوئی تین لاکھ آدمی دوسرے مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ان میں آدھے اگر راہرو فرض کئے جائیں جو آتے جاتے تھوڑی دیر کے لئے اس پُر فضا مقام کی سیر کرتے ہیں۔ تو آدھے ایسے ہیں جو یہاں معقول عرصہ کے لئے قیام کرتے ہیں۔ انہی آنے جانے والوں سے یہاں کے کثیر التعداد ہوٹل اور دیگر مہمان خانے آباد ہیں۔ اور انہی کے طفیل سیر و سفر کے لئے ہر طرح کی آسائشیں یہاں مہیا ہیں۔ الپس کی کئی چوٹیوں تک ہلکی ریل جاتی ہے۔ اس کی سڑک کو دور سے دیکھیں تو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی قلۂ کوہ تک چلی گئی ہے۔ گاڑی کو اس ڈھلواں سڑک پر لے جانے کے لئے اس کے انجن اور گاڑیوں کی ساخت میں ایسی کلیں لگائی گئی ہیں۔ جن سے گاڑی قابو میں رہے اور نیچے کو لُڑک نہ جائے۔ جھیل کی سیر کے لئے ہر وقت دُخانی جہاز چلتے ہیں جو مختلف قابل سیر موقعوں پر ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں اور ہر جگہ لوگ اُتر کر آگے تھوڑی دور پیدل سیر تماشا کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے سوا گاڑیاں

حاشیہ صفحہ ۳۴۱ ؎ مناظر کے لئے انگریزی لفظ ہے "سین" انگریزی میں منظر کو کہتے ہیں۔ ناٹک کے تماشے کے مختلف پردوں کو بھی سین کہتے ہیں۔ ناٹک والوں کے ذریعہ سے لفظ اُردو میں مروّج اور بعض نامور مصنفین اُردو کی بدولت مستند ہوگیا ہے۔؏

ہیں۔ گھوڑے ہیں۔ ہاتھ سے چلانے کی کشتیاں ہیں۔ جس مذاق کا کوئی آدمی ہو اپنی پسند کی سواری ڈھونڈھ لے اور سیر کرتا پھرے۔ سبزہ و گل اور کوہ و دریا کے تماشے کے ساتھ شہروں کی زندگی کے مزے ملانا چاہے تو جھیل کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں کی دوہری قطار ہے۔ وہاں کرسیاں اور بنچیں رکھی ہیں۔ لوگوں کا جماؤ رہتا ہے۔ بیٹھ جائے اور تماشا دیکھا کرے۔ شام کے قریب باجا بجتا ہے۔ شام کے بعد ناٹک وغیرہ کے تماشے شروع ہوتے ہیں۔ جھیل کے کنارے روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ اور مکانوں کے لمپ اور سڑک کی لالٹینیں اپنا عکس پانی میں ڈالتی ہیں اور عجیب بہار دیتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شہروں کی ان معمولی دلچسپیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہو۔ اور گوشۂ تنہائی کا متلاشی ہو تو وہ آبادی سے کچھ دور نکل جائے چاروں طرف مناظرِ قدرت اس کے مونس و ہمدم ہوں گے۔ درختوں کی ٹھنڈی چھانو ہوگی اور برف پوش پہاڑوں کی دل لبھانے والی ہوا۔ وہ ہوگا اور اس کے خیالات نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا۔ نہ اس تخلیے میں خلل ڈالنے والا اگر کہیں اسی شوق کا مارا اسی کا ہم خیال کوئی اور بھی آنکلا تو وہ اس گوشے کو آباد پاکر خود ہی اور گوشہ ڈھونڈھ لیگا۔

ہماری سیر ان دونوں قسموں سے علیحدہ تھی۔ ہمارا اس پر عمل تھا کہ جی بھر کر دیکھنا میسّر نہ ہو تو نہ ہونے سے ایک جھلک بھی بہتر ہے۔ جیسے تیتری باغ کی سیر کرتی ہے۔ ایک پھول سے دوسرے پر۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اسی طرح ہم تھے کہ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا نمونہ دیکھتے پھرتے تھے۔ ہر نئے مقام کو ابھی پہلا سلام۔ ابھی آخری سلام۔ جانتے تھے کہ یہی ایک نظر ہے جس کی اجازت ہے۔ پھر کہاں ہم اور کہاں یہ حسن قدرت و صنعت کے جلوے۔

۱۹؍ جولائی ۱۹۰۶ء **عجائب خانہ و صلح جنگ** لوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ عجائب خانہ تھا۔ بیس مختلف حصّوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلاتِ حرب

اور طریق جنگ میں قدیم زمانوں سے لیکر آجتک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں اور اس کی منشا تحریک صلح عام کی تائید ہے۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال ہے جو اسلحہ جنگ سے پُر ہے۔ وسط میں توپیں رکھی ہیں۔ پرانی سی پرانی توپوں سے لے کر زمانہ حال کی کرپ توپیں تک یہاں موجود ہیں اور ہر ایک کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ کون سی کس زمانے کی یادگار ہے۔ دیواروں پر ایک طرف نیزے۔ برچھیاں۔ تلواریں۔ اور دوسری طرح طرح کی بندوقیں سج رہی ہیں۔ ایک کمرہ اسلحۂ روما کے لئے ہے اور ایک ازمنہ متوسطۂ یورپ کے لئے۔ جنگ سی سالہ اور جنگ ہفت سالہ میں جو اسلحۂ استعمال ہوئے تھے۔ ان کا علیحدہ مجموعہ ہے۔ پہاڑی لڑائی کا سین جدا ہے اور جنوبی افریقہ کی جدید لڑائی کا جدا۔ یہ نظارے تاریک کمروں میں بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں کہ دیکھنے والا اندھیرے میں ہوتا ہے اور سپاہیوں کی تصویروں اور اسلحہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے گرد جنگل پہاڑ اور لڑائی کے میدان کا نقشہ ہو بہو دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر میں جنگ روس و جاپان بھی موجود ہو قلعہ بندی کے دستور کی ترقی کے مختلف مدارج۔ بیماروں اور زخمیوں کے اُٹھانے اور لیجانے کی تدابیر۔ جنگ میں عارضی پل بنانے اور توڑنے کے نمونے۔ بحری لڑائی کی خصوصیات۔ سب کا ایک خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ان سب کے بعد صلح کا محل آتا ہے۔ وہاں یورپ کے سب بڑے بڑے مدبروں کی تصویریں رکھی ہیں جو صلح عام کے حامی ہیں اور جو مجالس صلح میں شریک ہو چکے ہیں۔ ان تصویروں میں ایک ایرانی مدبر کی تصویر دیکھکر ہمیں خوشی ہوئی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا ارفع الدولہ مرزا رضا خاں دانش۔ پرنس صلح۔ اہل یورپ نے آجکل ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ ہمیں کسی ایشیائی کا مدبروں کی صف اول میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہوا۔

اس کمرے میں جس پر صلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مختلف زبانوں میں صلح کے

متعلق کتابیں اور رسالے اور اخبارات رکھے تھے جن میں سے اکثر مفت تقسیم ہونے کے لئے تھے اور ہر شخص مجاز تھا کہ اُن میں سے چند چن لے۔ ہم نے چند پرچے وہاں سے لئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ٹرکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں کے بعض نہایت جوش دلانے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جن میں ترکوں کو یورپ سے نکالنے اور ان کے خلاف اہل یورپ کو اُکسانے کے مضمون مندرج تھے وہ بھی اُنہیں کاغذات صلح میں رکھے تھے۔ کیا مجلس صلح ایسی ہی تدابیر صلح پھیلانے کی کر رہی ہے اور اُن کے قول و فعل میں ایسی ہی مطابقت چاہیئے؟ حقیقت یہ ہے کہ صلح عام کی تحریک سے مدبرین یورپ کا مقصود اصلی فقط اسیقدر ہے کہ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں صلح رہے اور وہ سب مل کر باقی دنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قایم رکھیں لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں۔ جبتک دول یورپ اور اُن کے مدبروں کے دماغ سے اپنے املاک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب کی حقارت کا خیال نہ نکل جائے۔ کیونکہ یہی دو خیال سب فساد کی بنا اور جنگ و جدال کی جڑ ہیں۔ اس صلح و جنگ کے عجائب خانے میں آلات حرب اور نمائش جنگ کو اسباب صلح سے جو نسبت ہے۔ غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوق جنگ و شوق صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں اور اپنے ہاں ہر قوم روز زیادہ زیادہ روپیہ سامان جنگ پر صرف کر رہی ہے اور یورپ کی ذہانت اور اُس کے علوم و فنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آرہی ہے کہ وقت جنگ زیادہ سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کئے جاسکتے ہیں اور زمین سے گولے مارنے کی بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن و آتش کی بوچھاڑ ہوسکتی ہے۔

برفانی باغ۔ اس عجائب خانۂ صنعت سے نکل کر ہم ایک عجائب خانۂ قدرت کی طرف گئے۔ جسے یہاں "گلیسیر گارڈن" یعنی تودہ ہائے برف کا باغ کہتے ہیں برف کے یہ تودے اُس زمانہ کی یادگار ہیں جب سارا سوئٹزرلینڈ برف کے نیچے

دبا ہوا تھا۔ یہ زمانہ تاریخی کتب سے بہت پہلے گذرا ہے۔ ماہران علم طبقات الارض نے اس کا پتہ چلایا ہے اور اب وہ یقینی طور پر ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ ایک وقت میں روئے زمین کا سارا شمالی حصہ ایک سطح برفانی تھا۔ کہیں اتفاق سے کوئی جگہ خالی تھی تو وہاں بھی حضرت انسان کا وجود نہ تھا۔ البتہ کچھ حیوانات تھے۔ مگر اب اُن حیوانات کی نسل بھی منقطع ہے۔ کہیں کہیں اُن کے پنجے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ساخت کیا تھی اور موجودہ جانوروں سے کسقدر نرالی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس برفانی عہد سے قبل ایک زمانہ ایسا تھا کہ ساری زمین پر پانی ہی پانی تھا۔ مگر اس وقت اُس زمانہ سے بحث نہیں۔ بلکہ صرف عہد برف سے کام ہے جس کی یہ حیرت انگیز نشانی لوسرن میں موجود ہے برف کے پگھلنے سے جو سیلاب پہاڑوں کے اندر رواں ہوا اس میں کئی بڑے بڑے تودے برف کے جو پگھلنے سے بچ رہے بہتے ہوئے آئے اور اپنے زور میں پتھروں کو تراشتے ہوئے آخر خود ایک چکر میں آ پھنسے۔ یعنی ایسی جگہ پہنچے جہاں وہ چاروں طرف مضبوط چٹانوں سے گھر گئے۔ اب نہ روئے ماندن نہ راہ رفتن" جائیں تو کہاں جائیں۔ پانی ہے کہ اوپر سے برابر آرہا ہے اور انہیں حرکت دیئے جاتا ہے۔ مگر یہ قلعہ بند ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آرام سے بیٹھے تھے۔ اپنی جگہ چھوڑ کر اس مصیبت میں آن پھنسے کہ رات دن ایک مقام پر چکّی کی طرح گھوم رہے ہیں۔ خود بھی گھستے ہیں پتھروں کو بھی گھساتے ہیں۔

یہ خدمت صدیوں سے ان کے سپرد ہے نہ کبھی رخصت نہ تعطیل اتنی خیریت تھی کہ چشم مردم سے اُن کی یہ سزا پوشیدہ تھی۔ مگر آجکل انسان کو یہ جرأت ہوئی ہے ہر جگہ کارخانۂ قدرت سے پردۂ راز اُٹھانا چاہتا ہے چنانچہ بیچارے معتوب تودہ ہائے برف کی پردہ دری بغیر بھی نہ رہا۔ ۱۸۷۲ء تک یہ قطعہ زمین جہاں اب یہ عجیب برفانی باغ ہے۔ ایک چراگاہ تھا۔ اور اس کی ہری ہری گھاس کے نیچے یہ برفانی کارخانہ جاری تھا۔ مگر کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک جگہ زمین میں سوراخ

ہوگیا اور وہاں سے اس برفانی چکّی کی آواز آئی۔ کھودنے پر یہ عجوبہ نظر آیا۔ اور پھر ایک چکّی کے دریافت ہونے سے اسی قرب میں کئی اور چکیاں نکل آئیں اور اس حصہ کو تماشائیوں کو محو حیرت کرنے کے لئے آراستہ کردیا گیا۔ اس کھدائی میں اس عہد کے جانور اور درخت ملے جو پتھر کی طرح سخت بن چکے تھے۔ اب لوگ جوق جوق ان عجائبات کو دیکھنے آتے ہیں۔ تواریخ وجغرافیہ دونو علوم کے شائقوں کی دلچسپی کا سامان یہاں موجود ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے قدیم باشندوں کی جھونپڑیوں اُن کے ہتھیاروں اور اوزاروں کے نمونے بھی اسی احاطے میں ایک جگہ دکھائے گئے ہیں۔ اور عام تماشائیوں کی دلچسپی کے لئے ایک نہایت خوش وضع بھول بھلیاں بنائی گئی ہے۔ جو غربوں کے مشہور قصر الحمرا کی بھول بھلیاں کی نقل ہے۔ بھول بھلیاں سے نکلتے ہی باغ کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جہاں چٹان کاٹ کر ایک بہت بڑا شیر بنایا گیا ہے۔ جس پر شہر لوسرن کو ناز ہے اور جو فی الواقع سنگتراشی کا ایک عمدہ نمونہ ہے

باغ سے لوٹتے ہوئے **ہوف کرک** جو کیتھولک مذہب کا بڑا گرجا ہے۔ رستے میں پڑتا تھا ہم نے اسے بھی ایک نظر دیکھا۔ بلندی پر واقع ہے۔ اور بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دروازہ تک پہنچتے ہیں۔ عام طور پر عیسائی گرجاؤں میں ایک مخروطی مینار ہوتا ہے۔ اس گرجا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دو مخروطی مینار بنائے گئے ہیں جنہیں جڑواں مینار کہتے ہیں۔ گرجا کے اندر لکڑی کا کام بہت خوبصورت بنا ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی کی ساخت کا نمونہ ہے۔ اُس زمانہ میں اہل سوئٹزرلینڈ کو لکڑی کے کام کا بہت شوق تھا۔ گو اب بھی وہ اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں اس گرجا کی شہرت صرف اس کی بڑائی اور وسعت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے ارغنوں کی وجہ سے ہے۔ یورپ کے گرجاؤں کے ارغنوں بجائے خود عجائبات ہیں دھات کی لمبی لمبی بانسری نما نلیاں متوازی رکھ کر ایسی بلند اور سُریلی آواز پیدا کی جاتی ہے کہ گرجا گونج اُٹھتا ہے۔ فن موسیقی کے ماہر ایک ایک ارغنوں کی ساخت میں اپنا کمال صرف کردیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ارغنوں جو ہوف کرک کی زینت ہے گانسلر نامی

ایک اُستاد نے ۱۶۵۱ء میں بنایا تھا۔ اس کے بعد ہاس نامی ایک اور اُستاد نے ۱۸۶۲ء میں اس کی تجدید کی۔ ۱۸۹۸ء میں پھر اس کی مرمت ہوئی ہے۔ چار ہزار نوسو پچاس بنسریاں اس ارغنوں میں ہیں۔ لوگ دُور دُور سے اس کا راگ سننے آتے ہیں۔ شام کے وقت ہر روز یہ ارغنوں بجتا ہے اور اس وقت کا داخلہ ایک فرانک (دس آنے) ہوتا ہے۔

جھیل کی سیر۔ جھیل لوسرن جس سے شہر لوسرن نے نام پایا ہے۔ اس ملک کی نہایت خوبصورت جھیلوں میں سے ہے۔ اور بعض اعتبارات سے سب سے بڑھ کر گنی جاتی ہے۔ اس کا طول ۲۳ میل ہے اور عرض آدھے میل سے لے کر تین میل تک ہے۔ چاروں طرف بلند پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں اور درمیان میں یہ جھیل عجیب بہار دیتی ہے جس سیاح کو فرصت ہو۔ وہ یہاں مہینوں رہے اور روز کشتی میں بیٹھکر سیر کو جائے۔ جہاں کہیں خشکی پر اُتر کر کوہستان کی سیر کریگا۔ اُس کے لئے کوئی نہ کوئی قابل دید منظر موجود ہوگا۔ ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دی گئی تھی اس لئے ہم گرجا سے واپس آتے ہی کشتی پر بیٹھکر جھیل کی سیر کو نکلے مطلع صاف تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گرد وپیش کے مناظر مزا دے رہے تھے۔ ابھی لطف سے سیری نہیں ہوئی تھی کہ وہ سٹیشن آگیا جہاں سے ہلکی پہاڑی ریل پر بیٹھکر کوہ الپس کی مشہور چوٹی "رگی کلم" کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم وہیں اُتر پڑے اور ریل پر سوار ہو لئے۔

رگی کلم کا منظر۔ ریل سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ ایسی ایسی ڈھلوان چوٹیوں پر چڑھتی ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اب گری اب گری۔ مگر فن انجنیری کی خوبی دیکھئے۔ گاڑیوں اور آہنی سڑک دونو کی ساخت میں وہاں یہ خصوصیت پیدا کی ہے۔ کہ گاڑیاں لڑھکنے نہ پائیں۔ اور مزید احتیاط کے لئے اوپر جاتے وقت انجن نیچے سے اوپر کو دھکیلے لئے جاتا ہے۔ اور رگی پر جا کر ٹھیرتا ہے جو اُس سطح سے جہاں سے ریل ملی تھی۔ چار ہزار تین سو ساٹھ فٹ اور سطح سمندر سے پانچہزار نوسو پانچ

فٹ بلند ہے۔ صبح و شام سینکڑوں تماشائی اس چوٹی پر موجود رہتے ہیں۔ اور جو تماشا وہاں اُنہیں نظر آتا ہے۔ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ تصور کیجئے کہ چودہ جھیلیں چھوٹی بڑی اور اُن کے گرد کے اشجار و انہار کو دو ہاتھوں شہر و قریہ سب وہاں سے نظر آتے ہیں اور یہ سین اہلِ نظر کے دل چھینے لیتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس سے ذرا اونچی چوٹیاں اسی کے قریب برف سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی عورتیں جو مناظرِ قدرت کی شناسا آنکھ رکھتی ہیں اس جنتِ نگاہ کی داد دیتے دیتے دیوانہ ہوئی جاتی ہیں "آہا ہا۔ اِدھر دیکھنا کیسا دلفریب سین ہے۔ اہوہو۔ اُدھر دیکھو کتنا پیارا نظارہ ہے" ایشیائیوں میں اگر کوئی حسنِ قدرت کے مزا لینے کی قابلیت رکھتا ہو یا پیدا بھی کر لے تو یہ جوش کہاں سے لائیگا اور حسنِ قدرت کے روبرو یہ زبان آوری کہاں سے پائے گا۔ یہاں تو حسن چپ لگا دیتا ہے۔ اور اس کا رعب مُہرِ لب بن جاتا ہے۔ ہم چُپ چاپ اس عجیب نظارے کو دیکھا کئے۔ اور اردگرد کے شور سے بے پروا۔ شام تک اسی محویت میں پڑے رہتے اگر ریل کی سیٹی یہ یاد نہ دلا دیتی کہ شام سے پہلے واپس جا کر جھیل کے کنارے چراغان کی سیر بھی دیکھنے کے لایق ہے۔ اُٹھے مگر بادلِ ناخواستہ۔ اسی چوٹی پر ایک بڑا عالیشان ہوٹل مسافروں اور تماشائیوں کے آرام اور تفریح کے لئے بنا ہوا ہے۔ وہ سامنے تھا اس کی صورت اور اس کے خوشنما صحن میں میزوں کے اردگرد لوگوں کے جھگمٹے دیکھ کر ہمیں بھی یاد آیا کہ چاء کا وقت ہے وہاں چاء پی۔ تازہ دم ہوئے اور ریل پر پہنچے۔ واپسی پر ریل تیز تر چلی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں جھیل کے کنارے تھے۔ وہاں کشتی فوراً مل گئی اور ہم اپنے قیام گاہ کے قریب آ پہونچے۔ تھوڑی دیر تک کنارِ آب سیر کرتے رہے۔ آخر تھک کر ہوٹل میں آئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔ کیونکہ سفر اٹلی درپیش تھا+

۲۰۔ جولائی ۱۹۰۶ء لوسرن میں ایک دن اور ایک رات ٹھہر کر ہم اٹلی کی طرف روانہ ہوئے۔ دن کے دس بجے جو گاڑی چلی اُس نے پانچ بجے کے قریب ہمیں

اٹلی کے مشہور شہر میلان میں پہنچا دیا۔ دن بھر سوئٹزرلینڈ کے نظر فریب سین آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف سفر کیا ہوتا۔ مگر ہر پھول کے ساتھ کانٹا لگا ہوا ہے۔ راستے میں اسقدر ٹنل پڑے کہ دھوئیں کے مارے بار بار دم گھٹتا تھا اور روح کو جو تازگی اور فرحت سبز پوش پہاڑوں اُن کی سفید چوٹیوں اور اُن کے آبشاروں کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ وہ سب اس دھوئیں سے مبدل بہ پریشانی ہو جاتی تھی کبھی صنعت اور اہلِ صنعت پر غصہ آتا تھا۔ کہ انہوں نے اپنے طمع کی خاطر قدرت کے پاکیزہ اور شاندار مناظر کے ساتھ کسقدر زیادتی کی ہے۔ اور ان کی عمدگی اور پہاڑوں کے سکون میں کتنا خلل ڈالا ہے۔ مگر ساتھ ہی انصاف یہ کہتا تھا۔ کہ اُن کی کوہکنی کی داد دی جائے۔ اور چونکہ ان کا منشا اُن کارناموں سے محض ذاتی فائدہ یا ذاتی نمونہ تھا۔ بلکہ اُن کی یہ کوشش تھی کہ ہزاروں بندگانِ خدا جو ویسے ان نظاروں سے بالکل محروم رہتے۔ اُنہیں اس سے بہرہ ور کیا جائے اس لئے اُن کی محنتیں شکریہ کی مستحق ہیں نہ کہ شکایت کی۔ یہ ٹنل ہی ہیں جن کی بدولت گویا زمین کی طنابیں کھینچکر عصرِ جدید کے ان فرہادوں نے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کو ملا دیا ہے۔ سب سے بڑا ٹنل جو ہمارے راستے میں پڑا وہ سنٹ گاتھرڈ کا مشہور ٹنل تھا۔ جس کے اندر ریل آدھ گھنٹے کے قریب رہی۔ اس سے دوسری طرف ملک کا نقشہ بدلنے لگا۔ بلند پہاڑوں کی جگہ میدان نظر آنے لگے۔ مگر یہ میدان سرسبزی میں رشکِ گلزار تھے۔ تھوڑی دیر بعد آسمان کے صاف نیلگوں رنگ اور آفتاب کی تیز چمک نے خبر دی کہ اٹلی کی تاریخی سرزمین شروع ہوئی۔ اسٹیشنوں کے ناموں نے اس خبر کی تصدیق کی۔ لوگانو۔ کیاسو۔ کامو۔ جس نام کو پڑھو وہ او پر ختم ہوتا ہے۔ یہ احساس کہ ہم اٹلی میں ہیں ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا انگلستان اور فرانس کے مصنفین نے نظم و نثر میں اٹلی کی اسقدر تعریف کی ہے اور اتنے فسانے اور ڈرامے یہاں کے قصوں پر مبنی ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا تاریخِ یورپ پر بالخصوص اور تاریخِ عالم پر بالعموم اتنا اثر پڑا ہے۔ کہ اس میں داخل ہوتے ہی خود بخود

طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی سرزمین بُت پرست روما کی شاہنشہی دیکھ چکی ہے۔ یہی پاپائے اعظم کے خودمختارانہ تسلط سے پامال ہو چکی ہے۔ اور یہی کچھ عرصہ ہوا اپنے میزینی اور گیریبالڈی کے ذریعہ دنیا کو سبق آموز آزادی رہی ہے۔ یہی وہ ملک ہے جس نے فن تصویر و بُت تراشی کو کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور جہاں اب بھی ان فنون کے طالب مشقِ فن بہم پہنچانے اور اساتذہ کی صحبت سے مستفید ہونے آتے ہیں اور یہی ملک ہے جہاں کے باشندوں کو حسنِ صورت میں یورپ کے شمالی ممالک سے امتیاز حاصل ہے۔ صباحت اور ملاحت میں یہاں آشتی ہے۔ اور بہت سی صورتیں ایسی نظر آتی ہیں جن میں حسینانِ انگلستان کا سرخ و سپید رنگ۔ خوبانِ فرانس کی نزاکت اور ماہ رویانِ مشرق کی سی سیاہ آنکھیں۔ سب خوبیاں یکجا پائی جاتی ہیں جوں جوں ریل میلان کے قریب ہوتی جاتی تھی۔ شوق بڑھتا جاتا تھا۔ یہ غنیمت ہوا کہ ریل شام سے پہلے پہنچ گئی سٹیشن پر لکھا دیکھا۔ میلانو اور جی خوش ہو گیا۔ اترتے ہی ایک ہوٹل میں اسباب رکھ بازار کا رُخ کیا اور شام کے وقت کو یوں استعمال کر لیا سفر کی کوفت نے شب گردی کی قابلیت باقی نہ چھوڑی تھی۔ اس لئے رات کو بیہوش لیٹ گئے اور دوسرے دن صبح سے باقاعدہ سیر شروع ہوئی۔ باوجود اجنبیت کچھ مانوس سی معلوم ہوتی تھی۔

۲۱۔ جولائی اٹلی میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ کہیں خوبصورت صاف اور کھلی سڑکوں اور ایسی سربفلک عمارات کو چھوڑ کر جو ہندوستان کے بڑے شہروں کلکتہ اور بمبئی میں بھی کمیاب ہیں۔ وہاں کئی باتیں ہمارے ملک سے ملتی جلتی ہیں سب سے پہلے تو آب و ہوا ہے۔ گرمی کے موسم میں گرمی خاصی پڑتی ہے۔ اور شام کے وقت لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر بیٹھتے ہیں کہ ذرا ہوا لگے مکانوں میں بھی ایک مشرقی رنگ موجود ہے۔ مثلاً بہت سے مکان امرا کے ایسے نظر آئے جن کے بہت بڑے بڑے دروازے ہیں۔ اور ان دروازوں کی اندر

صحن اور صحن میں چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں۔ بجائے اس کے باغچہ مکان کے گرد ہو جیسے انگریزوں میں رواج ہے۔ امرا اور شرفا کی عورتیں سوائے اس کے کہ گاڑیوں میں شام کے وقت سیر کو نکلیں بازار میں بہت کم نکلتی ہیں۔ دوپہر کے وقت کاروبار کچھ سست رہتا ہے اور لوگ دوپہر کی نیند کے مزے سے آشنا ہیں۔ مقام غور ہے کہ آب و ہوا کسی ملک اور اہل ملک کی عادات پر کتنا زبردست اثر رکھتی ہے۔ بازاروں اور کوچوں میں شور بھی اٹلی میں انگلستان اور فرانس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ جو ٹوکریوں میں رکھکر یا چھکڑوں میں لاد کر ترکاری یا پھل پھول بیچتے ہیں وہ تو اس طرح آواز لگاتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے دوکاندار۔ یہانتک کہ میں نے میلان میں ایک صبح ایک فقیر کو بھی صدا دیتے سنا اور یورپ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایسی صدا میرے کان میں پڑی۔ اٹلی کا ٹھیک اندازہ کرنے کے لئے روما کو دیکھنا ضرور ہے۔ مگر افسوس تنگیٔ وقت نے ہمیں میلان اور وینس صرف دو مشہور مقامات کی سیر پر قناعت کرنے پر مجبور کیا۔ اور انہیں بھی جی بھر کر دیکھنے کا موقعہ نہ دیا۔

میلان میں ایک بڑی نمایش انہی دنوں میں ہو رہی تھی۔ اور یہ نمائش انٹرنیشنل یعنی بین الاقوام تھی۔ ہمارا بہت سا وقت اس نمائش میں صرف ہوا۔ لیکن اسکے تفصیلی حالات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف اسی صورت میں دلچسپ ہوتے کہ انہی دنوں میں لکھے جاتے جب نمایش جاری تھی۔ اُس زمین کا یہ رقبہ جس میں یہ نمائش ہو رہی تھی۔ دس لاکھ مربع گز یعنی پیرس کی مشہور نمائش کے قریب قریب تھا۔ اور اس سارے رقبہ کا تیسرا حصہ نمائش کی عمارات سے گھرا ہوا تھا۔ آسٹریا۔ بلجیم۔ بلگیریا۔ کنیڈا۔ چین۔ کیوبا۔ ڈنمارک۔ فرانس۔ جرمنی۔ جاپان۔ انگلستان۔ ہالینڈ۔ پرتگال۔ سوئٹزرلینڈ۔ ٹرکی اور ایران یہ سب ممالک اس نمائش میں شریک تھے۔ اور سب نے اپنی اپنی مصنوعات کے نمونے ان میں بھیجے تھے۔ ایک ہال میں بحری سامان کی نمائش تھی۔ ایک میں ریل کے انجنوں اور گاڑیوں کے عمدہ ترین نمونے رکھے گئے

تھے۔ اور اس صیغے میں جرمنی۔ آسٹریا اور ہنگری میدان مقابلہ میں اُترے تھے۔ زراعت کے صیغے میں کینیڈا کا حصہ نہایت خوبصورت اور شاندار تھا۔ بازار مصر کا نمونہ لوگوں کی تفریح کے لئے وہاں رکھا گیا تھا۔ جس میں قاہرہ کی زندگی کے خراب پہلو دکھانے کی کوشش غالب نظر آتی تھی۔ اہل یورپ مشرقی زندگی کی تصویر جب کبھی کھینچتے اور اور اپنے ابنائے وطن کو دکھاتے ہیں تو اس کے تاریک پہلو کو ہی لیتے ہیں۔ ٹرکی اور ایران کے قالین عمدگی میں لاجواب تھے۔ مگر افسوس کہ اور کوئی مصنوعات وہاں سے قابل نمائش نہ نکلیں۔ ہماری آنکھیں نمائش میں ہندوستان کو ڈھونڈھتی تھیں۔ کہ کہیں اس کا بھی شمار بین الاقوام ہے یا نہیں۔ آخر بہت تلاش سے خیمۂ انگلستان کے سایۂ عاطفت میں کچھ جے پور کے ظروف اور کچھ بنارس کے دوپٹے ایک الماری میں سجے ہوئے نظر آئے۔ معلوم نہیں کس وجہ سے خود انگلستان کا حصہ اس نمائش میں بہت خفیف تھا۔ پس اس حصے میں سے ہندوستان کے حصہ میں کیا آتا۔ ہاں جو موجود ہو گیا یہی غنیمت۔ لیکن ہمارے ملک کو آیندہ ایسے مواقع سے فائدہ اُٹھانے اور ہندوستان کی مصنوعات کو دنیا کی منڈیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کی بہت سے صنعتیں مٹ گئیں اور مٹتی جاتی ہیں تس پر بھی ابھی یورپ و امریکا کے خوش مذاق اور انصاف پسند قدردانوں سے باجِ تعریف لینے کے لئے دستکاری کے کافی نمونے ہم جمع کر سکتے ہیں۔ اگر اطرافِ ہند سے بہترین مصنوعات جمع کرنے کی ہم کوشش کریں۔

۲۲۔ جولائی نمائش میں کام کی چیزوں کے علاوہ جن سے تجارت اور صنعت کی ترقی کا حال دکھلانا مقصود ہوتا ہے ہمیشہ بہت سے کھیل تماشے لوگوں کو کھینچنے کے لئے لگے ہوتے ہیں۔ چونکہ ان دنوں میں نمائش کے سبب لوگوں کا مجمع زیادہ نمائش میں ہی ہوتا اور شہر کی سڑکیں سوائے شام کے وقت کے سونی پڑی رہتی تھیں۔ اس لئے ہم نے ۲۲۔ جولائی کا بھی بیشتر حصہ نمائش میں ہی کاٹا اور وہاں کے دلچسپ تماشوں میں سے بعض تماشے دیکھے۔

۲۳ - جولائی | شہر میلان میں سب سے بڑھ کر قابلِ دید چیز وہاں کا گرجا ہے جس کا شمار دُنیا کی مشہور ترین عمارتوں میں ہے - باہر سے تو ہم نے اُسے آتے ہی دیکھ لیا تھا آج اندر سے بھی دیکھا اور اس کی چھت پر بھی چڑھے - یہ شہر کے مرکز میں واقع ہے ہمارا ہوٹل بھی اس کے قریب تھا - اور جب ہم باہر نکلتے تھے تو راستہ کا پتہ لگانے میں ہمیں اس سے بہت مدد ملتی تھی اور کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی - ورنہ زبان نہ جاننے کے سبب بہت مشکل ہوتی - اس گرجا کو یہاں ڈوموُ کہتے ہیں - اور کہا جاتا ہے کہ شاید اس سے زیادہ خوبصورت گرجا دنیا میں نہیں ہے ۱۳۸۶ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی عجیب بات ہے کہ گرجا بننے سے پہلے بھی یہ زمین معبد کے طور پر ہی استعمال ہوتی تھی - اور یہاں منروا دیبی کی پرستش کے لئے ایک مندر تھا بنا ہونے کے وقت سے آج تک کم و بیش زیر تعمیر ہی رہا ہے - نپولین اوّل نے اس کے جلد مکمل کرنے میں بہت کوشش کی مگر جلد ہی کا کام ویسا نفیس نہ بنا جیسا باقی حصّے کا کام ہے جو پہلے سے تیار ہو چکا تھا - اندر باہر اس کی آرائش میں جو محنت صرف ہوئی ہے وہ دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے - ہزاروں چھوٹے چھوٹے میناروں اور کنگروں کے ساتھ ساتھ چھ ہزار قدِ آدم بُت استادہ ہیں جو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں - جس کونے سے اس عمارت کو دیکھو ایک نیا حسن نظر آتا ہے اور ہر در و دیوار سنگ مرمر کے عمدہ کام کا ایک نمونہ ہے - اسکی عمارت جیسی باہر سے خوشنما ہے - اُسی قدر اندر سے شاندار ہے - ہم نے جس دن اسے دیکھا - اس دن ایک بہت بڑا مجمع کتھولک مردوں اور عورتوں کا اس میں مصروف عبادت تھا - مگر عمارت کا فقط ایک گوشہ اُن سے آباد تھا اور باقی جگہ خالی تھی -

ڈوموُ کے علاوہ اور بھی شاندار عمارتیں اس شہر میں ہیں مگر ایسی اہمیت نہیں رکھتیں شہر کے ہر چوک میں یا اور نمایاں مواقع پر بہت سے رونیں اور سنگین بت استادہ ہیں - جو اہلِ ملک کے مذاق بت تراشی اور قدردانیٔ بزرگانِ ملک و ملت پر دلالت کرتے ہیں - یہاں لوگوں کی عادات اور چلنے پھرنے میں وہ چستی اور چالاکی جو شمالی

یورپ کی اقوام کا خاصہ ہے نظر نہیں آتی۔ اور آرام طلبی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ فرانس کی طرح یہاں کے لوگ بھی باتیں کرتے وقت اپنے شانے ہلاتے ہیں۔ کھانے کا طریق گو سارے یورپ میں ایک ہے۔ پھر بھی اہل اٹلی کے کئی کھانے ہمارے ہاں کے کھانوں سے ملتے ہیں۔ خصوصاً سویّوں کا یہاں بہت رواج ہی۔ شوربے میں ڈال کر کھائی جاتی ہیں۔ حلوے یا کھیر کی صورت میں میٹھی پکائی جاتی ہیں۔ تلی ہوئی بھی کہیں کہیں بکتی ہیں۔ گانے کا شوق ان لوگوں کو بہت ہے اور ابتک یورپ کے بہت سے مشہور گویّے اٹلی سے آتے ہیں۔ لباس میں بھی رنگینی یہاں زیادہ پائی جاتی ہے۔ فرانسیسی کی طرح اہل اطالیہ کی زبان بھی شیریں ہے اور ایک خاص نرمی اور ملائمت اُن کے لہجے میں ہے جو انہی کا حصہ ہے۔ اطالی زبان فرانسیسی زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی بھی ہے۔ ایک جگہ اس مشابہت سے خوب کام نکلا۔ فرانسیسی میں "توت" "کل" کو کہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اطالی میں بھی اس کے لئے یہی لفظ ہے صرف تلفظ میں ذرا فرق ہے۔ ایک رسٹوران میں ہم بیٹھے تھے۔ وہاں کے ملازم سے کھانا مانگا مگر گونگوں کی طرح فہرست لیکر ایک چیز پر اُنگلی دھرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لاؤ وہ جاتا تھا اور آکر کہتا تھا ترمیناتو[۱] یعنی ختم ہوگیا۔ اب نہیں جانتے تھے کہ اسے کیونکر کہیں کہ کچھ باقی بھی ہے یا نہیں جب دو تین دفعہ اُس نے یہی جواب دیا میں تنگ آگیا اور میں نے فرانسیسی لفظ کو اطالی صورت دی اور خفا ہو کر اُس سے کہا "توتو ترمیناتو؟" یعنی سب کچھ ختم ہوگیا؟ اتفاق سے یہ فقرہ درست تھا وہ چوکنا ہوا اور اُس نے وہ چیزیں گن دیں جو اُس کے پاس موجود تھیں اور اُن سے انتخاب کر کے ہم نے اپنا پیٹ بھر لیا۔

[۱] یہی لفظ ہے جو انگریزی میں بھی مستعمل ہے "ٹرمی نیٹ" بمعنی ختم ہوگیا۔

نیا سال

۳۱ دسمبر کو میں ایک لمبے سفر سے واپس آ کر رخت سفر کھول رہا تھا کہ رات کے بارہ بجے۔ پرانے سال کی عمر کا خاتمہ ہوا اور نئے سال نے اسی ساعت جنم لیا۔ ایک کے گذرنے کا غم دوسرے کے آنے کی خوشی۔ دو متضاد چیزیں یکجا ہوئیں۔ گرجا کا گھڑیال پیہم بجنے لگا۔ گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے۔ جانے والے ترا خدا حافظ آنے والے تجھ کو مرحبا۔ ٹنی سن نے کیا خوب لکھا ہے " بجاؤ گھڑیال کہ پرانا سال گیا بجاؤ گھڑیال کہ نیا سال آیا " گھڑیال ہے کہ دو نو خدمتیں بے تکلف انجام دے رہا ہے۔ اس کے لئے نغمۂ خوشی اور نالۂ غم دونو برابر ہیں۔ آواز ایک ہے۔ سننے والے اپنے اپنے خیال کے مطابق معنے لیتے ہیں۔ جو گذرنے والے پر افسوس کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گھڑیال کی آواز کیسی رقت پیدا کرنے والی ہے۔ انہیں گھڑیال کی آواز وداع کے رنج و جدائی کے صدمے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہو لیکن وہی آواز بعض دوسرے کانوں میں ہنگامۂ شادی ہے۔ نئے سال کی آمد آمد ہے۔ اور مبارکباد کا غل۔ میں نہ سال کہن کے ماتمیوں میں تھا۔ نہ سال نو کے خوشامدیوں میں۔ فلسفیانہ طریق سے ایک طرف اُن خیالات کو ٹال رہا تھا جو ایسے وقت ہجوم کر کے آتے ہیں۔ سال گذشتہ میں کیا کرنا باقی رہ گیا۔ اور دوسری طرف اُن بیشمار امیدوں اور آرزوں کو روک رہا تھا۔ جو سال نو کے ساتھ لگی ہوئی آتی ہیں اور خانۂ دل میں سما جاتی ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد زمانے کی ناموافقت سے اکثر زمانے کی مایوسی سے بدل جاتی ہیں۔ اس اندرونی کشمکش میں طبیعت نے ایک شعر سے مدد چاہی اور میں اس پر غور کر رہا تھا اور اپنے خیال میں محو تھا ۔

آسان گذراں کار جہاں گذراں را　　زیرا کہ خردمند جہاں خواند جہاں را

کہ اتنے میں ایک دوست نے کہا " سال نو خوش باد" اس آواز کا کان میں پڑنا تھا۔ کہ

سالِ کہن کی یاد تازہ ہوئی۔ اُس مرحوم کا پہلا دن مجھے غربت میں آیا تھا۔ یہ برس وطن میں شروع ہوتا ہے۔ مگر غربت بھی اپنے مزے رکھتی تھی۔ نئے دن اور نئی ملاقاتیں۔ چار دن کی جان پہچان ہی کیا ہوتی۔ اس پر کئی مسافر نواز ملاقاتیوں کو ازراہ انسانیت یہ خیال آگیا کہ جہاں اپنے خاص دوستوں اور عزیزوں کو نئے سال کی مبارکباد بھیجیں۔ وہیں کسی غریب الوطن کو بھی ایک رقعہ بھیجدیں۔ صبح اُٹھتے ہی رنگین اور خوبصورت رقعے آنے لگے۔ ایک سے ایک کا رنگ نرالا۔ کوئی پُرتکلف کوئی سادہ۔ کوئی سنہری کوئی روپہری کسی پر فیتہ کسی پر ریشمی ڈورا۔ اندر باہر دلاویز عبارتیں۔ نظم ونثر میں لکھی ہوئی۔ جس لفافے کو کھولو سالِ نو میں کامیاب اور خوش رہنے کی دعائیں آرہی ہیں۔ پردیس میں معمولی روشناسوں کی یہ مروت گرویدہ کئے لیتی تھی۔ صرف یہی نہیں مشغلہ کتنا اچھا تھا۔ کہ ہر رقعہ پر غور کرنے سے بھیجنے والے کی طبیعت کا حال کھلتا تھا۔ خط کے بیل بوٹے فرستندہ کے مذاق کا پتہ دیتے تھے جو فقرات یا اشعار خطوں پر چھپے ہوئے تھے وہ بھیجنے والوں کی جذبات قلبی کا اظہار کرتے تھے۔ یورپ میں جہاں نئے سال کی خوشی منانیکا یہ طریق مروج ہے وہاں یہ بھی رسم ہے کہ ہر شخص جو اُن رقعوں کو جو اُسے بڑے دنوں میں اور نوروز کے دن آئے ہیں اپنے ہاں نشست کے کمرہ میں سجاتا ہے۔ خود اُن کی بہار دیکھتا اور آنے جانے والوں کو دکھاتا ہے۔ میں نے بھی اپنا مختصر سا سرمایہ اپنے کمرہ میں رکھدیا تھا۔ ایک ایک پیام مروت یا محبت کو دیکھتا تھا اور پھڑکتا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ ہر ایک کا جواب بھی ویسا ہی دیا جائے۔ دُکانوں میں سینکڑوں نمونوں کے رقعے چھپے چھپائے رکھے ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ہر شخص کے مناسب حال رقعے چُنتا تھا اور بھیجتا تھا۔

یہ دلچسپ رسم صرف ایک پُرانے رواج کی پابندی ہی نہیں۔ بلکہ کچھ فائدے بھی رکھتی ہے۔ ملاقاتیوں کی فہرست کی سالانہ جانچ پڑتال اور تجدید۔ دوستوں میں رابطۂ اتحاد کی مضبوطی۔ اور کم از کم ایک آدہ دن کے لئے معمولی دھندوں کے افکار سے

سبکدوشی۔ ساتھ ہی تجارت کا ایک صیغہ انہی رقعوں کی اشاعت اور تقسیم سے نکل آیا ہے۔ اب کے سال ہندوستان میں وہ سب مشغلہ خواب وخیال ہو گیا۔ یہاں ابھی یہ چرچے ہی نہیں۔ نوروز کے مشرقی طریق کے جشن عہد مغلیہ کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ انگریزی طریق میں مغائرت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اور بغیر مناسب تغیرات کے سوائے انگریزی داں طبقے کے اور کسی جماعت میں یہ طریق مقبول نہیں ہو سکتا۔ چند سالوں سے بعض لوگ عید کے موقعوں پر اس قسم کے پیغام ایک دوسرے کو بذریعہ ڈاک بھیجنے لگے ہیں۔ مگر ابھی یہ شوق محدود ہے۔ اس کے علاوہ یہ سب دولت کے چونچلے ہیں اور ہندوستان جیسے غریب ملک میں جہاں ضروریات زندگی کا پورا ہونا مشکل ہے۔ ابھی تفریحات کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے۔

نئے سال کے آتے ہی ایک اور بات۔ پرانے سال کی یاد آئی یعنی نئے سال کے تحفے۔ دنیا بھر میں یہ دستور ہے کہ دوست دوستوں کو کوئی چیز بطور تحفہ پیشکش کرتے ہیں۔ اس کے لئے مختلف تقریبیں ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی تیوہاروں پر کھانے پینے کی چیزیں اور بعض دفعہ نقد وجنس عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں بھیجنے کا رواج ہے۔ ایسا ہی شادی بیاہ کے موقعہ پر ہوتا ہے۔ یورپ میں اس قسم کے مذہبی تیوہار جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں نسبتاً کم ہیں۔ اور جو کچھ ہیں ان کے منانے کی طرز جدا ہے۔ البتہ بڑے دنوں اور نوروز کی تقریب پر یا شادی بیاہ کے وقت تحفے بٹتے ہیں۔ مگر اس رسم کو جس خوبی سے وہ ادا کرتے ہیں۔ وہ انکا حصہ ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ جو باتیں ہمارے ہاں خاص خاص گھروں میں اور ممتاز لوگوں کے ہاں نظر آتی ہیں وہ وہاں رواج عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں اور ہر کہ ومہ اپنے مقدور کے موافق اسی وضع کا پابند ہے۔ یعنی وہاں تحفہ دیتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ موقعہ کیا ہے اور جسے تحفہ دیا جاتا ہے۔ وہ کون ہے۔ چنانچہ نئے سال کے تحفوں میں بہت چھوٹے بچوں کو طرح طرح کے

کھلونے دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً لڑکیوں کو گڑیاں اور لڑکوں کو چھوٹے چھوٹے گیند بلّے۔ اُن سے ذرا بڑے بچوں کو جنھوں نے لکھنا پڑھنا شروع کر دیا ہے کہانیوں کی کتابیں دی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں خاص اہتمام سے تیار کی جاتی ہیں جلد خوبصورت۔ تصویریں دلچسپ۔ عبارت آسان۔ زبان سادہ۔ اور قلم جلی۔ تاکہ بچوں کو پڑھنے میں کچھ دقت نہ ہو۔ نوروز کے موقعہ پر لاکھوں ایسی کتابیں ایک دن میں بِک جاتی ہیں۔ اور اُن سے بچوں کو خوشی بھی ہوتی ہے اور تعلیم کا شوق بھی بڑھتا ہے۔ جو لڑکے لڑکیاں سن بلوغ کے قریب ہیں اور سکول میں پڑھتے ہیں۔ اُن کے لئے اور کتابیں ہیں۔ اپنے علم ادب کی مشہور ترین کتابوں کے عمدہ عمدہ اڈیشن خاص اس مطلب کے لئے نکالتے جاتے ہیں۔ چھپائی نفیس۔ جلد پر تکلف۔ کناروں پر سنہری رنگ۔ جلد کے اوپر سنہری حروف۔ کتاب کو سجا کر دُلہن بنا دیا جاتا ہے۔ اور ایسی جلدوں کو تحفے کے لایق جلدیں کہتے ہیں اور عموماً یہی کام اُن سے لیا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں ایک علم دوست آدمی کے لئے اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی عمدہ کتاب خوبصورت جلد سے آراستہ ہو کر اُس کی پاس پہنچ جائے۔ اور اُس کے مجموعۂ کتب کی زینت کا باعث ہو۔

بڑے بوڑھے اظہار دوستی اور یگانگت کے لئے مختلف قسم کے تحفے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں۔ مگر ہر شخص یہ احتیاط کرتا ہے۔ کہ تحفہ کار آمد ہو اور جس کے پاس بھیجنا ہو اُس کے مذاق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر تحفے کے لئے کتابیں انتخاب کرے تو سوچتا ہے کہ کون سی کتاب کس دوست کو پسند ہو گی۔ بعض لوگ اس انتخاب میں اپنے مذاق کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر مذہب کی طرف اُن کا میلان زیادہ ہو تو مذہبی کتاب انتخاب کرتے ہیں۔ تاکہ دوست کو تحفہ بھی چلا جائے اور وہ یہ کوشش بھی کر لیں۔ کہ اُن کا دوست اُن کا ہم مذاق ہو جائے۔ مگر اس کوشش میں رسم تحفہ کی خوبی آدھی رہ جاتی ہے۔ بہر حال اس ذریعے سے یورپ کے سب ملکوں میں بالعموم اور انگلستان میں بالخصوص ملکی لٹریچر کی اشاعت میں نہایت معقول

ترقی ہوتی ہے۔ اور نہ صرف پُرانے مصنفوں کی یاد تازہ رہتی ہے بلکہ اہل مطابع اور تاجرانِ کتب کی تجارت کو ایسا فروغ ہوتا ہے۔ کہ باید و شاید۔

ہمارے ابنائے وطن کا تعلیم یافتہ اور معقول پسند طبقہ اس بات کو تو ضرور تسلیم کرے گا کہ نئے سال کی خوشی منانے کا کوئی نہ کوئی طریق تعلیم یافتہ جماعت کے لئے بھی ہونا چاہیئے۔ پُرانی وضع کے لوگ ہر موسم کے تغیر پر کسی نہ کسی مذہبی تقریب کے بہانے کچھ نہ کچھ سامان خوشی کرتے ہیں۔ ابتک بسنت کے میلے ہندوستان کے باشندوں کے لئے نوروز ہیں۔ مگر تعلیم یافتہ جماعت عموماً ان میلوں کی تفریحات میں نہ شریک ہوتی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ انہیں اپنے لئے کوئی نئے رستے نکالنے چاہئیں۔ یہ نہ ہو کہ ادھر سے بھی رہ جائیں اور اُدھر سے بھی۔ تعلیم کا یہ نتیجہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ تعلیم یافتہ لوگ مردہ دل ہو جائیں یا کثرت تردوات سے ناجائز یا نامناسب طریقے غم و فکر دور کرنے کے ڈھونڈھنے لگیں۔ اور صرف پُرانے طریقوں کو بُرا کہنے یا اُن کو نظر حقارت سے دیکھنے پر اکتفا کر کے یاس و نومیدی کو اپنا شعار بنالیں۔ جب اُن سے کہا جائے کہ فلاں رسم قابلِ ترمیم و اصلاح ہے تو بجائے اصلاح یا ترمیم کی کوشش کرنے کے نہایت مایوس ہو کر یہ کہدیں۔ "ہمارے ملک میں اصلاح ہو چکی۔ اس کا تو کسی دن اسیطرح سختیاں جھیلتے جھیلتے خاتمہ ہو جائیگا" بلکہ اُن کا یہ فرض ہے۔ کہ اُمید کا پیام اپنے ہموطنوں تک پہنچائیں اپنی زندہ دلی قائم رکھنے کے لئے جائز خوشیوں اور مفید تفریحوں کے سامان اپنے گرد و پیش جمع کریں اور اپنی مثال سے دکھلائیں کہ اُنہوں نے تعلیم سے کیا کچھ فائدہ اُٹھایا تاکہ اور لوگوں کو اُن کی تقلید کی ترغیب ہو۔ آجکل ہندوستان میں ملکی علم ادب کی ترقی کی صدا ہر طرف بلند ہے۔ اور ہر شخص کہتا ہے کہ یہ ترقی خدا اسے جلد دکھلائے۔ مگر اس ترقی کے لئے جسقدر محنت اور کوشش درکار ہے۔ اس کے لئے بہت کم لوگ مستعد ہیں۔ ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہمارے ہاں جو لٹریچر موجود ہے پہلے اسے ایک باقاعدہ اور منضبط حالت میں لے آئیں۔ اگر کسی دوسرے ملک

کا آدمی ہم سے ہمارے بہترین مصنفوں کی کتابیں دیکھنے کے لئے مانگے تو ہم بجز چند ردّی کاغذ پر غلط اور بدنما چھپی ہوئی سستی اور بے جلد کتابوں کے اوراق پریشاں کے سوا کیا دکھا سکتے ہیں۔ اور وہ جب اپنے ہاں کی کتابوں کی ظاہری حالت کا مقابلہ کرے گا تو اُس کے دل پر کیا اثر ہمارے لٹریچر کے متعلق پڑیگا اور ہمیں کسقدر شرم آئیگی۔ ان کتابوں کو صاف اور خوبصورت وضع میں چھپوانا اور ان کو اپنے کتب خانوں میں جمع کرنا اور اُن کو غور سے پڑہنا ایک ذریعہ ہے۔ نیا لٹریچر ملک میں پیدا کرنے اور بڑہانے کا۔ اگر ہم محض شوق علم سے اس کے لئے کچھ اہتمام نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم دلچسپی کے بہانے سے۔ دوستوں کے خوش کرنے کی غرض سے۔ یورپ کی ایک مفید رسم کی تقلید ہی سے روز نوروز کو ہی ملکی لٹریچر کی سرپرستی کی تقریب بنالیں۔ اور نئے سال کی خوشی تعلیم یافتہ جماعت میں علمی ذخیروں کی تقسیم سے منائی جایا کرے۔ اگر اس تحریک کا جو اسی دفعہ سال انگریزی سے شروع میں پیش کی گئی ہے یہ اثر ہو کہ آیندہ سال کے نوروز تک ہمارے ہاں کی مقبول کتابیں یا کم از کم اُن میں سے پندرہ بیس جلدیں صحت اور عمدگی کے ساتھ طبع ہو جائیں اور قدردانوں کے ہاتھوں میں موجود ہوں یا سال نو کی ڈاک کے ساتھ تقسیم ہوتی نظر آئیں تو یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ یہ سال جدید ہمارے لٹریچر کے لئے ایک عہدِ جدید کا آغاز ہو گا۔ اور اس مرتبہ سال نو کی پیدائش کے وقت جو آرزوئیں اُس کی جلو میں آئی تھیں سب کی سب مبدل بہ یاس نہ ہوں گی اکثر لوگ نئے سال کی مبارک صبح کو قبول دعا کا وقت سمجھکر دعا مانگتے ہیں۔ لٹریچر کے اس ادنیٰ خادم کی یہ دعا ہے کہ "ہمارے لٹریچر کی ترقی" ہمارے نئے سال کا بہترین تحفہ ثابت ہو۔

عبدالبہا

حضرت عبدالبہا جن کی تصویر ہمیں بہت تلاش سے ملی ہے اور آج شایع کی جاتی ہے۔ دنیا کے مشہور ترین آدمیوں میں ہیں۔ یہ تصویر اُن کی جوانی کی ہے اور ایک عرصہ ہوا لی گئی تھی۔ لیکن چونکہ غالباً اس کے بعد اور کوئی تصویر نہیں لی گئی۔ یہ بھی بہت مغتنم ہے۔ یوں تو ہر نئے مذہب اور اُس کی تاریخ کے بنانے والے کے حالات دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر ایک ایسا نیا مذہب جس کی بنیاد ہمارے بزرگوں کے دیکھتے دیکھتے پڑی ہو اور جس کی ساخت اب تک ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہو معاصرین کے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اُن مذاہب یا فرقوں میں جو گذشتہ صدی میں پیدا ہوئے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے وہ اہمیت حاصل ہے جو اس فرقے کو جس کے سرگروہ حضرت عبدالبہا ہیں۔ یہ وہی فرقہ ہے جو پہلے بابی کے نام سے اُبھرا اور جس نے سرزمین ایران میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کا بانی سید علی محمد المعروف بہ "باب" تھا اور اس عرف کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپکو ایک آنے والے ہادی کا "دروازہ" یعنے پیش خیمہ بتاتا تھا۔ اُس پر علمار ایران نے کفر کے فتوے دیئے اور وہ زندان میں بھیج دیا گیا اور آخر ۱۸۵۱ء میں اپنے مذہب کی اشاعت کے جرم میں مارا گیا۔ اُس کے غائبانہ مداحوں اور معتقدوں میں ایک نوجوان بہاءاللہ نامی تھا "باب" کی وفات کے بعد اس نے طہران میں اس نئے مذہب کی اشاعت شروع کردی۔ حکومت نے اسے بھی قید کیا اور کچھ عرصہ بعد جلاوطن کر کے بغداد کو روانہ کر دیا۔ جب بہاءاللہ کا اثر بغداد میں پھیلنے لگا تو علمار کے مشورے سے یہ انتظام کیا گیا کہ اسے مع اُس کے بڑے بڑے ہمراہیوں کے قسطنطنیہ بھیجدیا جائے۔ بغداد سے رخصت ہوتے وقت اپریل ۱۸۶۲ء میں بہاءاللہ نے پہلے پہل اپنے خاص معتقدین کو یہ بتایا کہ میں وہی شخص ہوں جس کی بابت "باب" نے پیشینگوئی کی تھی۔ اور جس کے ظہور کے تم لوگ منتظر تھے۔ اُس دن سے بہاءاللہ کا

اثر اور بھی ترقی کرنے لگا۔ اس لئے اس غریب الوطن جماعت کو قسطنطنیہ میں بھی چین لینا نہ ملا اور وہاں سے یہ لوگ ادرنہ کو روانہ کر دیئے گئے۔ جو آجتک اس فرقہ کا صدر مقام ہے۔

بہاء اللہ نے جس دن سے اپنے "موعود" ہونے کا اظہار کیا۔ فرقۂ بابیہ میں دو جماعتیں ہو گئیں۔ جن میں ایک اُس کی قائل تھی اور ایک منکر۔ لیکن بابیوں کا گروہ کثیر اُسی کا طرفدار رہا۔ اور اُس دن سے اُس گروہ نے بجائے بابی کے بہائی نام اختیار کیا۔ اب بھی عام طور پر لوگوں میں یہ فرقہ بابی کے نام سے مشہور ہے۔ مگر خود یہ لوگ بہائی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ بہاء اللہ نے ۱۸۹۲ء میں رحلت کی اور اپنے معتقدین کو وصیت کر گیا کہ اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا عباس آفندی جانشین ہو۔ اور اسے "مَن اَرَادَ اللہ" کا لقب دیا۔ یعنی جو اس منصب کے لئے خدا کے ارادے میں تھا؛ مگر عباس آفندی نے عقیدتمندی کے لحاظ سے "عبدالبہاء" یعنی "بہاء کا غلام" لقب اختیار کیا۔ آفندی ممدوح اسی لقب سے مشہور ہیں۔ گو عراق عرب میں عرب لوگ انہیں زیادہ تر عباس آفندی کے نام سے ہی جانتے ہیں۔

ہم فرقۂ بابیہ اور اس کی بڑی شاخ فرقۂ بہائیہ کے حالات کسیقدر بسط کیساتھ پھر کسی موقعہ پر لکھیں گے۔ اس وقت فقط حضرت عبدالبہاء کے احوال و اقوال سے بحث مقصود ہے۔ کیونکہ وہ ابتک زندہ ہیں اور لوگ دور دور سے اُن کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اور اُن کی تعلیم و تلقین سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ امریکا میں ان کا اثر روز بروز ترقی پر ہے۔ امریکا والے دہریت سے پریشان ہو کر روحانیت میں پناہ گزین ہونا چاہتے ہیں۔ اور اکثر متلاشی مذہب ہیں۔ اس لئے ہر نئے مذہب کا ایک خاص اثر اُن پر پڑتا ہے۔ اور اسی لئے حضرت عبدالبہاء کے مریدوں کو جو اشاعت مذہب کی غرض سے امریکا گئے ہوئے ہیں بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ اور کئی شہروں میں جماعتیں قایم ہو گئی ہیں۔ اور اُن جماعتوں کی طرف سے روپیہ جمع ہو کر انہیں بغرض اشاعتِ مذہب پہنچتا ہے۔ نہایت خوبصورت اور نقش و نگار سے

آراستہ عرضیاں طلب فیض روحانی کے لئے بھیجی جاتی ہیں اور خود وہاں چھوٹے چھوٹے رسالوں اور عام فہم لکچروں کے ذریعے سے بہائی فرقہ کی تعریف شایع کی جاتی ہو تاکہ لوگوں کو اس کے اختیار کرنے کی ترغیب ہو۔ بمبئی کے مقبول رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں کسی امریکائی لیڈی کا ایک مضمون حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ جو اُس نے اکہ کی زیارت اور حضرت عبد البہا کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد لکھا ہے۔ جس سے نہ صرف اُس کی عقیدت ٹپکتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا سے جو زائر مشرق کے اس نسبتاً غیر محدود مقام تک فیضِ روحانی کے شوق میں آتے ہیں۔ وہ مایوس نہیں جاتے بلکہ ایک گہرا نقش دل پر لیکر جاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ اس عالم ناپائدار کی چکی میں آجکل غرب سنگ بالا اور شرق سنگ زیریں بنا ہوا ہے۔ تاہم روحانیت میں زمانۂ گذشتہ کی طرح آج بھی ایشیا ہی کا رتبہ بڑھا ہوا ہے۔ اور مشرق یدِ اعلیٰ یعنی اوپر کا ہاتھ اور مغرب یدِ اسفل یعنی نیچے کا ہاتھ ہے۔ ایک ہاتھ بخشنے والا ہے اور دوسرا لینے والا۔

فرقۂ بہائیہ کے مختلف بیانات نظر سے گذرے ہیں اور یہ قرار دینا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے کس کو قابلِ اعتبار مانا جائے۔ لیکن کسی اور بیان کو پیش کرنے سے پہلے تقاضائے انصاف یہ ہے کہ خود اس کے معتقدین کا بیان اُنکی زبان سے سُن لیا جائے۔ اور وہ یہ ہے:۔

"عباس آفندی بمقام طہران۔ ۲۳۔ مئی ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ عجیب بات ہے کہ ان کا روزِ ولادت وہی ہے جس دن "باب" نے اپنی تلقین شروع کی۔ آپ اوائل عمر سے اپنے باپ کی خدمت میں حاضر اور ان کی ساعی میں شریک رہے۔ سب سے پہلے اپنے باپ کے موعود ہونے پر ایمان لائے۔ اور آپ کی تربیت ایسے ڈھنگ پر ہوئی کہ آپ اس تحریک کا مرکز بن سکیں۔ سارے بہائی آپ کو اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ اور آپ کی بدولت مریدین کو اس روحانی زندگی سے، واقفیت ہوتی ہے جو بہاء اللہ کے حصے میں آئی تھی۔ اسی مرکز سے اب نورِ حق اطراف

عالم میں پھیل رہا ہے۔

"بہاء اللہ کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان کو روحانی طور پر جسم واحد بنا دے اور اس کی تلقین ایسی ہے کہ ہر ملک و ملت کا انسان اس پر کاربند ہو سکتا ہے۔ اسی سبب سے مغربی دنیا کے عیسائی۔ یہودی اور دہریے۔ مشرقی دنیا کے مسلمانوں زرتشتیوں برہمنوں اور بودھ مت والوں سے رشتۂ الفت و ہم خیالی۔ ہم مذہبی جوڑ رہے ہیں"

حضرت عبد البہاء کی جو نصائح مریدوں کی ہدایت کے واسطے شایع ہوئی ہیں۔ وہ ان بیشمار نصائح سے جو سب پُرانے متقدس مذہبوں کے پیشواؤں نے کی ہیں کچھ جداگانہ نہیں۔ کیونکہ دنیا بھر میں بنیادی اصول ایک ہی ہیں۔ اور انہی پر عمل کرنے سے سوسائٹی کی کَل چلتی ہے۔ یہاں اُن کی نصائح میں سے بعض بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں:-

کسی کو رنج مت پہنچاؤ۔ ایک دوسرے سے بہت محبت کرو۔ سب سے مہربانی کا برتاؤ کرو۔ اور اُن سے پاک طینتی محبت رکھو۔ اگر ہمیں مخالفت برداشت کرنی یا سہنی پڑے تو اسے برداشت کرنا چاہئیے۔ اور اس حال میں بھی حلیم اور مہربان رہنا چاہئیے۔ اگر مصیبت بہت سخت ہو تو ہمیں خوش ہونا چاہئیے۔ کیونکہ خاصانِ خدا کے لئے یہ انعام ہے"

"دوسروں کے عیوب کے متعلق سکوت اختیار کرنا لازم ہے۔ ان کے حق میں دعا کرنی چاہئیے۔ مہربانی اور رفق سے اُن کی مدد کرنا چاہئیے تاکہ اُن کے عیوب کی اصلاح ہو جائے۔ بجائے برائی پر نظر ڈالنے کے ہمیشہ اچھائی پر نظر رکھو۔ اگر کسی میں دس اچھی خصلتیں ہیں اور ایک بری تو دس کو دیکھنا چاہئیے اور ایک کو نظر انداز کر دینا چاہئیے۔ کسی کو لفظ ناملائم نہیں کہنا چاہئیے۔ گو وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ جو لوگ اوروں کے عیوب ہمارے سامنے بیان کریں۔ اُنہیں اس سے روکنا چاہئیے"

"تلقین حق میں مصروف رہنا چاہیئے کیونکہ ہمارے آقا نے فرمایا ہے کہ ہم اس حکم کی تعمیل کے بغیر روحانی قوت اور ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ جس کسی کو یہ قوت حاصل ہے۔ اسے رضوانِ الٰہی حاصل ہے۔ ہمارے آقا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اس دور میں جو بیج بویا جائیگا خدا خود اپنی رحمت کے بادلوں سے اسکی آبیاری فرمائے گا اور وہ بارآور ہوگا"

"ہمیں ایک دوسرے کا خادم بننا چاہیئے اور یہ جاننا چاہیئے کہ ہم ہر ایک سے کم ہیں۔ ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ ہم ایک روح ہیں جو بہت سے جسموں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ جسقدر ہم ایک دوسرے سے محبّت کریں گے۔ اسیقدر خدا کے قریب تر ہونگے۔ ہماری محبّت ہماری اطاعت اور ہماری توحید محض اقرار زبانی نہ ہوں بلکہ واقعی ہوں"

"ہمیں لازم ہے کہ ہم ہر مریض کے لئے باعثِ شفا ہر مغموم کے لئے باعثِ تسلّی۔ ہر پیاسے کے لئے خوشگوار پانی۔ ہر بھوکے کے لئے خوانِ آسمانی۔ ہر متلاشی کے لئے رہبر۔ ہر کھیتی کے لیے مینہ۔ ہر اُفق کے لئے ستارے ہر چراغ کے لئے روشنی ہوں۔ اور ہر شخص کے لئے جو آسمانی بادشاہی کی آرزو میں بیتاب ہو اس بادشاہی کی خوشخبری دینے والے ہوں۔ ہمارے آقا کا قول ہے۔ کہ ان علامتوں سے خدا کے ہر ایک نیک بندہ کی پہچان کرنا"

عازمانِ انگلستان کیلئے

جو صاحبان تعلیمی اغراض سے انگلستان جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لئے لندن کی "نیشنل انڈین ایسوسی ایشن" نے ایک چھوٹی سی کتاب انگریزی میں تیار کر رکھی ہے۔ جس سے انہیں تعلیم کے مختلف صیغوں میں داخل ہونے کی شرائط فیس کی شرح اور دیگر ضروری اخراجات کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں۔

اسی کتاب میں اختصار کے ساتھ سب ضروری امور کا ذکر کردیا گیا ہے۔ اور اس اعتبار سے عازمان انگلستان کے واسطے بہت مفید ہے۔ اس کی خوبی کی یہی دلیل کافی ہے کہ دس مرتبہ چھپکر فروخت ہو چکی ہے۔ اور اب گیارہویں دفعہ شایع ہوئی ہے۔ اس مرتبہ صنعتی تعلیم کے کئی مرکزوں کی مختصر کیفیت بھی اس میں درج ہوئی ہے۔ کیونکہ اب روز بروز اس طرف لوگوں کا میلان ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ میلان ملکی ترقی کی ایک عمدہ فال ہے۔ کتاب کا نام "ہینڈ بک آف انفارمیشن فور انڈین سٹوڈنس" ہے اور لاہور میں بی ایل سوری کی دوکان پر۔ بمبئی میں ڈی بی تاراپور والا اینڈ سنز سے اور کلکتہ میں تھاکر سپنک اینڈ کمپنی سے بہ قیمت ایکروپیہ مل سکتی ہے۔

اس کتاب کے آخر میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے "طلبہ کو نصیحت" اس کے بعض فقرات کا ترجمہ یہاں نقل کردینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں کئی ایسے سوالات کے جواب لکھے ہیں جو لوگ وقتاً فوقتاً ہم سے کرتے رہتے ہیں۔

لنڈن میں اگر کوئی طالب علم کفایت سے رہے تو ایک سو بیس پونڈ (یعنی اٹھارہ سو روپے) سالانہ سے لے کر ایک سو پچاس پونڈ (یعنی ساڑھے بائیس سو روپے) سالانہ تک میں اس کا گزارہ ہو سکتا ہے۔ اس رقم میں تعلیم کی فیس وغیرہ کا اخراجات شامل نہیں بلکہ فقط بود و باش کے ضروری اخراجات ہیں۔ البتہ اگر کوئی طالب اڈنبرا میں یا برطانیہ کے بعض دیگر شہروں میں جہاں لنڈن کی طرح گرانی نہیں۔ رہے تو اس سے کم میں بھی کام چل سکتا ہے۔"

"بعض لوگوں میں جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص گوشت سے پرہیز کرتا ہو اور صرف نباتاتی غذا کھاتا ہو تو اُسے انگلستان میں گوشت مجبوراً کھانا پڑیگا۔ اور اس کے بغیر اس کی صحت میں خلل آجائیگا یا آب و ہوا سرد ہونے کے باعث تندرست رہنے کے لئے شراب کا استعمال اس کے لئے ضروری ہوگا۔ یہ ہرگز درست نہیں۔"

"طلبہ کو چاہیئے کہ لندن آتے وقت بحری سفر کے اخراجات کے سوا بیس تیس پونڈ نقد (یعنی تین چار سو روپے) اپنے ساتھ لائیں تاکہ اُن ضرورتوں کے لئے جو وہاں پہنچتے ہی پیش آتی ہیں۔ وہ رقم کام آئے۔ انہیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے زمانۂ قیام میں کوئی تیس پونڈ کے قریب ہر وقت اپنے نام سے بنک میں امانت رکھیں اور یہ رقم معمولی رقوم خرچ کے علاوہ ہو۔ تاکہ اگر کبھی اُنہیں خرچ پہنچنے میں دیر ہو جائے۔ یا اچانک وطن جانے کی ضرورت پیش آجائے یا بیماری ہو تو پردیس میں پریشان نہ ہوں۔

"طالب علم کو چاہیئے کہ ہندوستان سے محض انٹرنس کے درجہ سے کوئی اونچا امتحان پاس کر کے انگلستان کا قصد کرے تاکہ آتے ہی جس فن کی تحصیل کے لئے آیا ہے اُس کے مطالعہ میں مشغول ہو جائے اور اس کا وقت ضایع نہ ہو"

"جو طلبہ اکسفورڈ یا کیمبرج یونیورسٹی میں جانا چاہیں۔ اُنہیں بتاکید یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ہندوستان سے ڈگری لے کر یا ایسا امتحان پاس کر کے چلیں جو اکسفورڈ اور کیمبرج میں بمنزلہ "رسپانشن" یا "لٹل گو" کے جو وہاں کے امتحانات داخلہ میں سمجھا جائے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اسقدر لاطینی سیکھ کر چلیں کہ آتے ہی ان امتحانات میں شریک ہو سکیں۔ کیونکہ لاطینی نہ جاننے کے سبب یا ہندوستان سے بڑے امتحان پاس کرنے سے بغیر چلنے کے باعث اکثر بہت سا قیمتی وقت اور روپیہ ان ابتدائی امتحانات کی تیاری میں ضایع ہوتا ہے"

"طالب علم کو مناسب ہے کہ وہ لندن پہنچنے سے پہلے اپنے کسی دوست یا واقف کو اپنے پہنچنے کی تاریخ سے بذریعہ خط یا تار مطلع کر دے۔ اگر کسی کا کوئی دوست یا واقف لندن میں نہ ہو تو "نیشنل انڈین ایسوسی ایشن" کے آنریری سکریٹری کو اطلاع کر دے۔ اس جماعت کی طرف سے کچھ نہ کچھ بندوبست اس کے لئے ہو جائے گا۔ اور کوئی شخص اسے ریل پر لینے کے لئے بھیجا جائیگا"

واضح رہے کہ یہ وہی ایسوسی ایشن ہے جس کا کام نیکدل مس مینگ مرحومہ نے

مدت العمر انجام دیا اور اب یہ اہم فرض ایک اور نیک دل انگریزی خاتون یعنے مس ای۔ جے۔ بیک نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور وہ اس جماعت کی آنریری سکرٹری ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں سے اُنہیں بہ سبب اپنے مرحوم بھائی مسٹر تھیوڈور بیک پرنسپل علی گڑھ کالج کے خاص دلچسپی ہے اور وہ نہایت سرگرمی سے اپنا فرض ادا کر رہی ہیں۔ اُن کا پتہ یہ ہے :-

نمبر ۲۳۳۔ البیون روڈ۔ سٹوک نیونگٹن۔ لندن نارتھ۔ انگلینڈ۔

فرقۂ بہائیہ کے داعی

فرقۂ بہائیہ اور اُس کے موجودہ پیشوا عبد البہا عبّاس آفندی کے حال کو جن لوگوں نے دلچسپی سے پڑھا ہوگا۔ اُنہیں یقیناً اس امر کے دریافت کرنیکا شوق ہوگا کہ اس فرقہ کے معتقد اپنے عقائد کی اشاعت کے لئے کن وسائل سے کام لے رہے ہیں۔ اور جو شہرت اس مذہب نے مختلف ممالک میں پیدا کی ہے وہ اسے کیونکر میسّر ہوئی ہے۔ دنیا میں کبھی کسی کو اپنے مقصد میں عام اس سے کہ وہ مقصد دینی ہو یا دنیوی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوتی جبتک وہ اپنے آپ کو اُس مقصد کی خاطر قربان نہ کردے۔ جب سے اس مذہب کا آغاز ہوا ہے اُس وقت سے بہت سے لوگوں نے اپنی جانیں اس پر نثار کیں۔ بہت سے فدائیوں نے اس کی خاطر قید کی مصیبتیں جھیلیں اور بہت سے جلاوطن ہوئے۔ مگر ان سب تکالیف کو اُس دُھن کے مقابلے میں جو انہیں دل سے لگ رہی تھی اُنھوں نے کچھ نہ سمجھا۔ اب گو وہ خطرات جو اوائل میں اُنہیں درپیش تھے کم ہو گئے اور اس جماعت کے سرگروہ اپنی جائے پناہ عکہ میں نسبتاً امن و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تاہم اُس کام سے جو انھوں نے اپنے ذمہ لیا ہے غافل نہیں ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے کی تسخیر کی فکر میں ہیں۔ اور اپنے داعی اور مشنری جابجا روانہ کرتے رہتے ہیں۔ امریکا میں جو عقیدتمند اس فرقہ کو ملے ہیں وہ بھی ان ہی مشنریوں

کی بدولت ملے ہیں۔ اور اب اُن امریکن بہائیوں میں سے بعض دعوتِ مذہب کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی سال بھر ہوا چار آدمی اس فرقہ کی طرف سے ہندوستان میں تلقین کرنے آئے تھے۔ اُن میں دو امریکہ کے رہنو والے تھے جو کئی مہینے ہندوستان میں دورہ کر کے اور چھوٹے چھوٹے رسالے اپنے مذہب کے متعلق تقسیم کر کے اور جستجوئے مذہب والے لوگوں سے گفتگو کر کے واپس چلے گئے ہیں۔ دو صاحب ایرانی تھے جو ابتک ہندوستان میں مقیم ہیں۔ اُن میں ایک حکیم مرزا محمود شیرازی لاہور میں مقیم ہیں۔ اُن سے ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ ایک حلیم متین اور ذی علم شخص ہیں۔ اُنہوں نے اپنا طریق اشاعت اپنے مزاج کے موافق رکھا ہوا ہے۔ نہ کہیں وعظ کہتے ہیں۔ نہ کسی سے مناظرہ کرتے ہیں۔ مگر چپکے چپکے برابر اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ جہاں کسی تعلیم یافتہ یا ذہین آدمی سے ملاقات ہو گئی یا اُسے کچھ کتابیں یا رسالے اپنے عقائد کے متعلق دکھا دیئے۔ پنجاب کے دارالحکومت میں اُن کا قیام گویا پنجاب پر ایک خاص یورش ہے۔ وہاں سب اضلاع پنجاب کے چیدہ آدمی آتے رہتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی تقریب سے اُن میں سے اکثر سے ملنے کی مواقع پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس مُلک میں رہتے رہتے کچھ اُردو بھی اُنہوں نے سیکھ لی ہے اور انگریزی جاننے کو یہاں کے لئے اور دیگر ممالک کے لئے مفید سمجھکر اسکی تحصیل کا بھی قصد کر رہے ہیں۔ ان کے دوسرے ایرانی رفیق حاجی مرزا محمد تقی ہیں جو اس وقت کلکتہ میں مقیم ہیں اور کلکتہ جیسے مرکز علم و دانش کے لئے موزوں بھی ایسا زبردست داعی ہی تھا۔ حاجی مرزا محمد تقی کی ایک پُرانی تصویر ہمیں ملی ہے۔ جس میں وہ زنجیر میں جکڑے ہوئے۔ دو ایرانی سپاہیوں کے پہرے میں نظر آتے ہیں۔ اسکی کیفیت یہ ہے کہ بہائی طریق اختیار کرنے سے پہلے حاجی صاحب ایران کے طبقۂ علماء میں تھے۔ جب اُنہوں نے علانیہ طور پر اپنے عقیدے کے بدلنے کا اقرار کیا تو حکومت کی طرف سے گرفتار کئے گئے اور محبوس رہے۔ کوئی تیس سال ہوئے جب انہیں یہ اُفتاد پڑی تھی۔ مگر زندان ان کے جوش میں کچھ کمی پیدا نہیں کر سکا۔ بلکہ وہ پہلے سے

بھی زیادہ سرگرم اور مستعد ہو کر نکلے۔ اور اُس وقت سے برابر اپنے مرشد اور اپنے مذہب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ ایثار۔ یہ بیغرضانہ جاں نثاری۔ یہ مذہب کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر غیر ملکوں میں رہنا اور مذہب کی اشاعت کرنا۔ ایسے افعال ہیں کہ بے اختیار اُن لوگوں کی ہمت۔ محنت اور عقیدت کی داد دینی پڑتی ہے۔ جو اپنی زندگی اس طرح وقف کر دیتے ہیں۔ خواہ اُن کے مذہب سے ہمیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

فرقۂ بہائیہ کے داعیوں نے امریکا اور ہندوستان میں جو لٹریچر تقسیم کیا ہے۔ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مذہب سے زیادہ صلح پسند مذہب کوئی مشکل سے ہوگا۔ مگر ایران میں اس مذہب کی تاریخ اس کے خلاف شہادت دیتی ہے۔ ہرچند کہ اس مذہب کے ساتھ سختیاں کی گئیں۔ لیکن اس کے بعض معتقدین نے دوسروں پر حملہ کرنے میں یا اُن کی دل آزاری میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن ممالک میں جہاں نئے خیالات اور نئے علوم کی روشنی پھیل رہی ہے۔ ان داعیوں کا بالکل صلح جو طریق اختیار کرنا اور اس امر کا اعلان کرنا کہ اُن کے مذہب کا مقصد اصلی اتحادِ مذاہب ہو اور ہر عقیدے کے آدمی اس برادری میں جو بہاء اللہ نے قایم کی ہے۔ شامل ہو سکتے ہیں۔ محض اُن کی زمانہ شناسی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مہذب دنیا کا میلان روز بروز اس خیال کی طرف ہوتا جاتا ہے۔ کہ اختلافِ مذاہب اگر مٹ نہ سکیں تو فرو ضرور کئے جائیں۔ ہر شخص دوسرے مذہب کی تعظیم کرے اور اس بات کو تسلیم کرے کہ سب ادیان جوہر حق سے آراستہ ہیں۔ فرق صرف طریق کا ہے کہ اُس منزلِ مقصود تک جو سب ادیان میں مشترکہ ہے کیونکر پہنچیں۔ اور اس لئے جس کسی کو جس راستے پر چلنے میں آسانی ہو وہ اُس راستے کو اختیار کر لے اور دوسرا اُس سے تعرض نہ کرے۔ اور عجب نہیں کہ ایک دن ایسا آئے جب یہ خیال سب اقوام متمدن میں عام ہو جائے۔ وہ دن جب کبھی آئیگا بنی نوع انسان کے لئے خوشی کا موجب ہوگا اس خیال کی اشاعت میں اگر بہائی استقلال کے ساتھ مصروف رہے تو وہ بھی

مہذب دنیا کے شکریہ کے بحصّہ رسدی مستحق ہوں گے۔ کیونکہ اُن کے سوا اور اُن سے پہلے اس خیال کے پھیلانے والے دنیا میں ہو چکے ہیں۔ اور اب تک موجود ہیں مشرقی دنیا میں اہل تصوف و ویدانت سے بڑھ کر داد کے مستحق ہونگے۔ کیونکہ انہوں نے اس خیال کی اشاعت ایسے زمانے میں کی جب لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے آجکل جو لوگ اس فکر میں ہیں اُنہیں مادّہ تیار ملتا ہے۔ اور اُن کے پیشرووں کی کوشش انسانی طبیعتوں کو اس رائے کے قبول کرنے پر پہلے سے آمادہ کر چکی ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو قومیں اس سعی میں مصروف ہیں اُن میں تھیوصوفی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ بہائی جتنا حصّہ اپنے مذہب کا اس وقت اہل ہند کے روبرو پیش کر رہے ہیں۔ اُس میں اور تھیوصوفی میں کچھ بڑا فرق نہیں۔ لیکن جو ایسے مسائل اُن کے ہاں موجود ہیں جن کے سننے سے اُنہیں ڈر ہے کہ عام مسلمان برہم ہونگے اُن کو درمیان نہیں لاتے +

چند گھنٹے لورپول میں

سفرِ ٹرکی میں بیشمار اصحاب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ لینے انگلستان میں شیخ عبداللہ کوئیلیم (شیخ الاسلام جزائر برطانیہ) سے بھی ملاقات کی نہیں اور اگر کی تو میری رائے اُن کی نسبت کیا قایم ہوئی۔ اور یہی سوال جب سے میں ہندوستان میں آیا ہوں دُہرایا گیا ہے۔ اس لئے اس مختصر سی ملاقات کا حال جو مجھے شیخ ممدوح سے ایک مرتبہ نصیب ہوئی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میں نے لندن سے بعض معاملات کے متعلق شیخ عبداللہ کوئیلیم سے خط و کتابت کی تھی اور اُنہوں نے مجھے دعوت دی تھی کہ لورپول جا کر اُن کے ٹہیروں۔ لیکن اس کا موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ میں اتفاق سے مانچسٹر میں مقیم تھا۔ کہ ایک دن فرصت کا نکل آیا اور یہ معلوم ہوا کہ لورپول وہاں سے قریب ہے اور گاڑیاں بکثرت جاتی ہیں۔ اس موقعہ کو غنیمت جانکر میں روانہ لورپول ہوا۔ اثنا تامل ضرور تھا

کہ بے اطلاع جاتا ہوں۔ خدا جانے شیخ ممدوح وہاں ہوں یا نہ ہوں۔ یا انہیں فرصت ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن چونکہ دوسرے موقعہ کا ملنا غیر متیقن تھا۔ جانا ہی مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے شیخ لورپول میں ہی تھے اور اپنے دفتر میں مل گئے اور جس اخلاق سے باوجود کم فرصتی کے اور باوجود کسی ملاقاتی کی آمد کے لئے تیار نہ ہونے کے وہ پیش آئے اُس کا ایک گہرا نقش میرے دل پر ہے۔

مجھے اُن کے کاروباری دفتر کا پتہ معلوم تھا۔ جہاں وہ سالسٹر کا کام کرتے ہیں شہر کے کامیاب سالسٹروں میں اُن کا شمار ہے۔ اور اُن کے وقت کا بیشتر حصہ اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ کام سے فرصت کا وقت نکلتا ہے۔ اُسے آپ اپنے مذہب کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ میں جب گیا تو وہ ابھی دفتر میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اُن کے آدمی نے مجھے وہاں بٹھایا۔ اور کہا کہ ابھی آتے ہیں تھوڑی دیر میں وہ تشریف لے آئے اور میرا کارڈ دیکھتے ہی مجھے بُلایا۔ نہایت خوش ہوکر ملے۔ مگر شکایت کی کہ میں نے اُنہیں پہلے سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرا آنا اتفاقی ہو گیا۔ اور میں بہت تھوڑے سے وقت کے لئے آیا ہوں۔ اسلئے اسے اُس آنے میں محسوب نہ کیا جاوے جس کا وعدہ تھا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ کہ میں اس وقت بھی خیر مقدم کہتا ہوں اور پھر آپ آئینگے تو پھر کہونگا اور میری خوشی یہ ہے کہ آپ کم از کم دو تین دن کے لئے آئیں اور کوئی دن تعطیل کا درمیان ہو تو میں آپ کو جزیرہ میں لے چلوں۔ جہاں میرا گھر ہے۔ اور جہاں اب لورپول کا مختصر سا اسلامی مدرسہ و یتیم خانہ بھی بغرض سہولت منتقل کر دیا ہے میں خود اکثر وہاں چلا جاتا ہوں۔ اور وہ جگہ بہ اعتبار صحت بخش آب و ہوا کے اس کارخانوں سے بھرے ہوئے اور دھوئیں سے گھرے ہوئے لورپول پر قابلِ ترجیح ہے میں نے بھی جزیرہ کو دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اور کہا "میں کوشش کرونگا کہ پھر آؤں اور وہاں کی سیر کروں۔ لیکن آج یہاں دو غرض سے آیا تھا۔ ایک آپ کی ملاقات سو حاصل ہوگئی۔ دوسرے آپ کے اسلامی عشق کے کام کا جو حصہ یہاں نظر آسکتا ہو اُسے

یا آپ کی معیت میں دیکھنا یا آپ کے کسی معتبر کے ساتھ جا کر دیکھنا۔ اُنہوں نے کہا جو کچھ یہاں موجود ہے۔ وہ میں خود ساتھ چل کر آپ کو دکھلاؤں گا۔ اب یہاں صرف ہمارے مسلم انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ہے جو لکچروں کے لئے ہال کا کام دیتا ہے اور جمعہ کے دن مسجد کا کام۔ اگر آپ جمعہ کے دن تشریف لائیں تو پچاس ساٹھ نمازیوں کی جماعت آپ کو ملیگی۔ ہمارے رجسٹر پر نومسلموں کی تعداد کئی سو تک پہنچ چکی ہے۔ مگر اُن میں سے بعض فوت ہو گئے۔ بعض کہیں دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ اب بھی کوئی تین سو کے قریب انگریز لورپول اور اُس کے گرد و نواح میں ایسے ہیں جو ہماری جماعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے جو جمعہ کے دن شہر میں ہوتے ہیں وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر لکچر کا دن اتوار کا ہے اُس دن زیادہ مجمع ہوتا ہے۔ اور لکچروں کے سُننے کے لئے عیسائی بھی آتے ہیں اور بارہا یہ ہوا ہے کہ وہ لکچروں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ مائل بہ اسلام ہوئے ہیں۔"

میں نے سوال کیا:۔ "یہ تو فرمائیے کہ آپ جب اشاعت اسلام کرتے ہیں۔ یا فرائض اسلام ادا کرتے ہیں تو اب بھی لوگ آپ پر اینٹ پتھر پھینکتے ہیں یا نہیں جیسے پہلے دنوں میں کیا کرتے تھے۔"

جواب:۔ "اب وہ نوبت نہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا تعصب ابھی دور نہیں ہوا۔ گو ابتدا میں جو ہجوم ہوتا تھا اور جو اذیتیں ہمیں دیجاتی تھیں اُن سے نسبتاً امن ہے۔ میں بھی حتی الوسع احتیاط سے کام لیتا ہوں اور اُنہیں خواہ مخواہ چھیڑ کا موقعہ نہیں دیتا (اپنی انگریزی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے) دیکھئے میں عموماً یہی ٹوپی اوڑھتا ہوں۔ اور فوراً ان لاکھوں انگریزوں میں مل جاتا ہوں جو شہر کے کوچہ و بازار میں پھرتے ہیں اور جن سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ کون جانتا ہے کہ یہ کوئیلم جا رہا ہے اور بہت سے کوئیلم جاننے والے ایسے بھی ہوں گے جو یہ نہیں جانتے کہ یہ عبداللہ کوئیلم ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے میرے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کہکر کہ اس شخص کے حواس میں خلل آگیا ہے جو اپنے آپ کو

مسلمان بتاتا ہے۔ جب میں اُسے کوشش اور محنت سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سالسٹری کے کام کے لئے میں وہی کوئیلم ہوں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے تھا تو کاروبار کی پہلے کی سی حالت قایم ہوئی۔ اب میں اپنی اسلامی وردی صرف جمعہ کے دن پہنتا ہوں اور باقی دنوں میں مثل اور لوگوں کے رہتا ہوں "

لورپول جانے سے پہلے میں نے شیخ کی ایک تصویر ترکی علماء کے لباس میں دیکھی تھی اور یہی اُن کی وقت نماز کی وردی ہے۔ شاید اس لنبے اور کھلے لباس کی وجہ سے ہوگا۔ کہ وہ خاصے قدآور معلوم ہوتے تھے۔ مگر دیکھنے پر معلوم ہوا۔ کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ اُن کی صورت زیادہ تیزی کا پتہ نہیں دیتی۔ مگر آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ اُن کا روزمرہ کا لباس انگریزی مذاق کے اعتبار سے بہت سادہ ہے اور وہ باوجود خوشحالی کے قریب قریب درویشانہ زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے ہیں اُن کی گفتار میں بھی وہ بات نہیں جو اُن کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ گو طاقت زبان معمولی گفتگو میں بھی موجود ہے۔ اُن کا تلفظ اور لہجہ اس علاقہ کا تلفظ اور لہجہ ہے جس میں وہ رہتے ہیں یہ بات شاید عام طور پر معلوم نہیں کہ انگلستان جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی مختلف حصّوں کے تلفظ اور لہجے میں فرق ہے چنانچہ مانچسٹر اور لورپول وغیرہ میں ایسے الفاظ کو جن میں حرف بالفتح پڑھا جاتا ہے۔ بالضم بولتے ہی ہیں۔ مثلاً "کپ" (پیالہ) کو "کُپ" اور "فن" (ہنسی۔ تماشا) کو "فُن" کہتے ہیں اور ہمارے شیخ کوئیلم بھی اس تلفظ کے عادی ہیں +

دفتر میں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد شیخ مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے کے لئے گئے۔ کھانے پر مختلف اسلامی مضامین کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ جن سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شیخ کا دل حقیقت میں نور اسلام سے منور ہے۔ وہ جو خدمت اسلام کی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ خلوص سے کرتے ہیں۔ اگر اُن کو سلطان المعظم کے ہاں سے کچھ امداد ملتی ہے۔ یا وہاں اُن کی خدمات کی قدر کی گئی ہے۔ تو یہ اُن کی خوش قسمتی اور سلطان کی بیدار مغزی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ امداد یا قدردانی اُنکی

مساعی کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی مساعی اُن کے دِلی عقیدے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہی وہ رائے تھی جو میں نے اُن لوگوں کو دی جنہوں نے جا بجا شیخ کی نسبت مجھ سے استفسار کیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ شیخ عبد اللہ کوئیلم کے پکے مسلمان ہونے کی ایک اور شہادت بھی مجھے ملی ہے جو قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مجھے لندن میں اُن کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر بلال کوئیلم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو باپ کے پیشے کی سند حاصل کرنے کے لئے لندن میں پڑھتے ہیں۔ اوّل تو اس نام سے ہی پیغمبر اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ دوسرے اُن کی تقریر جو اسلام کے متعلق سنی تو جی خوش ہو گیا اور معلوم ہوا کہ باپ نے خاص توجہ سے بیٹے کو اپنے مذہب سے آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بات بغیر خلوص کے ممکن نہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم پہلے مسلمانانِ لورپول کی قبور کو دیکھنے گئے۔ کوئی پچیس تیس قبریں ہونگی جو وہاں کے عیسائی قبرستان کے ایک گوشے میں بنی ہوئی ہیں اور دیگر قبور سے صاف نظر آ رہی ہیں۔ کیونکہ قبلہ کے لحاظ کی وجہ سے ذرا آڑی بنی ہیں اور دوسری قبروں کی سیدہ میں نہیں۔ شیخ نے سنایا کہ وہاں مسلمانوں کو دفن کرنے کے متعلق بہت جدوجہد کا سامنا ہوا تھا اور بہت جھگڑے کے بعد وہ زمین جس میں انگلستان کے ان اوّلین مسلمانوں کی قبریں بنی ہیں۔ مسلمانوں نے مول لے لی تھی۔ یادِ رفتگان سے شیخ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں کیونکہ اُن سونے والوں میں بہت سے اُن کے رفیق و مونس تھے۔ جنہوں نے ابتدائی تکالیف کے مقابلہ میں اُن کا ساتھ دیا تھا۔ اور ہم نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے کہ خدا ان مبارک ارواح پر رحمت فرمائے۔

قبرستان سے ہم انسٹی ٹیوٹ کی طرف آئے۔ مختصر سی عمارت ہے جو موجود ضروریات کے لئے کافی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ سہ منزلہ ہے۔ داخل ہوتے ہی دفتر کا کمرہ ہے۔ اُس کے آگے ہال کا بڑا کمرہ۔ ہال میں کوئی تصویریں یا دیگر آرائش نہیں۔ صرف ایک چبوترہ تقریر کے لئے بنا ہے اور نیچے کرسیاں رکھی ہیں۔ نماز کے وقت کرسیاں اُٹھا دی جاتی ہیں۔ چبوترہ کی ساتھ کی دیوار پر جلی حروف میں امیر

عبدالرحمن خاں مرحوم کے گراں بہا عطیہ کا ذکر ہے جو پرنس نصراللہ خاں کے ہاتھ لورپول کی اسلامی جماعت کو دیا گیا تھا اوپر کے کمرے اس وقت خالی پڑے ہیں یا اُن میں بنچیں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ پہلے وہاں مدرسہ کی جماعتیں تھیں اور ایک کمرہ امام مسجد کو ملا ہوا تھا جو وہیں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک بعض انگریزی داں ہندوستانی مسلمان اس خدمت پر مامور رہے۔ مگر آجکل کوئی آدمی اس مطلب کے لئے مقرر نہیں۔ انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کے بعد میں شیخ سے رخصت ہونے کو تھا۔ مگر انکی مروت نے اجازت نہ دی۔ اُنھوں نے کہا کہ چند منٹ اور آپ کی معیت میں گذار سکتا ہوں اور میرے ساتھ ریل تک مجھے پہنچانے آئے۔ راستہ میں لورپول بڑا بازار اور ٹاؤن ہال بھی اُنھوں نے مجھے دکھایا۔ اور اس کے بعد پھر لورپول آنے اور اُن کے ہمراہ اُن کے مکان پر چلنے کی تاکید کر کے رخصت ہوئے ✣

ہندوستان کا اثر انگلستان پر

انگلستان نے جو اثر ہندوستان پر ڈالا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہم روز قدم قدم پر اپنے گرد و پیش اُسکی شہادتیں موجود پاتے ہیں۔ کوئی گھر ایسا ہوگا جس میں کچھ نہ کچھ نفائسات انگریزی تہذیب کی تقلید کے نہ پائے جائیں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے پرانی وضع کے گھرانوں میں بھی لڑکیوں کے جہیز تک میں ایک حصہ انگریزی سامان کا آنے لگا ہے۔ میز کرسی۔ انگریزی وضع کا آئینہ چار کا سٹ وغیرہ چیزیں تو معمولی ہو گئیں اور ہر کہ و مہ ان کی ضرورت سمجھنے لگا ہے۔ جو ذرا اور متمول ہیں وہ نہایت شوق سے گھروں کو انگریزی فرنیچر سے سجاتے ہیں۔ کمروں کے نام انگریزی رکھتے ہیں کھانا انگریزی طریق سے کھانے لگے ہیں۔ پوشاک انگریزی پہنتے ہیں اور ان کے دیکھا دیکھی اور لوگوں کے سر میں بھی یہی سودا سماتا جاتا ہے۔ اور تو اور زبان تک کو انگریزی اثر نے بدل دیا ہے۔ سیکڑوں انگریزی لفظ تو روزمرہ کی بول چال میں شامل

ہو کر جزو زبان بن گئے ہیں۔ اور عالم و جاہل سب اُنہیں استعمال کرتے ہیں بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ اُن کے لئے ہماری زبان میں نہایت وسیع اور نہایت آسان اور نہایت مختصر لفظ موجود ہیں۔ اس پر بھی انگریزی کے رواج کی کثرت کے سبب سے لوگ عام طور پر اپنے لفظوں کی جگہ انگریزی لفظوں ہی کو زیادہ کام میں لاتے ہیں میز کو ٹیبل کہنا وقت پوچھنا ہو تو ٹائم پوچھنا ایسی مثالیں ہیں کہ ہر شخص کو مستحضر ہونگی۔ اور اس لئے زیادہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔

اس عام میلان کے تین بڑے سبب ہیں۔ سب سے اوّل یہ کہ صاحب حکومت کا اثر محکوم جماعت پر بہت زبردست ہوتا ہے۔ رعایا کا تخیل اکثر اپنے حکمرانوں کی عادات و رسوم کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ یہ عادات و رسوم حکومت کا جزو ہیں اور ان کے اختیار کرنیسے گویا ہم عزّت کے مدارج میں سے چند درجے طے کر چکے ہیں موجودہ حکمرانان ہندوستان کا عالمگیر اقبال اور بڑھا ہوا اقتدار اس خیال کو اور بھی مضبوط کرتا ہے۔ "ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است" ایک بہت پُر امقولہ ہے۔ مگر اس وقت بھی ایسا ہی سچا ہے جیسا کہ اُس وقت تھا جب یہ زبان زد خاص و عام ہوا۔ اور اسی سبب سے ہر انگریزی چیز آجکل پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے جو بُری بھی ہے وہ ہماری نگاہوں میں اچھی اور جو اچھی ہے وہ تو بہتر اور برتر نظر آتی ہے۔ دوسرا سبب ان چیزوں کی جدّت ہے۔ ہر نئی چیز زیادہ دلچسپ اور دلپسند معلوم ہوتی ہے۔ اور اس اصول کے موافق اگر انگریزی حکومت ہندوستان میں نہ بھی ہوتی تو بھی یہ چیزیں کم و بیش رواج پا جاتیں اور اسی وجہ سے اُن ایشیائی ملکوں میں جہاں ابھی ایشیائی حکومت باقی ہے انگلستان اور دیگر ممالک یورپ کا مال بکثرت جاتا ہے اور بکتا ہے۔ تیسرا سبب وہ حُسن ظاہری اور چمک ہے جو یورپ کی صنائع کا خاصہ ہے ذرا سی چیز کو چاہے اُسے کوڑیوں کے مول بیچنا ہو یورپ کے تاجر اپنی کلوں کے ذریعہ ایسی جلا دیتے ہیں کہ دیکھنے والا ایک دفعہ تو بھڑک جاتا ہے اور ایسی چیزیں بھی خرید لیتا ہے جن کی اُسے زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم پر مذکورہ بالا اسباب سے یورپ کا جسقدر اثر ہو کم ہے۔ یہ بھی جو آہستہ آہستہ اثر ہوا اس وجہ سے تھا کہ ہم لوگ بالطبع قدامت پرست ہیں۔ اور اپنی پرانی چیزوں کو عزیز رکھتے ہیں۔ تغیر اور تبدل سے ہم کو ایک قسم کی نفرت ہے۔ باوجودیکہ پشتہا پشت سے یہ دریافت کر چکے ہیں کہ زمانہ انقلاب پسند ہے اور آئے دن تبدیلیاں کرتا رہتا ہے۔ اس پر بھی بجائے اس کے یہ خود زمانہ کی ہوا کے ساتھ چلیں صدیوں سے زمانہ کو کوستے چلے آتے ہیں اور یہ تماشا ہو رہا ہے کہ نہ وہ اپنی خو بدلتا ہے نہ ہم اپنی خو بدلتے ہیں۔ غرض ہم تو اس طرح بحیثیت محکوم ہونے کے اثر پذیر اور بحیثیت قدامت پسند ہونے کے تاثر سے خالی چلے جاتے ہیں۔ اور اس کشمکش میں ہماری زندگی بسر ہو رہی ہے۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ انگلستان بھی ہم سے کچھ اثرات لئے بغیر نہیں رہ سکا۔

قوانین قدرت کے اسرار بھی عجیب ہیں۔ اور قومیں اُن کے آگے ایسی ہی مجبور ہیں جیسے افراد انسانی۔ فرض کیجئے دو شخص کچھ عرصہ تک باہم ملیں جن میں ایک زبردست ہو ایک کمزور۔ ایک کا دل و دماغ قوی ہو ایک کا ضعیف۔ تو بھی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جہاں زبردست کا اثر کمزور پر پڑا وہیں تھوڑا بہت کمزور نے بھی اپنے رفیق کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اسی طرح اقوام کی حالت ہے۔ ممکن نہیں کہ کسی قوم کا سابقہ کسی دوسری قوم سے پڑے اور وہ اُس سے متاثر ہونے سے بالکل بچ جائے۔ انگریزوں نے اس قانون قدرت کو مد نظر رکھ کے اور اُن سے پہلے جن قوموں کو ہندوستان سے سابقہ پڑا اُن کی حالت صفحاتِ تاریخ سے مطالعہ کر کے یہ تہیہ کر لیا کہ ہم قانونِ قدرت کی اس زد سے بچیں۔ اور بہت کچھ بچے بھی۔ یہاں آ کر رہنے اور ہندوستان کو اپنا گھر بنانے کا قصد تو اُن کی قوم کے کسی فرد نے آج تک کیا ہی نہیں۔ افریقہ۔ امریکہ اور آسٹریلیا سب جگہ جا کر رہتے ہیں اور آباد ہو جاتے ہیں۔ مگر ترک لازم ہے تو ہندوستان کا۔ جو معدودے چند ضروریاتِ ملک داری یا کاروبار کی وجہ سے برسوں کے لئے یہاں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ بھی شہروں سے دور جنگل میں منگل مناتے ہیں۔ موسم گرما میں

پہاڑوں پر انگلستان کی طرزِ معاشرت کا نمونہ پیدا کرتے ہیں۔ اور اس پر قناعت نہ کر کے ہر دوسرے تیسرے برس انگلستان کو دوڑ جاتے ہیں اور اس طرح اپنے ملک کی یاد اور وہاں کی عادات کا اثر تازہ رکھتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کوشش ہوتی ہے کہ انگلستان کے تازہ ترین فیشن یہاں رواج پائیں اور وہ یہاں بیٹھکر وہی زندگی بسر کریں جو ان کے ہموطن انگلستان میں کر رہے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی یہی اہتمام کیا جاتا ہے اور کوئی معزز اور متمول انگریز یہ گوارا نہیں کرتا کہ اُس کے بچے ہندوستان میں تعلیم پائیں۔ چھوٹی سی عمر میں اُنہیں انگلستان بھیجدیا جاتا ہے۔ اُن کی جدائی منظور کی جاتی ہے۔ مگر یہ نہیں پسند کیا جاتا کہ وہ یہاں کی خوبو سیکھیں۔ مگر ان سب احتیاطوں پر کچھ تھوڑا سا اثر ہمارا ابھی انگلستان تک پہنچ گیا ہے اور رفتہ رفتہ مستقل ہوتا جاتا ہے۔ اسے کم نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ اسی اصول کا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک بیّن ثبوت ہے۔ اور صاف ظاہر کرتا ہے کہ کوئی دو قومیں جو آپس میں ملیں ایک دوسری پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتیں +

کیا ہے ایک دستِ آرزو نے وار دو جانب
زلیخا کے جگر تک چاک ہے یوسف کے داماں کا

غور کرنے والے کو جو چیز آجکل انگلستان میں غیر معمولی نظر آتی ہے وہ مختلف رنگوں کا شوق ہے۔ جن لوگوں نے آج سے بیس برس پہلے انگلستان کو دیکھا ہے اور اب دوبارہ وہاں گئے ہیں۔ مجھے اُن سے معلوم ہوا کہ وہاں پہلے مرد تو مرد عورتیں بھی شوخ رنگ کپڑا نہیں پہنتی تھیں۔ اول تو سیاہ رنگ کے سوا کسی رنگ کا کپڑا وہاں مقبول ہی نہیں اور ہر موقع پر خواہ شادی ہو خواہ غمی۔ اس رنگ سے زیادہ تر کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی رنگ کا شوق کرے بھی تو اکثر صوفیانہ رنگ پسند کیے جاتے تھے نتیجہ اس کا یہ تھا کہ کسی مجمع میں سوا سیاہ پوشی کی کثرت کے کچھ نظر نہیں آتا تھا اور وہ انگریز اور میمیں جو ہندوستان کو دیکھتے تھے اور یہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں میں اور میلوں کے مجمعوں میں لوگوں کو رنگا رنگ کے لباسوں میں ملبوس پاتے تھے ہمارے

اس شوق کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اور اسی بنا پر بلادِ مشرق کو شاندار خوشرنگ اور چمکیلا بیان کرتے تھے۔ مگر اب انگلستان میں بھی موسم بہار میں کسی گروہ پر نظر ڈالی جائے جو دن کے وقت ساحل بحر (کنار دریا) یا کسی اور مقام تفریح پر جمع ہو تو لباسوں کی رنگینی کے اعتبار سے وہ کسی مشرقی گروہ سے بہت پیچھے نہیں رہیگا۔ عورتیں تو رنگ کی انتہا سے زیادہ شائق ہوتی جاتی ہیں۔ اودا اور بنفشئی رنگ نہایت مرغوب ہے۔ بلاؤس[۱] بنفشئی۔ گون[۲] بنفشئی۔ ٹوپی ہمرنگ۔ ٹوپی پر پھول بنفشئی چہرے پر ہلکی جالی کی نقاب اس کا بھی بنفشئی رنگ۔ اور دھوپ کے بچاؤ کے لئے اگر سن شیڈ[۳] ہاتھ میں ہے تو وہ بھی بنفشئی ریشم کا۔ اس کے سوائے اور بھی طرح طرح کے رنگ عورتوں میں مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ پیازی آسمانی سبز اور بعض بعض جگہ سُرخ۔ یہ میلان روز بروز ترقی پر ہے۔ یہانتک کہ مرد جو نسبتاً سادہ وضع کے پابند ہیں رفتہ رفتہ رنگینی کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔ فوق البھڑک صدری پہننا اب ایک معمولی بات ہوگئی ہے۔ اور ٹائی شوخ رنگ کی تو اب بڑے بڑے متین آدمی بھی پہننے لگے ہیں۔ دکانوں کی آئینہ دار کھڑکیاں آجکل رنگین کپڑوں سے مزین ہیں۔ اور کئی جگہ اُن میں جاپانی ریشم کے چوغے جن پر رنگارنگ کے نقش و نگار ہیں لٹک رہے ہیں۔ اکثر صاحبان ان چوغوں سے ڈریسنگ گون[۴] کا کام لیتے ہیں یعنی رنگین کپڑے پہننے کا شوق جو طبیعتوں میں پیدا ہوگیا ہے اُسے گھر کی چار دیواری کے اندر پورا کرتے ہیں اور باہر اپنی معتاد ملکی وضع کی پابندی قایم کرتے ہیں

زنانہ لباس میں ایک چیز کچھ عرصہ سے رواج پا چلی ہے جو قطعی ہندوستانی ہے یعنی دوپٹہ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لیڈیاں یہاں کی طرح اُسے اوڑھتی نہیں بلکہ کندھوں پر ڈال لیتی ہیں۔ اس طرح سے کہ اُس کے دونوں پلے آگے لٹکتے رہتے ہیں۔ نفیس بنارسی ململ کے طرح طرح کے بیل بوٹے دار اور کاڑھے ہوئے دوپٹے عام ہوتے جاتے ہیں اور موسم گرما کے لباس کا ایک جزو بن چلے ہیں بعض خاص موقعوں پر

۱؎ زنانہ کرتہ ۲؎ سایہ ۳؎ ہلکی ریشمی چھتری جو صرف آفتاب کی شعاعوں سے بچاؤ کے لئے لگائی جاتی ہے۔
۴؎ وہ کھلا چوغہ جو انگلستان میں صبح و شام معمولی کپڑے اُتارنے کے وقت پہنا جاتا ہے اور جس کے نیچے رخت خواب چھپا رہتا ہے۔

دوپٹے اوڑھے بھی جانے لگے ہیں۔ ایک دفعہ مکتی فوج کا ایک نہایت عالیشان جلسہ لنڈن میں ہوا جس میں عام حاضرین کے علاوہ چھ ہزار زن و مرد فوج کی مختلف شاخوں کی طرف سے دور دور سے آکر شریک ہوئے۔ اُس جلسہ میں جنرل بوتھ نے جو اس مذہبی فوج کا بانی اور سپہ سالار ہے اپنی فوج کی عورتوں کو جن کی تعداد کوئی تین ہزار کے قریب ہوگی باریک ململ کے رنگے ہوئے دوپٹوں سے سجایا تھا۔ ہر نشست پر ایک رنگا ہوا دوپٹہ پہلے سے رکھدیا گیا تھا۔ اور یہ عورتیں آتے ہی اپنی ٹوپی اُتار کر کرسی کے نیچے رکھدیتی تھیں اور دوپٹہ اوڑھ لیتی تھیں۔ اُن کے گورے رنگوں پر سبز اور بسنتی دوپٹے عجب بہار دیتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنرل بوتھ نے اپنے جلسہ کا منظر کسی آسمانی دنیا میں منتقل کر لیا ہے۔ اور جو نیک عورتیں وہاں جمع ہیں وہ اُس دنیا کے فرشتے یا حوریں ہیں۔ بوڑھے جرنیل کی جہاندیدہ نگاہ نے جو اس جلسہ کی شان بڑھانے کے واسطے دنیا بھر کے لباسوں سے اس ہندوستانی کو انتخاب کیا۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بعض چیزیں بتدریج انگلستان کے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہیں۔ خواہ ہم خود ان سے کتنے ہی نفور ہوتے جائیں۔

انگلستان کے مذاق میں جو تغیر تدریجاً پیدا ہو رہا ہے وہ کچھ لباس تک ہی محدود نہیں۔ کھانے کی چیزوں میں بھی اُس کا اثر نظر آتا ہے۔ قلیہ جسے انگریز کری کہتے ہیں اب انگلستان کے ہوٹلوں میں اکثر تیار ہونے لگا ہے اور بہت سے گھروں میں بھی رواج پا گیا ہے۔ اور یہ گھر نہ صرف اُن انگریزوں کے گھر ہیں جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں بلکہ ایسے گھرانے بھی جنہیں کبھی یہاں آنیکا اتفاق نہیں اس غذا کا شوق کرنے لگے ہیں۔ اس کے پکانے کا مصالحہ ٹین کے ڈبوں میں بند ہو کر مہنگے داموں بکتا ہے۔ حالانکہ اُس میں بڑا جزو فقط ہمارے ہاں کی پسی ہوئی ہلدی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے انگریزی مطبخ پلاؤ سے آشنا ہو گئے ہیں۔ اور کباب سے بھی ناواقف نہیں رہے۔ ہندوستانی مٹھائیاں بھی کہیں کہیں پہنچنے لگی ہیں اور ہندوستان کا

مشہور میوہ آم بھی وہاں اپنا سکّہ جماتا جاتا ہے۔ آم کی چٹنی اور آم کا مربّہ تو بآسانی دُکانوں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اب کہیں کہیں آم کا اچار بھی پسند ہونے لگا ہے +

یہ اثرات جن کا ذکر مثالاً کیا گیا ہے انگلستان کی مجموعی قومی زندگی اور اُسکی مستقل رفتار کے مقابلہ میں گو خفیف نظر آئیں۔ تاہم باعتبار آیندہ تغیّرات کے نشانوں کے خفیف نہیں ہیں۔ خصوصاً جب یہ دیکھا جائے کہ خیالات تک بھی ہندستان کا اثر پہنچ رہا ہے۔ آزادی۔ مساوات اور حقوق کے خیالات جو صدیوں سے اہلِ انگلستان کی گھٹی میں پڑے ہیں ضرور ابتک باقی ہیں۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اکثر امرا اور مدبّرین پر حکومت پسندی کا مذاق غالب آتا جاتا ہے۔ اور شوقِ جہانبانی جسے سیاسی اصطلاح میں امپیریلزم سے تعبیر کرتے ہیں۔ دماغوں میں سماکر آزادی اور مساوات کے تخیّل کو مغلوب کرتا جاتا ہے۔ یہ خاص اثر ہمارے نزدیک قابلِ ستایش نہیں لیکن یہاں ہمیں اچھائی یا برائی سے بحث نہیں۔ بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ امر واقعہ کیا ہے۔

اب تک جو اثر ہندوستان نے انگلستان پر ڈالا۔ اُس میں ہماری ہمّت یا کوشش کو کوئی دخل نہیں۔ اگر ہم اُن بے شمار مواقع سے پورا فائدہ اُٹھائیں جو انگلستان پر اثر ڈالنے کے لئے ہمیں حاصل ہیں تو ان اثرات کی رفتار زیادہ تیز ہوسکتی ہے اور نتائج کی اہمیت بھی اُس نسبت سے بڑھ سکتی ہے +

کُلیاتِ اکبر[1]

نظمِ اردو کے شائقین بالعموم اور کلامِ اکبر کے شیدائی بالخصوص یہ معلوم کرکے بہت خوش ہوں گے کہ جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کے فرزند ارجمند

[1] قیمت حصہ اول ۱۲؍ حصہ دُوم ۸؍ ۔ حصہ سوم ۱۲؍
ملنے کا پتہ۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔

سیّد عشرت حسین صاحب بی۔اے نے جو تھوڑا عرصہ ہوا کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر واپس تشریف لائے ہیں اپنے والد ماجد کے کلام کا مجموعہ ترتیب دے کر شائع کرا دیا ہے۔ انہوں نے اس اشاعت سے نہ صرف اپنا ایک اہم فرض ادا کیا ہے بلکہ اردو علم ادب کی ایک معقول خدمت کی۔ اور وہ ہمارے دلی تشکر کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب کئی حصّوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں حال کی غزلیں درج ہیں جنہیں دورِ سوم کی غزلیں کہا گیا ہے۔ دوسرے میں بیس پچیس سال قبل کا کلام ہے۔ اور اس حصّہ کا نام دورِ دوم رکھا گیا ہے۔ تیسرے حصّہ میں اس سے بھی پیشتر کا کلام ہے جسے جناب اکبر کی طبع رسا کی مشق اوّل کہنا چاہیئے۔ اور اسی لئے اس کا نام دَورِ اوّل رکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ رباعیات و قطعات و متفرقات ہیں جن میں اکثر ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ یوں تو ہر حصّہ دلچسپ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف کی طبیعت کا اصلی رنگ دَورِ سوم ہی میں نظر آتا ہے۔ گویا شاعر کا بڑھاپا اُس کے کلام کا شباب ہے کہ وہ سارے جوہر جو ازل سے اسکی طبیعت میں ودیعت کئے گئے تھے اور جو دَورِ اوّل میں بھی تغزّل کے زمانہ میں اپنی جھلک دکھا جاتے تھے اور دَورِ دوم میں رفتہ رفتہ ترقی پا رہے تھے۔ آخر کار جناب اکبر کی شاعری کا جزوِ اعظم بن گئے۔ اس زمانہ کا کوئی سیاسی مذہبی تمدنی اور اخلاقی مسئلہ ایسا مشکل سے ہوگا جس پر اکبر نے رائے زنی نہیں کی اور وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ جس فریق کی رائے سے موافقت کی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اُسکی خوشامد کی جا رہی ہے اور جس سے مخالفت ہوئی اسے شکایت کا موقع نہ ملے ہنستے بولتے لطیفہ کہتے زلف و سنبل سے قطعی گریز کئے بغیر اور بندش کی خوبیوں اور چُستی کا لحاظ رکھکر اس عہد کا یہ بے نظیر سخنور اپنا مطلب کہہ جاتا ہے اور ملک و ملّت کی حمایت کا فرض ادا کر جاتا ہے۔ ان نئی خصوصیتوں کی بنا پر میں نے رباعیات اکبر کا دیباچہ لکھتے وقت اپنے ایک دوست کا یہ قول نقل کر دیا تھا کہ اکبر کو لسان العصر کہیں تو بجا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر بہت مسرت ہوئی کہ یہ لقب عام طور پر موزوں قرار دیا گیا۔

اور مقبول ہوا۔ اور اب کلیات اکبر کے سرورق پر موجود ہے۔ میں چند اشعار نقل کرتا ہوں جن سے اس لقب کی یہ موزونی اور مناسبت واضح ہو جائیگی۔

بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم
ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے باخدا ہونا

طریقِ مغربی کی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور بجز ما سوا ہونا

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا

جیسی جسے ضرورت ویسی ہی اُسکی چیزیں
یہاں تخت ہو تو پھر کیا وہاں میز ہے تو پھر کیا

کیسی ہی سلطنت ہو سب خوش نہ رہ سکینگے
گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

اب ہر شعر نظر غور سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ہر ایک بجائے خود ایک مضمون کا مسلح ہے۔ پہلے شعر میں آجکل کی ایک خاص وقت کا جسے بسا اوقات اکثر لوگ محسوس کرتے ہیں بیان ہے۔ یعنی اس ملک میں مسلمانوں کو ایک طرف ہندو تمدن اور دوسری طرف انگریزی تہذیب سے سروکار رہے۔ کبھی ایک کے زیر اثر کبھی دوسرے کے تابع فرمان ہیں اور انہیں اپنے اصلی رنگ پر قایم رہنے اور اپنے فرائض کما حقہ ادا کرنے میں طرح طرح کی دشواریاں ہیں۔ اس مطلب کو بت اور مس کے استعارے میں ادا کرنا انتہائے بلاغت ہے۔ اور یہ استعارات جناب اکبر ہی نے اپنے لئے ایجاد کئے ہیں جیسے حافظؔ ساقی و مے سے طرح طرح کے معانی پیدا کرتا ہے جنہیں ارباب نظر سیاق کلام سے سمجھ جاتے ہیں۔ اسیطرح کلام اکبر میں بت اور مس کئی معنی رکھتے ہیں۔ کہیں بت سے مراد ہندو اور مس سے مراد انگریز ہے۔ مثلاً ان دو شعروں میں جو اردو ناگری کے ناگوار جھگڑے کے دنوں میں کہے گئے تھے:۔

بتوں نے کہدیا چل ہٹ تجھے ہندی نہیں آتی
مسوں نے کہدیا جا تجکو انگریزی نہیں آتی

مگر اکبر کہ ابتک مر رہا ہے ان حسینوں پر قیامت ہو کہ بے عزت کو شرم اب بھی نہیں آتی

کہیں بُت سے مراد ہندی عورتیں اور مس سے مراد انگریزی عورتیں لی جاتی ہے۔ اور شاعر جدید تحریکوں میں سب سے زبردست تحریک یعنی سودیشی کی طرف اشارہ کرکے ہندی نوجوانوں کو اپنے ملک کی عورتوں کی قدردانی کی ترغیب دیتا ہے جیسا اس شعر میں:۔

بتوں کو چھوڑ کر کیوں جاؤں میں اُس مس کی پیٹنی میں متاعِ حسن بھی داخل ہو تحریکِ سودیشی میں

اور کہیں لفظ بت ہندو تمدن کا اور لفظ مس انگریزی تمدن کا قائم مقام ہوتا ہو جسکی مثال خود یہی شعر ہے جو سب سے پہلے نقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ کے دوسرے شعر میں مغربی طریق تعلیم پر مذہب سے بیگانہ ہونے کا اعتراض نہایت زور سے ظاہر کیا گیا ہے اور ایک معنی میں اسی اصول پر زور دینا کہ نئی تعلیم بغیر مذہبی تعلیم کے مفید نہیں۔ جناب اکبر کے کلام کا خاص مقصد اور موضوع ہے۔ مدتیں ہوئیں جب سر سید احمد خاں مرحوم نے علی گڈھ میں علوم جدیدہ اور زبان انگریزی کی ترویج کا جھنڈا گاڑا اور اُن کے مداح اور دوست اُن کے ہمخیال ہو کر اُن کی تائید میں کھڑے ہوئے تو خان بہادر اکبر حسین صاحب نے اس تحریک کی بعض کمزوریوں کی طرف اپنے شاعرانہ اور ظریفانہ پیرائے میں قوم کو متوجہ کرنا شروع کیا اور سید صاحب کو اس طرح اپنا مخاطب بنایا۔ جیسے پُرانے شعرا واعظ اور زاہد سے خطاب کر کر کے اپنے اشعار کو دلچسپ بناتے تھے۔ گویا سید صاحب کی ذات سے خطاب کرنے کے علاوہ اس نئی تعلیم اور انگریزیت کا قائم مقام اُنھیں ٹھیرایا۔ ابتدا میں کہیں کہیں ایسی تیزی سے نکتہ چینی کی کہ بعض لوگوں نے اکبر کو سید مرحوم کا مخالف اور اُن کے کام کا دشمن جانا۔ لیکن آخر ان دونوں بزرگوں کے تعلقات باہمی اور خود جناب اکبر کے طرزِ عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ انگریزی تعلیم پا کر نوجوان اپنے مذہب سے بالکل غافل اور بے خبر نہ ہو جائیں۔ اور اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اول اور مقدم ضرورت مسلمانوں کا با خدا رہنا ہے۔ اور باقی سب خوبیاں

اُسی صورت میں خوبیاں ہیں کہ جب یہ صنعت ان میں موجود ہو۔ اُس زمانے میں تعلیم جدید کے نئے نئے جوش کے سبب سے کسی نے اس آواز پر کان نہ دھرا مگر آج افسران محکمہ تعلیم حکام انگریز اور دیگر اہل الرائے کیا ہندو کیا مسلمان مذہبی تعلیم کی ضرورت کے مقر ہیں اور ان خراب نتائج کا احساس کر رہے ہیں جو تعلیم یافتہ جماعت میں مذہب سے الگ رہ کر پیدا ہوئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی نصیحت گو تلخ معلوم ہوتی تھی کسقدر حق بجانب تھی اور کتنی دور اندیشی پر مبنی تھی۔ شاید کوئی یہ کہے کہ سید صاحب نے خود اس ضرورت کو محسوس کر کے کالج میں مذہبی تعلیم کو رواج دیدیا تھا۔ پھر اکبر کی تاکید مزید کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب ان شعروں میں سے جو آغاز مضمون میں نقل کئے گئے ہیں تیسرے شعر میں موجود ہے۔ یعنی مذہب صرف کتابوں اور کالج سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ نور ایمان انسان کے قلب کو بزرگانِ باعمل کی نظر سے میسر ہوتا ہے۔ اُن کی پاکیزہ زندگی اور اُن کی عمدہ مثال آدمی کو انسان بنا دیتی ہے۔ اور اکبر کو یہ شکایت تھی کہ جدید تعلیم لوگوں کو اس رستہ سے ہٹائے لئے جاتی ہے اور عالمانِ باعمل دن بدن کم ہوتے جاتے ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شکایت بیجا تھی۔

اکبر نے جیسے مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات اور مغربی تعلیم کی کمزوریوں میں نہایت معقول رائے دی ہے۔ اسی طرح بہت سے اہم پولٹیکل مسائل پر اُس کے خیالات نہایت غور کے قابل ہیں۔ اُن کا یہ کہنا کہ جو خیر خواہی ڈر سے پیدا ہو وہ خیر خواہی نہیں ہے۔ اس ملک میں حکام وقت کے لئے ایک انمول نصیحت ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم حاکم ایسے ہوں گے جو بے غرضانہ خیر خواہی اور غرضمندانہ وفاداری میں فرق کر سکیں۔ اسی طرح یہ اصول کہ کوئی سلطنت سب کو خوش نہیں رکھ سکتی ایک بالکل سچا اصول ہے جو ہر وقت پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ اور اس اصول کو بیان کرتے ہوئے اکبر کا یہ کہہ جانا کہ "گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا" ایک نہایت پُر لطف نکتہ ہے جس کی خوبی محتاجِ بیان نہیں +

مذہبی اور پولٹیکل امور کے بعد سوشل امور کا درجہ ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی اشیا کا استعمال کس سرعت کے ساتھ ہمارے گھروں میں بڑھ رہا ہے اور کس طرح لوگ دیوانہ وار یہ سمجھتے ہیں کہ لباسوں میں لباس ہے تو انگریزی۔ گھر میں فرنیچر اگر انگریزی ہے تو گھر ہے ورنہ خانۂ بے در اور جو آرام اور آسائش ہے تو انگریزی طرز بود و باش میں ہے۔ اور ہمارا طریق ماند و بود بے لطف و بے آرام ہے تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابنائے ملک کو جتا دیا جائے کہ وہ اس قسم کی یکطرفہ رائے قائم کر کے بہت غلط رستے پر جا رہے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ ہماری ضروریات ہمارے ملک کی حالت اور اُس کی آب و ہوا کے لحاظ سے بہ حیثیت مجموعی ہماری اپنی زیادہ موزوں اور آرام دہ ہیں اور اندھا دھند ہمارا شوق سامان مغربی ہمیں بے شمار مشکلات میں ڈال رہا ہے اور ڈالنے والا ہے۔ چنانچہ "یاں تخت ہے تو پھر کیا وہاں ہنر ہے تو پھر کیا" میں کس سلیس اور عام فہم طریق سے اور کسقدر اختصار کے ساتھ یہ بسیط اور ضروری مضمون ادا ہو گیا ہے ✢

یہ چند اشعار جو ہم نے نمونتاً پیش کئے ان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اکبر کے ہر قسم کے خیالات ان سے معلوم ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ موٹی موٹی باتیں جو اُن کے کلام میں اکثر آتی ہیں۔ ان شعروں کو پڑھ کر سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن کلیات اکبر مضامین رنگارنگ کا ایک دریا ہے جس کی غواصی کئے بدون معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس خوش فکر شخص نے اپنے کلام میں کیا موتی پروئے ہیں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اکبر نے اپنی نصائح کا مخاطب بیشتر اپنے ہم قوموں کو بنایا ہے لیکن بہت سی دل آویز نصیحتیں ایسی ملیں گی جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر گویا ایک غیور مسلمان ہے۔ تاہم تنگ خیالی سے بری ہے۔ اور اُس کے دل میں اپنے مذہب کی محبت کے بعد اپنے ملک کی محبت کا بھی گھر ہے۔ اسی سبب سے وہ جا بجا نہایت وسیع خیالی سے اپنے ہندو بھائیوں کو بھی کار آمد مشورے دیتا ہے چنانچہ کہتا ہے :-

شعر میں اکبر یہی مضمون تو ہر بار باندھ
لائے مسلمان سبحہ لے اے برہمن زنار باندھ

یعنی جیسے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ تسبیح ہاتھ سے نہ چھوڑیں اسی طرح ہندؤنکو یہ رائے دیتا ہے کہ وہ زنار کو باندھے رہیں اور اپنے مذہب سے نہ ہٹیں اور ان دونوں مشوروں کو ایسا ضروری سمجھتا ہے کہ انہیں بار بار لکھنا عیب میں داخل نہیں سمجھتا بلکہ اپنا فرض قرار دیتا ہے۔

ہندوستان کی آجکل کی زندگی میں شاید انگریزوں اور ہندوستانیوں کے میل جول کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اس پر اخبارات میں سینکڑوں کالم اور رسالوں میں سیکڑوں اوراق سیاہ ہو چکے ہیں۔ اکبر اس کے متعلق ایسا خیال ظاہر کرتا ہے جو ہندو مسلمان ہر طبقۂ رعایا کے دل میں موجود ہے اور جسے انگریزوں میں بہت تھوڑے لوگ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

یہ فقط نہیں ہے کافی کہ مرا مزاج پوچھیں
میرے دردِ دل کو سمجھیں مری احتیاج پوچھیں

اہلِ مغرب نے مشرقی ممالک پر تسلط حاصل کرنے کے لئے جو باریک طریقے ایجاد کئے ہیں اُس کی توضیح کے لئے یہ شعر قابلِ ملاحظہ ہے:۔

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اُس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اسی مضمون کو جو اس شعر میں مختصراً بیان ہوا۔ زیادہ شرح کے ساتھ ایک غزل میں بیان کیا ہے۔ جس کے تین چار شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آگیا تارِ امید و بیم اُن کے ہاتھ میں

مغربی رنگِ روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم اُن کے ہاتھ میں "تعلیم" اُن کے ہاتھ میں

اچھے اچھے اچھوں کا لُبھا لیتے ہیں دل
ہیں بہ نہایت خوشنما دو جیم اُن کے ہاتھ میں

مغرب ایسا ہی رہا اور ہو اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم اُن کے ہاتھ میں

اب تک ہم نے اکبر کی ظرافت کے کوئی نمونے پیش نہیں کئے۔ مگر ظریفانہ اشعار کے بغیر اُن کے کلام کی تنقید نا مکمل رہ جائیگی کیونکہ ظرافت ایسی چیز ہے کہ تشریح سے اُس کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اس لئے یہ اشعار بغیر کسی حاشیہ چڑھانیکے

نقل کئے جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ ان اشعار میں بھی اس زمانے کا ہر ضروری مسئلہ بڑی خوبی سے حل کیا گیا ہے:۔

حیراں ہیں اس زمانہ میں ہم جی کے کیا کریں
جائز سہی شراب مگر پی کے کیا کریں
تعلیم اونچے درجہ کی ہوتی نہیں نصیب
پھر گھر میں بیٹھ کر بجز اے بی کے کیا کریں

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں
اور تیرے بیاں کی دل آویزی میں
شیطاں عربی سے ہند میں ہے بیخوف
لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

وضع مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی
اب میں سمجھا واقعی ڈاڑھی خدا کا نور تھا

اُردو کے تین ربع کے مالک ہیں خود ہنود
پھر کیا سبب جو اس سے انہیں انحراف ہے
یعنی اُردو ہے چیز انہیں کے مذاق کی
اردو کے تین جزو یہی صاف صاف ہیں

اے شیخ جب نکیل نہیں دستِ قوم میں
پھر کیا خوشی جو اونٹ ترے ریل ہو گئے

اضافہ ہوئی مجھ سے گندم پہ مے
یہ پوتے سے بھی اک خطا ہو گئی

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی
نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی
ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

ظریفانہ اشعار کے متعلق کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انجن کی تھوڑی سی تشریح کر دی جائے۔ کلام اکبر میں لفظ انجن بُت اور مِس کی طرح اصطلاح کا رتبہ رکھتا ہے۔ آجکل کی مادّی ترقی کا مجسم قائم مقام ہے اور اس پر جو پھبتی کہی جائے وہ مادّی ترقی پر اعتراض ہوتا ہے۔ شعر مندرجہ بالا میں جو ہوا کی

تاریکی کی طرف اشارہ کیا ہے اُس میں گو یہ ظاہری لطف بھی موجود ہے کہ انجن جدہر سے نکل جائے ہَوا تاریک ہو جاتی ہے۔ مگر یہ باطنی اعتراض بھی صحیح ہے کہ مشینوں اور کلوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی تاریکی اکثر ممالک میں داخل ہوتی جاتی ہے۔

ظرافت اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ مہذّب نہیں ہوتی۔ گو ہم نے جو اشعار انتخاب کر کے پیش کئے ہیں وہ جوہرِ تہذیب سے آراستہ ہیں تاہم کلیات کے حصۂ ظرافت میں بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جو ہمارے نزدیک صفحۂ کاغذ پر نہ اُترنے چاہیئے تھے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اکبر جیسا طبّاع شخص اگر اُس کو کوئی لطیفہ سوجھے تو اُس کے کہنے سے رُک جاتا۔ مگر اس صورت میں کہ وہ مہذب ظرافت کے دائرہ سے خارج ہو اُس کو چھپوانا مناسب نہیں۔ کیونکہ چھپی ہوئی چیز ہر کہ و مہ زن و مرد و پیر و جواں کے ہاتھ میں جا سکتی ہے۔ اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ نوعمر طبائع پر ایسی ظرافت کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایسے لطیفے بے تکلف صحبتوں کی تفریح کے لئے زبانی بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کتاب میں ان کا آ جانا کتاب کی عام وقعت میں کسیقدر خلل انداز ہوگا اور ہمارا خیال ہے کہ جب اس کے دوبارہ طبع ہونے کی نوبت آئے تو اس پہلو سے نظرِ ثانی نہایت مفید ہوگی +

ایک اور اعتراض قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ گو انگریزی الفاظ کے استعمال میں جناب اکبر کو ایک مہارت خاص حاصل ہے اور وہ اُنہیں اکثر جگہ اُردو میں نہایت خوبصورتی سے کھپاتے ہیں۔ پھر بھی کہیں کہیں یہ استعمال حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہو جو نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں کسیقدر احتیاط سے کام لینا کلامِ اکبر کی بیشمار خوبیوں کو بڑھا دیگا۔ جن اشعار میں انگریزی لفظ بے تکلف بندھے ہیں اور لطف دے رہے ہیں یا ناگزیر تھے اُن کے نمونے ہم پیش کرتے ہیں اور اسکے بعد کچھ ایسے اشعار نقل کریں گے جن میں وہ تکلّف سے لائے گئے ہیں یا ضرورت سے زیادہ بھرتی کئے گئے ہیں۔ اور اس مقابلہ سے اس اعتراض کی توضیح ہو جائے گی۔

کہتے ہیں جرح کیا ہے جو باریک ہو وہ پُل
بائیسکل پہ گذریں گے ہم پُل صراط سے

ایسی بری اور مجکو پیارا لکھے
القاب میں دیکھئے ڈیر کلو ہے

حکمتوں سے ہوئی ہے جزوِ شکم
روح تو اب کورس جیتی ہے

کرکٹ جمناسٹک ٹریننگ کالج
مولانا سیکھتے ہیں بالفعل نٹی

اجل آئی اکبر گیا وقت بحث
اب اِف کیجئے اور نہ بٹ کیجئے

ممکن نہیں اے مس تیرا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پریزاد ہوں اور کِس نہ لیا جائے

جب میں کہتا ہوں کہ گو می کِس ڈیر
سر جھکا کر کہتے یو تے ٹیکٹ ہیں

زیادہ قابلِ افسوس یہ ہے کہ ان انگریزی الفاظ اور فقرات کے ساتھ اُن کے اُردو معنی بھی درج نہیں کردیئے گئے - اور اس وجہ سے جو لوگ انگریزی سے بالکل ناآشنا ہیں وہ اُن کی معنی سمجھنے سے بالکل قاصر رہیں گے۔

آخر میں ہم بحیثیتِ مجموعی اس لاجواب کتاب کی دل سے داد دیتے ہوئے اتنی بات اور کہدینی ضروری سمجھتے ہیں کہ ترتیب کے لحاظ سے اگر دورِ اوّل کو پہلے اور دورِ سوم کو بعد میں رکھا جاتا تو اُس سے علاوہ قدرتی تناسب ترتیب کے یہ فائدہ حاصل ہوتا کہ کلام کے ناظرین کو جناب اکبر کی شاعری کی رفتار کی تدریج نظر آجاتی کہ کس طرح شروع ہوئی اور کہاں تک بڑھی اُس کے ابتدائی دور میں کونسی چیز تھی جو اس کمال ترقی کا پتہ دیتی جو آخر اُن کی کلام نے حاصل کیا ہو - اور جس کی بدولت وہ جدید ادب اُردو کے اُن اساتذہ میں آگئے جن کا نام اُسوقت تک زندہ رہیگا جبتک یہ زبان اور اس کا علم ادب زندہ ہے ؛

سلطان عبدالحمید کی معزولی

زمانۂ حال کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ شاید اہمیت میں سلطان عبدالحمید کی معزولی سے بڑھکر نہ ہوگا۔ سارا جہان انگشت بدنداں ہے کہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا۔ مانا کہ وہ جماعت جو "اتحاد و ترقی" کے نام سے قائم ہے زور پکڑ گئی تھی اور فوج کا ایک معقول حصہ اسکے ساتھ تھا۔ مگر اس طرح ایک چشم زدن میں تینتیس سال کے تسلط کا خاتمہ کر دینا باہمہ زور و قوت۔ اُن کے بس کا کام نہ تھا۔ اگر خود سلطان عبدالحمید ہی رضا بقضا تخت و تاج کو چھوڑنا منظور نہ کر لیتا۔ چند مہینوں کے اندر اندر عثمانیوں نے دو مرتبہ مہذب دنیا کو متحیر کر دیا ہے۔ اوّل جب اُنہوں نے سلطان سے دستوری حکومت مانگی۔ اور بے کشت و خون کے حاصل کر لی۔ اور دوسرے جب سلطان کے اقتدار کو دستوری حکومت کی پہلی قربانی بنایا۔ یہ دونوں واقعات تاریخی اعتبار سے اہم تو ہر حال میں ہوتے۔ مگر انہیں عجیب سلطان عبدالحمید ہی نے بنایا۔ اُس کی دوراندیشی۔ اُس کے تدبر۔ اُس کی وطن پرستی نے اُسے مجبور کیا کہ وہ فریق انقلاب پسند کے مُنہ سے آئین کا نام سنتے ہی آئینی حکومت جس کا آغاز اُس کے سنہ جلوس سے ہوا تھا۔ اور جو اُس نے بعد ازاں قبل از وقت سمجھکر چھین لی تھی۔ بحال کر دے۔ اُس نے جب دیکھا کہ لوگوں کا میلان اس طرزِ حکومت کی طرف عام ہے۔ اسکے حامیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور اُن کی طاقت بھی معقول ہو گئی ہے۔ اب زیادہ دیر اُن کو اس مدعا کے حصول سے باز رکھنا سخت خانہ جنگی اور خونریزی کا باعث ہوگا۔ تو نہایت فیاضانہ دانشمندی سے دستور و آئین کو رواج دے دیا۔ ورنہ اگر وہ اڑ جاتا اور اتحاد و ترقی کی کمیٹی کو بزور اپنا مقصد حاصل کرنا پڑتا تو کمیٹی کو بے انتہا مشکلات پیش آتیں اور دیر تک جانیں لڑانے کے بعد اور ملک کو طرح طرح کے خطرات میں ڈالنے کے بعد بھی اُن کی کامیابی یقینی نہ تھی۔ ممکن تھا کہ

جیت اُن کی رہتی۔ لیکن عبدالحمید جیسے زبردست سلطان کے مقابلے میں ہار بھی ناممکن نہ تھی۔ سلطان کی ایک "ہاں" نے ملک کو اور اہلِ ملک کو اس آفت سے بچالیا۔ بلکہ یورپ بھر میں ترکوں کی حسن تدبیر اور خوش فہمی کی دھاک بیٹھ گئی۔ ٹرکی کے قریب ترین شورہ پشت ہمسایوں کے سوا جو پرانی شکستوں کی خلش سینوں میں لئے بیٹھے تھے اور موقع پاپاکر خود مختار بن گئے۔ تمام دول یورپ نے متفق اللفظ ہوکر سلطان اور اُس کی رعایا دونوں کو مرحبا کہا۔ اور مخالفت یا بے پروائی کی بجائی ٹرکی کی موافقت اور خیرخواہی کا دم بھرنے لگے۔ اس طرح سلطان نے بغیر کشت وخون کے معزولی گوارا کر لینے سے دوبارہ دنیا کو دنگ کر دیا ہے اور اپنی جبلی بڑائی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ یقینی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ قسطنطنیہ میں اس معزولی سے تھوڑے دن پہلے جو فساد ہوا تھا اور فوج کے ایک حصہ نے بغاوت کرکے وزارت بزور بدلوائی تھی۔ اس میں سلطان کا ایما تھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ "ترقی واتحاد کی کمیٹی" کو ضرور سلطان پر یہ شبہ ہوا اور اسی وجہ سے اُنہوں نے دستوری حکومت کی حفاظت کی لئے سلطان کو تخت سے اُترنے پر مجبور کیا۔ علمار کے فتوے کا جو بہانہ کیا گیا ہے وہ ایک ایسی چال ہے کہ اُسے معمولی سے معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اگر ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ یہ شبہ بالکل بیجا نہ تھا تو بھی یہ کہنا پڑیگا کہ سلطان نے اس موقع پر خونریزی کے روکنے سے ملک اور اہلِ ملک پر ایسا احسان کیا ہے جو کسی ایسے قصور کی جو اس شبہ پر مبنی ہو تلافی کرتا ہے۔ عبدالحمید اُترنے کو تو تخت سے اُتر گیا مگر اس اُترنے سے بھی صفحۂ تاریخ پر ایک ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا ہے جو دیر تک قائم رہیگا۔

سلطان عبدالحمید کے دورِ حکومت اور ذاتی خصائل کے متعلق ایک مختصر رائے میں نے اپنی کتاب "مقام خلافت" میں لکھی تھی۔ چونکہ اب بھی میری رائے وہی ہے۔ اس لئے یہاں اُس کا ذکر نامناسب معلوم ہوتا ہے:-

"بہ حیثیت مجموعی سلطان عبدالحمید خاں قابل تعظیم سلطان ہیں جن کے ساتھ اُنکے

اکثر ابنائے زمان ناانصافی کرتے ہیں۔ وہ اپنی عادت اور طریق بود و باش میں نہایت سادہ اور بہت سے شاہان سلف کا نمونہ ہیں۔ اُن کے مزاج میں غرور بالکل نہیں۔ نہایت رقیق القلب اور فیاض طبع ہیں۔ اسلام سے سچی محبت رکھتے ہیں۔ اور اسکے ساتھ غیر مسلم رعایا کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ امور خارجیہ میں اُن کی طبیعت خوب لڑتی ہے۔ اور اسی لئے علاوہ اپنے وزیر خارجیہ آپ ہی ہیں۔ اور اگر یہ خیال ملحوظ رہے کہ جب وہ تخت پر بیٹھے ٹرکی کے اکثر شاہزادوں کی طرح باقاعدہ اور اعلٰے تعلیم سے محروم تھے تو اُن کی لیاقت کی اور بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ اُن کے بعد امور خارجیہ کا ایسے سمجھنے والا ٹرکی کو پھر نصیب نہیں ہوگا۔ خود علوم جدیدہ سے واقف نہ ہونے کے باوجود ملک میں تعلیم کو رواج دینا اور خزانۂ سلطنت سے ایک بیش قرار رقم ہر سال اخراجات تعلیم کے لئے جدا کر دینا بھی ایک ایسا کام ہے۔ جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اس سلسلۂ تعلیم کے ذریعے جو دورِ حمیدیہ میں بہ نسبت سابق بہت ترقی پا گیا ہے۔ ہزاروں آدمی کاروبار ملکی میں حصہ لینے کے لئے تیار ہو گئے"

عجیب بات ہے کہ سلطان عبد الحمید کی شکل و مشابہت کے متعلق بھی دنیا میں ایسے ہی مختلف بیان مروج رہے ہیں جیسے اُن کی لیاقت اور طرزِ حکومت کی متعلق۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہیں تصویر کھنچوانے سے طبعی نفرت تھی اور وہ نہ چاہتے تھے کہ ہماری تصویریں اخبارات میں شایع ہوں۔ اس لئے اُن کی کوئی صحیح تصویر دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ سلاملق کے موقع پر جب وہ نماز جمعہ کے لئے محل سے برآمد ہوتے تھے تو اہلکار نہایت احتیاط سے اس بات کی نگرانی کرتے تھے کہ کوئی تماشائی اپنے ساتھ فوٹو کا سامان یا فوری فوٹو لینے کا چھوٹا کیمرا نہ اُٹھا لایا ہو۔ بارہا ایسا ہوا کہ یورپ کے صاحبان اخبار نے اپنے خاص آدمی اس غرض کے لئے بھیجے کہ وہ کسی طرح سلطان عبد الحمید کی صحیح تصویر لے آئیں مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے کوئی برس ڈیڑھ برس ہوا۔ ایک تصویر انگلستان کے ایک ماہوار رسالے میں مشایع

ہوئی تھی۔ جس کی بابت یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ درست ہے اور خاص اہتمام سے بصرف زرکثیر حاصل کی گئی ہے۔ مگر میں نے اس تصویر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بالکل جھوٹا دعویٰ ہے۔ اور مدعی نے نہ صرف عوام کو دھوکا دیا ہے بلکہ خود صاحب رسالہ کو ناحق لوٹ لیا ہے۔ میں جب انگلستان سے بہ عزم سفر ٹرکی روانہ ہونے کو تھا تو مجھے وہاں کے ایک اخبار نویس دوست نے کہا کہ اگر تم وہاں سے سلطان کی صحیح تصویر لاسکو تو جو دام مانگو گے دلا دینگے۔ میں نے کہا کوشش کرونگا۔ استانبول جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی تصویر موجود نہیں اور میسر نہیں آسکتی۔ میں نے اپنے دوست سے آکر کہدیا کہ تصویر تو نہیں ملی۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ میں نے ایک فرانسیسی کتاب کے سرورق پر تصویر دیکھی ہے جسے میں مطابق اصل کہہ سکتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کسی استاد فن نے سلطان کو کئی بار دیکھ کر ہاتھ سے بنائی ہے اور پھر اُس کی نقلیں چھاپی گئی ہیں۔ میرے اخبار نویس دوست نے کہا کہ اس کتاب کا پتہ بتا دو۔ اور یہ بیان لکھوا دو کہ تم سلطان کو اچھی طرح دیکھ چکے ہو اور یہ وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ یہ تصویر اُن سے مشابہت رکھتی ہے تو اتنی بات کے لئے بھی پانچ دس اشرفیاں تمہیں دلا دونگا۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ منظور نہیں کیونکہ استانبول میں سلطان نے مجھے نشانِ عثمانی دیکر مجھ پر اظہار عنایت کیا۔ میرے لئے زیبا نہیں کہ میں اُن کی مرضی کے خلاف اُن کی تصویر کی اشاعت کا باعث ہوں۔ اور اسی لئے میں نے "مقام خلافت" میں اس کے چھپوانے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ غلط تصویریں درست سمجھی جا رہی ہیں۔ تب خیال ہوا کہ جس کو میں درست جانتا ہوں وہ چھپوا دینی چاہیے۔ اس کی پلیٹ بنوانے کے لئے کلکتہ کے ایک کارخانہ کو لکھا اور تصویر ساتھ بھیجی۔ سوءِ اتفاق سے وہ تصویر صاحب کارخانہ نے کھو دی۔ اب اسکی ایک اور نقل کی تلاش کی ہے اور وہ اس رسالہ کے ساتھ شایع کی جاتی ہے۔ حال میں دستوری حکومت کے اعلان کے بعد چند اور تصویریں بھی شایع ہوئی ہیں، جو درست کہی جا سکتی ہیں کیونکہ غالباً ان آخری دنوں میں سلاطین کے موقع پر وہ روک تمام نہیں ہی ہو گی جو پہلے تھی +

اُردو سبھا

مارچ کے مخزن میں اردو سبھا کے متعلق بعض معاصرین کی آرا کا خلاصہ درج ہو چکا ہے بعض اور رائیں ابھی قابل اندراج ہیں اور اُن پر مفصل بحث بھی ابھی باقی ہے۔ مگر اس مرتبہ اُن خطوط کا انتخاب شائع کرنا لازم ہے جو اطراف و جوانب سے اردو سبھا کے قائم کرنے کی تائید میں آئے اور آرہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فہمیدہ اور علم دوست حضرات اس ملکی اور قومی خدمت کی اہمیت کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ اور ہر طرح سے اعانت پر آمادہ ہیں۔ زیادہ مسرت اس بات سے ہوتی ہے کہ تائید کا اظہار صرف مسلمان شعرا و مصنفین کی طرف سے ہی نہیں ہوا بلکہ معقول پسند ہندو اور عیسائی صاحبان نے بھی اس تجویز سے موافقت ظاہر کی ہے۔ بعض حضرات کا خیال تھا کہ ہندو صاحبان کو اس تجویز سے کوئی دلچسپی ہوگی یہ خیال بے بنیاد نہ تھا۔ اس کوتاہ اندیش تعصب پر نظر ڈالیں جو آئے دن اردو ہندی اور اردو پنجابی جیسے قضیوں کا باعث ہوتا ہے۔ اور دھڑے بندی کی بد ترین صورتیں اختیار کرتا ہے تو ہندوؤں کا کسی ایسی تحریک سے جُدا رہنا جو مسلمانوں کی طرف سے شروع ہو۔ یا مسلمانوں کا کسی ایسی تحریک سے علیحدگی پسند کرنا جس کی بانی ہندو ہوں۔ ایک قدرتی بات ہے۔ مگر باوجود ان حالات کے ہماری یہ خواہش بھی کہ کوئی کام تو ایسا نکلے جسے ہندوستان کی مختلف قومیں اپنی متفقہ غرض سمجھیں اور مل کر کر سکیں۔ ایک قدرتی خواہش ہے جس کا پورا ہونا ملک کی آیندہ بھلائی کا ذریعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس آرزو کی راہ میں دشواریاں بیشمار ہیں لیکن استقلال اور نیک نیتی سے آخر کار کامیابی کی قوی اُمید ہے۔ نیک نیتی کے ثبوت کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں اول نیت کا اعلان صاف لفظوں میں دوم اس کے مطابق عمل۔ اعلان آج کئے دیتے ہیں۔ عمل دیکھنے والے بعد کو دیکھ لیں گے۔ ہر شخص کو جو اس اعلان پر بھروسا کر کے اس تحریک میں شریک ہو ہر وقت

مجاز ہوگا۔ کہ عملی طور پر اگر اُسے حالت اُس کے خلاف نظر آئے تو اس تحریک سے قطع تعلق کرلے اور اس کی امداد سے اپنا ہاتھ کھینچ لے۔ وہ ضروری اعلان یہ ہے کہ یہ سبھا اُردو کی خدمت کرنے کی کوشش ایسے اصول پر کریگی جس میں اور زبانوں کے خلاف کوئی کوشش مقصود نہ ہو۔ یعنی اس کا کام ہوگا اُردو کو بجائے خود ترقی دینا نہ کہ کسی اور زبان کی مخالفت۔ فرض کیجئے کوئی ہندو صاحب ہیں جو بھاشا کے حامی ہیں۔ اُردو سبھا اُنہیں یہ کہیگی کہ آپ بھاشا کے حامی رہیئے۔ اگر اسے آپ اپنا مذہبی یا قومی فرض سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک گوشۂ چشم سب کی مشترکہ بولی کی طرف بھی رکھئے جو روزمرہ کے کاروبار میں نہ صرف مفید بلکہ ملک کی عام ترقی اور تجارتی فلاح کے لئے ضروری ہے۔ بنگالی اپنی زبان پر اور اُس کے تازہ لٹریچر پر۔ اور اہل بمبئی مرہٹی اور گجراتی کی روزافزوں کتابوں پر نازاں ہیں اور بجا نازاں ہیں اُن سے یہ کہنا کہ وہ ملک میں ایک عام زبان کو رواج دینے کے لئے اپنی زبان چھوڑ کر اُردو اختیار کرلیں۔ بیجا ہوگا۔ لیکن اگر اُن سے یہ کہا جائے کہ آپ اپنی زبانوں کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ برابر کرتے رہیں۔ صرف تھوڑا سا وقت اردو پر بھی صرف کریں تاکہ ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے اشخاص سے ملاقات کرتے وقت جو زبان آپ کو استعمال کرنی پڑتی ہے۔ وہ بھی آپ کو آسانی سے آجائے تو اس میں کسی معقول آدمی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اُردو سبھا کا منشا یہی ہے کہ وہ بنگالی اور گجراتی بولنے والوں کو اس قسم کی دعوت دے اور جو شریک ہونا چاہیں اُنہیں شریک کرلے۔ اسی طرح پنجاب کے اُس گروہ کو جو ان دنوں پنجابی زبان کو علمی زبان ہونے کے قابل بنانا چاہتا ہے۔ اور پنجابی کی تائید اپنا فرض سمجھتا ہے۔ کہا جائے کہ آپ پنجابی کی جو خدمت آپ سے بن پڑے بیشک کیجئے۔ لیکن جو بنا بنایا ذریعہ تعلیم پہلے سے موجود ہے اور جو عملی طور پر مفید ثابت ہو رہا ہے اُسے بھی اپنے دل میں کم از کم دوم درجہ کی جگہ دیجئے۔ تو انہیں اس میں کیوں عذر ہونا چاہیئے۔ پارسی صاحبان نے گو وہ گھروں میں اکثر گجراتی بولتے ہیں بعض اسباب سے اُردو

کے عام کرنے میں بہت کام کیا ہے۔ وہ غیر فصیح اُردو بولیں یا اُن کا تلفظ صحیح نہ ہو یہ اور بات ہے۔ وہ بہت کچھ معذور بھی ہیں۔ مگر چونکہ تجارت پیشہ قوم ہیں وہ اس زبان سے بالکل غافل نہیں رہتے۔ اُردو میں ڈراما جس حالت تک بھی پہنچا ہے۔ بیشتر ان صاحبوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ پس اگر ان میں سے کوئی صاحب اُردو سبھا کی طرف متوجہ ہوں تو انہیں خیر مقدم کہا جائے۔ اردو سبھا کی یہی خصوصیت اس کی امتیازی صفت ہوگی۔ جو انجمن ترقی اردو وغیرہ جماعتوں سے جو پہلے سے قائم ہیں اسے متمیز کرے گی اور اسی لئے ایک جداگانہ جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے جو بعض چیزوں میں اُن جماعتوں سے متحد اور بعض میں جدا ہو۔ اور جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کرے اگر ابتدا میں ہندوؤں۔ عیسائیوں یا پارسیوں میں نسبتاً کم اصحاب اس کی طرف متوجہ ہوں تو اس سے متردد نہیں ہونا چاہئے۔ وسیع خیال اور دور اندیش لوگ ہر قوم میں اور ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں۔ بنیاد ایسی ڈالنی چاہئے جس پر عمارت بناتے وقت یہ نہ محسوس ہو کہ میدان تنگ گھیر ا یا بنیاد ناقص رکھی۔

موصولہ خطوط کا خلاصہ لکھنے سے پہلے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ چند اخبارات و خطوط میں جو شکوک اس تجویز کے متعلق ظاہر کئے تھے اُن کا مختصر سا جواب ہو جائے۔ اب خطوط کے چیدہ چیدہ فقرے نقل کئے جاتے ہیں:

(۱) مسٹر جی۔ ای وارڈ صاحب پنشنر سول سروس کا خط مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۰۹ء از انگلستان

"اگرچہ میں پچھلے ہفتہ ہی آپ کو خط لکھ چکا ہوں تاہم میں آج پھر چند سطریں لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ میں اُس خوشی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو مجھے مخزن بابت دسمبر ۱۹۰۸ء میں "اردو سبھا" کے متعلق آپ کا اعلان پڑھ کر ہوئی۔ میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کو ایک نیشن بنانے کے واسطے اسی ایک چیز کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ میں آپ کی تجویز کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں"

(۲) مسٹر احمد شاہ صاحب۔ مورخہ ۱۶۔ فروری ۱۹۰۹ء از کراچی۔

"میں نے آپ کا اعلان اُردو سبھا کی بابت پڑھا ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے بہت

خوش ہوا ہوں۔ اپنے دوستوں کے حلقوں میں اس کا ذکر کیا گیا اور سبھوں نے اس تجویز کو نہایت پسند کیا ہے۔ آیندہ جو عملی کارروائی ہو گی۔ اُس سے مطلع کروں گا۔ امید ہے آپ بھی اپنی طرف کے نشو و نماؤں سے اس شجر کی شاخیں کہاں کہاں پھیلتی ہیں۔ اور کس رنگ و بو کے اس میں گل لگتے ہیں ضرور اطلاع دیتے رہینگے اب یہ دیکھنا ہے کہ اہل ملک آپ کے بوئے ہوئے اس پیڑ کو کہاں تک پانی دیتے ہیں اور اس کی پرورش کی کس حد تک دیکھ بھال کرتے ہیں"

(۳) لالہ پیارے لال صاحب مالک ودیا ساگر بک ڈپو۔ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۰۹ء

"آپ کی اُردو سبھا کا تذکرہ سُن کر اس کا ممبر ہونا پسند کرتا ہوں اور آپ کے آئندہ جلسہ میں شریک ہونے کی کوشش کرونگا"

(۴) سردار اودھم سنگھ صاحب بسرا ایم آر۔ اے ایس۔ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۹ء۔ از امرت سر۔

"میں آپ کی اس نادر اور بے بہا تجویز کی سچّے دل سے تائید کرتا ہوں۔ مجھے بھی آپ اس امر میں اپنا خدمت گذار خیال فرماویں۔ کسی قسم کی امداد سے جو امکان میں ہو گی دریغ نہیں کرونگا"

(۵) مولوی محمد خلیل الرحمٰن خاں صاحب اتالیق ہز ہائنس مہاراجہ صاحب بہادر ریاست سرمور۔ ۹ فروری ۱۹۰۹ء از ناہن سرمور "میں آپ کی اردو سبھا کی مفید تجویز سے اتفاق کرتا ہوں اور آپ کی بیدار مغزی اور روشن دماغی کی داد دیتا ہوں۔ کیونکہ اس میں علاوہ اشاعت و حفاظت زباندانی اردو کے ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد اور وداد کی صورت پیدا ہو جانا ایک یقینی امر ہے۔ جو نہایت ہی ضروری اور لابدی ہے"

(۶) منشی محمد علیم اللہ صاحب از باندی کوئی۔ مورخہ ۲۶۔ فروری ۱۹۰۹ء

"خیال اردو سبھا مبارک ہے۔ مگر نام "بزم اردو" کہئے"

(۷) مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ وغیرہ۔ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء از دہلی۔

"اگرچہ سبھا کا لفظ ارتباط و اتحاد کے خیال سے میل جول پیدا کرنے کے واسطے نہایت موزوں ہے مگر صلائے عام وغیرہ دو چار احباب نے چونکہ اس نام کو بے جوڑ یا

غیر مانوس خیال فرمایا ہے اور چند نام بھی جیسے انجمن اردو۔ محفل اردو۔ مجلس اردو تجویز کئے ہیں۔ اگر آپ کو بھی تبدیل نام کی طرف توجہ ہو تو میرے نزدیک بزم اردو زیادہ موزوں اور پیارا نام ہے۔ میں اس تجویز کو جو آپ کو سوجھی نہایت مناسب اور زبان کے حق میں آب حیات سے کم نہیں سمجھتا"

(۸) خان عبدالمجید خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۹ء از راولپنڈی۔ "واقعی بہت عمدہ اور مفید تجویز ہے اور یقین ہے کہ عام طور پر پسند کی جائے گی۔ میں دل وجان سے اس کام میں آپ کا مددگار ہوں۔ اور ہر ایک طرح کی امداد کے لئے تیار ہوں"

(۹) مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی از لکھنؤ۔ "اردو سبھا سے مجھکو پوری ہمدردی ہے شاید اس میں کوئی حصہ لے سکوں"

(۱۰) عبدالرحمٰن صاحب سہواروی۔ از کوئٹہ۔ "عجب نہیں کہ اکیڈمی سو پچاس برس کے عرصہ میں وہ کام بھی کر دکھائے جس کی تکمیل میں پولیٹکل اور تمدنی انجمنیں اب تک ناکام رہی ہیں اور خوف ہے کہ آیندہ بھی کامیاب نہ ہونگی۔ کیونکہ میری ناچیز رائے میں ہمارے ملک کی مختلف قوموں کو جو مذہب اور تواریخ میں ایک دوسرے سے جدا ہیں اب صرف ایک زبان ہی یکزبان کر سکتی ہے"

(۱۱) سید علی احسن صاحب احسن از مارہرہ۔ "اس مبارک تجویز کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ آپ خدا کا نام لیکر اس خیال کو عملی جامہ پہنائیے۔ اور مجھ سے قلمے۔ قدمے درمے جس طرح کی مدد ہو سکیگی اُس کے لئے ہر وقت حاضر ہوں"

(۱۲) حامد حسن صاحب قادری از رام پور "میں نہایت اشتیاق سے اُس دن کا منتظر ہوں جب مبارک اردو سبھا کی بنیاد رکھی جائیگی۔ اور جب ہزاروں آدمی ایک جلسہ میں ان تجاویز پر غور کرنے کیواسطے جمع ہوں گے اور زبان حال سے کہیں گے ع

"اردو زبان کے ہم ہیں اردو زبان ہماری"

(۱۳) نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر از اجیگڈھ سنٹرل انڈیا مورخہ ۴ مارچ ۱۹۰۶ء۔

"اُردو کی ترقی کے لئے دراصل آپ نے اُردو سبھا کی بہت اچھی تجویز کی اور نام بھی ایسا جانچکر رکھا جو دونو فریق (ہندو مسلمان) کے دلوں کو خوش اور راضی رکھ سکتا ہو۔ بعض کوتاہ اندیش بجائے اُردو سبھا کے انجمن اردو وغیرہ نام قرار دینا پسند کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ لفظ سبھا سے کیا کیا باتیں نکلتی اور پیدا ہوتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اسی باہمی پھوٹ نے ہمارے ملک کو غارت کردیا۔ خدا رحم فرمائے۔

جس وقت یہ سبھا ہوگی اور میری زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ بسر و چشم حاضر ہوکر شریک ہونگا اور جو خدمت میرے لائق ہوگی تہ دل سے اس کی تعمیل کرونگا۔

میرے فہم ناقص میں ایک اور بات آئی ہے جس کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک فنڈ بھی "اُردو فنڈ" کے نام سے قائم کردیا جائے۔ اور جس سے جو ہوسکے وہ اپنی حیثیت کے موافق اس میں چندہ دے۔ یہ روپیہ اُن لائق شخصوں کی تصنیف و تالیف یا "کسی مفید و کارآمد کتاب کا ترجمہ" شایع کرنے میں کام دیگا جو بیچارے اپنی غریبی کی وجہ سے خود شایع نہیں کرواسکتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب اُن کی شمعِ حیات گل ہوجاتی ہے۔ تو وہ سب کتابیں بھی ضائع ہوجاتی ہیں اور پھر جن کا تلاش کرنے سے بھی پتہ نہیں لگتا۔

میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ منشی انوار حسین صاحب تسلیمؔ سہسوانی مرحوم نے دو صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے اور جو کہ خاص اُنہیں کی تصنیف و تالیف تھیں جلاکر خاک کردیئے تھے ان میں سے بعض بعض کتاب ایسی بےمثل ولاجواب تھی کہ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ایک تو صرف نحو کی اردو لغت کی۔ اگر یہ شائع ہوجاتیں تو ملک کو بہت فائدہ پہنچاتیں۔ میں نے اور پنڈت بنواری لال صاحب نے پوچھا بھی تھی کہ منشی صاحب! کس واسطے کیا جاتا ہے۔ کہنے لگے کہ "ارے بھائی" اتنا روپیہ کہاں سے لاؤنگا جو انہیں شائع کراؤنگا۔ افسوس! اس فنڈ کے روپیہ سے ہر لائق مصنّف و مولف اور مترجم کا دل ہر طرح راضی اور خوش رکھا جاسکتا ہے۔ چاہے اُنکی کتاب شائع کیجئے چاہے صلہ دیجئے۔ جس وقت لوگ چندہ دینے لگیں گے اُس وقت

مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکیگا نذر کرونگا۔"

(۱۴) عبد الغفور صاحب از علیگڈھ - ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء - "میں اس انجمن کے قیام و اجرا کا دل سے متمنی ہوں - اُردو سبھا کا پہلا اجلاس دہلی میں ہونا چاہئیے - جس طرح ممکن ہو کم از کم پانچ ہزار اشخاص کو اُردو سبھا کی ممبری میں شریک کر کے ہر ایک شخص سے ایک روپیہ سالانہ چندہ وصول کیجئے اور اس رقم سے کوئی علمی کام کیجئے۔"

(۱۵) چند مختصر خطوط اتفاق رائے کے آئے ہیں جن کی عبارتیں نقل کرنا باعث طوالت ہوگا۔ صرف نویسندہ حضرات کے نام لکھ دینا کافی ہوگا۔ منشی عبد الواحد صاحب از رڑکی۔ سید امیر احمد صاحب بخت از اکبر آباد۔ سید محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی از ضلع پشاور۔ مولوی عبد الرؤف صاحب رئیس موائمہ از موائمہ ضلع الہ آباد۔ ڈاکٹر اشرف خاں صاحب از مرزا مہدی خاں صاحب کوکب از حیدر آباد دکن۔ سید حسن عابد صاحب جعفری از آگرہ۔

(۱۶) کارونیشن انجمن ریاست بنگن پلی۔ جنوبی ہند۔ "اراکین انجمن نے مضمون جو "اُردو سبھا" پر رسالہ مخزن میں چھپا تھا۔ بغور و خوشی ملاحظہ کیا۔ ہماری دعا اور خواہش ہے کہ آپ اپنی تجاویز میں کامیاب ہوں۔ اس کے متعلق ہم اپنی خدمت پیش کرنے کے لئے ہر طرح تیار ہیں۔"

(۱۷) خطوط مذکورہ بالا کے علاوہ بعض اور حوصلہ افزا پیام آئے ہیں۔ ہمارے غائبانہ کرمفرما جناب محمد اظہر علی صاحب آزاد ایم۔ آر۔ اے۔ ایس جن کے تراجم شکسپیر شائع اور مقبول ہو چکے ہیں ایک طویل خط تحریر فرماتے ہیں جس کے ہر فقرہ سے ہمدردی ٹپکتی ہے۔ اس کے اقتباس پھر کسی موقع پر درج ہوں گے۔ جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر پنشنر جج الہ آباد نے ایک جملہ میں ایسا وعدہ لکھا ہے کہ اس سے ہماری بیحد ہمت بندھی۔ وہ فرماتے ہیں:۔ "آپ کی اُردو سبھا کی تجویز اگر چل نکلی تو میری بقیہ عمر کے لئے بہترین مشغلہ ہوگا۔" خدا انہیں تادیر سلامت باکرامت رکھے اور اُردو کو ان کی بیش بہا خدمات سے مستفید کرے۔ گذشتہ جنوری جب میں کلکتہ اور پٹنہ گیا۔ اور پٹنہ میں جناب خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد کی ملاقات سے مشرف ہوا تو انہوں نے

کہا کہ "ہم ہر طرح سے اس تجویز کی امداد کے لئے تیار ہیں"۔ اُردو نظم ونثر کے ایسے مسلّم اور مشہور اُستاد کا ایسا وعدہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ کلکتہ کے احباب میں مولوی ابوالکلام صاحب آزاد نے کہا کہ وہ اس تجویز کے واسطے اپنی خدمات کچھ عرصہ کے لئے مفت وقف کرنے اور اپنے صرف سے اس کی تائید کے لئے دورہ کرنے کو آمادہ ہیں۔ میرے دوست ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے اور مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے نے جو کلکتہ کے ذی علم حضرات میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں اس تجویز کے ساتھ اپنی پوری ہمدردی ظاہر کی۔ نواب سید محمد صاحب بہادر انسپکٹر جنرل محکمۂ رجسٹری نے جو نہ صرف قوم کے سرکردہ ارکین میں ہیں بلکہ بحیثیت ادیب شہرت پائدار رکھتے ہیں اس خیال کو پسند فرمایا۔ لکھنؤ میں میرے قدیم عنایت فرما مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا کے ہاں ایک صحبت میں مجھے یہ ذکر چھیڑنے کا موقع ملا تھا۔ گو اُس وقت یہ تجویز ابھی شائع نہیں ہوئی تھی وہاں اُنہوں نے اور جناب سید مہدی حسن صاحب احسنؔ مصنف واقعات انیس نے نہایت گرمجوشی سے اس تجویز کی اعانت کا وعدہ کیا تھا۔ گذشتہ مارچ میں پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی مجھے دہلی میں ملے۔ اور کوئی گھنٹہ بھر تک اس کے عملی پہلوؤں پر گفتگو کر کے ہر طرح سے اس کو مدد دینے کا وعدہ کر گئے۔ اس حوصلہ افزائی کو دیکھ کر اب زیادہ دیر تک مزید آرا کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اندازِ معلوم ہو گیا ارادہ ہے کہ عنقریب ایک ابتدائی جلسہ منعقد کیا جائے ان امور پر غور کرنے کے لئے کہ نام کیا قرار دیا جائے۔ پہلا اجلاس کہاں ہو۔ ممبری کے لئے کیا شرائط ہوں وغیرہ وغیرہ

چونکہ میں اب لاہور میں مقیم ہوں۔ جو احباب قریب رہتے ہیں اور آسانی سے شریک مشورہ ہو سکتے ہیں۔ سردست صرف انہیں کو تکلیف دی جائے گی اور اسکے بعد حسب ضرورت کوئی بڑا جلسہ کسی بڑے مرکز میں جو کثرتِ رائے سے طے ہو جائے قرار پائے گا۔

بعض حضرات پوچھتے ہیں کہ جب اُردو سبھا کی تحریک ہر طرح سے پسند کی گئی ہے

اور اطراف و جوانب سے اُس کی تائید ہوتی ہے تو قایم ہونے میں اب کیا دیر ہے۔ فوراً ایک جلسہ کیا جائے اور اس کی بنیاد ڈال دی جائے۔ ان حضرات کی ہمدردی اور گرمجوشی تو قابل شکریہ و داد ہے مگر میرا خیال ہے کہ انہوں نے میری ابتدائی تجویز کو غور سے نہیں پڑھا۔ کیونکہ اُس میں یہ صاف لکھا تھا کہ آیندہ سال یعنی ۱۹۱۰ء میں کوئی تاریخ اردو سبھا کے پہلے جلسۂ عام یا کانفرنس کے لئے مقرر ہو گی۔ اور وہ جو ایک جلسۂ مشورہ اس سے پہلے منعقد ہونا ہے۔ اس کے لئے بھی میرا خیال یہ ہے کہ کوئی ایسی تاریخ مقرر ہو کہ باہر سے جو صاحبان شریک ہونا چاہیں وہ بہ آسانی شامل جلسہ ہو سکیں۔ جتنی بڑی اور جتنی عالیشان یہ تجویز ہے۔ اس کا اہتمام بھی ہر اعتبار سے اسی پیمانے پر ہونا واجب ہے۔ یہ مناسب نہ ہو گا کہ اس کا کوئی جلسہ بالکل مقامی حیثیت رکھے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ کچھ اصحاب دوسرے مقامات سے بھی شریک ہو سکیں اور کم از کم دور و دراز مقامات کے احباب کی رائیں فیصلہ طلب امور کی نسبت پہنچ سکیں۔

اردو جسقدر محتاج خدمت و توسیع ہے اُس کا احساس اب عام ہوتا جاتا ہے اور جا بجا مجلسیں قائم ہو رہی ہیں جن کا مقصد اُردو کی خدمت اور ترقی ہے۔ ان سب مجالس کے قائم ہونے سے مجھے سچی مسرت ہوتی ہے اور انہی سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ اگر اردو سبھا کی وہ صورت جو میرے ذہن میں ہے عالم وجود میں آ گئی تو ان انجمنوں کے کارکن اس کے دست و بازو ہونگے۔ اور یہ نہ صرف امید ہی امید ہے بلکہ بعض مجالس کی طرف سے مجھے اس قسم کی امداد کا یقین بھی دلایا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور میں کچھ عرصہ سے ایک سوسائٹی بزم اردو کے نام سے قایم ہے اُس کے اراکین نے ایک وفد کے طور پر تشریف لا کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا۔ کہ وہ ہر طرح کی امداد اُردو سبھا کے قایم ہونے کے موقعہ پر دینگے اس سوسائٹی کے ہفتہ وار جلسے کچھ عرصہ سے شروع ہوئے ہیں۔ جن میں اچھے اچھے مضامین نظم و نثر پڑھے جاتے ہیں۔ دو جلسوں میں مجھے بھی شریک

ہونے کا موقعہ ملا ہے۔ اور میں نے اُن جلسوں کو مفید اور کارکنان بزم کو شوق خدمتِ اردو میں سرگرم دیکھا۔ بزم اُردو کے جلسوں کی خبر اخبارات میں پڑھ کر اور ایک جلسہ میں میرا نام بہ حیثیت صدر جلسہ پڑھ کر کچھ لوگوں نے مجھے خطوط لکھے ہیں۔ جن میں مجھے "بزم اردو" قایم کرنے پر مبارکباد دی ہے۔ میں نے ان حضرات کو نج کے خطوط میں تو اطلاع دے دی ہے اور اب بذریعہ رسالہ بھی رفع شک کرتا ہوں۔ کہ "بزم اردو" کے قایم کرنے میں میرا کوئی حصّہ نہیں۔ حاجی رحیم بخش صاحب۔ منشی بشیر حسین خاں صاحب۔ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری۔ خواجہ دل محمد صاحب ایم اے و دیگر "بزم" کے بانیوں اور ممبروں میں ہیں۔ میں فقط اس کے بہی خواہوں میں ہوں۔

مخزن بابت ماہ مئی کے بعد جس میں وہ خطوط شائع کئے گئے تھے جو ہر مذہب و ملّت کے احباب کی طرف سے اُردو سبھا کی ضرورت کے متعلق آئے تھے اس قسم کی تائیدوں اور حوصلہ افزائیوں کی اطلاع شائع نہیں ہو سکی۔ اس اثناء میں معزز ین معاصرین میں سے دو رسالوں نے زبردست تائید کی ہے۔ جو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ سب سے بڑھ کر امید دلانے والی تائید تو لکھنؤ سے آئی ہے میرے نزدیک لکھنؤ سے اُردو سبھا کی حمایت کی صدا بلند ہونا گویا اس تجویز کا چل نکلنا ہے۔ کیونکہ لکھنؤ زبانِ اردو کا ایک بہت بڑا اور مستند مرکز ہے وہاں کچھ عرصہ سے ایک گلدستہ نظم و نثر کا نکلتا ہے جس کا نام معیار ہے اور جو اپنے رنگ میں ایک اعتبار خاص حاصل کر چکا ہے۔ اُس میں دو مضمون لکھنؤ کے دو مشہور مضمون نگاروں کے قلم سے نکلے ہیں۔ میرے غائبانہ عنایت فرما میرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی نے اس تجویز کی تائید بالفاظ ذیل کی ہے۔

"دسمبر ۱۹۰۸ء کے رسالہ مخزن میں شیخ صاحب کی ایک مہتم بالشان رائے دیکھ کر اُردو کے بہی خواہوں کو جو مسرت ہوئی اس کو اُن کا دل ہی جانتا ہے۔ کیونکہ یہ تجویز ایسی نہیں کہ کسی ہمدرد کے دماغ میں نہ پیدا ہوئی ہو۔ مگر اس کی اہمیت نے کسی کو اُبھرنے نہ دیا۔ اس وقت یہ تحریک اُن کی منہ مانگی مراد ہے۔ جناب شیخ صاحب! آپکا قدر دان

عزیز۔ اور انجمن معیار آپ کی اس بیش بہا تجویز پر اتفاق کا ہاتھ اُٹھائے ہے۔ جسقدر کام ہم لوگوں سے ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے ذمۂ ہمت پر لینے کو تیار ہیں۔ عمل کاروائی شروع ہوتے وقت اس کے دستور العمل پر گہری نظر ڈالی جائیگی۔ اس وقت تائید کی آوازیں بلند ہیں۔ کہ اردو کو ایک ایسی مجلس کی سخت ضرورت ہے "

دوسرا مضمون جو معیار میں شائع ہوا ہے وہ جناب محشر لکھنوی کے قلم سے نکلا ہے اس میں یہ تھوڑا سا اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

"ہمارے دوست اڈیٹر مخزن کی تحریک و تجویز پر لکھنؤ یا دہلی کے علاوہ اور اہلِ قلم کمرِ ہمت مضبوط باندھ لیں تو بہت جلد یہ خارزار گلستاں نظر آئیگا۔ کسی جگہ اور کسی مقام پر کوئی متنفس ایسا نہیں جو شیخ عبدالقادر صاحب کی اس بیش بہا تجویز کا تہ دل سے لبیک کہہ کر مؤید نہ ہو ہم سب ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہماری زبان اُردو ہے اُس اُردو کے دامن عاطفت میں جن جن علوم نے پرورش پائی۔ اس کو سب جانتے ہیں۔ بڑی بڑی مبسوط کتابیں۔ دیگر علوم کے درس و تدریس کے وقت انجام کار زبان عالم سے متعلم کے سامنے اُردو میں حل ہوکر پانی ہوجاتی ہیں۔ واعظوں کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی ہو اس کو خدا جانے مگر منبر پر زبان اُردو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لکچرار کوئی ڈگری کیوں نہ حاصل کئے ہوئے ہو۔ اس کے خیالات عرش کمالات کی اعلیٰ بلندی پر متمکن ہوں۔ لیکن اسٹیج پر ہزاروں اَن پڑھ سُننے والوں کے افہام و تفہیم کے وقت اُردو ہی سے مشکل کشائی ہوتی ہے۔ نامی نامی اخبار انگریزی یا کسی اور زبان میں ہوں۔ ان کے روشن صفحات پر قابل نامہ نگاروں کے مضامین کی یہ حالت رہتی ہے کہ جیسے جواہر اور دربارِ بادشاہ۔ مگر اُردو میں ترجمہ ہونے کے بعد یہ صورت ہوتی ہے کہ جیسے بارش بارانِ رحمت۔ اور فائدہ عام"۔

یہ تائیدی رائیں جو اب آرہی ہیں۔ ان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ محض شخصی رائیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ایک جماعت ایک ایک گروہ کی رائے ظاہر کرتی ہیں۔ رسالہ ترقی نے جو لاہور میں عیسائی "ریلجس بک سوسائٹی" کی طرف سے شائع ہوتا ہے

اپنے جون کے پرچہ میں ایک مدلل مضمون "اُردو سبھا" کے عنوان سے لکھا ہو جس سے کامل امید پڑتی ہے کہ ہمارے عیسائی دوست اس تحریک میں ہمارا ہاتھ بٹانے سے دریغ نہ کریں گے۔ اس مضمون میں سے بھی تھوڑا سا حصہ بطور نمونہ درج کرنا ضروری ہے :-

"ہمیں ہماری حالت پر سخت افسوس آتا ہے۔ کسی علم وفن کی ترقی کے واسطے کوئی سوسائٹی موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی کہیں ہے بھی تو تحقیقات اس کا مقصود نہیں۔ بلکہ اختلافات اور تنازعات باہمی کو بڑھانے اور دوستانہ تعلقات کو برد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسی کوئی انجمن نہیں ہے جس کا مقصود ایسا وسیع اور اعلیٰ ہو جس کی ترقی کے لئے تمام فرقے اور گروہ مل کر کوشش کریں اور ہمارے ہاں کی ہفت رنگی آبادی اس میں دل وجان سے شریک ہو۔ اس ضرورت کو ہمعصر مخزن کے پروپرائٹر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے محسوس کر کے "اردو سبھا" کے قیام کی تجویز پیش کی ہے اور اپنے رسالے میں ہر مہینے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ اس کی غرض زبانِ اردو اور اس کے ادبیات کی ترقی اور اشاعت ہے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اور سبھاؤں اور انجمنوں کو جو اسی قسم کے اغراض ومقاصد کی بہبودی وبہتری کے واسطے قایم کی گئی تھیں۔ نقصان پہنچائے۔ شیخ صاحب موصوف کی تجویز نہایت معقول ہے۔ ہمیں اس سے پوری ہمدردی ہے"

رائیں تو اور بھی بہت سی قابلِ اندراج ہیں۔ مگر اس مرتبہ انہی دو تین انتخابات پر اکتفا کرتے ہیں۔ میں ان سب حضرات سے جو مشورہ ابتدائی میں شریک ہونے پر آمادہ ہوں۔ یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اکتوبر میں کوئی تاریخ اس جلسہ کیلئے مقرر کرنے کی نسبت اُنکی کیا رائے ہو۔ ماہ اکتوبر کا آخری شنبہ ویکشنبہ یعنے ۳۰ و ۳۱ تاریخ بظاہر موزوں دن ہیں۔ اگر ان پر کثرت رائے سے اتفاق ہو جائے احباب جلد اپنی رائے سے مستفید فرمائیں تو کوئی ابتدائی جلسۂ مشورہ کے لئے مقرر کی جائے۔ اور اس میں یہ بھی طے ہو جائے کہ کانفرنس یا جلسۂ عام سال آیندہ میں کہاں اور کن دنوں میں منعقد ہو۔

جوان ترک

"جوان ترک"۔ فریق کا نام پہلے بھی بارہا سننے میں آتا تھا۔ مگر حال میں اس جماعت نے شہرت پائدار حاصل کی ہے۔ دولت ٹرکی کو اس انقلاب خاموش سے جو دستوری حکومت قائم کرنے سے ہوا ہے۔ بالآخر نفع ہو یا نقصان سلطان عبدالحمید غازی کی معزولی ملک کے لئے مفید ثابت ہو یا مضر لیکن "جوان ترک" گروہ کے یہ دونوں کارنامے برائی سے یا بھلائی سے ترکوں کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ ہمارے اخبارات میں اس گروہ کا ذکر چھپتا ہے تو ہمارے ابنائے وطن اکثر پوچھتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کے اصول کیا ہیں۔ اور یہ کس طرح کامیاب ہوئے۔ بعض صاحبوں کا یہ خیال ہے کہ یہ پرجوش نوجوانوں کی ایک جماعت ہے۔ جو شوق تغیر کے نشہ میں سرشار ہے۔ یہ خیال زیادہ تر اس لئے بھی پھیلا ہے کہ اکثر اردو تحریرات میں انگریزی اصطلاح "ینگ ٹرک" کا ترجمہ "نوجوان ترک" کیا گیا ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک "ینگ" کا ترجمہ "جوان" ہونا چاہئے۔ نوجوان کہنے سے ایک مغالطہ پڑتا ہے کیونکہ حقیقت میں اس گروہ کی کثیر تعداد نوجوان تو کجا جوان بھی نہیں ہے۔ بہت سے "جوان ترک" جہاندیدہ بوڑھے ہیں۔ جن کے بال سفید ہو چکے ہیں اور جن کی حالت پر لفظ "جوان" کا اطلاق اگر ہو تو اس مصرعہ کے مطابق ہو سکتا ہے کہ ع۔ بہ ہمت جواں دبہ تدبیر پیر۔ اُن کی تدبیر کی پختگی پہلے واقعہ سے ظاہر ہے۔ کہ انہوں نے اچانک آئین طلب کیا اور پا لیا۔ اور اُن کی جوان ہمتی اُس مستعدی سے نمایاں ہے جس سے انہوں نے استانبول میں فوجی بغاوت کے اُٹھتے ہوئے شعلوں کو بجھا دیا۔ مجھے اس وقت اُن کو بڑھانا یا عثمانیوں کے کسی اور گروہ کو گھٹانا منظور نہیں۔ نہ یہ منشاء ہے کہ اُس جماعت کی تعریف کروں جس نے سلطان عبدالحمید کو تخت سے اُتار دیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں اگر وہ سلطان عبدالحمید کو چند سال اور بٹھا دیتے۔ تو بہت سے ملکی مقاصد کے لئے شاید زیادہ مفید ہوتا۔ میں اس موقعہ پر اس امر واقعہ کا

بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آلِ عثمان کے قابل ترین افراد اس گروہ میں شامل ہیں جس زمانہ میں اُنھوں نے اس جماعت کی بنیاد ڈالی۔ اُس وقت وہ جوان ہوں گے۔ لیکن اب وہ معمّر ہیں۔ سب کے سب یا تقریباً سب مغربی تعلیم پائے ہوئے ہیں جو اُنھوں نے فرانسیسی کے ذریعہ سے حاصل کی ہے۔ اور اکثر فرانسیسی بے تکلف بولتے ہیں۔ ان میں جتنے سرگروہ رہنما ہیں وہ بالعموم برسوں یورپ میں جلاوطن رہے ہیں۔ اور ان کے زمانۂ جلاوطنی میں پیرس ان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ احمد رضا بے جو آئینی حکومت کے آغاز میں شورائے دولت کے صدر منتخب ہوئے۔ اور مجلس اتحاد و ترقی کے سرگروہ ہیں پیرس میں بیٹھے مدتوں ریشہ دوانی کرتے رہے ہے۔ ایک چھوٹا سا اخبار "مشورت" نامی وہاں سے نکالتے تھے جو خاصہ بااثر تھا۔ مجھے پیرس میں ان سے ذاتی طور پر ملاقات کرنے اور اُن کے خیالات سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک وضعدار آدمی ہیں۔ جن کا سن بادی النظر میں کوئی پچاس کے قریب ہے۔ ڈاڑھی کے بال سفید ہیں طبیعت غور و فکر کی عادی معلوم ہوتی ہے۔ بات سوچ کر کرتے ہیں۔ لندن میں مجھے ایک دوست نے اُن کا پتہ بتایا تھا۔ وہاں میں گیا تو معلوم ہوا کہ کسی جلسہ میں لکچر دینے گئے ہیں میں جلسے ہی میں جا پہنچا۔ دیکھا تو ایک بڑا مجمع معزز فرانسیسی اصحاب کا وہاں موجود تھا۔ اور احمد رضا بے مذہب اسلام کے متعلق ایک عالمانہ مضمون پڑھ رہے تھے جو بہت پسند کیا گیا۔ جلسہ کے ختم ہونے پر میں اُن سے ملا اور میں نے اُن سے پوچھا کہ پھر کس وقت ملاقات ہو سکتی ہے اُنھوں نے دوسرے دن شام کا وقت مقرر کیا اور ایک رسٹوران کا پتہ بتایا جہاں ان کے اکثر ہم وطن دوست جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ میں دوسری شام کو وہاں گیا۔ اور کچھ دیر تک اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ اُنھوں نے اپنی تجاویز اصلاح سنائیں۔ جن میں سب سے ضروری یہی تجویز تھی کہ پارلیمنٹ قائم کر کے رعایا کے سب طبقوں کو مساوی حقوق دیدیئے جائیں۔ اس کے بعد اُن کے چند ہمراہیوں سے وہیں ملاقات ہوئی میں نے دیکھا کہ وہ احمد رضا بے کو نہ صرف باعتبار لیاقت بلکہ بلحاظ صداقت و راست روی کے نہایت تعظیم کے قابل سمجھتے تھے اور اُن کا

بہت ادب کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک نے یہ بھی کہا کہ احمد رضا وہ شخص ہے کہ اگر کبھی زمانہ ہمارے موافق ہوا اور ہم وطن میں بخیریت پہنچے تو رتبۂ وزارت پائیگا۔ اسی شخص سے یہ معلوم ہوا کہ سلطان عبد الحمید کے چھوٹے بھائی رشاد آفندی جو اب سلطان محمد خامس کے لقب سے ممتاز ہو کر تخت سلطنت پر بیٹھے ہیں "جوان ترک" فریق کے معاون اور ہم خیال ہیں اور نیز یوسف عزالدین آفندی جو سلطان عبد العزیز مرحوم کے فرزند ہیں اور جن کی باری رشاد آفندی کے بعد ہے وہ بھی اسی آزادی پسند گروہ کے موافق ہیں۔ اُس شخص کا بیان یہ تھا کہ رشاد آفندی سے بحیثیت سلطان کسی نمایاں کام کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ صرف اسیقدر ہے کہ وہ کام چلنے دیگا اور اس میں مشکلات نہ ڈالے گا۔ مگر یوسف عزالدین سے زیادہ توقعات ہیں۔ "جوان ترک" جماعت کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ ناممکن ہوتی اگر خود ارا کین دولت میں جو سلطان عبد الحمید کی زبردست حکومت کی ملازمت میں بیش قرار تنخواہیں پا رہے تھے۔ بہت سے لوگ در پردہ "جوان ترک" نہ ہوتے۔ مجھے استانبول میں یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر تعلیم یافتہ شخص در پردہ "جوان ترکوں" کے خیالات سے متاثر ہے یا اُن سے ہمدردی رکھتا ہے لیکن زبان یا قلم سے اس ہمدردی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اُن دنوں گو بظاہر ہمیں دو مہینے میں ایک شخص بھی استانبول میں نہیں ملا جو مُنہ سے کہے یا کہنے کی جرأت کر سکے کہ وہ "جوان ترکوں" میں سے ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اپنے پیارے وطن کو جو سچ مچ بہشت کا نمونہ ہے خیر باد کہے۔ لیکن یوں گفتگو میں بہت سے بڑے بڑے لوگوں کی زبان سے کوئی نہ کوئی فقرہ ایسا نکل جاتا تھا جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکیں کہ وہ سیاسی آزادی کے شوق کا "ثمر ممنوع" چکھ چکے ہیں۔ پرانی وزارت کے جو ارکین اور عہدہ دار پہلے انقلاب کے بعد نئی وزارت میں جگہ پا گئے اُن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کم و بیش رسوخ فرقۂ انقلاب پسند سے رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اُن کا پھر معزول ہو جانا صرف یہی ثابت کرتا ہے کہ وہ مجلس اتحاد و ترقی کا اعتماد حاصل نہیں کر سکے اور اُن کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ دو آقاؤں کو خوش رکھنا چاہتے ہیں ورنہ اگر وہ اصولاً امی مجلس کے

موافق نہ ہوتے تو نہ انہیں کوئی متقرر کرتا اور نہ وہ اس انقلابی حکومت کے ماتحت عہدہ قبول کر سکتے۔

باوجود ہر طرح کی دیکھ بھال اور محکمۂ جاسوسی کی گرما گرمی کے اس جماعت کا چُپکے چُپکے ترقی کرتے جانا اور قوت پکڑ جانا تعجب خیز تو ضرور ہے۔ مگر سمجھ میں آسکتا ہے جو لوگ اصلاح کے مؤید ہونے کی وجہ سے مشتبہ سمجھے گئے اور جلا وطن کئے گئے وہ اصل میں تنہا نہ تھے۔ بہت سے ہم خیال دوست رکھتے تھے جنہیں وہ اپنے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ اُنہوں نے جرأت سے کام لیا اور اپنے خیالات ظاہر ہونے دیئے اُنہیں نکلنا پڑا اُن کے دوستوں نے حیلہ و تدبیر کو بہتر سمجھا اور اصلی خیالات کو دل میں چھپا کر مقتضائے وقت کے مطابق کام کرتے رہے اور منتظر رہے کہ زمانہ کب بدلتا ہے۔ علاوہ بریں ڈاک اپنا کام کیا کی تحریرات اور مطبوعات آزادی کی تلقین لئے ہوئے انہیں برابر پہنچتی رہیں۔ ہر چند کہ عثمانی ڈاکخانہ نے اس شوق میں کہ ہر باغیانہ تحریر اور ہر سازشی خط و کتابت سے مطلع ہو کر سلطان کی خدمت میں خبر پہنچائی جائے۔ ہزاروں خطوط کھولے اور اخبارات کے ہزاروں پرچے ردّی میں پھینکدیئے مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ ڈاکخانہ کا لاکھوں روپیہ کا نقصان ہو گیا۔ جو خطوط معمولی طور پر عثمانی ڈاکخانہ میں ڈالے جاتے اور اُن کا محصول دولتِ عثمانیہ کو ملتا وہ انگلستان اور جرمنی اور روس کے ڈاکخانوں کے ذریعے روانہ کئے گئے۔ وہاں کسی عثمانی افسر کا دخل نہ تھا نہ وہ کسی کے خطوط کھولنے یا دیکھنے کا مجاز نہ رکھتا تھا۔

تحریر میں جو تاثیر ہے محتاج بیان نہیں۔ میں نے استانبول میں بعض نہایت واقفکار اشخاص سے سُنا کہ ایک عبدالحق حامد بے کی کتابوں نے ترکوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور گو حکومت کی طرف سے ملک میں اُن کی اشاعت ممنوع ہو پھر بھی برابر پڑھی جاتی ہیں اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے حامد بے کا شمار بھی درحقیقت جوان ترکوں میں ہونا چاہئے۔ گو وہ دولت عثمانیہ کے دیرینہ اور تجربہ کار عہدہ داروں میں ہیں۔ حامد بے کی عمر اس وقت پچپن سال کے قریب ہو گی

جب میں لندن میں تھا تو وہ سفارت خانۂ عثمانی کے چانسلر تھے اور اس کے بعد سنا ہے کہ ہسپانیہ میں سفیر مقرر ہوئے۔ مدت ہوئی بمبئی میں کونسل جنرل عثمانی کا عہدہ رکھتے تھے۔ اُن کی قابلیت مسلمہ ہے اور اُن کی تصانیف نہ صرف ٹرکی میں مقبول ہیں بلکہ اُن کا شہرہ دیگر ممالک یورپ تک پہنچ گیا ہے۔ ان کی بعض کتابیں ترکی سے دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ کیمبرج کے ایک مستشرق پروفیسر گِب نے عثمانی شاعری پر ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں حامد بے کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جدید انگریزی انسائیکلوپیڈیا میں ترکوں کی ادبیات کے بیان میں ترکی علم ادب کو پانچ دَور پر تقسیم کیا گیا ہے اس میں دورِ پنجم کا حال لکھتے ہوئے یہ لکھا ہے:۔

”عبد الحق حامد بے نے سب سے پہلے یورپ کی طرزِ تحریر سے ترکی نظم میں کام لیا۔ بہت سی عمدہ نظمیں اور ڈرامے اس کی تصانیف میں ہیں اور یہ متفقہ رائے ہے کہ وہ ٹرکی کے موجودہ شعرا میں سب سے اوّل درجہ پر ہے۔ اکرم بے جو اس وقت استانبول کے شعرا کے طبقۂ اعلیٰ میں داخل ہے۔ حامد بے کا مقلد ہے۔“

حامد بے کے ڈرامے آزادی کے خیالات ملک میں پھیلانے کا ایک زبردست ذریعہ ثابت ہوئے۔ فاضل مصنف نے بغیر حاکم وقت پر کوئی حملہ کرنے یا حکومت سے پرخاش کرنے کے آزادی کا شوق اصولی طور پر دلوں میں جاگزیں کر دیا اس سے وہ معتوب ہوا اور گو بہ سبب اپنے اثر کے خدمت سے علیحدہ نہیں کیا گیا لیکن ترقی سے محروم رہا۔ ورنہ یقیناً کسی بڑے مرکز میں سفیر یا خاص پایہ تخت میں وزیر ہو گیا ہوتا۔ حامد بے کا ضبط قابل تحسین ہے۔ میں نے سوائے ایک مرتبہ کے کبھی کوئی ایسا کلمہ اُن کی زبان سے نہیں سنا جس سے معلوم ہو سکتا کہ وہ سلطان یا اُن کے وزرا سے رنجیدہ یا فریق انقلاب پسند کے طرفدار ہیں۔ ایسے ہی دور اندیش اور ضبط والے لوگوں کے دل و دماغ کی برسوں کی محنت سے وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جنہیں آج دنیا تعجب سے دیکھ رہی ہے۔ یہ علم خدا کو ہے کہ وہ نتائج ملک کی ترقی

کے لئے کہانتک مفید ثابت ہوں۔لیکن اتنا تسلیم کرنا محض انصاف ہے کہ "جوان ترک" کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں بلکہ گذشتہ نصف صدی میں جو کچھ علمی ترقی ٹرکی میں ہوئی ہے اس کے بہترین نمونے ہیں۔بعض لوگوں کو ان کے مذہبی عقائد سے بدظنی ہے مگر یہ زیادہ تر بے بنیاد ہے۔ان میں سے بیشتر نہایت درجہ عقیدت مذہب اسلام سے رکھتے ہیں۔البتہ سستیٔ عمل ضرور ہیں یعنی ان کا وہی حال ہے جو بہت سے انگریزی پڑھے ہوئے مسلمانوں کا ہندوستان میں ہے کہیں کہیں ان کے خاص خاص افراد پر بعض یورپین نامہ نگاران اخبار نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ان میں کوئی فلاں قوم سے ہے اور کوئی فلاں نسل سے۔لیکن اس اعتراض کا کوئی اثر کسی ایسے شخص پر نہیں پڑ سکتا جو ٹرکی کے حالات سے آگاہ ہے۔ٹرکی میں عام طور پر اور استانبول میں بالخصوص مختلف قومیں اس طرح مخلوط ہوئی ہیں کہ وہاں اب ان باتوں کی پروا نہیں کی جاتی۔ہر مسلمان یکساں حیثیت رکھتا ہے۔اور اسلامی دنیا اپنے مذہب کے اصول مسلّمہ کے موافق مجبور ہے کہ اس کی وقعت اسکی لیاقت شرافت اور حریت کے معیار سے کرے۔اور اس کے حسب و نسب سے زیادہ تعرض نہ کرے۔

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے شاید یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ "ینگ ٹرکی" غالباً اپنی قسم کی آخری جماعت یورپ میں ہے۔اس سے پہلے دیگر ممالک یورپ میں بعض پولٹیکل جماعتیں اسی طرح کی قایم ہو چکی تھیں۔اس لئے جب ترکوں نے بعض جدید تعلیم پائے ہوئے لوگوں کو سیاسی اصلاح کا خیال ہوا تو اُنہوں نے اپنے ہمسایہ قوموں کی تقلید کی اور اپنی جماعت کا نام بھی اسی قسم کی دوسری جماعتوں کے نام پر رکھا۔(۱۸۳۹ء میں انگلستان میں ایک پارٹی "ینگ انگلینڈ" کے نام سے قائم ہوئی تھی)۔"ینگ جرمنی" نام کی پارٹی جرمنی میں تھی جو ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی ناکامی سے منتشر ہو گئی۔اسی طرح ایک جماعت "ینگ اٹلی" کے نام سے مازینی نے قایم کی تھی جس کی بنیاد مارسیلز علاقہ فرانس میں رکھی گئی تھی۔اور آئرلینڈ میں ایک پارٹی "ینگ آئرلینڈ" کے نام سے ۱۸۴۵ء میں قایم ہوئی تھی۔انہی مثالوں کو دیکھکر ترکوں کو

"ینگ ٹرک" پارٹی قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور سالہا سال تک ایک گونہ گمنامی اور کس مپرسی کی زندگی کے بعد آخر اس کا دور دورا ہوا ہے جو دیکھئے کب تک رہے۔

سر ہنری ارونگ

(ایک چشم دید نظارہ)

اُنیسویں صدی کے آخری حصے اور بیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان کی اُس دُنیا میں جسے سٹیج سے تعبیر کرتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نامور نہیں ہوا جیسے سر ہنری اَرونگ۔ اُن لوگوں میں جن کی محنت۔ لیاقت اور خوش وضعی نے ایکٹر کے پیشے کو انگلستان میں ایک معزز پیشہ اور سٹیج پر کھڑے ہوکر تماشا دکھانے کو ایک فنِ لطیف بنا دیا۔ ہنری ارونگ کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ مجھے انگلستان کے سفر کے زمانے میں ایکٹری کے اس اُستادِ یگانہ کو دیکھنے کا ایک دفعہ موقعہ ملا۔ کیونکہ جب میں وہاں پہنچا تو یہ سُنا۔ کہ سر ہنری ارونگ اب اسٹیج کو خیر باد کہنا چاہتے ہیں۔ لندن سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جاتے جاتے بعض دوسرے اضلاع کی درخواست پر باہر ایک تماشے میں گئے ہوئے ہیں اور وہاں سے واپس ہوکر خانہ نشین ہو جائیں گے۔ میں نے چونکہ اُن کے کمال کی تعریف بہت سُن رکھی تھی اس لئے مجھے اس خبر سے نہایت افسوس ہوا۔ کہ انگلستان میں پہنچکر اور ہنری ارونگ کے زندہ ہونے کے باوجود اس کے کمالِ فن کا نمونہ دیکھنے سے مجھے محروم رہنا پڑیگا۔ لیکن اتفاق سے ایک موقعہ ہاتھ آگیا۔ لندن کے لوگوں کو اس درجہ شوق تھا۔ کہ اُنھوں نے بہ اصرار سر ہنری کو مجبور کیا کہ وہ دورہ سے فارغ ہوکر چند روز پھر لندن کے سٹیج کی رونق بڑھائیں۔ اور اُنھوں نے بیکٹ کا تماشہ چند روز کے لئے لندن میں دکھانا منظور کیا۔ شہر والوں کی خوش قسمتی تھی۔ کہ یہ قرارداد ہو گئی تھی۔ کیونکہ تھوڑے ہی دن بعد سر ہنری کا جام عمر لبریز ہو گیا اور وہ اس دُنیا سے

چل بسے۔ اگر لوگ انہیں پھر بیکٹ بنا ہوا نہ دیکھ لیتے تو اُنہیں نہایت افسوس رہتا
جس دن میں بیکٹ دیکھنے گیا وہ سر ہنری کے آخری دنوں میں سے ایک دن تھا۔
اس دن کا نظارہ عجیب تھا۔ ڈاوری لین کے پُرانے تاریخی اور مشہور تھیٹر میں تل
دھرنے کو جگہ نہ تھی جس وقت پردہ اُٹھا اور سر ہنری بیکٹ کے لباس میں نمودار
ہوئے تو لوگوں نے فرطِ جوش و مسرت میں تالیاں بجانی شروع کیں۔ سر ہنری
جُھک کر آداب بجالائے اور کام شروع کرنے کے لئے لب کشا ہونے کو تھے کہ
پھر اُن کے مداحوں نے "چیرز" کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ جوشِ توصیف پھر بڑھا۔ لوگ اُٹھ
اُٹھ کر رومال ہلاتے تھے اور "چیرز" دیتے تھے۔ یہ دَور ختم ہوتے ہی ایک تیسرا اور شروع
ہوا۔ اور اس کے بعد اُنہوں نے اپنا پارٹ شروع کیا۔ جبتک تماشا ہوتا رہا اور جتنی
دفعہ اس اثنا میں سر ہنری کو لوگوں کے روبرو آنے کا اتفاق ہوا۔ لوگوں کے جوش
کا یہی حال رہا۔ چند منٹ اپنا جوش ظاہر کئے بغیر وہ تماشا چلنے نہیں دیتے تھے۔
بیکٹ کے تماشے کو سٹیج پر لانا اور مقبول بنانا بھی ارونگ ہی سے ممکن تھا
یہ ڈراما ملک الشعرا ٹنی سن کا لکھا ہوا ہے۔ جو خود جانتا تھا کہ اس کے ڈرامے کمرے
میں بیٹھکر پڑھنے کے لئے موزوں ہیں سٹیج پر دکھانے کے لایق نہیں۔ مثلاً اس
ڈرامے میں حسن و عشق جو ہر قصہ کہانی اور ناٹک کی جان ہوتی ہے نام کو نہیں ہنری
دوم شاہ انگلستان کے زمانہ میں ایک ذی علم۔ نیک نہاد اور دیانتدار پادری ٹامس
بیکٹ نامی رفتہ رفتہ اپنی لیاقت اور علم کی بدولت بادشاہ کا مشیر خاص اور سلطنت کا
اعلیٰ عہدہ دار بن جاتا ہے۔ کنٹربری کے مشہور گرجا کا اسقف اعظم ہوکر وہ گرجا کا حامی
اور بادشاہ کی زبردستی اور مداخلت کا مخالف ہو جاتا ہے۔ اس سے بادشاہ اس کی
جان کے درپے ہوتا ہے۔ اور آخر چار سرداروں کو حکم دیتا ہے کہ اس کو قتل کردیں۔
وہ اسے گرجا کے اندر جاکر قتل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ مذہب عیسوی کے مطابق گرجا کے
اندر کسی کا خون کرنا جائز نہیں۔ چہ جائیکہ لاٹ پادری کا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
بیکٹ مذہب کی خاطر جان دینے کو تو دیدیتا ہے۔ مگر اُس دن سے اُس کا شمار ولیوں

میں ہونے لگتا ہے اور صدیوں تک لوگ اس کی قبر کو زیارت گاہ بناتے ہیں۔ اس تاریخی واقعہ کو ٹینی سن نے ڈرامے کی صورت میں نظم کیا ہے اور اس سیدھے سادے بظاہر بے نمک مگر دردناک قصہ کو ارونگ سٹیج پر لے آیا۔ پہلے جب اُس کا یہ ارادہ مشہور ہوا تو نقادوں نے رائے دی کہ یہ تماشا چلنے کا نہیں۔ یہ دکھڑا سننے کے لئے کون تماشے میں جائیگا۔ مگر کمالِ فن اسے کہتے ہیں کہ یہی رونا دھونا اور قتل و خون دیکھنے سننے کے لئے ہزاروں آدمی سینکڑوں مرتبہ جمع ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے نہ تھکتے تھے۔ وجہ کیا تھی فقط یہ کہ ارونگ نے اپنے آپ کو بیکٹ کے سانچے میں ڈھال لیا۔ خدا جانے تاریخ کی کتنی کتابوں کے ورق اُلٹے ہونگے اور ہنری دوم کے عہد اور بارہویں صدی عیسوی میں انگلستان کے پادری اور امرا اور سپہگروں کے عادات و اطوار کے متعلق کیا کیا تحقیقات کی ہوگی جس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ ارونگ کی بیکٹ کے لباس میں نکلتے ہی یہ محسوس ہوتا تھا کہ زمانہ چند صدیوں پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اور دیکھنے والے اچانک یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ بارہویں صدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بیکٹ کی عادات اور خصائل کا جو نقشہ مؤرخوں نے کھینچا ہے اس کے اعتبار سے اس طبیعت اور اس حوصلہ کے شخص کو جیسا ہونا چاہئے تھا۔ ارونگ کی صورت ایسی ہی ہو جاتی تھی۔ عمر کے لحاظ سے اپنی اصلی عمر سے بہت بوڑھا نظر آنے لگتا تھا۔ تقدس کی تصویر مجسم استقلال۔ مکمل خودداری۔ مذہبی آزادی اور اصول کے سامنے بادشاہ کے جابرانہ حکم اور تیغ قاتل کی سینہ پر رکھی ہوئی دہار۔ دونوں سے یکساں بے پروائی بیکٹ کا یہ نقشہ تھا جو ارونگ اپنے کمال سے حاضرین کے سامنے پیش کرتا تھا۔

انگلستان میں بھی وہ زمانہ گذر چکا ہے کہ ایکٹر کا پیشہ نظرِ حقارت سے دیکھا جاتا تھا مگر اس دور میں ارونگ نے مردوں میں اور مس ایلن ٹیری نے عورتوں میں اسے اس رتبہ پر پہنچا دیا کہ بادشاہوں نے اُن کا اعزاز اور قدردانی اپنا فخر سمجھا اور لوگوں نے اُنکی سوانح عمریاں لکھیں۔ متعدد لوگوں نے ہنری ارونگ کی سوانح عمری لکھی ہے ۱۸۸۳ء میں ہڑٹن نے اس کے تھوڑے عرصہ بعد آرچر نے ۱۸۹۳ء میں فٹز جیرلڈ نے اور

۱۸۹۷ء میں کلورٹ نے۔ برٹن نے ۱۹۰۳ء میں ایک کتاب شائع کی جس میں لائی سیم تھیٹر کے حالات بھی تفصیل کے ساتھ شائع کئے۔ جہاں ارونگ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا۔

نائٹ کا رتبہ اور سر کا خطاب ہنری ارونگ کو ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے ۱۸۹۵ء میں عطا کیا تھا اور انگریزی سٹیج کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ کسی ایکٹر کو ایسا اعزاز دیا گیا ہو۔ اس کے بعد اور بھی دو تین شخصوں کے کمال کا اعتراف اس طرح گورنمنٹ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ مگر ارونگ کو جو مقبولیت حاصل تھی وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ عزت ہے جو اسے پس مرگ دی گئی۔ ۱۹۰۵ء میں اس کا جنازہ اس دھوم سے اٹھا۔ کہ لندن سے اکثر اکابر۔ علما اور فضلا شریک ہوئے اور اسے وسٹ منسٹر ایبے میں دفن کیا گیا جہاں انگلستان کے بادشاہ اور وزرا اور شعرا اور دیگر ایسے مشاہیر مدفون ہیں جن کے احسانات کا بوجھ ملک و قوم کی گردن پر ہے۔ سنا ہے کہ ہنری ارونگ۔ ذاتی طور پر بہت مخیر شخص تھا اور خاصکر اپنے فن کے غریب لوگوں سے در پردہ بہت اچھا سلوک کرتا تھا اور ویسے بھی کوئی حاجتمند جس کا حال اسے معلوم ہو اس کی مدد اور ہمدردی سے خالی نہیں رہتا تھا۔ ارونگ کا سنہ پیدائش ۱۸۳۸ء ہے۔ گویا ۶۷ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ اس وقت بظاہر توانا معلوم ہوتا تھا۔ ڈاڑھی مونچھ دونو کا چونکہ صفایا تھا۔ اس لئے سوائے سر کے بالوں کی سفیدی کے کوئی آثار بڑھاپے کے نمایاں نہ تھے۔ مگر ایکٹر کی پرصعوبت زندگی اندر ہی اندر اس کا کام تمام کر چکی تھی راتوں کو دیر تک جاگنا اور دن کو رات کے لئے تیاری کرنا کوئی کھیل نہیں۔ جو اس فن کو فن سمجھکر کرتے اور اپنے فرض کو فرض سمجھکر ادا کرتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ یہ تو پھر بھی انگلستان کی آب و ہوا کو دعائیں دیں۔ کہ کیسی ہی سخت محنت کی زندگی کیوں نہ ہو۔ اہل انگلستان ان لوگوں سے جو گرم ملکوں کی روح فرسا گرمی میں جیتے ہیں۔ زیادہ دیر تک زندہ اور تندرست رہ سکتے ہیں۔

سر ہنری ارونگ کی اولاد بھی "علم پدر آموز" پر عمل کرکے اسی فن میں داخل ہوئی ہے

جس میں سر ہنری نے اسقدر نام پیدا کیا اور اس کا ایک بیٹا اس وقت اچھے ایکٹروں میں شمار ہوتا ہے۔ گو اس میں بھی شک نہیں۔ کہ باپ کا نام بھی اسے بہت کچھ فائدہ پہنچا رہا ہے +

سیپ کا گھر

انگلستان کے ساحل بحر کے مشہور قابل سیر مقامات میں ایک مارگیٹ نامی ہے جس میں تہ خانہ واقع ہے جس کی سب دیواریں سیپ کے بنے ہوئے بیل بوٹوں سے آراستہ ہیں۔ اُن میں سے ایک دیوار کی تصویر بطور نمونہ ہدیہ ناظرین ہے جس خوبی سے اس تہ خانہ کے غیر معلوم صناع نے دیواروں پر سیپ اور گھونگے جوڑ جوڑ کر نقش و نگار پیدا کئے ہیں۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ تصویر سے اس کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے اور نہ الفاظ اس کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ اوائل ۱۹۰۷ء میں انگلستان سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے اس تہ خانہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا صنعت کے اعتبار سے تو یہ سیپ کا گھر بہر حال دلچسپ ہوتا۔ مگر جو چیز مجھے خصوصیت سے دلچسپ معلوم ہوئی وہ اس کی مشرقیت تھی۔ اس کی بنا کی ابتدا کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ اور اُن سب کا مختصر ذکر میں کرونگا۔ لیکن مجھے ان میں سے کوئی اطمینان دہ نہیں معلوم ہوتی۔ جن انگریزوں نے اس تہ خانہ کے حالات لکھے ہیں وہ بھی اسقدر تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تہ خانہ اسرار سے خالی نہیں اور اس کی نسبت جو کچھ معلوم ہے۔ اس سے زیادہ ابھی دریافت کرنے کو باقی ہے۔ تاہم یہ کسی نے صاف طور پر نہیں لکھا کہ اسے دیکھکر یہ خیال اغلب نہیں معلوم ہوتا کہ کسی زمانہ میں کسی ایشیائی دستکار کے ہاتھوں سے ان دیواروں کی آرائش ہوئی ہو تو تعجب نہیں اور اس قیاس کے صحیح ثابت ہونے سے ممکن ہے کہ اب سے چند صدی پیشتر کے تعلقات انگلستان اور ایشیا کا کچھ پتہ چلے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس تہ خانہ کے گل بوٹوں کی جو اسے انگلستان کے اور تہ خانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ بلکہ یورپ کے بعض مشہور تہ خانوں سے بھی جدا رنگ میں دکھاتی ہے

وہ سورج مکھی پھول ہیں جو جا بجا اس کے در و دیوار کی زینت ہیں۔ اور سورج مکھی پھول کو جو تعلق ایشیائی تخیل سے اور ایشیائی مذاہب سے ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یورپ کی اقوام قدیم و جدید کو وہ خصوصیت سورج مکھی سے حاصل نہیں۔

سیپ کے اس عجیب و غریب گھر کی بنا کی بابت روایات مختلفہ بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں جو اور تہ خانہ تاریخی اعتبار سے کم و بیش شہرت رکھتے ہیں۔ اُن کا تھوڑا سا تذکرہ کر دیا جائے۔ ایک تہ خانہ مقام ٹونکنہم کے قریب واقع ہے۔ جسے مشہور انگریزی شاعر الگزانڈر پوپ نے بنایا تھا۔ پوپ ایک نیا باغ بنا رہا تھا اور اسے اپنے پرانے باغ سے ملانے کے لئے اُس نے ایک زیر زمین راستہ اور اسی کے ساتھ ایک تہ خانہ بنایا۔ جس پر اسے بہت ناز تھا۔ اُس نے ۱۷۲۵ء میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں اپنے تہ خانہ کی تعریف لکھی۔ اور اُسے یہ بتایا کہ میں نے اسے بہت سادہ وضع میں گھونگوں سے سجایا ہے امتداد زمانہ سے پوپ کا یہ تہ خانہ گو بوسیدہ ہو گیا ہے۔ مگر اب تک موجود ہے اور لوگ اسے دیکھنے جاتے ہیں اٹھارہویں صدی کی ساخت کے دو اور تہ خانے ہیں جو پوپ کے تہ خانہ کے بعد بنے ہیں۔ ان میں سے ایک مقام وسے برج کے پاس ہے جو ایک وقت میں شاہی عیش گاہ تھا۔ اور رات کو بادشاہ وہاں جا کر داد عیش و تفریح دیا کرتے تھے۔ ڈیوک آف نیو کاسل نے اسے بنوایا تھا اور کہا جاتا ہے کہ ۶ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔

دوسرا اوسیلڈن ہوس کہلاتا ہے۔ مگر وہ نہ اتنا بڑا ہے نہ خوبصورت۔ اس کے بعد ۱۸۷۳ء میں جان سکاٹ نامی شاعر نے اپنے باغ میں مقام ویر کے قریب ایک تہ خانہ بنایا جو اب تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو بھی اس نے سیپ اور گھونگے سے سجایا تھا۔ اس میں سات کمرے ہیں۔ برسوں اپنے اوقات فرصت میں سفید پتھر کی چٹانوں کی خارا شگافی کیا کرتا تھا اور اس تہ خانہ کے لئے جگہ بناتا تھا۔ ڈاکٹر جانسٹن جیسے شخص کو بھی جو عموماً خوبصورت چیزوں کی شناخت سے بے بہرہ تھا یہ

باغ اور تہ خانہ پسند آیا تھا۔ اور اس نے ایک موقعہ پر یہ کہا کہ سوائے کسی شاعر کے کوئی ایسا باغ نہیں بنا سکتا تھا۔

مارگیٹ کا تہ خانہ ان سب تہ خانوں سے زیادہ خوبصورت اور پر اسرار ہے۔ اسکی بنا کی ٹھیک تاریخ تو کسی کو معلوم نہیں۔ اسکے دریافت کا ذکر ۱۸۳۵ء کے ایک اخبار مورخہ ۶ اگست میں مندرجہ ذیل الفاظ میں درج ہے:۔

"مارگیٹ میں ایک وسیع تہ خانہ دریافت ہوا ہے جو پہاڑی کے نیچے دور تک چلا گیا ہے۔ اس میں راستے بنے ہوئے ہیں اور راستوں کی دونوں طرفیں سیپ سے آراستہ ہیں۔ جن میں طرح طرح کی خوبصورت بیلیں بنی ہوئی ہیں۔ جو بلاشبہ بڑی محنت سے مشعل کی روشنی میں بنائی گئی ہیں۔ یہ جگہ اتفاقیہ طور پر دریافت ہوگئی ہے۔ جس زمین میں یہ تہ خانہ نکلا ہے اس کا مالک کسی ضرورت سے زمین کھدوا رہا تھا۔ کہ یہ تہ خانہ نظر آگیا۔"

یہی بیان مستند معلوم ہوتا ہے۔ باقی سب کہانیاں ہیں کوئی تحقیق بات نہیں تاہم جو روایات مروج ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ انگلستان کے قدیم باشندوں کا (جو ڈروئڈ کہلاتے تھے) ایک مندر تھا۔ یہ کسی پرانے زمانے کے بادشاہ کا مقبرہ تھا۔ رومن زمانہ کی یادگار ہے اور اہل روما نے اپنے عہد میں مردوں کے دفن کرنے کے لئے بنایا تھا۔ قدیم ایران کے ایک دیوتا کا مندر تھا۔ پرانے زمانے کے راہبوں کا مسکن تھا۔ ان روایات کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات اس کی نسبت عوام میں مشہور ہیں کوئی کہتا ہے کہ یہ چونے کا بھٹہ تھا۔ جس میں کسی نے بعد کو سیپ جڑلی۔ دوسرا بتاتا ہے کہ کسی قزاق کا گھر تھا۔ جس میں وہ چھپا رہتا تھا۔ اسی طرح اس کے دریافت ہونے کے متعلق مختلف کہانیاں ہیں۔ بعض کہتے ہیں اتفاق سے ایک اوزار ایک سوراخ میں گرا اور گم ہوگیا۔ اس کو تلاش کرتے کرتے یہ تہ خانہ مل گیا۔ کوئی کہتا ہے۔ کوئی بلی کسی راستے اس کے اندر گھس گئی تھی۔ جب اسے نکلنے کی راہ نہ ملی اور اس نے دردناک آواز سے میاؤں۔ میاؤں شروع کی جس کا مدعا یہ تھا کہ کوئی آ کے نکالے تو اس کی آواز سے

اس تہ خانہ کا پتہ چلا- اسی طرح اس کے بنانے والے کی بابت کئی روائتیں ہیں بعض کے نزدیک ایک سیّاح نے اسے بنایا جو الحمرا کو دیکھکر آیا تھا- کوئی کہتا ہے کہ اس نواح کے ایک مشہور معلّم نے اسے بنوایا اور وہ لڑکوں کو سزا کے طور پر اس کے اندر بند رکھتا تھا- یہ سب باتیں بناوٹی اور غیر محقق ہیں- وثوق سے جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اِسی قدر ہے کہ جس کسی نے بنایا ہے اُس نے نہایت درجہ کی محنت اور نہایت درجہ کی کاریگری اس کے بنانے میں صرف کی ہے- ایسا سادہ مسالہ- اور اس پر ایسی خوبصورت گلکاری اور ایسی حالت میں کہ کام زیر زمین اندھیرے میں صرف چراغ یا مشعل کی روشنی سے کرنا پڑے- صبر و تحمل- قابل داد اور شوق قابلِ تحسین ہے-

جس دن سے دریافت ہوا ہے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے- اور جو لوگ مارگیٹ جاتے ہیں وہ اکثر اسے دیکھے بغیر نہیں آتے- دروازہ پر چھ پنس دیکر ایک ٹکٹ لینا ہوتا ہے- جسے دکھا کر اندر جاتے ہیں- دیکھنے والے جس راستے سے داخل ہوتے ہیں وہ کوئی چار فیٹ چوڑا ہے- گاس کے دھوئیں سے اور آمد و رفت کی کثرتِ سے اس راستہ کی چھت کالی اور دیواریں میلی ہو رہی ہیں- یہ راستہ کسیقدر پیچ کھاتا ہوا چلا جاتا ہے- یہاں تک کہ ایک محراب تک پہنچتے ہیں- اس کے اندر قدم رکھتے ہی سیپ سے آراستہ در و دیوار کی ایک بھول بھلیاں سی پیش نظر ہوتی ہے- اور آدمی کو متحیر کر دیتی ہے- محرابوں کی صورت چودھویں صدی عیسوی کی تعمیر پر دلالت کرتی ہے سیپ جوڑ جوڑ کر سورج مکھی کے پھولوں کی صورت جا بجا پیدا کی گئی ہے- ایک آدہ جگہ کھجور کی شاخ بنی ہے جو اہل روما کے مقبروں میں نظر آتی ہے- ایک اور موقع پر ایک نہایت خوبصورت گلِ سوسن بنا ہے جو اوپر جا کر گلِ نیلوفر کی صورت بنگیا ہے یہ گل سوسن اور گل نیلوفر کا ملاپ مشرق کے علوم باطنی کے ماہروں کے نزدیک خاص معانی رکھتا ہے- جس سے اہل مغرب عموماً بے خبر ہیں- کبھی کوئی ان پھولوں کے معانی جاننے والا وہاں پہنچیگا تو بتا سکے گا

کہ یہ نقش جن کی خوبصورتی کی تعریف ہر کو مہ کرتا ہے۔ محض خوبصورت ہی نہیں بلکہ خاص معانی رکھتے ہیں۔ بعض حصے بڑ لطیفی نقش و نگار کے نمونہ پر ہیں۔ غرض جو کچھ بھی ہو اس کی دستکاری انگلستان کے باقی تہ خانوں کی دستکاری سے جدا ہے اور بہت سے قرائن مشرقی دستکاری ہونے کے اس میں موجود ہیں۔ پھولوں کے علاوہ ستاروں کی شکلیں بھی اس تہ خانہ کے در و دیوار پر مبنی ہیں۔ جس سے اس خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ کسی ایسی جماعت کی ساخت ہم دیکھ رہے ہیں جو نجوم قدیم سے واقف تھی اور اس تعمیر میں اپنے عقائد کا اظہار کر رہی تھی۔ ایک اور بات اس نقش و نگار میں قابل ذکر ہے۔ کہ سارے تہ خانہ میں کہیں صلیب کا نشان نہیں ہے جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کہ ممکن ہے کہ یہ تہ خانہ انگلستان میں عیسوی مذہب کے رواج پانے سے پہلے بنا ہو یا عیسوی عہد میں کسی ایسی قوم کے افراد نے بنایا جو مذہب عیسوی کے معتقد نہ تھے ورنہ ایک آدہ نشان صلیب تبرکاً ہی موجود ہوتا +

اگر کبھی اس تہ خانہ کی بنا کی اصلیت منکشف ہوئی اور یہ مضمون قیاسات کی حد سے نکلکر یقین کے درجہ کو پہنچا۔ تو اُمید کی جاسکتی ہے۔ کہ یہ ثابت ہو جائے گا۔ کہ یہ سیپ کا خوبصورت گھر انگلستان میں اہل مشرق کی صنعت کی یادگار ہے اور قدیم زمانہ میں بھی مشرق و مغرب کے ممالک کے درمیان آمد و رفت بہت کچھ جاری تھی +

رموزِ بیخودی

مثنویاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جائینگی۔ لیکن یہ امتیاز شاید کسی کسی کو حاصل ہو کہ ملک و قوم تک کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لئے مثنوی کو ذریعۂ اظہار خیال بنایا جائے۔ خدا جزائے خیر دے شیخ محمد اقبال کو جنھوں نے اس زمانۂ انحطاط میں ملتِ اسلامیہ کو مثنوی "اسرار خودی" کے ذریعہ سے پیغام عمل دیا ہے اور "رموزِ بیخودی" میں مژدۂ حیات سنایا ہے۔

دنیا میں سب سے بڑی مثنوی غالباً مثنویِ مولانا روم (علیہ الرحمۃ) ہے جس کو اسلامی ممالک میں اکثر لوگ قرآن مجید کے بعد اعلیٰ درجہ کی مذہبی کتاب سمجھتے ہیں۔ اور "قرآن در زبانِ پہلوی" کا خطاب دیتے ہیں۔ اس کی زبان ایسی سلیس اور اندازِ بیان ایسا دلنشین ہے کہ خاص و عام میں مقبول ہے۔ یہ عالیشان مثنوی ایک دریائے ناپیدا کنار ہے اس کی کئی ضخیم جلدیں ہیں جن میں کلام الٰہی کے ضروری مسئلے جابجا عام فہم پیرایہ میں اور مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے لوگوں کو سمجھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد مذہب اسلام کی خدمت ہے۔ تصوف کا عنصر اس میں غالب ہے اور اس لئے یہ کتاب علما اور صوفیا دونوں میں مقبول ہے اور فلسفی بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" میں طرزِ مثنوی مولوی معنوی کا تتبع کیا گیا ہو۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ان دو مختصر مثنویوں کا مولٰنا روم کی عظیم الشان کتاب سے مقابلہ کیا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ نسبت ضرور ہے کہ اقبالؔ نے مثنوی شریف کی شیریں زبان اپنی مثنویوں کے لئے اختیار کی ہے اور مثنوی کی مقبول بحر تبرکاً اپنے لئے انتخاب کی ہے۔ جناب مولانا علیہ الرحمۃ کا فیضِ معنوی سمجھئے کہ ان دونو مثنویوں میں ایک خاص تاثیر موجود ہے۔ ذیل کے اشعار میں "اسرارِ خودی" کی تمہید میں اقبالؔ نے خود اس فیض کا اعتراف کیا ہے ؎

این قدر نظارہ ام بیتاب شد — بال و پر بشکست و آخر خواب شد
روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت — کہ بحرفِ پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانہ اربابِ عشق — جرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق
بر جگر ہنگامۂ محشر بزن — شیشہ بر سر دیدہ بر نشتر بزن
آشنائے لذتِ گفتار شو — اے درائے کارواں بیدار شو

"درائے کارواں" یعنے اقبالؔ نے بیدار ہو کر اس ارشاد کی تعمیل کی ہو سوز و گداز خدا نے فطرت میں ودیعت کیا تھا۔ ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر پڑتے ہی وہ سوز و گداز نالۂ نے کی طرح فریاد بن کر سینہ سے نکلا اور پکارا۔ کہ دنیا میں وہی افراد

زندگی کا فرض کما حقہٗ ادا کرتے ہیں۔ جو لذتِ عمل سے بہرہ یاب ہیں اور جو قوتِ عمل کھو بیٹھے ہیں یا محوِ خیال ہو بیٹھے ہوں۔ اُن کا شمار زندوں میں نہیں۔ اس ایک مضمون کو کئی پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے اور کئی تشبیہوں سے اور کئی مؤثر مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ "اسرار خودی" کے لئے ایک بسیط ریویو جداگانہ درکار ہے۔ جو کچھ کبھی (اگر حالات مساعد ہوئے) لکھا جائیگا۔ اخبارات میں اُس پر بہت لے دے ہو چکی ہے اور بہت کچھ اس کی تعریف میں لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت تو اس مثنوی کے دوسرے حصے سے بحث ہے جو حال میں شایع ہوا ہے۔ اور جس کا نام رموزِ بیخودی رکھا گیا ہے۔

اگر صرف دونوں مثنویوں کے ناموں کو سرسری طور سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ حضرت اقبال نے اضداد کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ نکتہ چینی زبانِ قلم سے بے اختیار نکلنے کو ہوتی ہے کہ پہلے تو ملتِ اسلامی کو پیغام دیا کہ اس کا ہر فرد خودداری سیکھے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہدِ زیست کے میدان میں مردانہ کارزار کے لئے تیار ہو۔ اور پھر دوسری کتاب میں خود ہی خودی سے بیگانہ بنکر وہی بیخودی کا جادۂ فرسودہ اختیار کر لیا۔ لیکن جب "رموزِ بیخودی" کو غور سے پڑھیں تو یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ اول تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے "رموزِ بیخودی" میں ان اصول سے بالکل انحراف نہیں کیا جو "اسرارِ خودی" میں اصولِ زندگی قرار دیئے گئے تھے اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں افراد کے لئے خودی اور خودداری ذریعۂ استواری ہے وہیں افراد کا اپنی ہستی قومی میں محو کر دینا اور اپنی انفرادی زندگی کے جزو کو قومی زندگی کی کُل میں شامل کر دینا قومی ترقی کے لئے لازم ہے اور اس کو بیخودی سے تعبیر کیا گیا ہے گویا یہ وہ بیخودی ہے جو خودداری اور خودشناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو فرد و قوم دونوں کے لئے عین نفع ہے۔ اس مثنوی میں یہ مضمون کس خوبی سے ادا ہوتا ہے ؎

تو خودی از بیخودی نشناختی — خویش را اندر گماں انداختی

جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو — یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو

خوگر پیکار پیہم دیدمش ہم خودی ہم زندگی نامیدمش
چوں ز خلوت خویش را بیروں کشد پائے در ہنگامۂ جلوت نہد

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گلبر گے چمن گردد خودی
(رموز بیخودی صفحہ ۵۴ و ۵۵)

یہ اصول ذہن نشین کرتے ہوئے شاعر مطلب کی طرف آتا ہے اور یہ بتلاتا ہو کہ ربطِ افراد کا نام ہی ملت ہے۔ اور افراد کی ہستی کے قیام کا مدار اسی ارتباط پر ہے اور اس دعوے کی زبردست دلیل نیچر کا مشاہدہ ہےo

مدعائے ما۔ مآلِ ما یکے است طرز و اندازِ خیالِ ما یکے است
ماز نعمتہائے او اخواں شدیم یک زباں و یکدل و یک جاں شدیم (صفحہ ۱۰-۱۱)

قومی زندگی کی بنیاد یکدلی پر رکھکر قومی خیالات کی تدبیروں کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔ پہلے تنبیہ کی ہے کہ یاس و ناامیدی قومی زندگی کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہیں۔ ترقی چاہنے والی قوموں کو چاہئے کہ ناامیدی کو پاس نہ آنے دیں۔ حوصلے بلند رکھیں اور سرگرم جستجو رہیں۔ ناامیدی عموماً خوف سے پیدا ہوتی ہے یا غم سے۔ اس لئے خوف اور غم سے بھی الگ رہنا چاہئے۔ اس ہدایت پر عمل کی تاکید کرتے ہوئے مثنوی میں آیات و احکام قرآنی کے حوالے پیش کے گئے ہیں اور بتایا گیا ہو کہ سوائے خدا کے کسی سے ڈرنا شانِ ایمان کے خلاف ہے اور جب بیم غیر اللہ سے نجات ہو۔ تو کوئی کام ایسے آدمی کے لئے دشوار نہیں ہوتاo

بیم چوں بند است اندر پائے ما ورنہ صد سیل است در دریائے ما (صفحہ ۴)

اس سلسلہ میں ایک حکایت اورنگ زیب عالمگیر کی درج کی ہے۔ جس پر جنگل میں نماز پڑھنے کی حالت میں شیر نے حملہ کیا۔ مگر بادشاہ اس سے نہ ڈرا۔ اور بغیر تاک کر ضرب لگانیکے اس نے خنجر کا ایسا وار کیا کہ شیر کو ہلاک کر دیا اور پھر مصروفِ نماز ہو گیا۔ اس حکایت کو نظم کرتے ہوئے اورنگ زیب کی خدماتِ مذہبی کی تعریف کی ہے اور اس ساری تعریف کی جان یہ شعر ہے جو عالمگیر کی شان میں کہا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ کی بلاغت خصوصاً قابلِ داد ہےo

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں ترکشِ ما را خدنگ آخریں۔ ص۱۳۶

اس کے بعد ملتِ اسلامی کو بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا باہمی رشتہ جناب رسالتمآب صلعم کی ذاتِ بابرکات کی بدولت مضبوط ہے ؎

از رسالت ہم نوا گشتیم ما ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود پختہ چوں وحدت شود ملت شود ص۱۴۲

پھر ملتِ اسلامی کی خصوصیات چند پُرمعنی شعروں میں بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ حُرّیت اور مساوات اس ملت کی سرشت میں داخل ہیں۔ اسلامی مساوات کی تمثیل کے طور پر ایک دردانگیز تاریخی روایت نظم کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سلطان مراد نے ایک مسجد بنوائی تھی جو ملک خجند کے رہنے والے ایک پردیسی معمار نے بنائی تھی۔ بادشاہ کو اُس کی عمارت کچھ ناپسند ہوئی۔ اور اُس نے معمار کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اُس معمار نے قاضی کی عدالت میں بادشاہ کے برخلاف استغاثہ کیا۔ بادشاہ عدالت میں طلب کیا گیا۔ قاضی نے مقدمہ سننے کے بعد فتویٰ دیا۔ کہ ؎

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

یہ فتویٰ سُن کر بادشاہ نے اپنا ہاتھ کاٹے جانے کے لئے پیش کیا ؎

چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید دستِ خویش از آستیں بیروں کشید

مدعی را تابِ خاموشی نماند آیۂ بالعدلِ والاحسان خواند

گفت از بہرِ خدا بخشیدمش از برائے مصطفےٰ بخشیدمش ص۱۵۴

یعنے قانون نے ہاتھ کاٹنے کے عوض میں ہاتھ کاٹنے کا فتوےٰ دیدیا۔ مگر خود مستغیث کو رحم آگیا اور اُس نے بدلہ نہیں لیا۔ اور بادشاہ کو معاف کر دیا۔ آگے چل کر میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے متعلق ایک پُردرد باب لکھا ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت حرّیت کی بنیاد رکھنے کے لئے اور ضمیرِ انسانی کا حق آزادی قایم کرنے کے لئے تھی ؎

ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

خون او تفسیر این اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

اقبال نے ایک باب ہجرت پر لکھا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس میں معنی آفرینی کی داد دی ہے۔ مقصود تو اس باب سے وہی ہے جو پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ ملت اسلام کی بنیاد مذہبی یگانگت پر ہے۔ اور یہ کسی خاص ملک یا وطن کی پابند نہیں۔ مگر اس باب میں مصنف نے اپنے دعوے پر ایک زبردست دلیل ہجرت نبوی کے مسلمہ واقعہ سے پیدا کی ہے۔ یعنے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو مکہ شریف سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں جا بسے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ فی الحقیقت دشمنوں سے عاجز آ کر بھاگ گئے تھے۔ بلکہ اس میں یہی حکمت چھپی تھی کہ اسلام کی عالمگیری کی بنیاد پڑے۔ اور اسلام کے نام لیوا ہر جگہ اپنا وطن بنائیں اور وہاں نور اسلام پھیلائیں ؎

آنکہ در قرآں خدا او را ستود
آنکہ حفظ جان او موعود بود

دشمناں بیدست و پا از ہیبتش
لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش

پس چرا از مسکن آبا گریخت ؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت ؟

قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند

ہجرت آئین حیات مسلم است
این ز اسباب ثبات مسلم است

اس کے مقابل میں ملت کی بنا وطن پر رکھنے کا جو خیال ہے اور جس کے خلاف دلائل چند اشعار میں اس سے پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ ان پر اس باب میں اقبال نے ایک اور دلیل اضافہ کی ہے اور وہ تمام انسانی اغراض کے لحاظ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف جغرافی قطعات میں سے ایک قطعہ بنائے ملت قرار پانے سے دنیا میں تنگ خیالی ایسی پھیلی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی ہے۔ اور دنیا میں جنگ و جدال کی کثرت ہو گئی ہے۔ گہری فلسفیانہ نگاہ سے اگر دیکھیں تو عام بنی نوع انسان کو اس اصول سے ضرور نقصان پہنچتا ہے۔ گو وہ محدود جماعتیں جو علیحدہ علیحدہ قومیں بنی ہوئی ہیں اس اصول کی بدولت جلد ترقی

کر جائیں۔ ان خیالات کو نظم میں یوں بیان کیا گیا ہے ؎

آں چناں قطع اخوت کردہ اند　　بر وطن تعمیر ملت کردہ اند　صفحہ ۴۷

ایں شجر جنت زعالم بردہ است　　تلخیِ پیکار بار آوردہ است

مردمی اندر جہاں افسانہ شد　　آدمی از آدمی بیگانہ شد　صفحہ ۴۹

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند　　آدمیت گم شد و اقوام ماند

اس مسئلہ سے کہ ملت اسلامی حدودِ مکانی کی پابند نہیں۔ قدرتی طور پر حدود زمانی کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے اور اس کے متعلق شاعر نے ایک باب میں یہ بیان کیا ہے کہ ملتِ اسلامی کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رومیاں را گرم بازاری نماند　　آں جہاں گیری جہانداری نماند　صفحہ ۵۷

شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست　　رونقِ خمخانۂ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند　　استخوانِ او تہِ اہرام ماند　صفحہ ۵۸

در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست　　ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما　　گلستاں میرد اگر میریم ما　صفحہ ۵۹

اسلامیوں کو یہ بتانے کے بعد کہ اُن کی ملت آن کے مذہب پر مبنی ہے، اور اس کے دوام کا وعدہ ہو چکا ہے، ان کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب جبھی ہوگا کہ وہ اپنے آئین کے پابند ہوں جو اُن کی آسمانی کتاب یعنے قرآن شریف میں مندرج ہے۔ اس باب میں قرآن شریف کی تعریف خوب اشعار میں کی گئی ہے جن میں سے صرف دو یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ او رحمۃ اللعالمیںؐ　صفحہ ۵۹

گر تو مے خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن　صفحہ ۶۲

آگے چل کر مسلمانوں کو شرع کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے ؎

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات　　شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا　　آنچہ حق مے خواہد آں سازد ترا

اگر اسی طرح باقی سب بابوں کا خلاصہ اس مختصر تبصرہ میں درج کیا جائے تو شاید باعثِ طوالت ہوگا۔ شائقین اصل کتاب کو پڑھیں اور مستفید ہوں۔ مگر دو تین بابوں کے خاص خاص اشعار کا ذکر کئے بغیر پھر بھی رہا نہیں جا سکتا۔ اُن میں ایک تو وہ باب ہے جس میں علم تاریخ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ترقی قومی کے لئے تاریخ دانی لازم ہے۔ یہ مضمون کیسے خوبصورت اور سلیس لفظوں میں ادا ہوا ہے ؎

ربطِ ایام است مارا پیرہن　　سوزنش حفظِ روایاتِ کہن
چیست تاریخ اے زخود بیگانۂ　　داستانے۔ قصہ۔ افسانۂ
ایں ترا از خویشتن آگہ کند　　آشنائے کار و مردِ رہ کند

اس سے اگلا باب بھی توجہ کے قابل ہے۔ اس میں عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ جتایا گیا ہے کہ اچھے بیٹوں، بیٹیوں کی ماں بننا بڑے فخر کی بات ہے اور نوعِ انسان کے صنفِ نازک کا یہ سب سے بڑا فرض ہے۔ جدید زمانہ میں اس فرض کی طرف جو بے توجہی کا میلان ہے وہ بہت نقصان دِہ ہے۔ ایک گنوار اور بد وضع لڑکی جو کسی نیک اور کارآمد شخص کی ماں بنتی ہے۔ اُس نازنین گل اندام سے بہتر ہے جو اپنے اس اہم فرض سے بے پروا ہو یا اس ذمہ داری کی متحمل ہونے کے ناقابل۔ اس پیغام کو تو حضرتِ اقبال سے اُنھی کے الفاظ میں سنئے

آں دُخِ[1] رستاق زادے جاہلے[2]　　پست بالائے سطبرے[3] بے دلے[4]
نا تراشے پرورش ناوادۂ　　کم نگاہے۔ کم زبانے۔ سادۂ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں　　گرد چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست　　یک مسلمانِ غیور و حق پرست[5]

---

[1] دُخ۔ مخفف دختر۔ [2] گنوار۔ [3] موٹی۔ [4] سیدھی شکل کی۔ [5] ماں بننا ۱۲

ہستیٔ ما محکم از آلامِ اوست　　　صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست

رسولِ عربی کی بیٹی حضرتِ فاطمۃ الزہراؓ کا نامِ مبارک اس سلسلہ میں مسلمان عورتوں کے لئے نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی خوبیوں اور نیکی کے لحاظ سے رسول کریمؐ جیسے باپ کی پیاری بیٹی حضرت علیؓ جیسے شوہر کی چہیتی بیوی اور حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ جیسے بیٹوں کی واجب التعظیم ماں بنی۔ اور اُنہوں نے اپنی زندگی میں مثال قایم کی کہ عورت ذات کس طرح اپنی زندگی کے ان تینوں مرحلوں پر اپنے فرائض کو ادا کرے کہ ساری ملت کے لئے بہتری کا باعث ہو۔ حضرت فاطمہؓ کی شان میں جو اشعار اقبالؔ کے قلم سے نکلے ہیں وہ اس دلی ارادت کے ترجمان ہیں جو اقبالؔ کو رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے ہے۔ اور ان میں یہ دو شعر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ صفات کا ایک دریا ہے جو ایک ایک شعر کے کوزہ میں بند کیا گیا ہے۔ اہلِ نظر داد دیں گے اور جنہیں تفصیل نہ معلوم ہو وہ صفحاتِ تاریخ و سیر ملاحظہ کریں ؎

آں ادب پروردۂ صبر و رضا　　　آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز　　　گوہر افشاندے بدامانِ نماز

آخری باب جس میں مثنوی کے مطالب کا خلاصہ اور سورۂ قل ھو اللہ احد کی تفسیر ہے خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب کا خاتمہ عرضِ حالِ مصنف پر ہوتا ہے جو بارگاہِ رسالت مآبؐ میں کی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کہ وہ راستے سے دور جا پڑے ہیں۔ اُن کے "شیخ" "برہمن" سے زیادہ بت پرست ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اُن کے دماغوں میں بت چھوڑ مندر بھر گئے ہیں۔ جو صفات پہلے غیر مسلموں سے مخصوص تھیں وہ اُنہوں نے سیکھ لی ہیں۔ موت سے نہ ڈرنے کی بجائے ڈرنے لگے ہیں۔ عرب کی بجائے عجم کی تقلید میں مبتلا ہیں۔ دعا ہے کہ اُن کو جو پیغام اس مثنوی کے ذریعے رہ حق کی طرف پھر آنے کے لئے دیا گیا ہے وہ باا ثر ثابت ہو اور مقبول ہو

اخیر میں چند شعر شاعر نے اپنی ایک دلی آرزو کے اظہار میں لکھے ہیں۔ اور اُن میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان شعروں کا مزا اہلِ دل اور فدائیان نبیؐ لیں گے ؎

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

مسلمے از ما سوا بیگانۂ
تا کجا زنجیریِ بُت خانۂ

حیف چوں اور اسر آید روزگار
پیکرش را دیر گیرد در کنار

از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فردائے من

(صفحہ ۱۳۸)

تمام شد